بسم اللہ

جامعہ

زیرِ ادارت - ڈاکٹر سید عابد حسین ایم - اے - پی - ایچ - ڈی

نمبر ۱	جنوری ۱۹۳۷ء	جلد ۲۸

فہرستِ مضامین

ت سالانہ ... فی پرچہ ۸

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) ... المطابع برقی پریس میں

عبادت

مذہبی عقائد کی چھان بین اور جذبہ دینی کے ارتقاء کا سلسلہ قائم کرنے کی جو کوششیں یورپی عالم تقریباً اسّی برس سے کر رہے ہیں اُن سے کوئی اور نتیجہ نکلا ہو یا نہ ہو، قدیم زمانے کی مذہبی روایتوں اور دیومالا کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ مشرق اور مغرب کی مقدس کتابوں کے ترجموں اور تشریحوں نے پہلے کے مقابلے میں مذہبی عقائد کا مطالعہ بہت آسان کر دیا ہے جو عالم مختلف مذہبوں کو اپنے سامنے رکھ کر ان پر اسی انداز سے غور کرتے ہیں جیسے کہ ایک نقاد مختلف شاعروں کے کلام پر، وہ اس نتیجے کو پہنچتے ہیں کہ کسی قدیم یا جدید مذہب میں کوئی بات نئی یا نرالی نہیں ہے، اور کسی مذہب کے پیرو یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے عقائد صحیح اور باقی سب کے غلط ہیں۔ کیوں کہ جس قدر ہم غور کرتے ہیں اتنے ہی ہمیں اس کے ثبوت ملتے جاتے ہیں۔ کہ مذہبوں میں مشترک صفات زیادہ ہیں۔ اور انفرادی خصوصیات کم، اور یہ خصوصیات بھی حالات اور مذاق کے فرق نے پیدا کی ہیں۔ ایسے حقائق نے نہیں کہ جن کا علم پہلے کسی کو نہ تھا۔ ایک اور نتیجہ جو اس تحقیق سے نکلا ہے یہ ہے کہ ہر مذہب، خواہ وہ کسی قوم کی میراث ہو جس سے وہ اور سب کو الگ رکھنا چاہتی ہو یا ایسا کہ جو عالم گیر بننے کا حوصلہ رکھتا ہو، دراصل انسانوں کی ایسی مادی ضروریات اور اغراض کا ایک عکس ہوتا ہے جن کا پورا ہونا انسان کی ترقی اور کامیابی کے لئے ناگزیر ہو اور اسی وجہ سے اس کو تقدس کا زرہ پہنا کر انکار اور مخالفت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ اور ایسی بہت سی باتیں یورپی عالموں نے اپنے کلیسا، اس کی تعلیم اور اس کے تعصبات کی ضد میں کہیں، اور چونکہ دینی معلم شروع شروع میں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے وہ ان پر بہت جز بز ہوئے۔ اور ایسے تعلیم یافتہ لوگ جو پرانے عقائد سے مطمئن نہ تھے اس نئے علم کو اصل حقیقت سمجھ بیٹھے۔ مسلمانوں میں پچھلے سو ڈیڑھ سو برس کے اندر نہ عالم ایسے

دشمن کے بکے ہوئے ہیں کہ اپنی عاقبت کو علمی تجسس کی نذر کر دیں نہ مذہبی رہنما ایسے صاحب اجتبا کر جس کھوپڑی کو غلط خیالات سے بھرا ہوا پائیں اسے پھوڑ کر رکھ دیں۔ نئے علم اور پرانے مذہب میں تضاد لوگ اب بھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ علم کی کمی یا طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے ہے، اور جیسے علم بڑھتا جائے گا اور ذہن غلامی کے اثرات سے پاک ہوتا جائے گا مذہب اور علم کی ہم آہنگی اور یک جہتی بڑھتی جائے گی۔

اگر علمی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ دنیا کے تمام مذہب ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کے مختلف طریقے ہیں جیسے دنیا کی تمام نسلیں اور قومیں ایک اصل کے مختلف نمونے ہیں تو اس سے کسی مذہب کی قدر گھٹ نہیں جاتی، اور اس کی شخصیت میں بھی فرق نہیں آتا۔ نوع انسانی کا ہر فرد، خواہ اسے تعلیم اور ماحول نے ایک نمونے کے مطابق ڈھالنے کی کتنی کوشش کی ہو، اپنی الگ شخصیت ضرور رکھتا ہے۔ اور بعض افراد جن میں زیادہ قوت ہوتی ہے ہر طرح کے دباؤ کے باوجود ابھر کر نقل کی جگہ نیا نمونہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جذبۂ دینی اصل میں ہر جگہ ایک ہے لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جس میں وہ ابھر کر ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی قوت حاصل کر لیتا ہے اور اگر بانی مذہب ایسا کامل ہو کہ ایک قوم یا ایک نسل ہی کو اپنا نہ سمجھے بلکہ ہر قوم اور ہر نسل یعنی انسانی فطرت کا ہر نمونہ اس میں مرغوب صفات کی کامل صورت دیکھے تو مذہب خود بخود عالم گیر ہو سکتا ہے۔ اس مذہب میں ایسی حقیقت ہو نہیں سکتی جس کا کبھی کسی کو علم یا احساس نہ تھا۔ اس لئے کہ ایسی نئی حقیقت کے لئے نیا نظام کائنات اور نئی انسانی سرشت درکار ہوگی، نئی بات ہر مذہب میں بانی کی حیثیت، اس کی تعلیم کی مجموعی شکل ہوتی ہے اور مذہب کو پرکھنے کی کسوٹی یہ اندازہ ہے کہ اس میں عام انسانی سرشت اور عام انسانی ماحول کس حد تک مدنظر رکھا گیا ہے اور کس حد تک ایک خاص قوم کا مذاق اور مزاج یعنی وہ صرف اپنوں کی فکر کرتا ہے یا اپنے پرائے کی قید سے آزاد ہے۔

علمی تحقیق نے مذہب کے متعلق جو دوسری حقیقت معلوم کی ہے کہ وہ اصل میں مادی ضروریات اور اغراض کا عکس ہے علم کے پرستاروں کے نزدیک مذہب پر ایک کاری ضرب ہے۔ کیونکہ وہ

یہ بتا سکتی ہے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ لیکن جو واقع ہوا اس کی اخلاقی قدر و قیمت جانچنے کے لئے تاریخ کا اپنا کوئی معیار نہیں۔ مورخوں کا البتہ اپنا معیار ہوتا ہے جسے ان کے عقیدے اور ذہنی تعصبات قائم کرتے ہیں۔ لیکن اس غیر علمی معیار کو وہ اپنے عقیدوں میں اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ دیکھنے والے کو اس کا پتہ نہیں چلتا یہ ہماری سادہ لوحی ہے کہ ہم عالم اور شعبدہ باز کو آدمیوں کی دو مختلف قسمیں سمجھ بیٹھتے ہیں ورنہ عالموں کے بستے پر ہر طرح کا شبہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہئے۔

تاریخ کے عالم شعبدہ بازی پر اس وجہ سے مجبور ہوئے ہیں کہ وہ تاریخ سے ایسے کام نکالنا چاہتے ہیں جو اس کے دائرے سے باہر اور اس کے اصل مقصد سے دور ہیں۔ تاریخ ایک نئے دین کی بنیاد نہیں بن سکتی، لیکن جذبۂ دینی کے مظاہر سے ہمیں واقف کر سکتی ہے۔ ماحول قادرِ مطلق نہیں ہے لیکن وہ انسانی زندگی کے تمام راز اپنے سینے میں رکھتا ہے۔ اس طرح یہ دعویٰ کہ مذہب مادی ضروریات اور اغراض کا عکس ہے۔ موجودہ مذہبوں کو مٹانے اور ایک علمی مذہب قائم کرنے کی نیت سے پیش کیا جائے تو وہ غلط ہے اس لئے کہ مادی اثرات معلوم کرنے کے لئے ہمارے جو ذریعے ہیں وہ محدود ہیں اور محدود رہیں گے اور ان کی حد سے گذرنے کے لئے ایسی بصیرت درکار ہے جو علم کی ایک علیحدہ اور بہت اعلیٰ قسم ہے اور کتابی عالموں اور اصطلاحوں سے بحث کرنے والے فلسفیوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن اگر یہی دعوے جذبۂ دینی کو انتہا پسندوں کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے کیا جائے تو وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ مذہب کوئی کتابی علم نہیں ہے۔ عقل کے کارخانے کی بنی ہوئی چیز نہیں۔ جذبۂ دینی انسانی زندگی اور انسانی شخصیت کو نمو اور فروغ دینے والی قوتوں کا سرچشمہ اور ان کا غیر محدود قدرتی ذخیرہ ہے اور جب تک ہم کو اس دنیا کے خاص مادی ماحول میں زندگی بسر کرنا ہے۔ مذہب کو مادی ضروریات اور اغراض سے کس طرح جدا کیا جا سکتا ہے۔ مادی ضروریات اور اغراض ادنےٰ بھی ہوتی ہیں اور اعلیٰ بھی، مگر اس کا کیا۔ انسان اشرف المخلوقات بھی ہے اور حیوان بھی۔

عبادت جذبہ دینی کی وہ شکل ہے جو مذہب اور زندگی کے تعلق کو قائم رکھتی ہے اور عبادت

کے جو طریقے اور اس کے جو مقصد کسی مذہب نے مقرر کئے ہوں، انھیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اور زندگی کا تعلق کس قسم کا ہے۔ عبادت کے ابتدائی طریقے۔ جن کا رگ وید کے بھجن اعلیٰ سے اعلیٰ، اور جان پرستی سب سے ادنیٰ نمونہ ہے، نوع انسانی کی خیر و عافیت کے لئے دعائیں مانگنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ نوع انسانی کی وہ حالت تھی جب اخلاقی خیر و شر، عدل اور انصاف کا معیار بن کر تیار نہ ہوا تھا، اور نجات کی وہ تمنا جس کے سائے میں بعد کو زندگی بسر ہونے والی تھی جسمانی سلامتی کی خواہش سے جُدا نہیں ہوئی تھی۔ عبادت کے طریقے جبلی ہیں، فطری ہیں۔ اخلاقی اور روحانی نہیں ہیں، تاریخ اور حیاتیات کے علم ان کے اور مہذب انسانوں کی عبادت کے درمیان رشتہ قائم کرنے میں اتنے ہی "کامیاب ہوئے ہیں جتنا کہ انسان کا بندر سے سلسلہ ملانے میں، آدمی انسان اسی وقت سے مانا جا سکتا ہے جب اس کو خیر و شر کا شعور اور علم ہوا۔ اور جب اس نے اپنے اخلاقی معیار کے مطابق زندگی کی طرح ڈالنے کا حوصلہ کیا۔ اس اعتبار سے گوتم بدھ، حضرت عیسیٰ اور پیغمبر اسلام کی تعلیم اور عبادت کا وہ مفہوم جو اس تعلیم میں مضمر ہے پہلے کے اور تمام مذہبوں سے جدا اور اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کے سب سے اہم اور نتیجہ خیز انقلاب انھیں مذہبوں کے پھیلنے سے ہوئے۔ یہی وہ "اتفاقات" ہیں جنھیں "تاریخ سمجھا نہیں سکتی"، آزاد اخلاقی ارادے، کے وہ عظیم الشان مظہر جو ہماری آئندہ ترقی کے ضامن اور اس وقت ہمارا سب سے مضبوط سہارا ہیں۔ یہاں اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ یہ علمی تحقیق کے کارنامے نہیں تھے۔ عبادت کے نئے طریقوں کے ذریعے سے نئی زندگی تعمیر کرنے کے منصوبے تھے اور اس وقت بھی ہماری کامیابی اس پر منحصر ہے کہ ہم اپنی حکمتِ علمی کو علوم صحیحہ کا محتاج نہ بنائیں۔ بلکہ اسے عبادت کا مظہر جانیں میں در اصل کچھ کہنا اور چاہتا ہوں یہ تمہید تو اس لئے ضروری تھی کہ بغیر اس کے میں اپنا مطلب سمجھا نہیں سکتا تھا۔ جب ایک طرف لوگ مذہب کو اپنی نئی زندگی سے جان بوجھ کر خارج کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف لوگ بغیر جانے بوجھے اپنے مذہب کا اسی نئی زندگی سے رشتہ توڑ رہے ہیں۔ ہندوستان میں مذہب کی مخالفت کرنے والے بہت سے ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ

وہ ارتقار کی اس منزل سے گذر چکے ہیں۔ جہاں اخلاق اور اعلیٰ مقاصد کے لئے مذہب اور عقیدے کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے یورپ میں تعلیم پائی ہے یا ان کی نئی معاشرت ان پابندیوں کو گوارا نہیں کرسکتی جو مذہب نے مقرر کی ہیں۔ ان میں سے جو لوگ تعلیم کی بدولت پہنچے ہوئے بنتے ہیں ان کا علمی اور عقلی سرمایہ یورپ کے کسی مفکر کے دو چار نظریے ہوتے ہیں۔ بیچارے بھگو وہ احتیاط بھی نہیں برتتے جو خود علم سکھاتا ہے اور ایسے نظریوں کو بھی بڑے جوش کے ساتھ دہراتے رہتے ہیں جو اگر غلط ثابت نہیں کئے جاچکے ہیں تو حقیقت کا مرتبہ ہرگز نہیں رکھتے، چونکہ وہ خود ارتقار کی اس منزل سے گذر چکے ہیں جہاں قول اور عمل پر ادب اور احترام کی قید لگی ہوتی ہے۔ وہ سقراط کی طرح اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ نادانوں کو چھیڑ کر دانا بنائیں۔ لیکن ان میں سقراط کی سی انسانی ہمدردی اور خلوص نہیں ہوتا۔ سقراط تو سقراط تھا[۵] یہ ڈانس بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جن کی قسمت ذرا اچھی ہوتی ہے بعض تو بے چارے اپنے غصہ کی آگ میں بھنتے رہتے ہیں۔ نہ آدمی نہ کباب، نئی معاشرت کے شیدائی پھر کچھ اچھے رہتے ہیں ان کے پاس روپیہ ہوتا ہے، چین سے رہتے ہیں۔ اپنے ہی جیسوں سے میل جول رکھتے ہیں اور بحث کا موقع ہوا تو اپنے کسی عام بھائی کو سامنے کر دیتے ہیں۔ نئی زندگی کے یہ دونوں قسم کے ہراول اپنے ان بھائیوں سے جو مذہب اور قدامت پسندی میں گرفتار ہیں سبقت لے جاتے ہیں تو بس اس اعتبار سے کہ اُن کی گرفتاری اور غلامی نئی وضع کی ہے۔

ہندوستان میں مذہب کے ایسے مخالف بھی ہیں جو مصلحت کی بنار پر مذہب کو بحث سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اب تک فسادیوں اور غداروں نے ہمیشہ مذہب اور ملت کی آڑ لی ہے اور سیاسی اغراض اور مفادِ عامہ کا احساس ہندوستانیوں میں جو تھوڑا بہت اتحاد پیدا کرتا ہے اسے مذہب اکثر مٹا دیتا ہے ان لوگوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ترقی اور اصلاح کے رستے میں مذہب کے روڑے اٹکانے والے آدمی کیسے ہیں اور قوم کو دھوکا دیتے ہوئے وہ اپنی ذاتی اغراض کو چھپا سکتے ہیں

---

[۵] سقراط نے ایتھنز کی جمہوری عدالت کے سامنے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں ڈانس ہوں میرا کام ایتھنز والوں کو ستانا ہے

یا نہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ فساد اور غداری کسی کو ملت سے خارج نہیں کر دیتی ۔ اور مسلمان مسلمان رہتا ہے چاہے وہ ملت کا خادم ہو یا اسے ہر خریدار کے ہاتھ بیچتا پھرے ۔ اس صورت میں مذہب سے علیحدہ ہوئے بغیر کوئی کام نہیں بنتا اور اگر مذہب کو چھوڑنے سے ایسے بہت سے آدمی بھی چھٹ جائیں جو قومی مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں اس خیال کے جو لوگ ہیں وہ چاہے اصولاً ہر مذہب کے مخالف ہوں اور وہی عقیدے رکھتے ہوں جو یورپی علم یا معاشرے کے غلاموں کے ہیں ۔ اُن کی شکایت بالکل بجا ہے ۔ ہم برسوں سے ہر روز اور ہر جگہ مذہب کے وفا باز خیر خواہوں کو ہندوستانی قوم ہی نہیں بلکہ اپنی ملت کا کام بگاڑتے اور اسے بے آبرو کرتے دیکھتے آئے ہیں ۔ اور ان لوگوں کی طرف سے جو اصولاً اور پورے خلوص کے ساتھ مذہب کو صحیح زندگی اور سچی کامیابی کی بنیاد مانتے ہیں کوئی تحریک نہیں ہوئی ہے کہ دین داری کو پرکھنے کے لئے قوم پرور اخلاق اور مفاد عامہ کا معیار مقرر کیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسا معیار مقرر نہ کیا گیا تو ہندوستان کی ہر ملت اور سب سے پہلے مسلمان خود پرست اور انگریز پرست غداروں کے ہاتھوں تباہ ہوں گے ۔

تو باوجود اس کے کہ مذہب پر اعتراض کرنے کا طریقہ اکثر خود قابل اعتراض ہوتا ہے ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں، اور اب میں بحث صرف مسلمانوں سے کرنا چاہتا ہوں ، دین اور دنیا کے درمیان وہ رشتہ نہیں رہا ہے جو ان کا دین سکھاتا ہے وہ اپنی عبادت کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہیں یا اسے نظر انداز کر رہے ہیں جس کا ہماری موجودہ پستی اور انتشار ہی ایک ایسا ثبوت ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہماری عبادت سراسر روحانی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ایک تقریب بھی ہے ۔ وہ شخصی صرف اس حد تک ہو سکتی ہے کہ خلوص ہر شخص کے لئے لازمی ہے ۔ وہ پرستش کا طریقہ ہی نہیں ، اتحاد اور یک جہتی رکھنے کا ایک ذریعہ بھی ہے ۔ انتہا پسندی نے عبادت کے مفہوم کو ، روزہ نماز کی پابندی تک محدود کر دیا ہے ۔ اور روزہ نماز کا مقصد بھی ثواب کمانا ٹھہرایا ہے ۔ اور اگر اسلام نے دینی فرائض مقرر کرنے

ہوئے دنیاوی ضروریات کا خیال رکھ کر ایسے رجحانات کی پیش بندی نہ کر لی ہوتی تو ہمارے انتہا پسند بزرگ ایسے اپاہج کے سوا جن کی عمر پلنگ سے اُٹھ کر مصلے پر اور مصلے سے اُٹھ کر پلنگ پر جانے میں صرف ہو، کسی اور طرح کا مزاج اور حوصلہ رکھنے والے آدمی کے لئے دین دار بننا مشکل کر دیتے، لیکن اسلام کی حکمت اور اس کی فطرت شناسی میں بھی ہمیں اس تنگ نظری یا یوں کہئے اس روحانی کاہلی سے بچا نہیں سکی ہے جو عبادت کے آسان سے آسان طریقے تلاش کر کے انھیں حجت اور تحقیق کی موشگافیوں اور تقدس اور سند کے وزن کے ذمہ داری کا ایک اچھا خاصا پیا بنا دیتی ہے اور بہت سے فرائض کو جنھیں ادا کئے بغیر اسلامی عبادت کبھی مکمل نہیں ہو سکتی نظر انداز کر دیتی ہے۔ اسے ہم صاف صاف کہنا چاہیں تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ روزے اور نماز کو لوگ آسان دیکھ کر انھیں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ جہاد کو جو ارکان اسلام میں اتنی ہی بڑی حیثیت رکھتا ہے بھلا دیتے ہیں۔ اس کی ایسی مہمل تشریح کرتے ہیں کہ اس کا موجودہ حالت میں فرض ہونا ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ مسلمان جہاد کی کسوٹی پر کسی کے ایمان کو پرکھ نہیں سکتے، ایک ریاکاری ہی نہیں بلکہ صریحی غداری کو تسبیح اور مصلے کی بساط بچھاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور کچھ کہہ نہیں سکتے، اس لئے کہ وہ غلط فہمی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اسکے مخالف اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے مرحلے ہی سے گذر نہیں پاتے۔ نقصان وہ پہنچاتی ہے، لعنت کسی اور پر بھیجی جاتی ہے

اپنی جداگانہ حیثیت رکھنے کے علاوہ یہ کہنا بھی غلط تھا اور اب بھی غلط ہے کہ مسلمان پر روزے نماز کی ادائگی فرض نہیں غور اسی پر کرنا ہے کہ روزہ اور نماز علامت ہیں اس عبادت کی جو ملت کی معاشی، سیاسی اور اخلاقی اصلاح اور ترقی سے ادا ہوتی ہے مسجد بنا کر کھڑی کر دینا کافی نہیں کہ قبلہ صرف ملی آزادی کی صاف فضا میں نظر آسکتا ہے۔ غریب اور امیر کا ایک صف میں کھڑا ہو جانا کافی نہیں۔ قوم اور ملت کی معاشی حالت میں توازن پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ گھر میں وقت سے نماز پڑھ لینا کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے اگر شخصی زندگی میں کوئی ضبط اور نظام اور مقصد نہیں، نیت باندھنے سے پہلے اور سلام پھیرنے کے بعد نمازی کے دل پر ذاتی اغراض

کا ہجوم رہتا ہے اور وہ خلوص کے ساتھ صرف اپنی ہی سلامتی اور کامیابی کے لئے دعا مانگ سکتا ہے۔ جب تک جہاد کا حوصلہ دل میں نہ ہو اور زندگی میں اپنا رنگ نہ دکھلائے ہماری عبادات ادھوری رہ جاتی ہیں۔

جہاد کے لئے کافر کی شرط لگائی جائے تو وہ بے شک ایک فرض ثابت نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ کفارِ مکہ کے نمونے اس وقت ہمیں بہت تلاش کرنے پر ملیں گے لیکن اگر ہم یہ سوچیں کہ مسلمانوں کو پچھلے دو تین سو برس میں کس نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور کیسے، تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کے اصل دشمن کون ہیں اور ہندوستان میں ہمارے مذہب اور ہماری ملت پر غلامی کا جو دھبہ ہے وہ کیسے مٹایا جا سکتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو ہندوستان کو آزاد کرنا، اور بلا کسی شرط اور تحفظِ حقوق کے آزاد کرنا ہمارا دینی فرض ہو جاتا ہے اور اگر ہم بے وقوف نہیں بننا چاہتے ہیں تو ہمیں ہتھیار بھی وہی استعمال کرنا چاہئیں جو اس وقت کام آ سکتے ہیں۔ ہمارا مقصد میدان میں پرا جما کر کھڑے ہونے سے پورا نہیں ہوگا بلکہ اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے سے۔ جان دینے سے نہیں بلکہ جان کھپانے سے، اس کا نام قومی خدمت یعنی قوم پر احسان کرنا کہئے تو یہ بہت مشکل ہوتا ہے اور اس سے طبیعت جلد اکتا جاتی ہے۔ اسے عبادت سمجھئے تو یہ عادت بن جاتا ہے، خود بخود ہموار رہتا ہے اور آدمی کی نظر دنیاوی کامیابی پر نہیں بلکہ عاقبت پر رکھ کر اس میں وہ عاقبت اندیشی اور انسانی فطرت کا لحاظ پیدا کر دیتا ہے جو اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتا۔

لیکن دنیا نے آج کل ایسا رنگ اختیار کیا ہے کہ سیاسی آزادی جہاد کی تمہید نہیں تو اس کا پہلا باب ہی ہو سکتی ہے کہ سیاسی آزادی کے ساتھ ایسی معاشی غلامی ہونا بھی ممکن ہے جو آدمی کی آبرو کو خاک میں ملا دے اور اسے اس لائق بھی نہ رکھے کہ وہ بازار میں اپنی محنت کیا اپنے آپ کو بیچ کر بھی دو کوڑی حاصل کر سکے۔ ایسا افلاس ممکن ہے جو انسانیت کو بالکل پامال کر دے۔ مختلف طبقوں اور ملتوں میں ایسی بیگانگی اور عداوت ممکن ہے جو کھلم کھلا خانہ جنگی

سے بھی بدتر ہو۔ ہمارے دشمن غیر ہی نہیں بلکہ مختلف طبقوں اور ملتوں کی غیریت بھی ہو اور اغراض کا ایسا اختلاف اور تصادم جو کہ آزادی کے مفہوم ہی کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہو، تاریخ کو دیکھئے تو آزادی کے مطالبے کے ساتھ ہمیشہ ایک غرض لگی ہوتی ہے۔ آزادی کے جھنڈے کے نیچے ایک فوج بھی کھڑی ہوتی ہے۔ کبھی آزادی مذہبی جماعتوں کا مطالبہ تھی جو آزاد ہوئے بغیر اطمینان سے اپنے مذہب کی پیروی نہیں کر سکتی تھیں۔ کبھی وہ ایسے طبقوں کا نعرہ تھی جن کی نشوونما ریاست یا قدامت پسند طبقے روکے ہوئے تھے۔ اس نے بعض جو نیا یا دہ سیاسی تھا، لیکن تھی دراصل وہ کچھ اور اس وقت اگر ہم یہ سمجھیں کہ آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو ہم آزادی کی بس ظاہری شکل دیکھیں گے۔ اور ظاہری شکل کے ساتھ ہمیشہ ڈھول کے اندر پول کا شبہ لگا رہتا ہے۔ ہمارے دلوں میں آزادی کے حوصلے کو ایک نئی زندگی تعمیر کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیئے اور زندگی ایک طبقے کے مفاد، کسی ایک خیال کے پرچار سے بہت زیادہ بڑی چیز ہے۔

اس وقت یہ ممکن ہے کہ ان لوگوں کو جو مظلوم ہیں یا اپنے حق سے محروم رکھے گئے ہیں ظلم اور زیادتی کا احساس دلا کر بیدار کیا جائے اور انھیں ان اغراض کی مخالفت ہی پر نہیں جن کی بدولت یہ ظلم ہوا بلکہ اس سارے نظام حیات کو جس نے یہ ظلم روا رکھا درہم برہم کرنے پر آمادہ کیا جائے یعنی مختلف طبقوں کی عداوت مذہب اور تہذیب کی بیخ کنی اور سماج کے اندر خانہ جنگی، وہ تمام مرحلے طے کئے جائیں جنکے بغیر آجکل انقلابی تحریک کا اصولاً صحیح اور عملاً کامیاب ہونا دشوار مانا جاتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم روس کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں، قومی سیرت اور مخصوص حالات کا گہرا مطالعہ کریں دنیا کا رنگ دیکھتے رہیں اور زندگی کی ایسی اصلاح کریں جو چاہے کسی خاص فلسفے کے مطابق نہ ہو مگر ہمارے دیس اور دیس والوں کو پورا پورا فیض پہنچائے۔ یعنی اس وقت جو ظلم ہو رہا ہے اسے بند کرنے، جو اندھیرا پھیلا ہے اسے دور کرنے، جو مردنی چھائی ہے اس میں نئے حوصلوں کی جان ڈالنے کے لئے دو صورتیں ممکن ہیں، عداوت اور عبادت، اور اگر ہماری عبادت ثواب کمانے تک محدود رہی تو عداوت بلا روک ٹوک اپنا کام کرے گی۔

غزل کی حمایت

اعتراضات اور جوابات

ذیل کا مضمون حکیم آزاد انصاری صاحب
کے مجموعہ کلام کے مقدمے کا ایک حصہ ہے
جو ہنوز زیر طبع ہے۔

بعض کور مذاق اپنی زبان اور اپنے شعروادب کے دشمن کچھ عرصہ سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ غزل کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا جائے۔ یہ نادان اپنی غزل کی دشمنی کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔ (۱) "غزل کا معشوق مذکر ہوتا ہے، اور یہ ایک شرمناک امر ہے" (۲) "غزل آج تک انھیں مضامین ومطالب کی حامل چلی آرہی ہے جو صدیوں پہلے ظاہر کئے جا چکے ہیں، اس میں خیالاتِ نو کی مطلق گنجائش نہیں"۔ (۳) "غزل کے معشوق کا دہن موہوم ہوتا ہے، کمر معدوم ہوتی ہے، قد سروشمشاد سے بھی دو ہاتھ اونچا ہوتا ہے، گردن گردنِ صراحی سے بھی دو تین بالشت لمبی ہوتی ہے، اس کی آنکھیں گلہائے نرگس کے مثل، اس کے بال سنبل کے مانند، اس کی زبان برگ سوسن کے مشابہ ہوتی ہے یہ معشوق ایک ناممکنات کا پتلا ہوتا ہے، اگر کسی طرح مجسم کر دیا جائے تو آدمی ڈر ڈر کے بھاگنے لگیں" (۴) غزل بوالہوسی اور پست خیالی سکھاتی ہے" (۵) "غزل کا ہر شعر جداگانہ اور متضاد مضمون کا حامل ہوتا ہے، اس کے اشعار میں کوئی ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا، وہ بالکل ایک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے، جو ذہنِ انسانی کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ واحد دماغ میں بیک وقت اتنے مختلف اور متضاد خیالات پیدا ہو سکیں (۶) "تمام اصنافِ سخن میں تو مطالب ومعانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، مگر غزل میں اس کے برخلاف الفاظ کے لئے مطالب ومعانی کی جستجو کی جاتی ہے اور یہ ایک بالکل غیر فطری طریقہ ہے"۔ یہ دلائل بظاہر تو نہایت وزنی اور قطعی مسکت نظر آتے ہیں، مگر درحقیقت بالکل بے وزن، بے حد

فریب دہ اور محض لچر پوچ ہیں اور ان کی پیداوار نتیجہ ہیں صرف مغرب زدگی کا بالترتیب جوابات ملاحظہ ہوں

(۱) "غزل کا معشوق مذکر ہوتا ہے، اور یہ ایک شرمناک امر ہے"۔ غزل کا معشوق مذکر نہیں ہوتا بلکہ اس میں افعال و صفات مذکر استعمال کئے جاتے ہیں، یہی بالکل درست ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے اس کی وجوہ حسبِ ذیل ہیں:۔

اوّل مرد صنفِ قوی ہے اور عورت صنفِ نازک، اور ہر امر میں صنفِ قوی کا لحاظ زیادہ رکھا جاتا ہے۔ اگر مرد و عورت کا جدا جدا ذکر کریں گے تو یوں کہیں گے " اتنے مرد آئے، اتنی عورتیں آئیں"۔ لیکن جب مخلوط و مشترک ذکر منظور ہوگا تو یوں کہنا پڑے گا " اتنے مرد عورت آئے، یا اتنے عورت مرد آئے"۔ یعنی لفظ عورت خواہ مقدم ہو یا موخر فعل دونوں صورتوں میں مذکر ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افعال و صفات مذکر کو افعال و صفاتِ مونث پر ترجیح ہے اور یہ دونوں صنفوں کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

دوم جب کوئی ایسا عام حکم دیا جاتا ہے جو مرد و عورت دونوں کو حاوی ہو اس وقت بھی ہمیشہ افعال و صفات مذکر ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً " جو شخص اس رستے سے گذرے گا اس کو دس روپے جرمانے کی سزا دی جائے گی"۔ یہاں بھی فعل مذکر ہی استعمال کیا گیا ہے۔ مگر صرف اس بنا پر کہ اس حکم میں فعل مونث " گذرے گی" استعمال نہیں کیا گیا عورت کو اس حکم کے اثر سے مستثنےٰ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اگر یوں کہا جاتا " جو اس رستے سے گذرے گی اُس کو دس روپے جرمانے کی سزا دی جائے گی"۔ تو بالیقین مرد اس حکم کے دائرۂ اثر سے خارج ہوتا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ افعال و صفات مذکر کو ترجیح ہے اور ان کا دائرۂ اثر مرد عورت دونوں کو محیط ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کے قوانینِ حکومت اور ہر مذہب کے قوانین شرع میں تمام و کمال افعال و صفات مذکر ہی استعمال کئے گئے ہیں، جو مرد عورت دونوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مصنفہ علامہ حالیؒ۔

سوم، اگر غزل میں افعال و صفات مونث لائے جانے لگیں تو صرف عورت بہ حیثیت معشوق باقی رہ جائے گی اور مرد اس کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا، حالانکہ کبھی مرد عاشق ہوتا ہے اور کبھی عورت

اور غزل ٹھہری مرد و عورت دونوں کے معاملاتِ عشق کے اظہار کا ذریعہ اس لئے غزل میں افعال و صفات مذکر ہی کا استعمال زیادہ انسب ہے کہ وہ اِن دونوں صنفوں کو حاوی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عورتیں بھی جب غزل کہتی ہیں تو وہ بھی افعال و صفات مذکر ہی کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہندی میں شاعری صنفِ نازک کی زبان سے کی جاتی ہے اور اس میں افعال و صفات مونث استعمال کئے جاتے ہیں، اور مرد و عورت دونوں کو حاوی ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ "جناب آپکے اس استدلال کو افعال و صفات مذکر کی حد تک تو قبول کیا جا سکتا ہے مگر ستم تو یہ ہے کہ غزل میں "سبزہ خط" "چہرا" "دستار" "ترک بچہ" اور "ہندو بچہ" جیسے مخصوص بہ صنف قوی الفاظ بھی تو پائے جاتے ہیں، جس سے قطعی یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل کا معشوق مذکر ہی ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت! آپ اِسے مرد کا مرد کے ساتھ عشق جتانا کیوں کہتے ہیں، ممکن ہے ان میں عورت کے جذباتِ عشق ظاہر کئے گئے ہوں، اب اگر یہ کہیں گے کہ "جناب! یہ اشعار تو اکثر مردوں کے کہے ہوئے ہیں" تو میں کہوں گا کہ بے شک یہ مردوں کے کہے ہوئے ہیں۔ مگر کیا مرد عورت کے جذباتِ عشق ظاہر نہیں کر سکتا؟ آخر کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا عورت مرد پر عاشق نہیں ہوتی اگر مرد نے عورت کے جذباتِ عشق بھی حوالۂ قلم کر دیئے تو اس نے کیا گناہ کیا۔ اگر یہ کوئی عیب ہے تو اس کو ہر حالت میں عیب ہونا چاہئے۔ یہ کیا ستم ہے کہ مرد ہندی شاعری میں عورت کے جذباتِ عشق ظاہر کرے تو وہ درست مگر غزل میں نادرست۔ اور پھر آپ اس عیب کو اپنی دیگر اصنافِ سخن مثنوی اور نظم وغیرہ میں تو جائز رکھیں اور بیچاری غزل کو اس بنا پر کشتنی و گردن زدنی قرار دے دیں۔ اور آخر مردانہ حُسن بھی تو آخر حُسن ہوتا ہے، وہ بھی دلوں کو لُبھاتا ہے، وہ بھی نظروں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے، اس میں بھی ایک خاص کشش ہوتی ہے، وہ بھی تعریف کئے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ جب یہ درست ہے اور درحقیقت درست ہے تو پھر ایسے اشعار کو بُرے معنی پہنانے کس کا قصور ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایک مرد نے ایک مرد کے حُسن کی تعریف کر دی ہے اور بس۔

اب ایک آخری صورت اور باقی رہ گئی ہے، اور وہ یہ کہ اگر مرد جذباتِ عشق ظاہر کرے تو اس کو افعال و صفات مونث استعمال کرنے چاہئیں، اور اگر عورت ظاہر کرے تو اس کو افعال و صفات مذکر۔ البتہ یہ درست بھی ہے اور مناسب بھی، واقعی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ مگر غزل میں نہیں بلکہ دیگر اصنافِ سخن مثنوی اور نظم وغیرہ میں۔ اس کی وجہ وجہ چہارم میں ملاحظہ ہو۔

چہارم۔ دنیا بھر جانتی ہے کہ متغزلین کی شاعری مجازی شاعری تک محدود نہیں ہوتی، ان کو حقیقی شاعری یعنی متصوفانہ شاعری بھی کرنی پڑتی ہے، اور معشوقِ حقیقی مذکر ہے، اس کو مونث نہیں بنایا جاسکتا اس لئے غزل میں افعال و صفات مذکر کا استعمال صرف بہتر و مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری و ناگزیر بھی ہے۔

(۲) "غزل آج تک انھیں مضامین و مطالب کی حامل چلی آرہی ہے جو صدیوں پہلے ظاہر کئے جاچکے ہیں، اس میں خیالاتِ نو کی مطلق گنجائش نہیں"۔ یہ غزل دشمن اصحاب شاید واقف نہیں۔ اگر واقف ہیں تو بالیقین اس کھلی حقیقت کے اعتراف سے پہلو تہی کرتے ہیں کہ صنفِ غزل مخصوص ہے صرف معاملاتِ حسن و عشق کے اظہار کے لئے۔ یہ جذبات و احساسات تمام دوسرے جذبات و احساسات سے محبوب و مرغوب تر جذبات و احساسات ہیں۔ یہ کبھی پہلے چھپائے جاسکے ہیں، نہ آئندہ چھپائے جاسکیں گے، یہ ہمیشہ ظاہر کئے جاتے رہے ہیں اور ہمیشہ ظاہر کئے جاتے رہیں گے۔ یہ اس قدر قوی ہیں کہ کوئی مخالف و مزاحم قوت ان کے اظہار کو روک نہیں سکتی۔ جس طرح زندگی کے لئے چلنا پھرنا کھانا پینا اور سانس لینا ضروری ہے اسی طرح ان کا اظہار بھی ضروری ہے۔ یہ جذبات و احساسات محدود ہیں، غیر محدود نہیں، ان کی ہمیشہ تکرار ہوتی رہی ہے، اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ آخر بیچارے غزل گو حضرات نئے جذبات و احساسات لائیں کہاں سے، اک بڑے سے بڑا متغزل بھی صرف اتنا ہی کرسکتا ہے کہ ان جذبات و احساسات کو اپنی قوتِ متخیلہ اور اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے مدد لے کر اک نئی، دل کش، انوکھی اور حسین تر صورت میں پیش کردے اور بس۔ اور اسی کا نام شاعریٔ کمال شاعری ہے، بہ فرضِ محال اگر دشمنانِ غزل غزل کے مٹانے میں کامیاب بھی ہو جائیں، اور

غزل صنفِ شاعری سے محروم کر دی جائے تو بہر حال ان جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے کوئی دوسری صنفِ شعر تلاش کرنی پڑے گی۔ جب ایسا ہے اور ضرور ایسا ہی ہے تو پھر غریب غزل ہی نے کیا قصور کیا ہے، جو آپ اس کو حلال کر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اب رہا اس اعتراض کا دوسرا جزو کہ غزل میں خیالاتِ نو کی گنجائش نہیں، یہ بھی ایک بڑی حد تک غلط ہے۔ اگر کوئی غزل میں یہ گنجائش پیدا کرنا چاہے تو بالیقین پیدا کی جا سکتی ہے، اور بلند خیالی اور وسیع النظر متغزلین یہ گنجائش پیدا بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ گنجائش اسی حد تک پیدا کی جا سکتی ہے جس حد تک کہ غزل غزل باقی رہے لیکن دشمنانِ غزل تو غزل کا وجود ہی باقی رکھنا نہیں چاہتے اس حساب سے تو لفظ "گنجائش" لفظِ مہمل ہو کے رہ جاتا ہے۔

(۳) "غزل کے معشوق کا دہن موہوم ہوتا ہے"۔ قد سروِ شمشاد سے بھی دو ہاتھ اونچا ہوتا ہے گردن گردنِ صراحی سے بھی دو چار بالشت لمبی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں گلہائے نرگس کا نشہ اس کے بال سنبل کے مشابہ اور اس کی زبان برگِ سوسن کے مانند ہوتی ہے، یہ معشوق ایک ناممکنات کا پتلا ہوتا ہے، اگر اس کو کسی طرح مجسم کر دیا جائے تو آدمی ڈر ڈر کے بھاگنے لگیں۔"

دشمنانِ غزل کا یہ اعتراض بھی چنداں قابلِ اعتنا نہیں۔ اصلیت صرف اتنی ہے، کہ چھوٹا دہانہ (دہن) پتلی کمر، دراز قد اور لمبی گردن خوشنما معلوم ہوتے ہیں، اور اگر ایک حسین میں حسن کے ساتھ یہ صفات بھی پائی جائیں تو اس کا حسن زیادہ دلفریب اور زیادہ جاذبِ نظر ہو جاتا ہے۔ اب رہ گئے سرو شمشاد، نرگس، سنبل وسوسن۔ یہ محض تشبیہی الفاظ واشیا ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ سرو شمشاد اپنے قد وقامت کے لحاظ سے خوشنما نہیں ہوتے۔ نرگس کے پھول میں چشمِ معشوق کی سی مستی نہیں پائی جاتی، سنبل کسی حسین کے بکھرے بالوں کی یاد نہیں دلاتی۔ برگِ سوسن کسی کی زبانِ حسین سے مشابہ نہیں ہوتی، مختصر یہ ہے کہ یہ سب تشبیہی الفاظ اور تشبیہی اشیا ہیں۔ ان کا استعمال غزل میں محض تشبیہاً کیا جاتا ہے نہ کہ بطورِ اصل وحقیقت۔ مگر دشمنانِ غزل ہیں کہ ان تشبیہات کا اک خوفناک مجسمہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم غزل سے نفور ہو جائیں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ بعض مبالغہ پسند

غزل گو اصحاب نے ان تشبیہات کا استعمال حد سے گذرے ہوئے مبالغہ کے ساتھ کیا ہے اور مخالفین غزل کو اسی سے غزل کے معشوق کی ایسی بھونڈی تصویر بنانے کا سامان . . . . ہاتھ آیا ہے۔ مگر یہ قصور ان مبالغہ پسند غزل گویوں کا ہے نہ کہ غزل کا۔

(۴) غزل پست خیالی اور بوالہوسی سکھاتی، بلکہ پست خیال غزل گو یہ گندگی پھیلاتے ہیں، کیونکہ غزل گویوں میں اکثریت پست خیال شعرا کی ہے۔ مگر یہ غزل گویوں ہی پر کیا منحصر ہے، ہر صنف شعر میں پست خیال شعرا کی کثرت ہوا کرتی ہے، اور وہ اپنے پست خیالات اور شرمناک جذبات کی اشاعت سے ملک کی ادبی فضا کو گندہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ شعرا حقیقت میں شاعر نہیں ہوتے بلکہ متشاعر ہوتے ہیں۔ یہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر دور میں ہوتے ہیں۔ یہ پہلے بھی تھے، اور اب بھی موجود ہیں اگر یہ سچ ہے کہ ہر شے اور ہر کیفیت اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے تو شعرا کے ساتھ متشاعرین کا وجود بھی اسی طرح لازم و ضروری ہے جس طرح نور کے ساتھ ظلمت کا وجود۔ اگر متشاعر نہ ہوں تو حقیقی شاعر کی تمیز ناممکن ہو جائے۔ متشاعرین کی شاعری ہمیشہ نظر انداز کی جاتی رہی ہے، اور اسی کو اب بھی نظر انداز کر دینا چاہئے۔ یہ خود کبھی باقی رہے ہیں نہ ان کی شاعری باقی رہی ہے، نہ یہ آئندہ باقی رہیں گے، نہ ان کی شاعری باقی رہے گی۔

متشاعرین کے برخلاف حقیقی شعرا ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں، اور بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ پہلے بھی کم ہوتے تھے اور اب بھی کم ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ پیغمبروں کی طرح عندالضرورت کبھی کبھی مبعوث ہوا کرتے ہیں، نہ یہ خود پست ہوتے ہیں اور نہ ان کی شاعری پست ہوتی ہے، یہ بلند فطرت، بلند خیال اور بلند نظر ہوتے ہیں۔ یہ جب آتے ہیں تو اپنی قوم، اپنے ملک اور اپنے شعر و ادب کے لئے حیاتِ نو کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ اور جب جاتے ہیں تو ان سب کو بقائے دوام عطا کر جاتے ہیں، ایسے بلند فطرت شعرا کو پست خیالی اور بوالہوسی کی اشاعت کا ذمہ وار قرار دینا چاند سورج کو تاریکی و ظلمت کا ذمہ وار ٹھہرانے سے ہرگز کم نہیں۔

زمانۂ حال کے بلند فطرت اور بلند خیال شعرا کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔ جناب بیخود دہلوی

حضرت جگر مراد آبادی۔ مولانا وحشی شاہجہاں پوری، مولانا حسرت موہانی۔ جناب آرزو لکھنوی، جناب صفی لکھنوی۔ جناب فانی بدایونی۔ جناب جوش ملیح آبادی۔ جناب نجم آفندی اکبرآبادی۔ جناب سیماب اکبرآبادی۔ جناب امجد حیدرآبادی۔ جناب ضامن کنتوری۔ جناب چکبست مرحوم۔ علامہ کیفی دہلوی۔ جناب پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی۔ جناب مولانا ظفر علی خاں صاحب۔ علامہ سر اقبال۔ جناب سالک مدیر انقلاب لاہور (اگر کسی ضروری صاحبِ کمال کا نام بوجہ لاعلمی یا سہواً اندراج سے رہ گیا ہو تو خواستگار معافی ہوں)

ان میں بعض صرف غزل گو حضرات ہیں اور بعض ناظم (نظم کہنے والے) بعض ایسے جامع کمال ہیں کہ وہ غزل گو بھی ہیں اور ناظم بھی، اور بعض ایسے وسیع نظر اور رفیع الخیال افراد ہیں جن کی شاعری غزلیاتی یا منظوماتی شاعری کے دائرے کو توڑ کر حکیمانہ و مصلحانہ شاعری کی حدود میں داخل ہو چکی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان غیر معمولی شاعرانہ دل و دماغ رکھنے والی صاحبِ کمال ہستیوں میں سے علامہ سر اقبال، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت فانی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں صاحب اور علامہ سیماب اکبرآبادی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

اگر آپ مندرجہ بالا فہرست پر تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو اس میں آپ کو اکثریت متغزلین ہی کی نظر آئے گی۔ للہ ہم کو بتایا جائے کہ ان صاحبِ کمال ہستیوں میں سے خواہ وہ متغزل ہوں یا غیر متغزل کس کی شاعری پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بوالہوسی و پست خیالی سکھانے والی ہے۔ اب اگر آپ ان کو چھوڑ کر یا ان میں شامل کر کے کلو، ممتو، بدھو یا شبراتی وغیرہ جیسے وقیع شعرا کے نام پیش کرنے کی جرات کریں گے تو پھر آپ کو جوابِ جاہلاں باشد خموشی۔ سننے کو تیار رہنا چاہئے۔ بہرحال غزل کی بلندی و پستی بھی اور اصنافِ سخن کی طرح کہنے والے پر موقوف ہے اگر کہنے والا پست خیال ہے تو وہ ضرور پست ہوگی، اور بلند خیال ہے تو وہ بالیقین بلند ہوگی یہ اگر سچ ہے اور درحقیقت سچ ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پست خیالی و بوالہوسی کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں تو وہ ہمارے ملک کے متشاعر ہیں، یا پھر وہ مدیران رسائل و جرائد جو اپنی سنہری

روپہلی مصلحتوں کی بنا پر ان متشاعرین کا کلام شائع کرتے رہتے ہیں۔

(۵) "غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال اور جذبے کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں کوئی ربط، ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ایک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے۔ خود ہی انسان کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے، یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک واحد دماغ میں بہ یک وقت اس قدر مختلف اور متضاد خیالات پیدا ہو سکیں"؛ اس اعتراض کے تین جزو ہیں۔ پہلا جزو یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال یا جذبے کا حامل ہوتا ہے، اس کے اشعار میں کوئی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا" یہ بالکل درست ہے کہ عموماً غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال کا حامل ہوتا۔ مگر یہ بالکل غلط ہے کہ اس میں کوئی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا۔ مسلسل غزلیں کی حد تک تو جو فارسی میں زیادہ اور اُردو میں نسبتاً کم پائی جاتی ہیں، شاید غزل دشمن حضرات بھی ربط و ہم آہنگی اور تسلسل کے قائل ہوں، رو گئیں غیر مسلسل غزلیں۔ اگر غائر نظر سے دیکھا جائے اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا جائے تو وہ بھی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل سے معرا نہیں ہوتیں، کیونکہ غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مختصر نظم ہوتا ہے، اور ایسی نظم ہوتا ہے کہ اگر وہ مناسب الفاظ میں پوری قوت سے ادا ہو جائے تو ہزار طول و طویل نظمیں مل کر بھی اس ایک شعر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ آخر نظم گو حضرات ہی کیا تیر مارتے ہیں۔ یہی نا کہ ایک مفرد خیال کو دس پندرہ یا بیس پچیس اشعار میں پھیلا کر ایک کافی حد تک شرح و بسط سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر غزل گو شخص اسی پھیلے ہوئے خیال کو سمیٹ کر اور اپنے مخصوص متغزلانہ اشاروں، کنایوں، اور تلمیحات سے کام لے کر صرف ایک شعر میں ادا کر دیتا ہے جس کا ہر اشارہ یا کنایہ ہزار داستان درآغوش ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی پھر اس سمٹے ہوئے خیال کو دس بیس اشعار میں پھیلا کر نظم کے قالب میں ڈھالے گا (جیسا کہ اکثر آج کل کے نظم گو حضرات کرتے رہتے ہیں) تو یقیناً طاقت تقسیم ہو جائے گی اور جس حد تک طاقت تقسیم ہو جائے گی اسی حد تک اس کا مرتبہ شعریت بھی پست ہو جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ آج کل زیادہ سے زیادہ بیس پچیس برس سے "نظم" کا لفظ بہ اتباع مغرب جس معنی میں مستعمل ہو رہا ہے اس معنی میں ہمارے ہاں نظم کا وجود نہ تھا، مگر یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہماری شاعری میں سرے سے نظم کا وجود ہی نہ تھا۔ تھا اور ضرور تھا۔ مگر دوسری صورتوں میں اور ان صورتوں کو نظم کے نام سے موسوم

نہیں کیا جاتا تھا۔ فارسی زبان میں زیادہ اور اُردو زبان میں کم اکثر مسلسل غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اور مسلسل غزلیں بھی نظم ہی کی صنف میں داخل ہیں۔ اگرچہ غیر مسلسل غزلیات کا ہر شعر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ بجائے خود ایک مختصر و مکمل نظم ہوتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے اشعار میں اوّل سے لے کر آخر تک یعنی از مطلع تا مقطع بالاکثر تسلسل نہیں پایا جاتا، اور پایا بھی نہ جانا چاہئے۔ کیوں کہ صنفِ غزل مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے ایجاد ہی نہیں کی گئی۔ وہ وضع کی گئی ہے صرف مفرد یا مرکب خیالات کے ادا کرنے کے لئے بے حد ایجاز واختصار کے ساتھ مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے ہماری شاعری میں دوسری ایک درجن کے قریب اصناف موجود ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

رباعی، قطعہ، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مثمن، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، مثنوی۔

ان میں سے رباعی غزل کے بعد دوسری دلچسپ وکارآمد صنف ہے، جو غزل ہی کی طرح ایجاز واختصار کے لئے وضع کی گئی ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ رباعی میں متغزلانہ افکار و انداز بیان کی کوئی قید نہیں، اور اس میں غزل کے برخلاف ایک شعر کی جگہ دو شعروں میں اپنے خیالات کو تسلسل کے ساتھ نظم کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے۔ غزل اور رباعی کے بعد تیسری صنف قطعہ ہے۔ یہ صنف ایجاز واختصار اور شرح وبسط دونوں کو مشترک ہے۔ کیونکہ قطعہ رباعی کی طرح کم سے کم دو شعر تک محدود ہے اور زیادہ کے لئے اگر قافیہ تنگی نہ کرے تو اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں، یعنی یہ صنف رباعی کی طرح ایجاز واختصار کے کام بھی آسکتی ہے اور نظم کی طرح تسلسل اور شرح وبسط کے بھی۔ ان تینوں صنفوں کے علاوہ باقی جس قدر صنفیں ہیں وہ سب کی سب مسلسل خیالات ربط وہم آہنگی کے ساتھ ادا کرنے کے لئے ایجاد کی گئی ہیں۔ ان میں سے خصوصاً مثنوی تو ہماری شاعری میں وہ ہمہ گیر وکارآمد صنف ہے جس میں ہر قسم کے بڑے سے بڑے اور طویل سے طویل خیالات بلکہ افسانوں، داستانوں اور تاریخوں تک کو نظم کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ اور ایسی سب اصناف سخن جن میں طویل یا حقیر خیالات و واقعات تسلسل کے ساتھ

منظوم کئے جاتے ہیں یا کئے جا سکتے یقیناً نظم ہی کہلانے کی مستحق ہیں۔ اس بحث سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم نے مذکورہ بالا تمام اصناف سخن میں سے اگر کوئی صنف اپنے خیالات کو پورے ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے لئے وضع کی ہے تو وہ صرف ایک غزل ہے۔ اگرچہ رباعی اور قطعہ سے بھی ایک حد تک یہ کام لیا جا سکتا ہے مگر ان کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ جب اتنی اصناف ہماری شاعری میں مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے موجود ہیں اور ہم نے ان میں سے صرف ایک غزل کو ایجاز و اختصار کے لئے چُن لیا ہے، جو اس کے لئے ہر طرح موزوں اور مناسب بھی ہے، اور حالت یہ ہے کہ اس ضروری صنف کا کوئی بُرا بھلا بدل بھی پیش نہیں کیا جاتا تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزل کو مٹا ڈالنے کے درپے ہو جانا کہاں کی عقل مندی اور کون سی دانائی اور مصلحت پر مبنی ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ کسی خیال کو شرح و بسط کے ساتھ مسلسل ادا کرنے میں جزئیات کا احاطہ کرنا پڑتا ہے۔ اور جزئیات کا احاطہ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایجاز و اختصار کا مرتبہ کہیں بلند ہے۔ اور پھر ایجاز و اختصار بھی ایسا ایجاز و اختصار جو جامع و مانع بھی ہو اور ماقل و دل بھی اور اسی قسم کے ایجاز و اختصار کا غزل کے سوا کسی دوسری صنفِ شعر میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے غزل کا مٹا ڈالنا اپنی شاعری کی ایک بے حد دلچسپ اور ضروری صنف ایجاز و اختصار کا مٹا ڈالنا ہے جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔

اس اعتراض کا دوسرا جزء یہ ہے کہ "چونکہ غزل کے اشعار میں باہم کوئی تسلسل یا ربط و ہم آہنگی نہیں ہوتی لہٰذا وہ بالکل اک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے، جو ذہنِ انسانی کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے" ماتم کرنے کی جگہ ہے کہ مغرب زدگی نے مخالفین غزل کے ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم کو اس درجہ مسخ و مغلوب کر دیا ہے کہ طعام و لباس سے لے کر شعر و ادب تک ہر وہ چیز جو ایشیا کی خصوصیات کی حامل ہے خواہ وہ ہماری تہذیب اور ہمارے مذاق کے نقطہ نظر سے کتنی ہی صحیح، دلچسپ اور مفید و اہم کیوں نہ ہو مگر مغربی ذوق اس پر مہر تصدیق ثبت نہیں کرتا وہ ان دشمنانِ وطن کے نزدیک صفحہ ہستی سے بالکل

مٹا ڈالنے کے قابل ہے۔ خدا جانے یہ حضرات غزل کو جو ایک خالصتاً ایشیائی چیز ہے، مغربی عینک لگا کر کیوں دیکھتے ہیں۔ آخر اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کہ وہ ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ چند مختلف المضامین نظموں کا جو ایک ہی بحر اور ایک ہی ردیف و قافیہ میں لکھی جاتی ہے، اور جس کا ہر شعر بجائے خود ایک مختصر اور مکمل نظم ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہی حضرات اپنی آنکھوں سے مغربی عینک اتار کر غزل کو ہماری بتائی نظر سے جو ہماری فطری اور حقیقی نظر ہے دیکھنے کی تکلیف گوارہ فرمائیں گے تو پھر غزل ان کو نہ تو چوں چوں کا مربہ دکھائی دے گی اور نہ کسی قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا کرے گی، بلکہ اس کے برخلاف غزل میں وہ عجیب عجیب خصوصیات اور ایسی ایسی ناقابلِ انکار خوبیاں نظر آئیں گی جو مغربی شاعری میں ہزاروں قسم کی جدید العصر ذہنی ترقیات کے باوجود آج تک بھی مفقود و معدوم ہیں۔

اس اعتراض کا تیسرا جزو یہ ہے کہ یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک واحد دماغ میں بیک وقت اسقدر مختلف اور متضاد خیالات سما سکیں"۔ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں جنھیں درج ذیل کیا جاتا ہے۔

اوّل تو یہی غلط ہے کہ "ایک دماغ میں بہ یک وقت دو یا دو سے زیادہ متضاد یا غیر متضاد خیال پیدا ہونے ناممکن ہیں"۔ خاص خاص حالتوں میں اکثر مشاہدے میں آیا ہوگا کہ انسان وقتِ واحد میں رو بھی رہا ہے اور ہنس بھی رہا ہے، مغموم بھی ہے اور اپنے غم پر خوش و قانع بھی، شکوؤں سے معمور بھی ہے اور شکر سے تر زبان بھی، مضطرب بھی ہے اور سکونِ خاطر سے لذت یاب بھی، پریشان بھی ہے اور اپنی پریشانی کا مدح خواں بھی، مانوس بھی ہے اور مایوس بھی، بیدل بھی ہے اور ساعی بھی۔ ایسے واقعات کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ اکثر دیکھا ہوگا کہ جب بچھڑے ہوئے دو عزیز یا دو دلی دوست یا عاشق و معشوق مدت کے بعد ملتے ہیں تو بے اختیار باہم لپٹ جاتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں اور جب تک دلوں کی بھڑاس اچھی طرح نہیں نکل جاتی ان کے لپٹ لپٹ کے رونے رُلانے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت ان کے دلوں میں خوشی و غم کے دوگونہ جذبات و خیالات موجزن نہیں ہوتے اور یہی خوشی و غم کی وہ ملی جلی کیفیت ہے جو عام طور سے "گریہ مسرت" کے دلچسپ اور معنی خیز نام سے مشہور ہے۔ یہ مثال تو

کسی انسانی دل ودماغ میں بہ یک وقت صرف دو متضاد یا غیر متضاد خیالات وجذبات سما سکنے کی مثال تھی اب ہم ایک ایسا شعر پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے ایک انسانی دل ودماغ پہ بیک وقت چار یا چار سے زیادہ مخالف ومتضاد خیالات وجذبات کے مستولی ہونے کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ یہ شعر ہمارا ہی ہے۔ خدا کے لئے اس کو یہ سمجھ کر یا کہہ کر رد نہ کر دیجئے کہ چونکہ یہ تیرا لکا ہوا ہے اس لئے ناقابلِ قبول ہے۔

بیدل بھی ہوں، شاداں بھی، شاکی بھی ہوں، نازاں بھی
جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا

عاشق معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں تمہارے سلوکوں سے بیدل (مایوس وغمگین) بھی ہوں اور شاداں (پُر امید ومسرور) بھی۔ شاکی (شکایت مند اور فریادی) بھی ہوں اور نازاں (مفتخر، شکرگذار اور احسان مند) بھی۔ کیونکہ تم نے مجھے آج تک جتنے داغ بھی دئیے ہیں سب دلچسپ دئیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب داغ تکلیف دہ ہوتے ہیں اور اُن سے اذیت پا کے مایوس وغمگین اور شاکی، فریادی ہونا قدرتی بات ہے۔ مگر چونکہ معشوق نے یہ داغ دورانِ محبت میں دئیے ہیں اور دورانِ محبت میں معشوق کے ہاتھوں پہنچی ہوئی تکلیف بھی راحت سے زیادہ قابلِ قدر ہوتی ہے، پھر دلچسپ تکلیف تو اور زیادہ قابلِ قدر ہونی چاہئے۔ اس لئے عاشق خوش بھی ہے اور پُر امید بھی، اور نازاں بھی ہے اور شکرگذار و احسان مند بھی۔ اس حالت میں وہ جن متضاد یا غیر متضاد خیالات وجذبات سے متاثر نظر آ رہا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔ (۱) خوشی وغم (۲) امید وبیم (۳) تکلیف وراحت (۴) شکر وشکایت (۵) مدح وذم۔ (۶) بے صبری اور صبر ورضا (۷) احسان مندی ونا احسان مندی وغیرہ۔ ایسی صریح مثالوں کی موجودگی میں کوئی احمق سے احمق بھی یہ کہنے کی جراءت نہیں کر سکتا کہ کسی انسانی دل ودماغ میں بیک وقت دو یا دو سے متضاد یا غیر متضاد خیالات وجذبات نہیں سما سکتے۔ اگر نہیں سما سکتے تو فرمائیے اتنے جذبات و خیالات کا حامل شعر بہ یک وقت کیونکر موزوں ہوگیا۔

دوئم یہ کہ غزل صرف ایک سانس یا آنِ واحد میں تو کہہ نہیں دی جاتی، اس کے کہنے اور لکھنے کے لئے بھی کچھ مدت درکار ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ مدت دس دس دن اور پندرہ پندرہ دن

تک طویل ہو جاتی ہے۔ جب ایسا ہے اور فی الواقع ایسا ہی ہے تو اس سے بالبداہت ثابت ہوتا ہے کہ غزل کے مخالف و متضاد مضامین نہ بیک وقت دماغ میں آتے ہیں اور نہ بیک وقت نظم کئے جاتے ہیں۔ بلکہ یکے بعد دیگرے دماغ میں آتے ہیں اور یکے بعد دیگرے نظم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک غزل سات شعر کی ہے، اور اس کی تیاری پر ایک گھنٹہ اور دس منٹ خرچ ہوئے ہیں، یعنی ہر شعر بالاوسط دس منٹ میں کہا اور لکھا گیا ہے یعنی پہلے دس منٹ میں اور دوسرے دس منٹ میں دوسرے متضاد یا غیر متضاد مضمون کا دوسرا شعر، اور اسی طرح تیسرا اور چوتھا اور باقی بھی علیٰ ہذا القیاس۔ مطلب یہ نکلا کہ یہ ساتوں شعر بیک وقت موزوں نہیں کر دئے گئے بلکہ یکے بعد دیگرے موزوں کئے گئے ہیں، جن کے موزوں کرنے پر جدا جدا دس دس منٹ کا وقت صرف کیا گیا ہے۔ اور حالت یہ ہے کہ انسانی خیال مطلق بے لگام و بے مہار ہوتا ہے اور ایک ایک لمحے میں ہزار ہزار موافق و مخالف راہیں اختیار کرتا رہتا ہے، انتشار یا بے لگامی، اور بے مہاری اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر اس کو بہ جبر و کوشش روکا نہ جائے تو وہ ایک ثانئے کے لئے بھی ایک مرکز یا ایک نقطے پر قایم نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اور جوگیوں وغیرہ کو سالہا سال تک اپنے خیال کو ایک مرکز یا نقطے پر مرکوز رکھنے کی کوشش و مشق کرنی پڑتی ہے۔ جب انسانی خیال کی یہ حالت ہے کہ ایک ثانئے کے لئے بھی کسی ایک مرکز پر قایم نہیں رہتا تو دس دس منٹ کا فصل زمانی ہے مخالف یا موافق جذبات و خیالات کو موزوں کرنا کیونکر ناممکن قرار دیا جا سکتا ہے۔

بہرحال جب نہ تو یہ صحیح ہے کہ انسانی دل و دماغ بہ یک وقت دو یا دو سے زیادہ مخالف یا موافق جذبات خیالات سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ یہ درست کہ "غزل کے تمام اشعار آنِ واحد میں نظم کر دئے جاتے ہیں"۔ تو پھر ان فریب دہ اور لاطائل دلائل کی بنا پر غزل کی جان کا لاگو ہو جانا محض مغرب زدگی کی پیدا کردہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔

(۲) "تمام اصناف سخن میں تو مطالب و معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، مگر غزل میں اس کے برخلاف الفاظ کے لئے مطالب و معانی کی جستجو کی جاتی ہے"۔ یہ اعتراض مخالفین غزل کی افواج قاہرہ کے سپہ سالار اعظم شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے غزل کش دماغ کی پیدا وار

ہے، مگر اس اعتراض میں بھی کوئی جان نہیں، بلکہ یہ دوسرے اعتراضوں سے بھی زیادہ کمزور اور بودا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کلام خواہ نظم ہو یا نثر، دو اجزا سے مرکب ہوتا ہے (۱) الفاظ (۲) معانی۔ ہر ادیب کو خواہ وہ ناظم ہو یا ناثر کبھی معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، اور کبھی الفاظ کے لئے معانی۔ یہ دونوں صورتیں لازم وملزوم اور فطری ہیں اور ان میں باہم کوئی تضاد نہیں۔ کیا دورانِ تصنیف وتالیف میں کبھی کبھی، کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر ایسے مواقع پیش نہیں آتے کہ استعارے، تشبیہ یا مخصوص تراکیب اور الفاظ کی مختلف اقسام نشست اور دروبست سے ان کو نئے نئے معانی پہنانے پڑتے ہوں۔ ایسے معانی جو روزمرہ کی بول چال اور ان کے لغوی معنی سے بالکل جدا ہوں جن کے بغیر کلام میں جدت، تازگی، تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی، زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں چند مثالیں درج کردینی کافی ہوں گی۔

پہلی مثال "گل" "بانگ"۔ یہ دو معمولی لفظ ہیں۔ پہلے لفظ کے معنی پھول ہیں، اور دوسرے کے معنی آواز۔ علیحدہ علیحدہ یہ دونوں لفظ بجز اس کے کہ اپنے لغوی معنی دیں کسی قسم کی گہرائی یا تاثیر اپنے اندر نہیں رکھتے۔ مگر جب انہیں دونوں لفظوں کو ملا کر "گلبانگ" بنا دیا جاتا ہے تو کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہی دونوں لفظ معمولی ترکیب پانے سے پہلے کیا تھے اور ترکیب پاکر کیا بن گئے۔ پہلے ان دونوں لفظوں کے معنی کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ ترکیب پانے کے بعد جو رنگینی، دلکشی اور طاقت لفظ گلبانگ میں پیدا ہو گئی ہے۔ کیا اس کی تشریح ممکن ہے؟

دوسری مثال: "سمند" اور "ناز" بھی دو معمولی لفظ ہیں۔ پہلے لفظ کے معنی "گھوڑا" اور دوسرے کے معنی "ناز" یعنی اک خاص قسم کی "ادائے معشوقانہ"۔ ان میں بھی علیحدہ علیحدہ کوئی جاذبیت اور معنویت نہیں اور نہ لفظاً ومعناً کوئی ربط ہے۔ بلکہ ایک شدید قسم کا تنافر پایا جاتا ہے۔ مگر جب یہی دونوں لفظ، اس شدید بے ربطی وتنافر کے باوجود ترکیب اضافی سے ملا کر "سمندِ ناز" میں تبدیل کر دیتے ہیں تو کس بے پناہ طاقت کے حامل ہو جاتے ہیں کس قدر لطیف، دلکش اور ناقابلِ اظہار معنی پیدا کر دیتے ہیں، اور اپنے مفہوم کو مل کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

تیسری مثال۔ یہ ایک مثال چند در چند مثالوں کا مجموعہ ہے۔ ذیل کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس "زود پشیماں" کا پشیماں ہونا

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

مندرجہ بالا اشعار کی جدّت، تازگی، دلفریب انداز بیان اور رفعتِ خیالی کو چھوڑئیے کہ یہ ایسی ظاہر یا ہر چیزیں ہیں جن کو ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔ صرف "زود پشیماں" کی دلنواز ترکیب، اور "نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے" کی عجیب وغریب اور معجزانہ اسالیب بیان پر غور فرمائیے۔ کہا تو گیا ہے "زود پشیماں" مگر معنی پیدا کر دیئے گئے ہیں "دیر پشیماں" کے اور پھر کسقدر "دیر پشیماں" کہ قتل کرنے کے بعد جفا سے توبہ کی جا رہی ہے۔ ظاہر تو کیا جا رہا ہے کہ "نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے" لیکن مقصد یہ ہے کہ ہم سمجھ گئے کہ تم کہیں سے آ رہے ہو" اور پھر یہی نہیں کہ سمجھ گئے کہ تم کہیں سے آ رہے ہو، بلکہ یہ بھی سمجھ گئے کہ کہاں سے آ رہے ہو" اور مزید براں یہ بھی کہ "کیا کر کے آ رہے ہو" آپ نے دیکھا کہ اس مصرعے کے چند سیدھے سادے الفاظ کن کن عجیب وغریب بلیغ مطالب و معانی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں اور پھر رہنمائی بھی کتنی کامیاب رہنمائی۔ اب اس شعر کا دوسرا مصرعہ لیجئے "پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"۔ اک غزل کے انداز بیان سے ناواقف شخص تو یہ کہدے گا کہ "یہ مصرعہ بالکل مہمل ہے۔ نہ اس کو پہلے مصرعہ سے کوئی ربط اور نہ یہ خود کسی مطلب و معنی کا حامل" مگر ایک ادا دانِ غزل اسے سن کر پھڑک اٹھے گا اور بے ساختہ پھڑک اٹھے گا، اور شورِ "احسنت و مرحبا" سے آسمان سر پر اٹھا لے گا۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں"۔ اب غور فرمائیے کہاں تو "پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"۔ اور کہاں "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں"۔ کن معمولی الفاظ کو کن دلچسپ اور عجیب وغریب معنی کا حامل بنا دیا گیا ہے۔ یہ غزل کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم اس قسم کی اور سینکڑوں مثالیں پیش کر سکتے تھے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ سمجھنے والے کے لئے اتنی مثالیں کافی ہو سکتی ہیں۔ اور جو نہ سمجھنا چاہے اس کے لئے لاکھوں مثالیں بھی بیکار محض ہیں

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ کہ مذکورہ بالا مثالوں میں انھیں روزمرہ کے معمولی الفاظ کو جنھیں ہم ہمیشہ استعمال کرتے رہتے ہیں اور جن کی نسبت ہم کو کبھی شبہ بھی نہ گذرا تھا کہ ان کے کچھ اور معنی بھی ہو سکتے ہیں، کیسے کیسے نئے دلکش اور ماورائے فہم وقیاس مطالب ومعانی کا جامہ پہنا دیا گیا ہے جن کا لغوی معنی سے کوئی تعلق نہیں اور یہ جامہ پہنا کر ان کو ایسی غیر محدود طاقت کا مالک بنا دیا گیا ہے جسکا احاطہ کرنا بھی دشوار ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں روزمرہ کے معمولی الفاظ کو جن میں اس سے پہلے کوئی جان نہ تھی۔ یہ ناقابلِ قیاس طاقت کس نے بخش دی اس کا صرف ایک ہی جواب ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ محض شاعر کی اِس طاقتِ خلّاقی نے جو اس گرہ سے آگاہ تھی کہ الفاظ کو اک خاص صورت سے ترکیب دے کر ان میں نئے نئے مطالب ومعانی کیونکر پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ بہر حال وہ ادیب، شاعر جو معانی کو صرف الفاظ کا جامہ پہنانا تو جانتا ہے، مگر الفاظ کے لئے نئے نئے مفہوم اور نئے نئے معانی پیدا کرنے سے عاجز وقاصر ہے، ہرگز ادیب وشاعر کہلانے کا مستحق نہیں، کیونکہ گو معانی کو الفاظ کا جامہ پہنانا بھی فکر وکاوش کا محتاج ہے، مگر پھر بھی آسان کام ہے لیکن الفاظ میں نئے نئے مفہوم ومعانی پیدا کرنا سخت دشوار ہے اور ہر ادیب وشاعر کے بس کا روگ نہیں۔

غزل پر مذکورہ بالا اعتراضات کے علاوہ بعض اور اعتراضات کئے گئے ہیں، مگر وہ اسقدر غیر اہم ہیں کہ ان کے باضابطہ جواب دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ان میں سے چند کے مختصر جوابات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض: "غزل کا وجود فارسی اور اُردو کے سوا اور کسی زبان میں نہیں پایا جاتا، یہ کھلا ثبوت ہے اس امر کا کہ غزل ایک بیکار چیز ہے۔" اول تو یہی غلط ہے کہ غزل کا وجود دنیا کی اور زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ کسی زبان کی شاعری کا جذبات حسن وعشق سے خالی رہنا ناممکن ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مروجہ غزل کی صورت میں نہیں پایا جاتا، دوسری صورتوں میں پایا جاتا ہو مگر ان جذبات کا اظہار جس صورت میں بھی پایا جائے ہم اسکو اپنی زبان میں "غزل" کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ دوسرے اگر دنیا کی دوسری زبانوں میں غزل جیسی کارآمد اور دلچسپ صنف کا وجود نہیں پایا جاتا تو اس کو ان زبانوں کی بدقسمتی سمجھئے۔

دوسرا اعتراض۔ "غزل میں ایک ایک عاشق کے ہزار ہزار رقیب ہوتے ہیں، جن سے

رات دن جوتی پیزار ہوتی رہتی ہے۔"

جواب۔ اوّل تو بات یہ ہے کہ انتہائے عشق میں عاشق کے احساسات بہت نازک ہو جاتے ہیں، وہ انسان تو انسان ہُوا، گھٹا، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، باغ، صحرا، طوطا، مینا، آئینہ، کنگھی وغیرہ جس جس چیز کی طرف معشوق کی نگاہِ التفات جاتی ہے، ان سب کو اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے۔ یہ دلیل ہے کمال محبت کی، اور کمالِ محبت کمالِ عشق مانا گیا ہے، جو مذہب عشق کی رُو سے اجرِ عظیم کا مستحق ہے، دوسرے ایک حسین پر بیت سے انسانوں کا فریفتہ ہو جانا بھی تو کوئی عجیب و نادر واقعہ نہیں بلکہ یہ تو کل اک کھلا ثبوت ہے معشوق کی فراوانی حسن کا، اور یہی شاعر کا منشا ہوتا ہے۔ اب رہا جوتی پیزار کا معاملہ، سو اگر آپ کو شاعر بہ حیثیت عاشق اپنے رقیبوں سے لفظی اظہارِ بیزاری یا زبانی ہاتھا پائی، بیچ مچ کی جوتی پیزار نظر آنے لگے تو اس میں بے چارے شاعر کا کیا قصور، بہتر ہو کہ آپ اپنی آنکھوں کا علاج کرائیں۔

تیسرا اعتراض: غزل کے مضامین میں یک رنگی و توافق نہیں ہوتا۔ یعنی ایک شعر میں جس شے کو سراہ کر عزیز بنایا جاتا ہے اُسی کو دوسرے شعر میں مذمت کر کے گرا دیا جاتا ہے۔"

جواب۔ شاعر کوئی فلسفی یا مورخ نہیں ہوتا کہ اس کے کلام میں یک رنگی و توافق کا نہ پایا جانا عیب میں داخل سمجھا جائے۔ وہ صرف شاعر ہوتا ہے۔ اور شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ کسی شے کو دیکھ کر جن مخالف موافق جذبات سے متاثر ہو ان کو شعر کا جامہ پہنا دے۔ اگر اس نے ایک شعر میں ایک چیز کو سراہا ہے اور دوسرے شعر میں اس کی مذمت کی ہے، اور ان دونوں شعروں میں کافی شاعرانہ دلکشی پائی جاتی ہے تو یہ اس کے کمالِ فن کی دلیل ہے نہ نقص کمال کی تفصیل کے لئے دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مصنفہ علامہ حالی علیہ الرحمہ۔۔

چوتھا اعتراض: غزل گو، غزل میں خاص اپنے اصلی جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ اس کو یا تو یہ جذبات سہنے اوپر یہ جبر طاری کرنے پڑتے یا پھر اسے اس پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات کو حوالۂ قلم کرے۔"

جواب۔ اوّل تو یہ غلط ہے کہ غزل گو، غزل میں اپنے جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا، اگر وہ فی الواقع قادر نہیں ہوتا تو پھر وہ شاعر نہیں بلکہ متشاعر ہے، کیونکہ شاعری میں اپنے خیالات وجذبات کو جامۂ شعر پہنانا اس سے آسان کام ہے، اور چونکہ یہ آسان کام ہے اس لئے ہر غزل گو شاعر غزل میں بالاکثر اپنے ہی خیالات وجذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور وہ زیادہ تر ایسے ہی قافیوں کا انتخاب کرتا ہے جو اس کو اس کام میں مدد دے سکیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہر متغزل کے کلام میں بعض خیالات وجذبات کی بہتات ہوتی ہے، اور بعض کم، بعض بہت کم یا کالعدم ہوتے ہیں۔ اور اسی کمی بیشی سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ایک شاعر کے رجحانات طبیعت اپنی زندگی میں کیا تھے، اور اس کو کن خیالات وجذبات یا کن معاملات سے زیادہ سابقہ پڑا تھا، اور کن سے کم۔ دوسرے شاعر کو تو ترجمانِ عالم کہا گیا ہے، اور بجا طور پر کہا گیا ہے۔ اس کے لئے اپنے خیالات وجذبات ظاہر کرنا تو ایک پیش پا افتادہ چیز ہے، اس کو تو چرند پرند، نباتات وجمادات، کوہ و دریا، چاند سورج، آسمان وزمین۔ غرضکہ ہر چیز کی زبان سے بولنے اور ان سے گفتگو کرنے کی قدرت ہوتی ہے جب یہ صحیح ہے تو پھر اگر ایک غزل گو شاعر اپنے علاوہ اپنے دوسرے ابنائے جنس کے خیالات وجذبات کو جامۂ شعر پہنانے یا دنیا کی دوسری جاندار اور بے جان اشیا کی زبان سے بولنے اور ان سے ہم کلام ہونے پر قادر ہے تو یہ اس کے شاعرانہ کمال کی ایک روشن دلیل ہے نہ کہ کوئی قابلِ الزام وگردن زدنی جرم۔ یہ کونسا انصاف ہے کہ آپ تمام دیگر اصنافِ سخن یعنی نظموں وغیرہ میں، تو اس جرم کا ارتکاب روا رکھیں اور اس کو مستحسن سمجھیں، مگر بے چاری غزل کو اس مستحسن جرم کی پاداش میں جلّاد کے حوالے کردیں۔

یورپ کے نوجوان

کاش اس مضمون کا عنوان "یورپ کے نوجوان" کے بجائے "یورپی نوجوان" ہوتا۔ مگر یہ تخیل اب چند سال سے امید موہوم ہو کر رہ گیا ہے۔ یورپ کے مختلف ممالک کے نوجوان اپنے اپنے مقاصد کے ماتحت متحد ضرور ہیں، مگر مجھے شبہ ہے کہ آیا انھیں کبھی اتنی قوت نصیب ہو گی کہ وہ سیاسی، جماعتی یا کم سے کم اخلاقی مسائل میں فیصلہ کن ثابت ہو سکے۔

جنگ عظیم کے بعد ہم نوجوانوں کو یقین نہ آتا تھا کہ پھر اس پیمانے کی دوسری کشمکش بھی ہو سکتی ہے یہ خیال فاتح اور مفتوح دونوں کے یہاں مسلّم تھا۔ مگر ۱۹۲۲ء میں ویسٹ منسٹر ابی میں مجھے پہلی بار یہ خیال ہوا کہ شاید میں غلطی پر ہوں۔ میں "نامعلوم سپاہی" کی قبر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی لوح پر لکھا تھا "وہ جو خدا کی راہ میں کام آیا اور اپنے ملک اور بادشاہ کے لئے قربان ہوا، اس نے عدل و انصاف اور بنی نوع انسان کی آزادی کی خاطر اپنی جان دی"۔ چند ہی گھنٹوں کے بعد مجھے ایک تھانے میں جانے کا اتفاق ہوا، کیونکہ میں ایک ایسے ملک کا باشندہ ہوں جو کبھی دشمن رہ چکا تھا اور اسی لئے میری وہاں تصدیق اور جانچ ہونی تھی۔ تھانے کے افسر نے مجھ سے پوچھا "تم جنگ میں شریک تھے؟" میں نے کہا "میں اس وقت بہت چھوٹا تھا"۔ اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا، اور کہنے لگا "خیر، اگلی جنگ کے لئے بہت موزوں ہو"۔ اس موقع پر تو مجھے گمان بھی نہیں گذرا کہ سارجنٹ کا قول ٹھیک نکلے گا۔ مگر یہ شبہ جو اس وقت پیدا ہوا تھا، اب پورے یقین کے درجے تک پہنچ چکا ہے۔

یورپ کی موجودہ نسل کے اندر وہی انقلابی جذبہ اور کشمکش نظر آتی ہے، جو بالعموم ان نوجوانوں کے اندر کارفرما ہوا کرتی ہے جو کسی اہم تاریخی زمانے میں نشوونما پاتے ہیں۔ نوجوانوں نے اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی نظام ادب کے رجحانات، فنونِ لطیفہ کے معیار اور مذہب کے

تخیلات کے خلاف ہمیشہ بغاوت کی ہے ۔اس لئے موجودہ انقلابی جذبہ بھی کوئی نئی چیز نہیں ، ہاں مقاصد کی پیچیدگی کشمکش کی شدت اور دباؤ کی زیادتی کی وجہ سے نمایاں معلوم ہوتا ہے ۔

یورپ کی اس نئی نسل کو عمر سے قطع نظر، تجربے کے لحاظ سے دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے گروہ میں اکثر وہ لوگ شامل ہیں جن کے دلوں میں جنگ کے قبل کے زمانے کی یاد باقی ہے ، اور دوسرے میں وہ لوگ ہیں جو اثنائے جنگ یا اس کے بعد کے ایام میں پلے اور بڑھے ۔ روزی کا سوال دونوں کے لئے یکساں طور پر مشکل ہے ۔ مگر اس سے بھی مشکل یہ امر ہے کہ وہ اپنے لئے مناسب نصب العین تجویز کرسکیں جو ان کے مقاصد کے شایانِ شان ہو ۔ اس لئے جوں جوں وہ عمر میں ترقی کرتے جاتے ہیں ، ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ موجودہ حالات چونکہ ناقابلِ حل ہوتے جارہے ہیں ، اس لئے انقلاب کی ضرورت ناگزیر تر ہوتی جاتی ہے ۔ ان حالات کے پیشِ نظر جو کچھ نہ ہوتا کم تھا ۔ اسی لئے آج کل مختلف ممالک کے نوجوان نہایت سرگرمی کے ساتھ لیسے ، سیاسی نظام کے ماتحت مصروفِ عمل ہیں جن کا فلسفیانہ پہلو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے ۔

جنگ کے بعد یورپ کی نئی نسل کے سامنے کون کون سی صورتیں تھیں ؟ ایک طرف تو مختلف ممالک کی محدود و قوم پرستی جس کی بنیاد ملوکیت پر تھی ۔ ایک دوسرے سے دست و گریباں تھی اور دوسری جانب آزاد سرمایہ داری اور آمرانہ اشتراکیت (Dictatorial Comunism) میں رقابت تھی ۔ جنگ کے بعد فوراً ہی ہر جگہ اشتراکی انقلابات سے آزاد سرمایہ داری کو اندیشہ ہو چلا تھا ۔ مگر قوم پرستی نے پھر سنبھالا لیا اور اب نوجوان اس گومگو میں پڑ گئے کہ آیا جمہوریت ابھی دنیا میں باقی رہے گی یا اشتراکی پیغمبروں کا قول کہ ایک عالمگیر انقلاب قریب ہے ، صحیح نکلے گا ۔ مگر یہ سوال جتنا بظاہر سادہ معلوم ہوتا ہے ، اتنا آسان نہیں ہے ۔ کم و بیش تمام ممالک میں ان دونوں صورتوں میں انتخاب کرنا ناممکن ہوگیا ہے ، اور جہاں ناممکن نہیں تھا وہاں بھی اب متضاد سیاسی تخیلات کے ایک جگہ جمع ہوجانے سے مشکلات پیدا ہوگئی ہیں ۔ اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ اس کا وجود عقلِ سلیم پر مبنی ہے اور اس کے ذریعے ساری دنیا کا بھلا ہوگا ۔ اس نے جمہوریت سے آمریت تک اپنے

مدارج مقرر کئے ہیں، اس کی مدمقابل آزاد یا قدامت پسند سرمایہ داری ہے جو اس تخیل پر مبنی ہے کہ عدم مداخلت (Laissez faire) کے اصول کے ماتحت جماعت کی جو خود بخود ترتیب ہو جاتی ہے وہی برقرار رکھی جائے۔ فاشسٹیوں کے نزدیک بھی حصولِ مقاصد کا ذریعہ "استدلال" اور "عقل" ہے۔ مگر نازیوں کے یہاں کامیاب زندگی کا گُر یہ ہے کہ جو کچھ فوراً سمجھ میں آجائے اس پر بے چون و چرا اور بغیر کسی استدلال کے کاربند ہو جانا چاہئے۔ جب موجودہ نسل کے رہنما قوت و اقتدار کے لئے سرمایۂ اثاث او افتراکی تہذیبوں میں جنگ کے نعرے لگاتے ہوئے اُٹھتے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "قیامِ انسانیت" کی خاطر جنگ ناگزیر ہے۔ تو تخیلات کی حسرتناک پیچیدگی اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہو جاتی ہے۔

غرض یورپ کی نئی نسل کا نہ تو زاویۂ نگاہ ایک ہو سکتا ہے، اور نہ مقاصد۔ البتہ انہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جو طریق عمل اختیار کیا ہے اسی کی بنا پر ان کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حامیانِ جنگ کا طبقہ جس نے اس چار سالہ کشاکش کے دوران میں ہوش سنبھالا ہے، یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ قوت کی حکومت کو تسلیم کرنا چاہئے۔ چنانچہ جنگ کو ناگزیر سمجھ کر انھوں نے طے کر دیا کہ سیاسی اور جماعتی مسائل کا فیصلہ مشین گن پر چھوڑ دینا چاہئے۔

حامیان امن جنھوں نے جنگ کے بعد کے زمانے میں ہوش سنبھالا، یہ سمجھتے ہیں کہ قیامِ امن کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ کوشش امن سے ان کا مقصد جنگ کا سرے سے خاتمہ کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اسے نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں وہ بین الاقوامی اور قومی مفادات کے درمیان خوش معاملگی پیدا کرنے کے حامی ہیں اور اس سے پیشتر کہ باہمی کشمکش اسقدر نازک اور پیچیدہ صورت اختیار کرلے کہ بغیر جنگ کے اسکا تصفیہ ہی نہ ہو سکے وہ اس گتھی کو سلجھا دینا چاہتے ہیں۔ حامیانِ جنگ میں ایسے لوگ شامل ہیں جو طاقت اور اثر کے لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں اور روز بروز اُن کی طاقت اور تعداد میں ترقی ہو رہی ہے لیکن حامیانِ امن میں بھی ایسے لوگ شامل ہیں جن کے سیاسی، جماعتی اور معاشی تجربات نسبتاً زیادہ پختہ اور مسلّم ہیں، اور روز بروز یہ

طبقہ بھی ترقی کر رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یورپ کے نوجوانوں کی اکثریت ان دو طبقوں میں سے کس کے ساتھ ہوگی۔ یورپ میں نوجوانوں کی موجودہ تحریکات پر سیر حاصل تبصرے کے لئے تو مضامین کا ایک سلسلہ درکار ہے، اگر ہم یہاں ان کی ذہنیت کا مختصر طور سے تجزیہ کریں گے جس سے اُن کے طریقِ عمل پر کچھ روشنی پڑے گی۔ یورپ کی نئی نسل کی اخلاقی اور ذہنی کیفیت کا شاید سب سے زیادہ یاس انگیز پہلو یہ ہے کہ آج کل آپس میں خیالات و جذبات کا تبادلہ تقریباً ختم ہوگیا ہے اور وہ اپنے ہی ملک کے محدود دائرے میں رہ کر قوموں کے اندر منافقانہ جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں۔ ہر عقیدے اور مسلک کے لوگوں نے اپنے اِرد گرد گویا جادو کا ایک حلقہ سا بنا لیا ہے جس کے اندر رہ کر وہ طرح طرح کے قومی ترانوں اور نعروں کی صورت میں صرف اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنایا کرتے ہیں اور محض اپنے ہی مسائل میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ آج کل سائنس کی بدولت باہمی میل جول کی کتنی سہولتیں فراہم ہیں، اس کے باوجود یہ جادو نہیں ٹوٹتا۔ اور کیا مجال کہ ان "طلسمی حلقوں" کے باہر کوئی قدم رکھ سکے۔ آج یورپ ذہنی اعتبار سے متعدد حصوں میں اس طرح تقسیم ہے کہ ایک کو دوسرے کے خیالات کی مطلق خبر نہیں۔ یہ صورت اتنی نمایاں ہے کہ یورپ میں ذہنی بیداری کے نشاۃ ثانیہ کے بعد سے آج تک کبھی رونما نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہی مثال لیجئے۔ سولھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک Erasmus کی تصانیف کا مطالعہ ــ جو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مشترکہ زبان (Lingua franca) لاطینی میں لکھتا تھا۔ یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہایت آزادی کے ساتھ کیا جاسکتا تھا۔ اور اس کا ترجمہ بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ درجنوں زبانوں میں ہوتا تھا اور کونگبرگ سے آکسفورڈ تک تمام یورپ میں علم کی خاطر سفر کرتے تھے۔ اور ارباب علم و ادب کا ہر ملک میں سرگرمی سے خیر مقدم ہوتا تھا۔ مگر ایک آج کا زمانہ ہے کہ کتابوں کی درآمد تک محال ہے۔ یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بیرونی طالب علموں کی تعداد ایام انقلاب فرانس کے

علاوہ اتنی کم کبھی نہیں رہی جتنی آج ہے۔

جن لوگوں نے روسیک کے کھیل دیکھے ہیں۔ یا جنھیں عالمگیر اسکاوٹس جمہوری دیکھنے کا موقع ملا ہے، اُنھیں ان دونوں موقعوں پر عالمگیر اجتماع کو دیکھ کر یقین ہوگیا ہے کہ نوجوان دنیا کو باہم منظم دیکھنے کے متمنی اور مشترکہ نظام عمل کو نہایت دلیری کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان مظاہروں کے دیکھنے کے بعد یورپ کے موجودہ نوجوانوں سے کچھ امید بندھتی ہے مگر کون نہیں جانتا کہ محض امید ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضرورت کس چیز کی ہے ؟ اگرچہ اس سوال کو سُن کر بیشتر نوجوان جواب کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں گے اور اپنے اپنے مسائل میں مصروف ہوجائیں گے۔ لیکن ہر ملک میں ایسے چند نوجوان بھی ملیں گے جو قوموں کے بنیادی اختلافات کو دور کر کے ان کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت اور ان کے باہمی تعلقات میں لوچ پیدا کرنے کی اہمیت کو محسوس کریں گے۔

انھیں اس امر کا زیادہ سے زیادہ احساس ہو رہا ہے کہ دنیا تو خیر یورپ کو بھی متحد کرنے میں نہ اشتراکیت کے متعدد پہلوؤں میں سے کوئی پہلو اور نہ سرمایہ داری کی آزادانہ شکل کوئی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ان میں سے کسی کو کامیابی ہوگی بھی تو اس حالت میں کہ اس کے اصولوں کو تمام دنیا متفقہ طور پر سمجھ لے اور انھیں برتنے کے لئے تیار ہو جائے۔ نظری حیثیت سے تو دنیا اشتراکیت کے زیر اثر بھی اور سرمایہ داری کے ماتحت بھی شکوہ سے رہے گی، اس لئے کہ دونوں نظریوں کی بنیاد اس مفروضے پر قایم ہے کہ ہر جگہ ایک ہی قسم کے انسان بستے ہیں۔ آزاد خیال طبقے کے لائحہ عمل کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ یہ نتیجہ انفرادی کوششوں سے رونما ہوگا۔ اس کے برعکس اشتراکیوں کا دھیان ہے کہ یہ یکسانیت طاقت کے بغیر نہیں پیدا ہوسکتی۔ ان نظریوں کے عملی پہلو نے انھیں ایسی پیچیدگی میں ڈال دیا ہے کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں قسم کی ریاستوں میں اس مقصد کے حصول کے لئے طاقت کے استعمال کو ضروری سمجھا جاتا ہے مساوات کا یہ نظریہ ممکن ہے قومی مسائل کو کسی حد تک حل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ مگر جب

یہ بین الاقوامی معاملات میں برتا جائے گا تو بالکل بیکار ثابت ہوگا حتیٰ کہ تمام دنیا جماعتی دباؤ سے تنگ آکر ایسا طریقۂ فکر و عمل اختیار کرنے پر مجبور ہوگی جو ایلڈ و ہکسلے (Aldous Huxley) نے کم و بیش اپنی تصنیف "خیالی دنیائے جدید" (Brave New World) میں پیش کیا ہے

نوجوانانِ یورپ کے مفکرین کو اب احساس ہو چلا ہے کہ یورپ میں جمہوریت، آمریت، فاشیت اور اشتراکیت کا سایہ بہلو بہ پہلو قایم رہے گا۔ ان کے حامی ممکن ہے اپنے اندرونی (ملکی) مسائل کو سلجھانے میں کامیاب ہو جائیں، مگر مستقبل میں اُنھیں اُس وقت تک دوام اور استقلال میسر نہیں ہو سکتا جب تک ان میں بین الاقوامی معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے۔ ایسی کوئی اسکیم ابھی تک مرتب نہیں ہوئی ہے، مگر اس کی ضرورت کو سب محسوس کر رہے ہیں۔ اگر ذہنیتوں میں معقولیت پسندی آگئی تو یہ سوال کہ کس ملک میں کونسا سیاسی اور معاشی نظام رائج ہے کچھ زیادہ اہم نہ ہوگا۔ لیکن اگر ان کے خیالات میں وسعت اور رواداری نہ آئی تو ان کے درمیان تو ایک اندیشہ ناک کشمکش جاری ہی ہے۔ دوسری ریاستوں سے بھی ان کے تعلقات خوش گوار نہ رہیں گے۔

آج کل یورپ میں باہمی اختلافات اور اتحاد بالجبر کے مسائل نے جو صورتِ حال اختیار کر رکھی ہے اس کی ایک جیتی جاگتی تصویر جولین بنڈا (Julien Benda) کے مشہور مقالہ "اقوامِ یورپ" (Discours a la Nation Europeenne) میں نظر آتی ہے۔ مقالہ نگار نے یہ مقالہ مشہور جرمن فلسفی "فشٹے" (Fichte) کے خطبات کے جواب میں لکھا ہے۔ فشٹے نے ایک صدی پہلے یہ خطبات برلن یونیورسٹی میں (Rede an die Deutsche Nation) کے عنوان سے دیئے تھے۔ یہ دونوں تصنیفیں علمی و ادبی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ ممتاز ہیں اور جتنی مقبولیت نوجوانانِ یورپ میں ان کو حاصل ہوئی شاید ہی کسی اور تصنیف کو حاصل ہوئی ہو۔ اگر کوئی شخص اِن دونوں نظریات میں سے انتخاب کرنا چاہے تو اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تقریروں کا مطالعہ اگر غور سے کیا جائے اور ان کی اصلیت کو

سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اِن میں کوئی بیّن اور بنیادی فرق نہیں ہے۔ فِشٹے نے قومیت کی تعلیم دی ہے اور اُسے فلسفۂ حیات کی بنیاد کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اِس کی رُو سے افراد کی زندگی وعمل کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس سے جرمن قوم کی تہذیبی سماجی اور معاشی ترقی میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے۔ گویا فِشٹے کی تعلیم مشترکہ مفاد پر انفرادی مفاد کی قربانی کی حامی ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی معاملات میں فِشٹے نے بھی دوسری قوموں کے ساتھ رواداری، احترام اور مساوات کے اصولوں کو برتنے کی بڑے زور سے حمایت کی ہے، دوسری جانب بنڈا (Benda) "مذہب انسانیت" (Humanitarianism) کا علمبردار ہے اور بین الاقوامی کشمکش میں اُسی "انسانی رویہ" کے اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

بنڈا نے اپنی تصنیف میں فکر وعمل کے دو معیار قایم کئے ہیں۔ ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ۔ اس نے "یورپ" کو مقدم اور "قوم" کو موخر رکھا ہے۔ مگر بہ حالتِ موجودہ جب فِشٹے اور بنڈا کے حامی "قومی" اور "یورپی" جذبے کی تعریف کرنے لگتے ہیں تو دونوں کے دونوں اسے کھینچ تان کر اپنے ہی معیار کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بنڈا کا منتہائے نظر "یورپی قوم" سے یہ نہیں تھا کہ وہ یورپ کو ایک قوم کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس سے اس کا مفہوم وہ ہے جو یورپ کے متعلق فشٹے نے پیش کیا ہے۔

جا۔ اوٹن (J. Otten) نے جو یورپ کی نئی نسل کے نمائندوں میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ بنڈا کے خطبے پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اپنے مقالہ (Mobility and Revolution) میں لکھتا ہے۔

"ہمیں شاعرانہ اور مبہم باتوں، خیالی اور متعصبانہ اصولوں اور روایتی پابندیوں سے آزاد ہونا پڑے گا۔ اپنے ہمسایوں کی غلط روایات اور مضرت رساں تعصبات میں رواداری کا جذبہ پیدا کرنا تو مشکل ہے ہی۔ مگر اس سے بھی مشکل یہ ہے کہ ان عقائد و تخیلات کی درشتی کو دُور کیا جائے جن کے ہاتھوں یورپ تباہ ہو رہا ہے۔ لیکن اگر

ہیں ابھی فصل کاٹنا اور دوسری کاشت کرنا ہے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

ضرورت اس امر کی ہے کہ یورپ کے نوجوانوں میں ایک غیر مقلدانہ جذبۂ خدمت وایثار پیدا ہو، وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں اور قومی اور بین الاقوامی زندگی کے تمام تغیرات پر جو آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں، نظر رکھتے ہوں اور ان پر قابو پانے کے لئے کوشاں رہیں۔

کیا ان خیالات کے علمبردار کوشش کریں گے کہ یورپ کے نوجوانوں میں اس مقصد کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے؟ اور کیا اس کی تکمیل کے لئے وہ کوئی راستہ نکالنے کی منظم کوشش کریں گے؟ یا پھر اُس حسرتناک انجام کا انتظار کیا جائے جو کبھی سماریا کے اچھوتوں کا ہوا تھا۔ کیا انجیل مقدس کا نظریۂ حیات وموت یہ نہیں:۔

"موت کے انتظار میں ہم یہاں کیوں بیٹھے رہیں، اس خوف سے کہ شہر میں داخل ہوں گے تو سب مر جائیں گے، ہم قدم نہ اٹھائیں تو یہاں بھی تو آخر مرنا ہی ہے؟"

کیا ممکن نہیں کہ نوجوانانِ یورپ بھی انہی انسانوں کی طرح آگے قدم بڑھائیں "اور کامرانی کا پیغام لائیں"؟

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصہ اسی گھر میں گذر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا، میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہونگے، لیکن جس پر گذرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو اُن لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے کو تباہ کئے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لئے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگدل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لئے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انہیں کو دیکھو۔ صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ بازار سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دوکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دوکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ انھیں ایسی ہی دوکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بار بار کہا کسی چلتی ہوئی دوکان سے چیزیں لایا کرو وہاں مال زیادہ کھپتا ہے۔ اس لئے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں۔ ٹٹپونجیوں سے ان کی ہمدردی ہے۔ اور وہ انھیں اُلٹے اُسترے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل۔ اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم۔ تیل لائینگے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں۔ مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دوکان پر جاتے تو جیسے انہیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دوکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دوکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک ان کی بات ہو تو برداشت کرلی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت نہیں برداشت

ہوتی۔ میں کہتی ہوں آخر آپ ٹٹپونجیوں کی دوکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمہیں نے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیئے، بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے۔ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سنار کو جانتا ہوں۔ میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ میرے ساتھ چالبازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کئے۔ اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دیدیئے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا۔ اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنھیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں بھی عار نہیں۔ انکی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست، قلانچ، بے سروسامان ہیں، جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب قرض مانگنے کے لئے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لئے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے روپے ادا کئے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے، دو بار کھو کر سیکھتا ہے۔ مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے۔ اب مانگ کیوں نہیں لاتے، کیا مر گئے تمہارے وہ دوست۔ تو بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں

دیا جاتا. خیر سُو کھا جواب نہ دو۔ میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی کرو. مگر ٹال تو سکتے ہو کیا بہانے نہیں بنا سکتے، مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بیچارے کیسے انکار کریں۔ آخر لوگ جان جائیں گے کہ یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انہیں امیر سمجھتی رہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گرو رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے۔ اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپے کے وارے نیارے نہ کر لے، اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میری تو ناک میں دَم آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے۔ ذرا سا تو گھر مشکل سے دو چارپائیاں اوڑھنا بچھونا بھی با افراط نہیں۔ مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دعوت دینے کے لئے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے اس لئے انہیں چارپائی بھی چاہیئے، اوڑھنا بچھونا بھی چاہیئے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے۔ جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر۔ زمین پر پڑے پڑے سُکڑ کر رات کاٹتے ہیں۔ گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں۔ لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آ جاتی ہے گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لئے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی ایسا خدا کا بندہ نہیں جو ضرورت کے وقت انہیں دھیلے سے بھی مدد دے سکے دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مرد خدا نے تو جیسے آنکھیں کھولنے کی قسم کھائی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے۔ ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے وہ آپ کا دوست ہے۔ شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں۔ آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں۔

کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امرا مغرور ہیں، مدمّغ ہیں، خوشامد پسند ہیں۔ ان کے پاس کیسے جائیں دستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمتگار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمتگار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی۔ مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رُکی ہوئی ہے۔ ایکدن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں۔ بڑا فرماں بردار ہے، پرلے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجے کا باتمیز۔ خیر، میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیونکر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں، مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں۔ بے ایمان نہ تھا، مگر احمق اول نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاتا ہے۔ کم بخت دوکانداروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اُسے دس تک کی گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سُور کے کان اُکھاڑ لوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اُسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کمبخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے۔ اس میں جھاڑو دیتا تو اِدھر کی چیز اُدھر، اوپر کی نیچے گویا سارے کمرہ میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل۔ مگر آپ کمرہ میں اطمینان سے بیٹھے رہتے، گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اُسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا اگر کل

سے تو نے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دونگی۔ سویرے سو کر اٹھی تو دیکھتی ہوں کمرہ میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینہ سے رکھی ہے، گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنسکر کہا ' دیکھتی کیا ہو' آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھادیا۔ تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو، اُلٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔ لیجئے صاحب' یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر۔ میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقہ کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا۔ اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات۔ ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اُٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بیباق کر دو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے، اس پر تنخواہ بھی دیدوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کُرتہ دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے رُکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بیکاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی شدّت کی تھی۔ اس کا مجھے خود احساس تھا۔ غریبوں پر کیا گزرتی ہے، اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب رؤسا اور امراء کے پاس ایک ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری پڑی ہوئی ہے تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر۔ میں نے تو اسے جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا کہ اپنا کوٹ اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک

کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں، اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے، وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی انھیں قدرت نے عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں۔ آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے نہ دیکھا گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آجائے آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی۔ نہ منکسر مزاج ہی سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے سیدھی سادی حماقت۔ جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات کو شراب کے نشہ میں بدمست، جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیئے؟ اتنی عمر گذر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لئے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بیشک میں جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں بطلق عذر نہیں۔ مگر روپے میں دیدوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بیچارے اپنے لئے بھی کبھی کچھ نہیں لاتے۔ میں جو کچھ منگوا دوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر آخر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں۔ گھر میں عورت کے لئے طرح طرح کے زیور۔ کپڑے۔ شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لئے بھی مٹھائی، کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں۔ قسم سی کھالی ہے۔ اس لئے میں تو انھیں بخیل کہوں گی۔ بدشوق کہوں گی، مردہ دل کہوں گی! فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص نمود ا!

لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ عالم ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس
ں عہدے دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔
ڈالی تو دور کی بات ہے۔ اور تو اور، کبھی کسی افسر کے گھر جاتے بھی نہیں۔ اس کا خمیازہ
نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے۔ اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں
ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب
ب ہو جاتا ہے۔ بیچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مشکل کام آجائے تو انھیں کے
منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انھیں گھسو اور پیتو وغیرہ خطابات ملے ہوئے
، مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں، ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار
ں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو
میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے۔ اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم
نہ کھچا رہے۔ پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں بھی ظاہر ہو جاتی
ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ
پہنچتا ہے یا جس پر اعتماد ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں
ی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں۔ اس کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہے
کہاں پوری ہو۔ جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے
الے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسروں سے لڑ گئے۔ یا کام کی
کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات
ی نہیں پوچھتے مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آجکل تحصیلدار
ہیں۔ گھر کی جائداد انھیں کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں۔ موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر
ہیں، مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی

میں نے کہا اپنے برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں۔ آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہو گی۔ میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لکھا۔ معلوم نہیں خط میں کیا لکھا۔ لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟ آپ نے ترش ہو کر کہا ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے ابھی کیا جواب آسکتا ہے۔ ایک ہفتہ اور گذرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات چیت کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش کوئی نہ کوئی شگوفہ لئے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی تعریف بھی ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لئے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، مالی، اخلاقی، تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے۔ محض اس لئے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کب چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتہ گذر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آپہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا۔ تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا۔ یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا نفع نو دس سال قبل تھا۔ اب ایک ہزار سے کم نہ ہو گا۔ کبھی ایک جھنجھی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیئے۔ دو ہزار نہ ہو۔ ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو۔ ڈھائی سو ہو۔ کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھر کو تو ہو۔ تحصیلدار کی آمدنی ہماری آمدنی کی چوگنی ہے۔ رشوتیں بھی لیتے ہی ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ ہیں ہیں ہاں ہاں کرنے لگے۔ یہ بیچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں۔ عزیزو اقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔ خوب! گویا جائداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے گھڑنے بھی نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بتا دیتی

کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا۔ یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہو گیا، گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی، اس میں دیوالہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو یہ بات۔ اس جولانی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بیوی سے قرض لئے تب جا کر کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادران یوسف سے خدا بچائے!

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں۔ دو بچیاں بھی ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں۔ سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحبزادے ابھی گھوم کر نہیں آئے ہیں گھبرا رہی ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں، اور اخبار چھین کر کہتی ہوں جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا۔ نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں۔ تمہیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا۔ تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک نہیں آیا! بڑا شیطان ہے۔ آج بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں۔ مارے ہنٹروں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر، طیش کے عالم میں آپ اس کی تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ اُدھر جاتے ہیں، اِدھر لڑکا آ جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں تو کدھر سے آ گیا۔ وہ بیچارے تجھے ڈھونڈھنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے؟ آج قدر عافیت معلوم ہو گی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان، اور بدحواس۔ گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں آیا کہ نہیں؟ میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں۔ آ کر بیٹھا تو ہے۔ جا کر پوچھتے کیوں نہیں؟ پوچھ کر

ہار گئی کہاں گیا تھا۔ کچھ بولتا ہی نہیں۔

آپ گرج پڑتے ہیں۔ منّو۔ یہاں آؤ۔

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آکر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامہ سے باہر ہیں، ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضبناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں۔ مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بناوٹی غصہ سے کہتے ہیں، تم کہاں گئے تھے جی۔ منع کیا جاتا ہے، مانتے نہیں ہو۔ خبردار جواب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا اِدھر اُدھر گھومتا ہے؟

میں سمجھ رہی ہوں کہ یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہوگا۔ گزبڑ تو بری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصہ فرو ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں۔ "تم تو جیسے ڈر گئے۔ بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے۔ اسی طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے کل نو کی خبر لیگا۔ اس نے بھی دل میں کیا سمجھا ہوگا۔"

آپ فرماتے ہیں "تم نے سنا نہیں میں نے کتنے زور سے ڈانٹا۔ بچہ کی روح ہی فنا ہو گئی ہو گی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے۔"

"تم نے ڈانٹا تو نہیں، ہاں آنسو پونچھ دیئے۔"

آپ نے ایک نئی اُپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیئے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیئے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ

ٹے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے بھی گولیاں، کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کہ کوئی لڑکا کنکوا ڑالے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ سکول سے ونہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں وت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں ایسے باپ کا بھلا لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے۔ ابا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی۔ انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی یہ برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو ابا جان کی ہی صحت کون بہت اچھی تھی۔ بیچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوا اڑانے کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو۔ ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے۔ تمھیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ نہ ہو۔ لیکن آپ میرے بچوں کو خراب نہ کیجئے۔ برے برے شوق نہ پیدا کیجئے۔ اگر آپ انھیں سدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑتے نہیں۔ لگے باتیں بنانے۔ ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہیں لیجاتے تھے لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے

پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے، خوب آتشبازیاں چھوٹیں گی، غبارے اڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں۔ ان پر مزے سے بیٹھنا۔ اور تو اور۔ آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکیٹ، فٹ بال، ہاکی ایک سے ایک مہلک۔ گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آجاتا ہے تو کتنے خوش ہوتے ہیں گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کو چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بیچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے، چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں، پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے، اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہوسکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے احتراز کریں، لیکن اس کا اثر عام حالات پر بہت کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لئے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھ جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دیئے جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑائی۔ جب اس طرح ایک پورا سال گذر گ اور لڑکی کا سترہواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کرلی۔ حضرت بھی راض ہو گئے۔ کیونکہ ان لوگوں نے قرارداد نہیں کی۔ حالانکہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کہ اچ رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔ شا کے بہ خیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔ لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک چلتی تھی۔ یہ رسم بیہودہ ہے۔ یہ رسم بے معنی ہے۔ یہاں روپیہ کی کیا ضرورت؟ یہاں گہنے

کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں، وہ کیوں؟ یہ تو صاف چھیڑ ہے۔ تم نے میرے مُنہ میں کالک لگادی۔ میری آبرو مٹادی۔ ذرا خیال کیجیے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات پر ردّوقدح ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھی اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں۔ میں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا۔ کھانا کھایا۔ خیر۔ رات کو شادی کے وقت کنیادان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیادان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔ لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے پیسے کا ہوتا ہے۔ جانور بھی دان دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے کتنا سمجھاتی ہوں صاحب، پرانا رواج ہے۔ شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔ عزیز اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہو گئے۔ مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔ پیروں پڑی۔ یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا۔ جو کچھ کرنا ہو گا میں کرلوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور اسے دعا دو۔ مگر اس مردِ خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آگیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیادان چچا یا ماموں کرے، یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیادان کی رسم ادا کی۔ آپ گھر میں جھانکے تک نہیں۔ اور لطف یہ کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر

ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا، حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھیں اُٹھا کر نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے۔ بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں۔ اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول اور نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف، آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ، سب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے۔ ہر لحظہ چور اور رہزن کا خوف! بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔



افلاطون کی وصیّت

معلمین اور متعلمین کے لئے

مشہور و معروف یونانی فلسفی "افلاطون" کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں آج اس کی وصیت و نصیحت جو استادوں، شاگردوں اور طلبہ کے سرپرستوں کے لئے بہت کارآمد ہو پیش کی جارہی ہے۔ یہ وصیت اس قابل ہے کہ لوگ اسے دستورالعمل قرار دیں۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"میں نہ تو اہل فلسفہ و حکمت اور ماہرین فن بلاغت کے اعلیٰ طبقے کی جماعت کو خطاب کرتا ہوں اور نہ اس سے کمتر طبقے کے لوگوں سے میرا خطاب ہے۔ بلکہ میرا روئے سخن ان دونوں طبقوں کے درمیانی گروہ کی طرف ہے

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ پر خود اپنے نفس کی اصلاح و تذکیر اور علم و ادب کے لئے ترغیب و تحریص لازم ہے۔ بجائے اس کے کہ میں کسی دوسرے شخص کو اپنی اصلاح و تہذیب کی ضرورت کا احساس دلاؤں، عقلاً یہ ضروری ہے کہ میں خود اپنے نفس کو اپنے نفع و نقصان کا مخاطب قرار دوں۔ جب میں ایسا کروں گا تو ارباب علم و ادب سے بہرہ مند ہو سکوں گا۔

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ میں اپنے آپ کو نہیں پہچانتا، میں نہ حکیم ہوں نہ دانا اور نہ علم و تعلیم پر حاوی۔ میں اب تک ادب و حکمت کا طالب ہوں، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرے بعد فصیح و بلیغ صاحب تحریر اور شاہراہ ہدایت قائم کرنے والا کون ہوگا۔ جو دونوں جماعتوں کو ایک ساتھ مطمئن کردے، اعلیٰ طبقہ (علماء و حکماء کی جماعت) بھی خوش رہے اور ادنیٰ طبقے کی تعلیم و تادیب بھی ہوجائے۔ نہ اُن کے ساتھ زیادتی ہو نہ اُن پر سختی، نہ اُن کا کسی خیال سے اکرام کرے، نہ اُن کے ساتھ زجر و توبیخ سے ذلت کا سلوک کرے نہ ان لوگوں میں گھل مل کر قرابت کا سا رویہ

اختیار کرے ۔ نہ ان کے ساتھ تساہل وغفلت اور بے رُخی کا برتاؤ کرے ۔ بلکہ دونوں گروہوں کے ساتھ مساوات اختیار کرے یعنی اپنے علو مرتبت وشانِ ریاست (سرداری) کو میری تعلیم کے مطابق قائم رکھے اور اُن کو اس بات کی تعلیم دے جو میں نے بتلائی ہے۔

تادیب وتعلیم کے مدعیو! اگر تم دلبستانِ ادب کے سرتاج معلم بننا چاہتے ہو تو میری وصیت کو سمجھو۔ جو میں تم کو لکھ کر دیتا ہوں۔ تمھارے اخلاق تلامذہ وطلبہ کے ساتھ بلا زیادت و نقصان نہایت صحیح و مستقیم ہونے چاہئیں۔ قسم ہے اللہ کی جس نے ہر علم وادب کو پیدا کیا ہے میں تم سے حلف لیتا ہوں کہ تم حد سے ہرگز متجاوز نہ ہونا۔ اپنی عادات کو پاکیزہ بناؤ اور اپنے علو مرتبت کا خیال رکھو۔ روحانی روشنی حقیقی آب وتاب کے مجسمے بن جاؤ۔ طلباء کے لئے صاف شفاف آئینہ بن جاؤ۔ انسانیت ومروت۔ تہذیب وفتوت کے ہادی بنو تاکہ وہ تہذیب و فتوت حاصل کرلیں۔ بُری باتوں، مصیبت والام، موت وفنا کا سبب بن جانے والی خواہشوں سے ان کو باز رکھو اور تم شہوت مذمومہ اور ارتکاب خطایا سے باز رہو۔ اُن سے خندہ پیشانی سے ملنے اور شیریں زبانی سے گفتگو کرنے میں بخل نہ کرو۔ ایسی چیز کے پاس نہ جاؤ جو تمھاری ملامت کا باعث ہو۔ اور نہ تم کسی مذموم عادت کا سبب بنو کہ جس کی وجہ سے تمھارے شاگرد تمھارے ساتھ جسارت ودلیری سے پیش آئیں۔ تم ان کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کی جرأت نہ دلاؤ۔ کسی ناپسندیدہ ، مکروہ بات کا ان کے سامنے ذکر نہ کرو۔ اُن کے ساتھ تمھارا برتاؤ رازداری کا ہرگز نہ ہونا چاہیئے جب تم ان کو تعلیم دو تو ایسا کلام نہ کرو جو حاضرین (طلباء) کی جماعت سے پوشیدہ رہنے والا ہو۔ دھوکا اور فریب کے ساتھ اُن کو تعلیم مت دو۔ انعام واکرام کے ساتھ ان کا تقرب حاصل نہ کرو۔ ان کے سامنے مت ہنسو۔ اُن کے ساتھ اُن کے استحقاق کے مطابق برتاؤ کرو۔ ان کو سکھاؤ کہ وہ اپنے علمی مراتب سے تنزل نہ کریں۔ ورنہ تم بھی ان کی تعلیم میں اپنے مرتبے سے تنزل کر جاؤ گے۔ رات کے خواب، زوال پذیر نعمت و دولت اور فانی لذتوں کے ساتھ محفلیں قائم نہ کرو، ورنہ تمھاری ذات کا خلوص اور تعلیم کا وقار

جا تا رہے گا۔ تم ان سے حیا کرو۔ عیوب سے بچو اور توقیر اختیار کرو۔ تم کو اور تمہارے شاگردوں کو بھی چاہیئے کہ اس بیش قیمت پند و نصیحت پر عمل کر کے اپنے آپ کو لعن طعن۔ جرح قدح سے محفوظ کر لیں تم ان کو اپنی اور اپنے ہم پیشہ لوگوں کی نیز دوسرے اشخاص کی اکرام و اعزاز کے ساتھ خدمت کرنے کا عادی بناؤ اور تم ان کو اس سے نہ روکو۔

تم ان کو موقع و محل پر ادب کی تعلیم دو اور صحیح طور پر سمجھ بوجھ کر یہ شک و شبہ نہ ہو کہ تم نے ان کے ساتھ کوئی بے جا روش اختیار کی ہے۔ مبادا کہ تم اپنے علو مرتبہ سے تنزل کر جاؤ طلباً میں سے جسارت کرنے والوں کے ساتھ والدین کی طرح نرم دلی نہ اختیار کرو اور نہ اس سے عزیز و اقارب جیسی محبت کرو۔ بلکہ اجنبی کی طرح بالکل ابتدائی تعلق سمجھ کر سیاست و تہذیب دینی چاہیئے۔ اور تکلیف و مشقت کے ساتھ ان سے مواخذہ کرنا چاہیئے۔ اگر ان کے عزیز و اقارب میں سے کوئی اس سیاست و تادیب و گرفت سے منع کرے اور تم سے رحم دلی اور نرمی کی درخواست کرے تو اس کو اپنے پاس سے نکال دو۔

تمہاری اصلاح و سزا غصہ اور بدحواسی کی حالت میں نہ ہو اور نہ تم اُن کو اپنی بے التفاتی اور نامہربانی کی وجہ سے بے کار چھوڑ دو۔ تمہارے سلوک کی رفتار غیر منظم، بے ترتیب نہ ہونی چاہیئے اور نہ ان کو بغیر کسی قاعدے کی پابندی کے آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔ تم ان کے اجسام اور خط و خال پر نظر تامل کرنے سے اجتناب کرو۔ جب کبھی ان سے محبت کرنے لگو اور ان پر تمہاری مہربانی زیادہ ہونے لگے تو تم ان کو بجائے دشمن کے خیال کرو اور وقعت و بزرگی کا لحاظ رکھ کر ان کو روحانی حقیقی تعلیم دینا یاد رکھو۔ اور ضرورت کے وقت لطیف اور عمدہ دواؤں سے ان کا علاج کرو تاکہ ان کے ذہن صاف اور روشن ہو جائیں اور جو علم تم ان کو سکھانا چاہتے ہو وہ ان کے واسطے باعثِ فخر و عزت ہو، ان کو باقلا، لوبیا، پیاز، لہسن جیسے نسیان پیدا کرنے والے کھانوں سے پرہیز کرنے کا عادی بناؤ اور سمیات کے استعمال سے بھی، نیز اس قسم کے اور کھانوں سے بھی ان کو باز رکھو مقررہ اوقات کے اندر عمدہ لطیف غذا کی معین مقدار کھانے کا پابند بناؤ۔ کھانے کی حرص

اور نشے سے ان کو بچاؤ ۔ ان کی علمی حالت کے موافق عمل میں حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنے دو بدکاری کی طرف مائل کرنے والی اور مہلک شہوانی نظر سے ان کو باز رکھو، بھدّی نامعقول تیز رفتار سے چلنے کی ممانعت کرو۔

ان ہی میں سے ایک نائب استاد (مانیٹر) ان پر مقرر کرو۔ جو ان پر مناسب طور سے نگران رہے۔ اور وہ سب سے متقدم (اعلیٰ) ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ غنی ہو یا فقیر، وجیہہ و شکیل ہو یا بد شکل، بے عقل خوب صورت کا خیال نہ کرنا چاہیئے بلکہ عقل و دانش کو مقدم سمجھنا چاہیئے۔ اُن نوجوان طلبار کا مانیٹر ایسا ہونا چاہیئے جس پر وثوق و اعتماد کیا جا سکے، جو ذکی، سمجھ دار بارعب ہو اس کی شہرت، بدسلوکی، بدمعاملگی، بد باطنی سے داغ دار نہ ہو، بد افعال شخصوں کو مانیٹر نہ بناؤ بلکہ اُن سے دور رہو۔ جب تم کو خوش قسمتی سے صفات حسنہ و اخلاق فاضلہ سے مزین و آراستہ مانیٹر مل جائے تو اس وقت مناسب ہے کہ تم طلبار کا روپیہ پیسہ، زر امانت اور ان کی چیزیں اس کے سپرد کر دو کہ وہ انتظام کے ساتھ اُن کے لئے تصرف میں لائے۔

تم کو اپنے ہر طالب علم کے لئے مناسب تعلیم کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ تمھاری تعلیم ان کے لئے امتیاز و تربیت کے خلاف نہ ہو، ان پر ان کی طاقت کے مطابق بار ہونا چاہیئے۔ جبر و اکراہ اور تکلیف مالا یطاق سے ان کے دلوں کو مردہ مت بناؤ۔ ان میں سے ہزار ہزار، سَو سَو پچاس پچاس، دس، دس پر نائب استاد مقرر کرو۔ جو اپنے طلبار پر امر و نہی کا مختار ہوگا اور اگر کبھی کوئی نائب علم و ادب کے راستے سے ہٹ کر اپنے طلبار کو ایسے کام کی ہدایت کرے جس کا وہ خود عامل نہیں۔ تو اس کو معزول کر کے دوسرے کو اس کی جگہ قائم کرنا چاہیئے۔ حزم و احتیاط کے یہ بات خلاف ہے کہ کسی خائن اور جھوٹے پر اعتماد کیا جائے۔ اور جو شخص عمداً کسی کی جان لے اس کا بھی عذر قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر کسی نوجوان سے لغزش ہو جائے تو معاف کر دینا چاہیئے اور تین مرتبہ تک یہ معافی ہو سکتی ہے۔ تین دفعہ غلطی کے بعد اس کو طلبار کی جماعت سے خارج کر دیا جائے اور اس کی آمد و رفت بند کر دی جائے تاکہ اور نوجوان اس سے متاثر نہ ہو سکیں۔

علم وادب کو دوست رکھنے والے بھائیو! میری وصیت سنو اور یاد رکھو، میں بھی تمہاری طرح علم وحکمت کا شیدائی ہوں، میں تم کو ایک آسان مقالہ لکھ کر دیتا ہوں جس میں تم کو ہر عمدہ علم وفن حاصل کرنے کا راستہ بتاؤں گا۔ جس سے ہر متعلم لطف اندوز ہوگا۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ علم کی تحصیل شروع کرنے سے پہلے تم کو بالکل پاک باطن اور صاف دل ہونا چاہئے نہ تم میں کسی طرح کا عیب ہو۔ کیوں کہ ناپاک اشیا پاک صاف چیزوں کے ساتھ، اور پاک چیزیں ناپاک کے ساتھ نہیں مل سکتیں۔ ناپاک لوگوں کو تعلیم مت دو۔ بلکہ پاک صاف نیک طبع لوگوں کو زیور علم سے آراستہ کرو۔ عیب دار، کور باطن شخص کو پاک باطن، صاف دل انسان کے پاس بھی نہ آنے دیا جائے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ صاف لطیف اور شیریں پانی کا ایک گلاس متعفن کالی مٹی کے گھڑے کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نیز کم زور آشوب زدہ نگاہ سورج کی شعاعوں کی تاب نہیں لاسکتی۔ ایسے جسم کے اندر جس میں جہل وحرص کا خمیر ہوچکا ہو، روح نفس پر تہذیب وتادیب کا اثر نہیں ہوسکتا۔ عاقل انسان کے لئے اس سے زیادہ قبیح اور بُری بات کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ لوگوں کو ایسی بات بتلائے جس سے وہ خود بے بہرہ ہو اور ارتکاب معصیت سے آلودہ ہو۔ علم وحکمت اور اللہ عزّوجل سے تشبّہ (بفحوائے "تخلقوا باخلاق اللہ") افعال حسنہ واخلاق فاضلہ کا رہنما اور عقل ودانش کا معلم ہے۔

حسد سے بچو! یہ نفاق وشقاق، جدائی وافتراق پیدا کرنے والی چیز ہے۔ تمہارا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تواضع کا سلوک ہونا چاہئے۔ کمال محبت کے اندر مساوات اختیار کرنی چاہئے اپنے نفسوں کو اللہ کی طرف جھکا دو اور عقلائے کاملین اور فضلائے عالمین کی اطاعت کرو جو اپنے افعال واعتدال اور صبر وقناعت کی وجہ سے عظمت کا کامل استحقاق رکھتے ہیں۔

آباواجداد پر فخر کرنے والے ناقابل اعتماد ہیں۔ وہ ایسی اولاد ہیں کہ اپنے بزرگوں سے تہذیب نفس کا علم اور دیگر ضروریات ولوازم سے واقفیت حاصل کرنے میں قاصر رہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ طلباء کے سامنے آبائی ورثہ کے بلا استحقاق مدعی بنتے ہیں۔ یہ لوگ ظالم ہیں، علم وحکمت

کے دشمن ہیں۔ شیطان کے جال میں پھنسانے والے ہیں ان سے اجتناب لازم ہے۔ تم میں سے ہر شخص کو چاہیئے کہ اپنے رفیق کو اپنے جیسا سمجھے۔ اس کو رازداری کا اہل خیال کرے۔ ہر ایک پر دوسرے کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت ضروری ہے تاکہ آپس میں رازداری بلا خوف وخطر ہو سکے۔

سننے والے اطاعت شعار، حق و حکمت کے طالب و پرستار، حق کی طرف سے برسر پیکار، صدق و راستی کے دوست دار ہو، اوقات و ازمنہ اور ان کے اختلافات کا علم حاصل کرو، صلاح وسکون، سلامتی و اطمینان کے قیام کے واسطے معتمد مرکز بن جاؤ۔ نیک لوگوں کی باتیں کیا کرو۔ ان کی ظاہری و باطنی بصیرت سے متواضع ومنکسر ہوکر بینائی حاصل کرو، متکبر مت بنو، خداؤں (معبودوں) کی سی رفعت حاصل کرو، ہمیشہ ترک لذات کا سبق دیتے رہو۔ روحانیت وحقائق کے اندر تدبر و تفکر کیا کرو۔ ایسا کلام اختیار کرو جو دائمی حیات کا باعث ہو۔ فضائل ومحاسن سے تمسک کرو، تکبر کا بارگراں اپنے کندھوں پر نہ اٹھاؤ۔ اپنے مراتب سے تجاوز نہ کرو۔ جھوٹی تعریف اور غیر واقعی باتوں سے اپنی شان کا اظہار نہ کرو۔ فخر و مباہات سے اپنی عظمت قائم نہ کرو، سرکش جابر لوگوں کے اخلاق سے دور رہو۔ تم اپنی کم علمی و نادانی سے بے خبر غافل نہ رہو۔ جو کچھ تم سکھلاتے ہو اس سے کامل طور پر واقف بنو اپنے حدود سے تجاوز کرنے کی جرأت نہ کرو۔ بے حقیقت باتوں پر مت جھگڑو۔ غلط اور لغو باتیں اختیار نہ کرو۔

شہوات قبیحہ سے بچو۔ ایسی خواہشات کی طرف رجحان نفس و میلان طبع کو روکو، علمی کتابوں کا مطالعہ لازم سمجھو، اور کبھی مطالعے سے مکدر و بددل نہ ہو۔ حکماء علماء کے سامنے کامل سکوت و سکون اختیار کرو۔ اپنے والد اور بزرگوں کا خوف وادب ملحوظ رکھو۔ اپنی ماؤں کا اکرام و احترام کرو آرام طلبی و کاہلی اور نیند اور سستی نہ پسند کرو۔ خیر و شر میں امتیاز، نفع و نقصان میں فرق کرو۔ جب تک تم سے سوال نہ کیا جائے جواب نہ دو۔ جھگڑے قضیوں سے بچو لطیف غذ

استعمال کرو۔ کھانے کی حرص سے گریز کرو۔ مسکرات و نشہ آور چیزوں سے باز رہو بلکہ معارف و حِکَم اور علم و ادب کی دائمی حلاوت پر خورونوش کی فانی لذت کو ترجیح نہ دو۔ اور شراب خوری کی حرص نہ کرو۔ تمھارے کھانے کے اوقات مقرر ہونے چاہئیں۔ اگر ممکن ہو تو کھانے میں شہد بھی استعمال کرو۔

" اللہ عزوجل کا ذکر بہت کیا کرو۔ اس کے احسانات کو فرداً فرداً بھی اور مجتمع ہو کر بھی یاد کیا کرو۔ اپنے سے بڑے اور زیادہ عمر والے کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کرو۔ ان سے کلام و گفتگو میں جرح و قدح نہ کرو، ان کے سامنے لغو باتوں کے لئے اپنی زبان کو آزادی نہ دو۔ دوسروں کی برائیوں کو اپنا مشغلہ نہ بناؤ۔ تم اپنے آپ کو عاقل و دانش مند نہ سمجھو۔ بلکہ دوسرے خود تمھاری دانش و حکمت کی شہادت دیں گے۔ جب کبھی تمھاری بات صحیح و درست اور تمھاری دلیل قوی ہو جائے تو اپنے دل میں خوش نہ ہو۔ اور مخالف پر غالب آجانے سے فخر نہ کرو۔

" تنہائی و وحدت کے اندر سکون و اطمینان اختیار کرو، رفعت و سرداری کی خواہش نہ کرو۔ اگر کوئی شخص تمھاری تعظیم و تکریم کرے تو تم اپنے دل میں متواضع اور منکسر بنو۔ اگر کوئی ذمہ دار حاکم شخص تم کو کسی کام کا ذمہ دار بنائے تو تم اس کام کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دو۔ غصے کو پی جانا اپنی عادت بناؤ، غیظ و غضب کو جلدی اختیار نہ کرو۔ عزت نفس و خودداری کا خیال رکھو۔ اس کی وجہ سے تم کو عظمت حاصل ہوگی، کوئی کام غیض و غضب کی حالت میں نہ کرو۔ دوستوں کا دوستی سے پہلے امتحان کر لو۔ آزمائش سے قبل دوست نہ بناؤ۔"

" بازاروں میں کھڑا ہونا معیوب سمجھو۔ اگر تم بازار نہ جانے کا انتظام کر سکو تو ضرور کرو، کیوں کہ بازار، آبادی اور شہر کے گھورے ہیں۔ اور وہاں انسان کو کوئی پاک صاف چیز نہیں ملتی۔ عوام خصوصاً بازار کے لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ وہ لوگ بے خبر، بے عقل، سفلے ہیں ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ صحیح علم حقیقی معرفت سے بے بہرہ ہیں۔ اپنے اسرار و بھید کسی کو نہ بتاؤ۔ حکام سے تواضع کے ساتھ بات کرو۔ بلکہ ہر شخص کے لئے جھک جاؤ۔ متواضع

ہو جاؤ، لوگوں کے ساتھ میل جول رکھو، تم سب آرام سے رہو گے۔ تم کو اگر تکلیف ہوگی تو جان پہچان والوں ہی سے ہوگی۔ اس دنیا کی عارضی عزت و شوکت جو اکثر لوگوں کی نگاہ میں بہت بڑی چیز ہے تمہارے دل میں اس کی وقعت بالکل نہ ہونی چاہیئے۔ جب کسی انسان کا کوئی فعل تم کو ناگوار معلوم ہو تو اس کو اسی وقت متنبہ کر دو، دورخی مت اختیار کرو، تمہاری محبت میں چاند کی روشنی کے اختلاف و انقلاب کی طرح تلون و تغیر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ سورج کی روشنی کی طرح قائم و دائم بلا زیادت و نقصان رہنا چاہیئے۔ احکام کے اندر لوگوں کی طبیعت کا خیال نہ کرو بلکہ عاقلانہ بلاخوف و خطر حکم بنو، جو تمہاری نظروں سے غائب ہیں اُن کی برائی مت کرو۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے قسم نہ کھاؤ، تم سلاطین و ملوک کے زمرے میں مت رہو اگر وہ تمہارے حق میں غاصب ہیں۔ تم کو بوڑھا ضعیف اور ذہن و حافظہ کو خراب کرنے والے لہو و لعب سے بچنا چاہیئے ہنسی کی مداومت سے دور رہو اور ایسے لوگوں کی مجالست سے اجتناب کرو جو شہوات قبیحہ کو مستحسن و مزین کر کے دکھلاتے ہیں اور اپنی تدبیروں سے غلط کاریوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو اپنی دسیسہ کاری سے ناقص خواہشات، فاسد خیالات پیدا کر کے تم کو سانپ، اژدہا، سمیات، اور مہلک ادویات پر جرأت دلاتے ہیں ان لوگوں سے بھی دور رہو جو ایسی ایسی عجیب چیزیں دکھلاتے ہیں جن کی حقیقت کچھ نہیں۔ شعبدہ بازی، جادوگری جھاڑ پھونک اور ہنسی دلانے والی باتوں سے بھی بچو، دوست نما دشمن، اور اس بھائی سے بھی بچو جس کے کلام میں صداقت نہیں۔ ضمانت و ذمہ داری کا اعتبار نہیں۔ بات کے اندر صواب و راستی نہیں۔

• نوجوانوں کو فن حرب کے متعلق صف بندی، نشانہ بازی، بھاگ دوڑ، پہلوانی اور اسلحہ کے استعمال کی ضروری ضروری باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔ لیکن ان چیزوں میں انہماک نہ ہونا چاہیئے۔ ان کے لئے گھوڑے کی سواری ضروری ہے۔

• علم موسیقی کے متعلق بھی کچھ واقفیت مناسب ہے۔ کیونکہ فنون لطیفہ میں سے ایک یہ بھی

ہے۔ آوازہ لحن کے جوڑ توڑ اور مخارج کی مناسبات اور "عود" کے اقسام معلوم کرو۔ اور دوسرے آلات موسیقی سے بھی کچھ واقفیت ہو جانی چاہئے۔ سب سے بہتر "ارغن" ہے جس میں طبائع اربعہ کے لحاظ سے "اسی" تار ہوتے ہیں"۔

"دیکھو! جب تم اس تہذیب و حکمت کے زیور سے آراستہ ہو جاؤ اور تم کو اس کی ہدایت و رشد حاصل ہو جائے تو تم علم و ادب کے آسمان پر خورشید جہانتاب و مہر عالمتاب ہو کر چمکو گے پھر تم اس "اللہ" کا شکریہ ادا کرو جو تمام و کل کا مدبر، ازلی، قدیم، حق و انصاف کا قائم کرنے والا ہے جو اس وصیت و نصیحت کے خلاف کرے تو متعلین کے ذمہ دار نگران پر اس کی تادیب واجب ہے کیونکہ ہر خطا کے لئے سزا ضرور ہے۔ خواہ فوری ہو یا بتاخیر۔ لیکن فوری سزا اختیار کرنا مناسب ہے۔ تاکہ لوگوں میں خلل و فساد کا سبب اور مجادلہ و مقاتلہ کا باعث نہ ہو جائے۔ ایسے شخص کو نکال دینا چاہیئے اور متعلین کی جماعت میں نہ شامل ہونے دیا جائے۔ بلکہ اس کو آرام و چین کی زندگی بھی نہ بسر کرنے دی جائے"۔

"نوجوانوں کے نظام و تدبیر کے ذمے دار نگراں پر واجب ہے کہ وہ صاف شفاف آئینہ کے مانند ہو، کیونکہ وہ افسری و سرداری کا ذمہ دار ہے جو اس وصیت پر عمل کرنے سے کوتاہی کرے اس کو تعلیم طلبہ و تادیب متعلین سے معزول و برطرف ہو جانا چاہیئے"۔



سانپ کے منہ میں مینڈک نہ اُگلا جائے نہ نگلا جائے۔



اسپین کے ساتھ مدعیانِ ہمدردی کی دستگیری

ورسائی کے معاہدے پر ایک اور ضرب

ورسائی کے معاہدہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جرمنی دریا بین الاقوامی اختیار میں رہیں گے لیکن ہٹلر نے نومبر ۱۹۳۶ء میں اپنے ملک کے سب دریاؤں پر کامل قبضہ کا اعلان کر دیا۔



دنیا کی بڑی طاقتوں کا جنگی ساز و سامان

بحری قوت - ایک جہاز برابر ہے ایک لاکھ ٹن کے

برطانیہ ٹن ۱۱۶۱۰۰۰

امریکہ " ۱۰۷۳۰۰۰

جاپان " ۸۵۰۰

فرانس " ۵۰۲۰۰۰

اٹلی " ۴۱۶۵۰۰

روس " ۲۰۰۰۰۰

جرمنی " ۱۸۰۰۰۰

ہوائی طاقت - ایک جہاز برابر ہے ۵۰۰ جہازوں کے

روس ۴۰۰۰

برطانیہ ۳۵۰۰

فرانس ۳۱۰۰

جرمنی ۳۰۰۰

اٹلی ۳۰۰۰

امریکہ ۱۵۰۰

جاپان ۱۰۰۰

بری طاقت

ایک آدمی برابر ہے ایک لاکھ فوج کے

جرمنی سپاہی ۱۳۰۰۰۰۰

روس " ۱۳۰۰۰۰۰

اٹلی " ۷۵۰۰۰۰

فرانس " ۶۶۵۰۰۰

برطانیہ " ۵۴۰۰۰۰

جاپان " ۴۰۰۰۰۰

امریکہ " ۱۴۰۰۰۰

کلامِ آزاد

جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری اردو کے نہایت خوش فکر شعرا میں سے ہیں، غزل گوئی میں آپکا پایہ بہت بلند ہے اور اردو کے چوٹی کے غزل گو شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے کلام کی خصوصیت انتہائی سلاست و روانی کے ساتھ باریک سے باریک فلسفیانہ اور عارفانہ مسائل کا بیان کرنا ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ کی غزل، غزل کے حدود سے متجاوز ہو کر وعظ و خطبہ کی صورت نہیں اختیار کرتی اسکی رنگینی اور دلکشی برابر قائم رہتی ہے۔ ذیل میں ہم موصوف کی زیرِ طبع دیوان سے چند غزلیں منتخب کر کے پیش کرتے ہیں۔ اس انتخاب کا باقی حصہ اگلی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

حالِ دلِ فگار سنایا نہ جائے گا
زخمِ دروں سینہ دکھایا نہ جائے گا

ظاہر کا ربط و ضبط بڑھانے سے فائدہ
دل ایسی چیز ہے کہ گنوایا نہ جائے گا

اِک مُدعائے واجب الاظہار دل میں ہے
لیکن زبان تک کبھی لایا نہ جائے گا

یارانِ غمگسار کی غمخواریاں فضول
الفت وہ درد ہے کہ بٹایا نہ جائے گا

اب تیری عادتوں کا بدلنا محال ہے
جو ہم نے کھو دیا ہے وہ پایا نہ جائے گا

تیرے ستم جو آج نہ بھولے تو کل سہی
لیکن ترا خیال بھلایا نہ جائے گا

انجامِ کار کا بھی تجھے کچھ خیال ہے
کیا جو ستائیگا وہ ستایا نہ جائے گا

غیروں کے واسطے ہی مسیحائے وقت ہو
ہم کو تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

آزاد مفت جان کھپانے سے فائدہ
قسمت کی خوبیوں سے بر آیا نہ جائے گا

کبھی مہرباں ہو کے دل شاد فرما
کبھی قدرِ خدماتِ آزاد فرما

اگر ہو سکے بھول کر یاد فرما
اگر شاد فرما سکے شاد فرما

کبھی اپنی موجودہ غفلت سے باز آ
کبھی الفتِ مامضیٰ یاد فرما

یہ خاموشی حیرت افزا کہاں تک
کچھ احباب کے حق میں ارشاد فرما

اسیرانِ الفت بہ تنگ آچکے ہیں — جو خوفِ خدا ہے تو آزاد فرما
کچھ احساس تکلیف شوقِ نہاں کر — کچھ اظہارِ دردِ خداداد فرما
جو بر لا سکے حاجتِ شوق برلا — جو فرما سکے فکرِ امداد فرما
ترے لطف بے انتہا ہیں تو ہونگے — کبھی کوئی تشریح اعدا فرما
جہاں تک ہو پامال جور و جفا کر — جہاں تک ہو تکمیلِ بیداد فرما
کہاں تک جنونِ تغافل کہاں تک — کچھ اصلاح طبعِ خداداد فرما
کبھی شرطِ منصف مزاجی بجا لا — کبھی حق رسیہائے آزاد فرما

شکر ہے کہ دل دے کر یارِ دلربا پایا — یعنی جس قدر کھویا اس سے کچھ سوا پایا
خنجرِ فنا کھا کر ثمرۂ بقا پایا — زیست کی بنا ڈھا کر زیست کا مزا پایا
جس نے ہر دو عالم کو چشمِ غور سے دیکھا — اس نے ہر دو عالم سے تم کو ماورے پایا
ہم نے بے نشاں ہو کر آپ کا نشاں ڈھونڈا — ہم نے آپ کو کھو کر آپ کا پتا پایا
شاد رہ کے بھی شاکر رنج سہہ کے بھی شاکر — بندۂ محبت کو بندۂ رضا پایا
ہم کو بتکدے میں بھی شانِ حق نظر آئی — ہم نے بتکدے کو بھی خانۂ خدا پایا
صرف اک غمِ الفت وجہ صد خوشی دیکھا — ورنہ ہر تعلق کو رنج و غم فزا پایا
ہاں متاعِ راحت بھی قیمتی سہی لیکن — جنسِ دردِ الفت کو جنسِ بے بہا پایا
اے ندیم دور اندیش ابنِ عشقِ جاناں ہیں — یہ نہ پوچھ کیا کھویا اس کو دیکھ کیا پایا
اسمیں شک نہیں آزاد شوخ بھی ہے منہ پھٹ بھی — کچھ سہی مگر اس کو آدمی کھرا پایا

سرسبز پھر بہار سے سارا چمن ہوا — معمورِ جلوۂ گل و سرو و سمن ہوا
پھر حکمِ مے کشی مسرت کا عام ہے — پھر اذنِ چارۂ غم و رنج و محن ہوا

پھر شیخ دل سے پیرِ مغاں کا مرید ہے — پھر زاہدوں کا نشۂ تقویٰ ہرن ہوا
پھر محو سادہ زاہدِ شب زندہ دار ہے — پھر رہن بادہ خرقۂ زہدِ کہن ہوا
پھر جام لے کے ساقیِ رنگیں ادا ہوا — پھر گرمِ نغمہ مطربِ گل پیرہن ہوا
پھر صحنِ گلستاں میں بساطِ طرب بچھی — پھر شغلِ مے کشی لبِ نہرِ چمن ہوا
پھر جلسۂ طرب میں غزل خوانیاں چھڑیں — پھر انعقادِ محفلِ شعر و سخن ہوا
پھر چار سمت سرو قدوں کے ہجوم ہیں — پھر اجتماعِ لالہ رخانِ زمن ہوا
پھر ہم زبان ہر صنمِ گل بدن بنا — پھر مہربان ہر بُتِ غنچہ دہن ہوا
پھر اخترِ مقدرِ عالم چمک اُٹھا — پھر آفتابِ لطفِ خدا ضو فگن ہوا

پھر اب کے سال چار طرف اتنے خم لنڈھے
آزادِ فاقہ مست بھی پی کر مگن ہوا

حقِ الفت ادا کریں گے آپ؟ — آپ پاسِ وفا کریں گے آپ؟
ہم فریبِ نگاہ کیوں کھاتے — کیا خبر تھی دغا کریں گے آپ
کون واقف کسی کا دل لے کر — کیا بنائیں گے کیا کریں گے آپ
آپ کیوں درپئے دل و جاں ہیں — ہم نثار ادا کریں گے آپ
آپ پُرسانِ حالِ غم ہوں گے؟ — آپ خوفِ خدا کریں گے آپ؟
کب تک آزاد جبر کے ہوتے — صبر پر اکتفا کریں گے آپ

اس کو قیدِ مکاں سے کیا نسبت — بے نشاں ہے نشاں سے کیا نسبت
عرش و کرسی کی رفعتیں برحق، — مگر اس آستاں سے کیا نسبت
مہر بھی ضو فشاں سہی لیکن — اس رُخِ ضو فشاں سے کیا نسبت

شیخ کعبہ خدا کا گھر ہی سہی　　پھر و پیر مغاں سے کیا نسبت
برق مضطر سہی مگر آزادؔ
میرے قلب تپاں سے کیا نسبت

میں وہ بیکس کہ واجب الامداد　　تو وہ کافر کہ خوگر بیداد
دل بھی ناشاد جان بھی ناشاد　　ہر طرح جی پہ آ بنی فریاد
ایک دل اور سینکڑوں دلبر　　ایک صید اور لاتعد صیاد
ہائے وہ لطف الفت باہم　　یاد ہے آج تک وہ عالم یاد
منزل عشق پر خطر ہے تو ہو　　شوق کہتا ہے ہر چہ بادا باد
او ستم دوست! منصفی فرما　　داد خواہوں پر اور یہ بیداد
کون تاب مقاومت لاتا　　ہم تھے اور تیرے عشق کی افتاد
اب وہ ظالم ہے اور فکر جفا　　لے امید وفا مبارک باد
نہ وہ صبر و سکون دل باقی　　نہ وہ صبر و سکوں کی استعداد
میرے غم سے نمود شادی غم　　میرے دم سے وجود کون و فساد
کہیں آباد ہی نہ ہونے دیا　　بارک اللہ! قسمت برباد
حال آزادؔ کیا گذارش ہو
کہ وہ آزادیاں نہ وہ آزاد

اک مرا دل کہ مصائب کا شکار　　اک مری جان کہ صرف افکار
تو اور اک چشم عنایت سے دریغ　　میں اور امید وفا کا آزار
نا مرادانہ بسر ہوتی ہے　　نہ وہ دنیا ہے نہ وہ لیل و نہار

نہ وہ تسکین کے پہلو باقی
نہ وہ امید نہ وہ صبر و قرار

نہ کوئی درد و مصیبت کا شریک
نہ کوئی یار نہ کوئی غم خوار

نہ وہ خوش وقتی بزم عشرت
نہ وہ دل چسپیٔ سیر گلزار

نہ وہ محفل نہ وہ غوغائے نشاط
نہ وہ گلشن نہ وہ دنیائے بہار

نہ وہ آنکھیں نہ وہ رنگیں جلوے
نہ وہ نظریں نہ وہ لطف دیدار

جس جگہ جائیے دل کو وحشت
جس طرف دیکھئے کلفت دو چار

کامرانی کا زمانہ نہ رہا
کوئی حسرت ہو نکلنی دشوار

کیا پڑی ہے کہ کوئی رہبر ہو
میں ہوں اور منزل دشوار گذار

اے ترے لطف کی دنیا ہو کی
اس طرف بھی نگہ لطف شعار

کوئی انجام کا کھٹکا نہ رہا
اے زہے شغل ہجوم افکار

وضع آزاد نرالی دیکھی
ہاتھ میں سبحہ گلے میں زنار

تو کہ ہر وقت غرق جلوۂ ناز
میں کہ دن رات سجدہ ہائے نیاز

بارک اللہ دلربا انداز
آنکھ میں سحر بات میں اعجاز

میری امید یاس کی تمہید
میری تسکین درد کا پرداز

میرے حصے کا اضطراب ازل
میرے قصے کا درد سے آغاز

تیرے گھر کے طواف میرا حج
تیرے در کے سجود میری نماز

تیری منزل بلند تر منزل
میری پرواز پست تر پرواز

وہ کمال کرم وہ غایت قرب
وہ وصال بہم وہ راز و نیاز

طاقت ضبط راز۔ سلب نہ کر
جو مرا راز خود وہ تیرا راز

تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں
دل کی آواز غیب کی آواز

شکرِ احسانِ دوست، دل بخشا — اور وہ دل کہ درد سے ممتاز
سرمدی زندگی عطا کردی — اے غمِ دوست تیری عمر دراز
بندہ پرور اب آپ کا آزادؔ
خود ہی بندہ ہے خود ہی بندہ نواز

وہ شیدائے اصنام ہے اور بس — یہ عہدِ در و بام ہے اور بس
کل آفاق اب تک بایں عقل و رائے — گرفتارِ اوہام ہے اور بس
وجودِ وفا کی تلاشیں عبث — فقط نام ہی نام ہے اور بس
نہ اذکارِ دنیا نہ افکارِ دیں — حدیثِ مے و جام ہے اور بس
وہی ہم ہیں اور شغلِ بیکارِ عشق — وہی فرصتِ نام ہے اور بس
زمانہ ہے اور کوششِ جد وجہد — مگر ہم ہیں آرام ہے اور بس
نہ آزادؔ مے کش نہ شاہد پرست
وہ کم بخت بدنام ہے اور بس

تو ہے اور فکرِ جفا ہے اور بس — میں ہوں اور شکرِ خدا ہے اور بس
بندہ پرور اس طرف بھی اِک نظر — اِک نظر کی التجا ہے اور بس
یا تو دل تھا اور لاکھوں مدعا — یا دلِ بے مدعا ہے اور بس
کوئی بارِ عشق اٹھا سکتا بھی ہو — ادّعا ہے ادّعا ہے اور بس
عادتِ چون و چرا کے دن گئے — اب سرِ صبر و رضا ہے اور بس
کل تک اصرارِ خطا تھا لیکن آج — میں ہوں اقبالِ خطا ہے اور بس
ہو چکے دنیا کے شکوے ہو چکے — اب فقط تجھ سے گلا ہے اور بس

ناخدا بھی ناخدائی کر چکے — اب خدا کا آسرا ہے اور بس
دوستو ناصح مرا دشمن نہیں — اک ذرا سر پھر گیا ہے اور بس

شکوۂ جور و جفا سے کیا غرض — کیا غرض اِک بیوفا سے کیا غرض
اب کوئی امید ہی دل میں نہیں — زحمتِ بیم و رجا سے کیا غرض
دل جہاں بہلے وہی گلزار ہے — باغ و گلشن کی فضا سے کیا غرض
مجھ کو اپنی زندگی دو بھر نہیں — التفات جاں فزا سے کیا غرض
آپ کے ارمان بھی تھوڑے نہیں — جستجوئے ماسوا سے کیا غرض
آپ کی حسرت بھی ناکافی نہیں — خواہش ہر دوسرا سے کیا غرض
اب سراپا مدعا ہوں اب مجھے — عرض حال مدعا سے کیا غرض
آپ تکمیلِ ستم فرمائیے — آپ کو خوف خدا سے کیا غرض
جن کو توفیق مے و معشوق ہے — ان کو ضبط اتقا سے کیا غرض

حضرت آزاد ہم اک رند ہیں
پارسایانہ ریا سے کیا غرض

تنقید و تبصرہ

پیلی پاس اور میلی ساند | ڈراما مصنفہ مارس میٹرلنک، مترجمہ جناب تمنائی صاحب، مقدمہ از پروفیسر شرف عالم آرزو جلیلی صاحب، ناشر پنجاب بک ڈپو تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۶۸ صفحے۔ قیمت ۱۲ر

مارس میٹرلنک یورپ کے انوکھے ڈراما نویسوں، ادیبوں اور فلسفیوں میں مشہور ہے۔ انسان کی لاعلمی، بے بسی، موت کے بعد کی انجان دنیا کے خیالی نقشے، یہ اس کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ زبان میں اسے خاص ملکہ ہے۔ بلکہ بیشتر فرانسیسی ادیبوں کی طرح اس کا اصل سرمایہ زبان ہی ہے۔ وہ حقیقت نگاری کیا دنیا اور زندگی اور انسانوں کی اس شکل کو جو ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں نظر انداز کر کے تمام تصورات اور جذبات کو تمثیل کے کڑھاؤ میں گھوٹتا ہے اور زبان کے قوام میں ڈال کر نئے نئے مزے کی مٹھائیاں تیار کرتا ہے جن میں سے سب کی آخر لیف یہ ہے کہ وہ معدے تک پہنچنے نہیں پاتیں۔ کبھی منہ ہی میں گھل کر ہوا بن جاتی ہیں۔ کبھی دماغ میں ہلکا سا سرور پیدا کر کے رہ جاتی ہیں۔

پروفیسر آرزو جلیلی صاحب نے مقدمے میں میٹرلنک کی سوانح حیات اور اس کی ادبی خصوصیات بیان کی ہیں اور خاصی وضاحت سے۔ ترجمہ بھی خاصا رواں ہے۔ لیکن ہم اصل سے مقابلہ نہیں کر سکے۔ اس لئے اسکی صحت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ چھپائی اچھی نہیں ہے۔ اور نام صحیح پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ شروع میں منیجر صاحب پنجاب بک ڈپو نے فاضل مترجم، اور مقدمہ نویس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور اشاعت کے آداب میں اس نئی رسم کا اضافہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

م م

نصاب شہریت | مصنفہ پروفیسر عطاء اللہ، ایم اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ناشر قومی کتب خانہ لاہور، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۲۰۶ صفحے۔

یہ کتاب مڈل اسکولوں کے طلبار کے لئے تیار کی گئی ہو اور اس میں پنجاب کے حالات خاص طور پر مد نظر رکھے گئے ہیں۔ نظام حکومت کا کوئی بڑا شعبہ توجہ سے محروم نہیں رہا ہو اور آخر میں مجلس اقوام یا لیگ آف نیشنز کا بھی ذکر خیر ہے۔ اگر خیال نہیں رکھا گیا ہے تو طالب علم کی طبیعت اور دلچسپی کا، اور اس حقیقت کا کہ ضروری معلومات کے ساتھ طالب علم کے دل میں ایسے حوصلے پیدا ہونا چاہئیں جو اسے اچھا اور سچا شہری بنائیں۔ اس ایک کتاب کے مضامین کو چار کتابوں میں تقسیم کر کے انھیں اس طرح بیان کرنا چاہئے تھا کہ طالب علم کا شوق بڑھے اور علم سے اسے لگاؤ ہو جائے۔ لیکن دنیا کی مصلحتوں کو کوئی کیا کرے۔

مم

فن انشا پردازی | ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر ادبیات اردو، جامعہ عثمانیہ، ناشر کا نام و پتہ درج نہیں۔ تقطیع ''۱ × ''۷، حجم ۵۱۱ صفحے مع اشاریہ

یہ اس قسم کی کتاب ہے جیسے کہ انگریزی میں کوئلر کاؤچ کی تصنیف لکھنے کا فن (THE ART OF WRITING QUILLER COUCH) اور اتنی ہی مفید اور دلچسپ بھی ہے۔ اس میں نومشق ادیبوں کو جو ہدایتیں دی گئی ہیں وہ بیشتر صحیح اور اچھی ہیں اور اس وقت جو بد مذاقی پیدا ہوگئی ہے اس میں اعتراض کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن ایک بڑی کسر یہ رہ گئی ہے کہ مختلف اچھے اور برے طرز کی عبارتوں، موزوں اور ناموزوں تشبیہوں اور استعاروں کے نمونے نہیں دئے گئے ہیں۔ انشار پرداز کو اپنی زبان سے محبت ہونا ضروری ہے اور یہ محبت زبان کے اچھے نمونے ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عنوانات کے مسئلے پر اس قدر تفصیل سے بحث کرنا جیسے کہ فاضل مصنف نے کیا ہے۔ چنداں کار آمد نہیں۔ مضمون سمجھ میں آجائے تو عنوان خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ اور مضمون سمجھ میں آنے کے لئے موضوعوں اور عنوانوں کی فہرست نہیں بلکہ مطالعہ اور مشاہدے کا شوق درکار ہے اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ انشا پردازی کے علم کو افسانہ نویسی کے فن سے براہ راست کوئی مطلب نہیں۔ افسانہ نویس کی ہدایت نقادوں کا کام ہے معلوم نہیں فاضل مصنف نے شاعری کو بحث سے کیوں خارج کر دیا ہے۔ ہم کو تو صرف نثر

لکھنے والوں پر یہ جتانا ہے کہ انھیں الفاظ اور محاوروں اور زبان کی روانی پر اتنی ہی توجہ کرنا چاہئے جتنی کہ شاعر کرتے ہیں ۔ دوسری زبانوں میں بھی نظم کی ادبی خوبیاں نثر کے لئے نمونہ مانی جاتی ہیں لیکن فاضل مصنف کے مدنظر اصولی بحث نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس وقت کی ضرورت، اور اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کتاب بہت مناسب ہے اور خاصی مکمل بھی ۔

م م

ہندستانی لسانیات | ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے، پی ایچ، ڈی پروفیسر ادبیات اردو ۔ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، تقطیع ۲۲×۱۸/۸ حجم ۱۹۰ صفحے مع اشاریہ ۔ ناشر کا نام درج نہیں ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، کتابستان، سٹی روڈ، الہ آباد، مکتبہ جامعہ نئی دلی ۔

اردو زبان کی تاریخ پر کام کیا جا چکا ہے ۔ لیکن یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو اور ہندستانی پر علم لسانیات کے اصولوں کے مطابق بحث کی گئی ہے ۔ فاضل مصنف نے ابتدا علم لسانیات سے کی ہے ۔ اور زبان کی ماہیت، آغاز اور تشکیل کے طریقے سمجھا کر اور دنیا کی زبانوں کی تقسیم پر ایک نظر ڈال کر ہندستان کی زبانوں کی تقسیم واضح کی ہے ۔ کتاب کے دوسرے حصے میں صرف ہندستان پر بحث کی گئی ہے اور اس بحث میں لسانیات، تاریخ، روشن خیالی اور وسعت نظر سب نے برابر کا حصہ لیا ہے ۔

یہ کتاب ضروری معلومات کا ایک خزانہ ہے اور وہ اردو بولنے والے بہت ہی غریب رہ جائیں گے جو اس سرمائے سے فائدہ نہ اٹھائیں ۔

م م

بچہ کا دل اور دوسرے ڈرامے | از سعدی مچھلی شہری، ناشر بچوں کا کتب خانہ، کلائیو روڈ، نئی دہلی ۔ حجم ۱۷۶ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶

یہ سات ڈراموں کا مجموعہ ہے، اور خواجہ حسن نظامی صاحب، شوکت تھانوی صاحب فرید جعفری صاحب نے اس کا مقدمہ، دیباچہ اور تعارف لکھا ہے، ڈرامے سب بالکل سہل ہیں ۔

نوجوان مصنف کو اگر واقعی ادبی ذوق ہے تو انھیں اچھے ڈراموں کا مطالعہ کرنا اور لکھنے کی مشق کرنا چاہیئے۔

ضرب کلیم بال جبریل کے بعد ڈاکٹر اقبال کے تازہ اردو کلام کا مجموعہ ضرب کلیم کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ کس قدر دلکش اور روح پرور ہے صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان اشعار کی تعریف کرنا یا دوسرے شعراء کے کلام کی طرح اُن کی داد دینا، یا اپنے خیال کے ساتھ ان کی مطابقت دکھانا، یا بے کیف توضیحات کر کے اُن کی لطافت کو کھونا نہ صرف کور ذوقی ہے بلکہ شریعت ادب میں گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حیاتِ ملیہ اسلامیہ کے ان اہم مسائل کے متعلق جن میں مفکرین غلطاں و پیچاں ہیں۔ اور جو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے سے بھی حل نہیں ہوتے دو دو اور چار چار شعروں میں جچی اور تلی رائیں، روشن تعلیمات، اور بے پردہ حقائق ہیں جو اہل بصیرت کی نگاہوں میں موتی کی طرح بڑی چمک رہی ہیں۔ ان کی کیفیت بقول مرزا بیدل یہ ہے ؎

نزاکتہاست در تصویر مینا خانۂ حیرت ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

ان کو تو بس دیکھئے، پڑھئے، سوچئے اور نہاں خانۂ دل کے کسی گوشہ میں محفوظ رکھ لیجئے۔

لیکن چونکہ میرا طریقۂ فکر جداگانہ ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بعض باتوں سے کلی طور پر میں متفق نہیں ہو سکا۔ انھیں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مہدی کے عنوان سے وہ فرماتے ہیں

مجذوب فرنگی نے باندازِ فرنگی ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

اس میں غالباً روئے سخن میری طرف ہے۔ کیونکہ مہدی کے عقیدے کے قرآنی ہونے سے سب سے پہلے میں نے علی الاعلان انکار کیا ہے، اس لئے گذارش کرتا ہوں کہ تخیل سے مراد اگر عقیدہ ہے تو ہمارے پاس اس کا ایک معیار ہے یعنی کلام اللہ۔ اس میں کہیں مہدی بھیجنے کا

وعدہ نہیں کیا گیا ہے لہذا اگر ہم یہ عقیدہ رکھا بھی کریں تو اللہ کے اوپر کیا ذمہ داری ہے کہ وہ مہدی کو بھیجے۔ اور اگر محض تخیل مقصود ہے تو مایوس قوموں کے تخیلات بھی اُن کے لئے عذاب ہی ہوا کرتے ہیں صدیوں پر صدیاں گذرتی جا رہی ہیں اور امت ہے کہ اس امید پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے کہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کبھی کبھی جب مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے تو گھبرا کے کہنے لگتی ہے۔

یہ انتظارِ مہدی و عیسے بھی چھوڑ دے

پھر مجبور ہو کر اس ٹوٹی ہوئی امید کا سہارا لیتی ہے اور پکارتی ہے۔

اے سوار اشہبِ دوران بیا

غالباً اسی تخیل کا اثر ہے کہ ملت کے اُن سربرآوردہ افراد کو بھی جو اس وقت تعمیر قوت میں سرگرم ہیں ڈاکٹر صاحب اپنے بلند معیار کے مطابق نہیں پاتے اور کہتے ہیں

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی   کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے کہا ہے۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے   غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

یہ خالص شاعرانہ استدلال ہے۔ غالب کی طرح جس نے کہا ہے۔

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد   مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

جس طرح مگس کی قے کہدینے سے شہد کی لطافت اور شیرینی میں فرق نہیں آسکتا اسی طرح محکومیت کی نسبت سے الہام بھی اگر حق ہو۔ غارت گر اقوام نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت عیسےٰ علیہ السلام رومی سلطنت کے محکوم تھے جن کی نسبت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا

نبیِ عفت و غمخواری و کم آزاری

بلکہ اکثر انبیاء کرام علیہم السلام محکوم اقوام ہی میں مبعوث کئے گئے جس کے خاص اسباب وعلل تھے جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

دراصل نبوت کی صداقت کا معیار حاکمیت یا محکومیت پر نہیں ہے بلکہ خود الہام کی نوعیت پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی مجموعے میں ایک دوسرے شعر میں اس کسوٹی پر بھی اس کو کسا ہے۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

نسخ جہاد اور کفر کی غلامی کا دوامی پٹہ کبھی سچی نبوت کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

پنجابی مسلمانوں کی مذہبی ذہنیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کرے کہیں منزل تو گذرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

یہ حقیقت اگرچہ قابل انکار ہے مگر اسی ذم سے پنجابی مسلمان کی مدح کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے جو یقیناً ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر بھی رہا ہوگا۔ مگر انھوں نے اس تنبیہہ کے موقع پر اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن میں تو ظاہر کئے بغیر نہیں رہوں گا۔ یعنی

لیکن اُسے مل جائے جو اچھا کوئی رہبر
بگڑا ہوا مدت کا سنورتا ہے بہت جلد

نظریہ حیات کے متعلق تین اقوال لکھے ہیں۔

سپنوزا

نظر حیات پہ رکھتا ہے مرد دانشمند
حیات کیا ہے حضور و سرور و نور وجود

فلاطون

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانشمند
حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود

اقبال

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

فلسفۂ خودی پر پہنچ کر رک گئے۔ لیکن تصوف (کہ برائے شعر گفتن خوب است) ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور صوفی کی زبان سے کہتا ہے۔

حیات و موت و خودی جملہ ہیں عوارضِ نفس　　حقیقت ایک ہے جو خود ہے شاہد و مشہود

(اکبر)

بلاغ الحق | مصنفہ شمس العلما حافظ سید محب الحق صاحب۔ کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ، تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت فی نسخہ ۱۲؎۔

مصنف سے پر "فضا" پٹنہ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

شمس العلما، حافظ محب الحق صاحب کا سلسلہ حقانیہ چار جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی تین جلدیں دعوۃ الحق، منہاج الحق، اور شرعۃ الحق مطبوع ہو کر شائع ہو چکیں اور عام طور پر اہل نظر نے اُن کو پسند کیا اور اچھی تصنیف قرار دیا۔ لیکن یہ چوتھا حصہ جو ان سب کا نچوڑ اور بیان کی خوبی اور دلائل کے متانت کے باعث نہایت پر مغز ہے اب تک نہیں چھپا تھا۔ یہ پہلی بار شہزادہ ناصر الدین محمد اسد الرحمٰن قدسی کے حکم سے عزیزی پریس آگرہ میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اس میں عقائد اسلامی، عبادات معاملات، اور اخلاق وغیرہ کے متعلق قرآن کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ جو لوگ قرآن سے ذوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب نہ صرف مفید بلکہ شمع راہ ہے۔

جامع النحو | مولفہ حکیم محمد احمد صاحب۔ معلم مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر اعظم گڈھ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶ قیمت فی نسخہ ۱۲؎

مصنف سے مل سکتی ہے۔

حکیم محمد احمد صاحب زمانے سے صرف و نحو کی تعلیم دیتے دیتے اس کے ماہر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے تعلیمی تجربے کے بعد طلباء کی آسانی کے لئے یہ کتاب لکھی۔ میرا خیال ہے کہ جس سہولت کے ساتھ اس کتاب سے نحو عربی کے مسائل ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ اس آسانی

کے ساتھ کسی درسی کتاب سے نہیں ہو سکتے۔ اس میں طلبا کی ضروریات پیش نظر رکھی گئی ہیں اور خوش اسلوبی کے ساتھ مسائل ترتیب دئے گئے ہیں۔ جو لوگ عربی سیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کو نحو کے لئے یہ کتاب ضرور منگانی چاہئے۔

خانۂ کعبہ کے موجودہ محافظ کی سرگذشت

یعنی

سوانح حیات سلطان ابنِ سعود

جس میں پہلی سعودی حکومت کے محیر العقول کارنامے عرب میں ترکی اور مصری حکومتوں کے الجھے ہوئے حالات خاندان ابنِ رشید کی المناک سرگذشت۔ تحریک وہابیت کی تبلیغ و اشاعت۔ وہابیوں کا جزر و مد۔ تحریک اخوان کی بنا، و تاسیس سلطان ابنِ سعود کے عہد بعہد کے حالات و کوائف اور درخشندہ فتوحات۔ فتح حجاز کے مفصل واقعات۔ دستور ملکی کا قیام و نفاذ۔ انتظاماتِ ملکی کی اصلاحات۔ علوم و فنون کی ترویج و تشویق۔ امنیت و مدنیت کے لئے گراں قدر مساعی۔ نجدی معیشت و معاشرت۔ مغربی حکومتوں سے تعلقات اور متعدد معاہدات وغیرہ وغیرہ پوری شرح بسط سے درج ہیں۔

کتاب مستند معلومات کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔ طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ نہایت اعلیٰ۔ ضخامت ۲۶×۲۰/۸ ۲۷۶ صفحے۔ قیمت صرف دو روپے

ملنے کا پتہ

مینیجر سلسلۂ "مشاہیر اسلام" نمبر ۱۵ جالندھر شہر (پنجاب)

ثانوی تعلیم کی اصلاح و تنظیم

جیسا کہ تمام حضرات کو معلوم ہوگا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس جوبلی اس سال علی گڑھ میں ایسٹر کی تعطیلات میں منعقد ہو رہا ہے۔ تعلیمی مباحث کی شمولت کے لئے اور تقسیم کار کے اصول پر اجلاس کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کے لئے ایک علیحدہ سکریٹری اور صدر کا انتخاب ہوا ہے۔ انھیں شعبوں میں ایک شعبہ ثانوی تعلیم کا ہے۔ جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) فرمائیں گے۔

چونکہ ثانوی تعلیم کا مسئلہ ملک کی ذہنی اور علمی ترقی کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کے بہت سے مسائل غور طلب ہیں۔ جن کا کوئی مناسب اور تشفی بخش حل اب تک پیش نہیں ہو سکا اس لئے میں ملک کے تمام ارباب فکر اور ماہرین تعلیم سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس شعبے کے اجلاس میں شامل ہو کر اس کے مباحث میں شریک ہوں اور جو حضرات ثانوی تعلیم کے کسی مسئلہ پر اپنا مقالہ پڑھنا چاہیں وہ مجھے اپنے اس ارادے سے مطلع فرمائیں اور مقالہ کا عنوان لکھ بھیجیں۔ فروری کے اخیر تک مقالہ کی ایک نقل میرے پاس آجانی چاہئے تاکہ اس کو پروگرام میں شامل کیا جائے۔ شعبہ کانفرنس کا عام عنوان "ثانوی تعلیم کی اصلاح اور تنظیم" ہوگا اور مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مسئلے کے کسی خاص پہلو سے بحث کریں۔ مقالے مختصر ہونے چاہئیں اگر زیادہ طویل ہوں تو کانفرنس میں پڑھنے کے لئے ان کی ایک تلخیص تیار کر لینی چاہئے۔ شعبہ کا مفصل پروگرام بعد میں شائع کیا جائے گا۔

غلام السیدین

سکریٹری شعبہ تعلیم ثانوی

پرنسپل۔ ٹریننگ کالج۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بسم اللہ

جامعہ

زیرادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم، اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۸ | اگست ۳۷ سنہ ع | نمبر ۲

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپے (صہ) فی پرچہ آٹھ آنے (۸/)

(پرنٹر و پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس۔ دہلی)

شمالی ہند کے دیہاتی شعرا میں جدید انقلابی رجحانات

"میں نے یہ مضمون ۱۱، ۱۵ ر نومبر ۱۹۳۶ء کو ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی ہندی اردو کانفرنس میں جو الہ آباد میں منعقد ہوئی تھی، پڑھا تھا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری سید سجاد ظہیر صاحب نے مجھ سے اسی وقت لے لیا تھا۔ میرے پاس اس مضمون کی کوئی نقل تک نہ تھی جو میں کسی رسالے میں خود طبع کرا دیتا لیکن جب مدت تک ظہیر صاحب نے کہیں اُسے چھپنے کے لئے نہ بھیجا، تب میں نے دریافت کیا کہ آخر میرا مضمون کہاں ہے تو معلوم ہوا کہ ان سے اسی وقت ایڈیٹر صاحب رسالۂ تسنیم پٹنہ اپنے رسالے کے لئے لے گئے تھے، مگر اُن کا رسالہ بند ہو گیا۔ اور یہ مضمون اُن کے دفتر میں رکھا رہا۔ آخر بہت سعی و محنت کے بعد یہ واپس ملا ہے اور اس نوٹ کے اضافے کے ساتھ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔" مُطّلبی

دیہاتی شعراء کا ذکر کرنے سے پہلے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دیہات کی تمدنی اور اقتصادی حالت کے متعلق موٹی موٹی باتیں بتا دی جائیں۔

ہم دیہاتی آبادی کو حسب ذیل حصص میں منقسم کر سکتے ہیں:۔

زمیندار، کسان زمیندار، کسان، مزدور کسان، ساہوکار، زمیندار ساہوکار اور کمین

زمیندار وہ شخص یا اشخاص، جو مالکان اراضی ہیں اور کسانوں سے لگان وصول کرکے ایک حصہ اس کا حکومت کو بطور مال گذاری ادا کرتے ہیں، اور باقی اپنے صرف میں لاتے ہیں۔ کسانوں کے مقابلے میں اُن کی مالی حیثیت بہت اچھی ہوتی ہے۔ اپنے بیشتر کام وہ بیگار یا بہت سستی مزدوری پر لوگوں سے کراتے ہیں۔ مزدوری اکثر ششماہی غلہ کی صورت میں فصل کی پیداوار آنے کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ لیکن مزدور چونکہ قلاش ہوتا ہے اس لئے اس کو وقتاً فوقتاً جو غلہ بطور پیشگی کھانے کے لئے

دیا جاتا ہے، اس پر سود لگایا جاتا ہے۔ اور ششماہی حساب ہو کر معلوم ہوتا ہے، کہ مزدور مقروض ہے
یہی حالت ایک قسم کی دائمی غلامی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کسان زمیندار، وہ چھوٹی چھوٹی زمینوں
کے مالک جو اپنے ہاتھ سے زمین کاشت کرتے ہیں ـــــ کسان یا کاشتکار، جو ایک مقررہ لگانِ
زمین، زمیندار کو ادا کرتا ہے۔ اور نقصاناتِ قحط سالی، ژالہ باری، کمی پیداوار، خود برداشت کرتا
ہے۔ اور زمین پر اپنی محنت اور قرض سے حاصل کردہ سرمایہ لگا کر فصل حاصل کرتا ہے۔ روپیہ، بیج
کپڑا وغیرہ تمام ضروریات مہاجن یا کسی دوسرے ساہوکار سے نہایت گراں سود پر قرض لیتا ہے
فصل کے ختم ہونے پر حساب ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ سب پیداوار ساہوکار کے حوالے کر دی
جاتی ہے۔ اور قرضہ بدستور باقی رہتا ہے۔ اور پھر دوسرے سال اس قرضے میں مزید قرضے کا اضافہ
کرتے رہتے ہیں۔ خریدتے وقت بازار سے گراں نرخ پر اسے غلہ ملتا ہے۔ اور جب بیچتا ہے تو بازار
سے ارزاں نرخ پر پیداوار ساہوکار کو دیتا ہے ـــــ مزدور کسان، وہ مزدور جس کے پاس
نہ بیل ہوتے ہیں، اور نہ جس کی اس قدر مالی ساکھ ہوتی ہے کہ زمیندار اس کو براہِ راست زمین
کاشت کرنے کے لئے دے، اور ساہوکار، بیج وغیرہ ضروریات، اس لئے وہ کسی کسان یا زمیندار
کے ہاں محنت کا شریک ہو جاتا ہے۔ دو بیل اس کے سپرد کئے جاتے ہیں بیلوں کے لئے چارہ جنگل
سے لانا، اور کاٹ کر کھلانا، کھولنا، باندھنا۔ ہل جوتنا، بیج بونا۔ اور فصل اُٹھانا، یہ سب کام
اس کو سال بھر تک انجام دینے ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر پیداوار کا چوتھا حصہ اور بعض جگہ
پانچواں اور چھٹا حصہ بعد منہائی اس حصے کی لگان کے اُسے دیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ کسی زمیندار
کا شریک ہوتا ہے اس لئے اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو کسان مزدوروں کا ہوتا ہے۔ جن کا ذکر
زمیندار کے ذکر میں کیا جا چکا ہے ـــــ ساہوکار، مہاجن یا ساہ۔ وہ سرمایہ دار
جو زمیندار کسانوں۔ اور کسانوں کو تمام اجناس وغیرہ قرض دیتا ہے۔ جس پر وہ شرح سود
عام طور چالیس روپیہ سینکڑہ تک لیتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ چند سال میں زمیندار کسان
اور کسان کی ہر چیز ساہوکار کی ہو جاتی ہے۔ اور وہ اُسے اپنا ان داتا سمجھنے لگتے ہیں۔

ساہوکار زمیندار — اگر زمیندار ناسمجھ اور فضول خرچ ہے تو بہت جلد زمینداری ساہوکار کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ اور جب ساہوکار اور زمیندار ایک ہو جاتے ہیں، تو بہت دردناک مصائب سے کسانوں کو آشنا ہونا پڑتا ہے جو سابقہ زمیندار کے ظلم و ستم کو بھلا دیتے ہیں۔ لیکن یہ حالت پنجاب میں دوسری شکل اختیار کرتی ہے۔ دیہات کے متمول ساہوکار کسانوں کا خون پی کر آہستہ آہستہ شہروں اور منڈیوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے بااثر زراعت پیشہ اقوام کے زمینداروں اور کسانوں کو قرض روپیہ دیتے ہیں کہ وہ دیہات میں مزدوری مثلاً کاشتکاروں اور چھوٹے زمینداروں کو زیادہ شرح سود سے قرض دیں۔ اور اس طرح ایک نئی قسم کے زمیندار ساہوکار پیدا ہو جاتے ہیں......

کمین، حجام، بہشتی، کہار، کھاتی، لوہار، چمار اور بھنگی جو اپنے اپنے پیشے بہت حقیر معاوضوں پر انجام دیتے ہیں، اور گاؤں کی مشین کو چلاتے ہیں، اُن کی حالت اور کسانوں کی مالی حالت میں سوائے کمین اور شریف کے امتیاز کے کوئی فرق نہیں ہوتا۔

حکومت کے کارندوں کی ایک جماعت اور اُن کی ذریات بھی گاؤں کی زندگی کا ایک جزو ہے۔ جن میں پٹواری، نمبردار، چوکیدار، مکھیا شامل ہیں۔ اور پنجاب کے دیہات میں بجائے مکھیا کے سفید پوش اور ذیل دار۔ ان کے علاوہ بعض پیشہ ور قزاق جو وکیلوں، پولیس اور تحصیل کے عمال سے تعلق رکھتے ہیں اور خود ساختہ مقدم یا چودھری اور ڈھونڈا کہلاتے ہیں، اور اُن کا کام زیادہ تر رشوت کے سودے طے کرنا اور حصہ بٹانا ہوتا ہے۔

ہمارے دیہات کی زندگی سادگی، شرافت، غربت و فلاکت کا ایک مرقع ہے۔ جس کو ہر نیا آدمی ہزار پردے ڈالنے پر بھی چند دن میں سمجھ لیتا ہے اُن کے رسم و رواج آئین و ضوابط ایک ایسے مشترک کنبے کے منہدم آثار معلوم ہوتے ہیں جس کو گذشتہ زمانوں کے حالات نے آہستہ آہستہ منتشر کیا ہے اور یقیناً کبھی اس کے افراد ایک جان اور ہزاروں قالب بن کر رہتے ہوں گے۔

ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ فلاں مذہب کے پرستار ہیں۔ بہت دشوار ہے۔ کیونکہ

وہ توہم پرست ہیں۔ اکثر مذہبی عقیدوں کے متعلق وہ یہ اندیشہ رکھتے ہیں۔ کہ اگر وہ صحیح ہوئے تو نقصان نہ پہنچ جائے، اس لئے اِن کو مان لو۔ مبادا انکار کی صورت میں قحط پڑ جائے یا پیداوار نہ ہو یا مویشیوں اور آدمیوں میں بیماری پھیل جائے۔ ایشور یا خدا، مذہبی اوتار، پیر پیغمبر اور دیوتاؤں کو وہ محض مذکورہ وجہ کے سبب تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر جب بارش نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے تو وہ اپنی سیدھی سادھی زبان میں بہت سادگی سے ایشور کو فحش گالیاں دیتے نظر آتے ہیں یا خدا کے ظلم پر بہت ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ گو شروع شروع میں وہ اُسے رضامند رکھنے کے لئے گیہوں کے دلیے، چاول کی گنجیاں بھی اس کے نام پر دان پن اور خیرات کرنے کے لئے پکا کر خود کھاتے اور اوروں کو کھلاتے ہیں۔

تمام ہندو دیہات میں جہاں ایک مسلمان کا بھی گھر نہیں ہوتا، پیروں کے فرضی مزار ملتے ہیں۔ جن پر چڑھاوے چڑھائے جاتے اور منتیں مانی جاتی ہیں اور فرضی پیر صاحب کی کراماتیں بیان کی جاتی ہیں۔ مسلمان دیہات میں ماتاؤں کے مٹھ اور کھیڑا دیوٹ نظر آتے ہیں۔ عورتیں جن پر کھیل تباشے چڑھاتی ہیں، کہ کہیں بچوں کے سیتلا نہ نکل آئے یا کھیڑے کا دیوتا ناراض ہو کر کوئی اور مصیبت نازل نہ کر دے۔ غرض مذہبی اعتقادات محض اس شک و شبہ کی بنیاد تک ہیں کہ کہیں وہ صحیح نہ ہوں۔ پنڈت اور ملا کا گاؤں میں ضرور اقتدار ہوتا ہے۔ لیکن اس کا سبب مذہبی عقیدت نہیں ہے بلکہ شادی بیاہ، کریا کرم، تجہیز و تکفین کے مراسم کی ادائیگی ان کے ذریعے ہوتی ہے۔ نیز تعویذ، گنڈوں، ٹونے، ٹوٹکوں سے وہ گاؤں کے اندر اپنا اثر رکھتے ہیں۔ پنجاب کے بعض اضلاع میں پیروں کا بہت بڑا اثر ہے۔ لیکن اس میں بھی مذہبی عقیدت کے بجائے یہ حقیقت کارفرما ہے کہ وہ سب بہت بڑے زمیندار اور جاگیردار ہیں اور ان کے مظالم کی دھاک اور سخاوت کی جھوٹی شہرتیں ان کے اقتدار کا باعث ہیں نیز یہ شبہ بھی ؎

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

اُن کو پچھاڑ رہا ہے جو کسانوں کی مذہبی عقیدت کا اصل اصول ہے۔

مذہبی تہوار، تیرتھ جاترا اور عرسوں وغیرہ کی شرکت: بیشتر موسمی میلوں کی شرکت کے مرادف ہے۔ میلے دیہات کی جان ہیں۔ عورتوں کے گاتے ہوئے جھرمٹ کے جھرمٹ، اور الگوجے بجاتے ہوئے بانکے نوجوانوں کی ٹولیوں کے گشت اور پھر کسی جھرمٹ اور ٹولی کی مٹ بھیڑ یہ ایسی دلچسپیاں ہیں کہ جو ہر موسم کی تبدیلی اور بالخصوص بہار کی جان ہیں۔ اور وہ مصائب ہیں جن میں دیہات کی پرجا ہر وقت مبتلا رہتی ہے۔ میلے، ٹھیلوں، چوپئی کے مقابلوں، ہلیاریوں کی گتوں اور ہولی کے کھیلوں کے ذریعے ہی بھلائے جاتے ہیں۔

گنگا، جمنا، نربدا وغیرہ بڑے بڑے دریاؤں کا ماتا۔ مائی اور دیوی سمجھا جانا بھی اُسی نقصان کے خوف اور نفع کے توقع کے سبب ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ کیونکہ دریا کھیتوں کو اپنی طغیانی سے زرخیز بھی کرتے ہیں اور بستیوں کو دریا برد بھی کر دیتے ہیں۔

دیہات میں بہن یا بیٹی کی طرف بدنگاہی سے دیکھنا قتل ہو جانے کے مترادف ہے۔ گاؤں کے چمار اور بھنگی کی بیٹی بھی ہر شخص کی بہن یا بیٹی سمجھی جاتی ہے۔ اور بہو سارے گاؤں کی بہو کہلاتی ہے اس کا بھگا دیا جانا یا کسی قسم کی بد اطواری کا اس سے یا اس کے متعلق کسی سے سرزد ہونا سارے گاؤں کی بدنامی اور رسوائی تصور کی جاتی ہے۔ گویا ہر فرد کے ناموس کی حفاظت سارے گاؤں کے ناموس کی حفاظت ہے۔

دیہات کی اقتصادی حالت ایک دردناک داستان غم ہے۔ دو فیصدی آدمی مشکل سے ایسے ملتے ہیں جو پیٹ بھر کر کھانا کھالیں اور گرمی اور جاڑوں میں کافی لباس پہنتے ہوں باقی آبادی اکثر فاقوں سے دوچار رہتی ہے۔ جاڑوں کی راتیں آگ جلا جلا کر گذاری جاتی ہیں۔ اور گرمیاں لو سیدہ کپڑوں سے ستر پوشی کر کے۔ وہ برسات میں ملیریا کا شکار ہوتے ہیں۔ ملیریا ختم نہیں ہوتے پاتا کہ سردی نمونیہ اپنے ساتھ لاتی ہے اور وہ موت کا پیغام ہوتا ہے۔ زراعت کے لئے مسلسل محنت اور مشقت، ان کا مشغلہ زندگی ہے۔ جس سے ہر سال قرضے کی رقم بھاری ہوتی چلی جاتی ہے۔ لیکن وہ سوائے اس کے کچھ اور اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ گھر، در، مویشی زمین سب قرض کی

نذر نہ ہوجائیں ۔ اب وہ صنعتی مرکزوں، شہروں کا مزدوری کے لئے رُخ کرتے ہیں ۔ جہاں گو اسی قدر دردناک مصائب سے اُن کو واسطہ پڑتا ہے ۔ مگر وہ مجبور ہیں ۔ گاؤں میں ان کے لئے صرف ادائے قرض میں گرفتاریوں کے خطرے ہیں ۔ زندگی گذارنے کی کوئی صورت وہاں نظر نہیں آتی ، بہرنوع وہ عالی شان و دولت مند شہر کے گلی کوچوں یا خیراتی شفاخانوں میں ایک دن مردہ پائے جاتے ہیں ۔ بہت ہیں جنھیں جیل کی زندگی ہی میں اپنے گذارے کی صورت نظر آتی ہے بھوک سے تنگ ہوکر وہ حقیر چوریاں کرتے ہیں ۔ جو آمدنی اس سے ہوتی ہے ، وہ بچنے کے لئے رشوتوں اور مقدمات کی پیروی میں چلی جاتی ہے اور وہ خود جیل جاکر اطمینان کا سانس لیتے ہیں ۔

دیہات کے باشندے کہنا چاہیئے کہ ایک قلب مطمئن کے مالک ہیں ۔ بھوک کے مصائب کو مقدر کا قصور یا پچھلے جنم کی غلطیوں کی سزا سمجھ کر جو انھیں مذہبی ادارے صدیوں سے بتا رہے ہیں وہ خاموش ہوجاتے ہیں وہ ان کا کوئی چارہ نہ سوچنے کے عام طور پر عادی ہیں ۔ جب مذہبی ادارے ان کو محض تسلی دیتے ہیں کہ " اس جنم کے مصائب آیندہ جنم میں پھل دیں گے " یا اسلام میں صرف غریبوں کا حصہ ہے ۔ اور وہ جنت کے مالک ہوں گے تو یہ افیم ان کو بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتی ہے ۔ غرض ایک شدید جمود طاری ہے ۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ختم ہونے میں کتنی مدت صرف ہوگی ۔ اعلیٰ تعلیم جو روشن خیالی پیدا کرسکتی ہے وہ میسر ہی نہیں ہے اور جن کو معمولی نوشت و خواندگی ہے وہ عموماً چھوٹے سرمایہ داروں کی اولادیں ہیں ۔ جو سرکاری ملازمتوں کے آرزومند ہیں ۔ گرداور پٹواری سے لے کر تحصیل کے چپراسی تک کی ملازمت اگر مل جائے تو گویا بہت بڑی کامیابی انھیں ہوگئی ۔ سیاسی خیالات کی اشاعت جو دیہاتی آبادی کو بیدار کرسکتی ہے قطعاً وہاں نہیں ہونے دی جاتی ۔ سرکار کو تو غرض ہی کیا کہ وہ سیاسیات سے ان کو باخبر کرتی جہاں سے وہ سستے سے سستا سر بیچنے والا سپاہی فوج اور پولیس کے لئے بھرتی کرتی ہے لیکن اکثر ہمارے ملک کی خیرخواہی کا دم بھرنے والے ان سیاسیین نے بھی دیہات میں آزادی وطن کے خیالات کو داخل ہونے سے روکا ۔ جو بیشتر سرمایہ دار تھے ۔ اور ہیں ۔ اور جنھیں یہ اندیشہ تھا کہ دیہات کی

آبادی سرکار کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے قبل اُن سود خوار اور اُن کا خون پینے والے ساہوکاروں اور زمینداروں کے خلاف عدم ادائیگی قرض و لگان نہ کر بیٹھے جو ان کو صدیوں سے کھا رہے ہیں لیکن باوجود اس عام کوشش کے کہ دیہات کو سیاسی تحریک سے اُدھر اور بے خبر رکھا جائے وہ بے خبر نہیں رہے ۔ بازار ، ہاٹ تحصیل ، تھانے ، اور ضلع کی کچہریوں میں وہ آتے جاتے ہیں جو سنتے ہیں وہ آکر گاؤں میں سنایا جاتا ہے۔ چوپال اور چوک کے الاؤ پر یہ خبریں نہایت حیرت اور تعجب سے کہی اور سنی جاتی ہیں۔ اکثر اس پر تنقیدیں کی جاتی ہیں ۔ مذاق اڑائے جاتے ہیں رنج کئے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ گالیاں بھی دی جاتی ہیں۔ اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ باتیں گو اس طرح روز ہوتی اور ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ گو بہت تھوڑے ہی سہی، مگر اپنے اثرات ضرور چھوڑ جاتی ہیں۔ جن سے ماحول آہستہ آہستہ متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ دیہاتی شاعری بھی گو سیاسی اور خصوصاً انقلابی خیالات سے بہت کم متاثر ہوئی ہے۔ مگر پھر بھی خواہ بہت خفیف ہی سہی مگر ضرور کچھ نہ کچھ اثر ڈھونڈے سے ملتا ہے۔

دیہاتی شاعری کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ قسم جس میں کبیر اور بھیک سے اخلاقی واعظین اور روحانیت کے پرستاروں کا تتبع کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی شاعری وہ ہے جس میں پرانے مذہبی قصوں، کہانیوں، اور جدید دیہاتی ہنگاموں کے سورماؤں کی بہادریوں کو بھجنوں، گیتوں چوپئیوں اور سانگوں کا لباس پہنایا گیا ہے۔ تیسری قسم عاشقانہ شاعری کی ہے۔ لیکن اپنی زندگی اور اس کی روزانہ کشمکش، مصائب و آلام کے متعلق چونکہ انھوں نے بہت کم غور کیا ہے، اس لئے اس کا پتہ نہیں یا بہت کم ہے۔ تاہم جدید انقلابی خیالات چونکہ محنت کش جماعتوں کی تباہی سے دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے ان میں کچھ نہ کچھ انقلابی رجحانات ضرور پائے جاتے ہیں۔ اور اگر ہم پوری طرح تجسس اور تحقیق کر سکیں تو ان رجحانات کا سراغ اس زمانے سے ملتا ہے، جبکہ جدید خیالات مغربی ممالک سے آکر ہندوستان کی شہری آبادی میں پھیلنے بھی نہ پائے تھے جیسا کہ آپ کو دلیپ کے کلام کے اقتباسات سے معلوم ہوگا جو آج سے ساٹھ برس قبل کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جو میرے خیال میں دیہات کا پہلا انقلابی شاعر ہے اور وہ ضلع سہارنپور کا رہنے والا بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ

اور بھی شعراء ہیں ۔ جن کے کلام میں کہیں کہیں پتے کی بات مل جاتی ہے ۔ دلگیر سے بھی قدیم شعراء میں سعداللہ اور کھتے میواتی شاعروں کا نام لیا جا سکتا ہے۔

زمانہ حال کے کلام میں بھی ان خیالات کا رنگ نظر آتا ہے اور بعض میں دلگیر سے بھی زیادہ گہرا ۔ ایسا کلام بھی ہے جو گایا جاتا ہے ۔ لوگ شوق سے سنتے ہیں ۔ مگر اس کے خالق کا پتہ نہیں لگتا۔ کہ وہ کون تھا ۔ ایسے اقتباس بھی آپ کو اس مضمون کے آخر میں ملیں گے ۔

دیہاتی ادب اور جدید رجحانات ایک ایسا وسیع مضمون ہے جس کے لئے بہت مہلت تلاش تجسس اور غور کے لئے ملنی چاہیئے تھی ، جو اتفاق سے اس سطور کے راقم کو میسر نہیں آسکی ہے تاہم مجھے بڑی خوشی اس بات پر ہے کہ میں کلام دلگیر سے آپ لوگوں کو روشناس کرا رہا ہوں جو قطعاً ایک انقلابی شاعر ہے ۔ اور جس نے اپنا کلام اس وقت طبع کرایا تھا ، جبکہ ہندی اور اردو شعراء گل و بلبل کے فرضی عشق اور مدبھری نینوں کو سراہ رہے تھے یا پیروں ، دیوی ، دیوتاؤں کے خوارق عادات معجزوں کے نظم کرنے اور فرضی سورماؤں کے جھوٹے قصے منظوم کرنے میں مصروف تھے ۔

کلام دلگیر کا جو مطبوعہ نسخہ مجھے ملا ہے ۔ وہ نامکمل اور منتشر ہے ۔ نہ شروع کے ورق ہیں اور نہ آخر کے ، بیچ میں سے بھی ورق جا بہ جا ندارد ہیں ۔

دلگیر کا عاشقانہ کلام بھی خالص دیہاتی رنگ لئے ہوئے ہے گو اس نے غزلیں لکھیں ہیں اور حمد و نعت سے بھی رسم کہن کی تقلید میں اُسے آراستہ کیا ہے مگر لکھا سب اپنے رنگ میں ہے اور اس میں کسی کا اتباع نہیں کیا ہے ۔ وہ اپنے حریف کو بے تکلف ایک ٹھیٹھ دیہاتی کی طرح گالی دیتا ہے ۔ مثلاً مجنوں کا اور اپنا مقابلہ کرتا ہے ۔

مجنوں مہارسی[1] کے اوڑ[2] کرے گا ۔ جنگلوں جنگلوں تاڑا[3] کا ڈھیا

سو بریاں[4] دلگیر عسک[5] ماہیں ٹانگ تلے اور شاڑا[6] کا ڈھیا

---

[1] برابری [2] نکال دیا ، بھگا دیا [3] دفعہ ، مرتبہ [4] عشق [5] سالا

پنڈتوں کی غیب دانی کو فریب اور قابل سرزنش قرار دیتا ہے۔

کبدے رے پانڈے سانچی سانچ　　ہمارے کرم کے ریکھا[1] بانچ[2]
بولا پانڈا سنو پدھان[3]　　کدھی نہ آوے سانچ نے آنچ
اب کے سیر[4] کرو من کھول　　بھر لو ناج سو کوٹھے پانچ
پانڈا[5] اچھلو کھا۔کھا ناج　　جابد ہرنا بھریں کلانچ
کہے دلمیر لو پانڈا جھوٹ　　سر پہ مارو جوتی پانچ

جنت کی حوروں پر اردو شعراء اور اپسراؤں پر ہندی شعراء نے بہت کچھ کہا۔ ان کا مذاق اڑایا ہے اور آرزوئے وصل بھی بیان کی ہے۔ مگر دیہاتی شاعر اس کے متعلق بالکل جداگانہ نظریہ پیش کرتا ہے۔

پہلے شعر میں وہ اپنی بیوی کی اس حرکت پر کہ وہ پرچھائیں دکھا کر غائب ہو جاتی ہے۔ اس کو کہتا ہے کہ کس "ساہو" کی یہ حور ہے۔ حور کا نام آتے ہی اس کا خیال اسے جنت کی حوروں کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ جن کو وہ بہشت کی بھوال کہتا ہے۔ گویا بہشت ایک گاؤں ہے۔ اور جس طرح دیہاتی کہتے ہیں کہ "اری تو کس گاؤں کی بھوڑ یا ہے"؟ وہ انھیں اس اصول پر بہشت کی بھوئیں کہتا ہے۔ پھر یہ خیال کہ حوروں کی تقسیم تو قیامت کے بعد عمل میں آئے گی۔ آخر کچھ نہ کچھ بہشت میں وہ کرتی ہی ہوں گی۔ اور اپنا دل بہلاتی ہوں گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ڈھول بجاتی اور رانجھا گاتی ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ معلوم نہیں بات صحیح ہے یا جھوٹ۔ کہتے ہیں کہ اللہ میاں ان سے راضی ہیں اور حوریں ان کے عشق میں چور ہیں۔ پھر وہ اس ساری کہانی کو جھوٹ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے دشمن د ملان لوگ ہمیں دھوکہ دیتے ہیں۔ مرد حور ہے اور عورت حور ہے۔ جن کے دم سے ساری کائنات رنگین ہے۔ اصل قطعہ اس طرح ہے:۔

---

[1] تحریر، [2] پڑھ [3] چودھری، سردار [4] کاشت [5] اس طرح۔

چھاتیں دیکھوں بھاجے دور | تو ساسوؔ کی کیسی حور
حور، نور، بہت کی بھاوٰں | نت مالک کے رہیں حجورؔ
رجھاگادیں، ڈھول بجاویں | ناچیں، کودیں کریں بھوّرؔ
صاحب ان سوں راجی کہئے | او وہ صاحب کے عشقؔ میں چور
یو جہانے بیری ملّاں سُلّاں | ہمیں بہکادیں کہہ کہہ حُور
حُورا مانسؔ حوروہے بیترؔ | جن کی دھرتی نورم نور

یا ملّاں کے دیہہ مائیں دے
دلمیرانت پا تر گھور

انسانوں کی معاشی اور اقتصادی اونچ نیچ جس کو زمانے نے قسمت اور تقدیر کا کرشمہ سمجھ رکھا ہے۔ شاعر کے لئے حیران کن ہے۔ کہ اگر یہ کرشمہ قدرت ہے تو اس میں آخر کیا مصلحت ہے

کیوں کرمن کی ریکھ نیاری | چیتر، بانجھ، پھوڑ جن ہاری
کو رمانی کو موتی بیکم | کو رمکا کی پیسن ہاری
ایکاں کے سر چیتر براجے | ایکاں کے سر جوتہ کاری
کوائے راجہ کوائے پرجا | کوائے داتا کوائے بھکاری
ایکاں کے گل موراں مالا | ایکاں کے پایاں بیڑی بھاری
ایک سہر کی چیتر کامنی | ایک گاؤں کی ٹھیٹھ گنواری
اک پہرے کمکھابؔ کا ستناؔ | بیٹے گھاگرہ ایک ادگھاریؔ
کوائے حاکم کوائے ٹھاکر | کوائے بوئے کھیت کیاری

لہ ساس، خوشدامن ۔ ٢ه حضور ٣ه فتور ٤ه عشق ٥ه مانس۔ مرد ٦ه عورت
٧ه جسم، بدن ٨ه کمخواب ٩ه پاجامہ ١٠ه برہنہ

جارشے ماں کوائے ٹپوا وڈھے — کیتن تاپ کے رین لساری
کنیں کھوائے مرگا چاول — کاہو لے نہ بھوسی ادھاری

مختلف مذاہب کے پرستاروں کی شیخی اور پرستش کا یہ انجام کہ "راہ خدا" میں بے وجہ روپیہ خلقت کا برباد ہوتا ہے اس طرح بیان کرتا ہے:۔

اپنے اپنے راگ گا دیں سبھی نباے — سننے وارا سنے ہے جو واکے من میں آئے
کے ہندو ، کے مسلمان[۱] کے ہوئے انگریج — سب کے سر بھروں ٹری نبے کھودی سہائے
ایک کہے رام جی - دوجا کہے کھدا[۲] — ہردوار کی پیٹریاں کوئی ڈبکی کھائے
ایک گیا تو جائے ہے ایک جا ہے اجمیر — ایک پوجے ہے پاتھرا اک گنگا جی نہائے
مندر میں بندر ہریں[۳] مکہ لوٹیں[۴] ٹھگ — صاحب تیری راہ میں پر جا گانٹھ کٹائے

بھوک کے دردناک نتائج اس طرح بیان کرتا ہے:۔

بھوک سوں ماتا ، جائی تج دے[۵] — بھوک سوں جائی مائی تج دے
بھوک سوں با ہنڑ[۶] تجے با ہنڑ کو — بھوک سوں بھائی ، بھائی تج دے
بھوکی کا من[۷] تجے کنتھ[۸] نے — بھوکا کھسم[۹] لگائی تج دے
بھوکے بھجن نہ ہوں صاحب کے — بھوکا نواج[۱۰] پڑھائی تج دے
بھوکا ہا ٹی[۱۱] رہے نہ راجی — بھوکا اوگاہ[۱۲] اوگاہی[۱۳] تج دے
بھوکا ہا فج[۱۴] کران[۱۵] بھول جائے — بھوکا ملاں کو بانگی[۱۶] تج دے
بھوکے بیٹ گرب[۱۷] نا ٹہرے — بھوکا گرب جنائی تج دے

---

[۱] مسلمان [۲] خدا [۳] لوٹیں - چوری کریں [۴] چھوڑدے [۵] بہن [۶] بیوی [۷] شوہر [۸] خصم [۹] نماز [۱۰] قاضی [۱۱] گواہ [۱۲] گواہی [۱۳] حافظ [۱۴] قرآن [۱۵] اذان [۱۶] حمل

بھوکا دکھیر نسیر گئے جوڑے   سیراں جوڑی جوڑاتی تج دے

کہتا ہے کہ لالچ نے ہر جگہ گھر کر لیا ہے اور لالچی لوگوں نے ملک اجاڑ کر اس میں لالچ کو بسا دیا ہے :-

سب کے منو سمایو لوب   سگ پر جانوں بھایو لوب
کے پھکر کے راج کنوار   چوڑہ سر کٹوایو لوب
لوب سے ڈوبے ساہوکار   مول سوں بیاج سوایو لوب
لوبی لوگ اُجاڑیں دیس   اوجڑ نگر بسایو لوب

کہتا ہے کہ حق اور صداقت رشوت سے شکست پا چکے ہیں :-

نہ کہیں ہم کدھی مروڑ کی ایک   اور سانچی کہیں کروڑ کی ایک
گھونس[۵۱] دیتی مکدمہ[۵۲] جیتیا۔   نیم[۵۳] کی لاکھ اور اکوڑ کی ایک

اس کے نزدیک روپیہ کیا قوت رکھتا ہے۔ اور وہ جو ایک کسان ہے اس سے کس قدر دور ہے :-

اوہ ہی دوکھ ٹریا ہے   اوہ ہی جیو جیویا ہے
ڈوبے اوہ ہی تریا ہے   اوہ ہی ناؤ کھویا ہے

باہنٹر کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیا ہے

اوہی لائے من میں لاج   اوہی کھوائے بھوکا ناج
اوہی سنوارے سگڑے کاج   اوہی چھلنی اوہی چھاج

باہنٹر کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیا ہے

---

۵۱ رشوت   ۵۲ مقدمہ   ۵۳ انصاف

بنا روپیوں چلے نہ گاڑی　　　بنا روپیوں اوٹپے داڑھی
بنا روپیوں بوڑے نہ سانڑھی[1]　　　بنا روپیوں سونکھیں ہاڑی[2]

با ہنٹر کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّا ہے

بنا روپیہ برچھی نہ بھالا　　　بنا روپیہ گورا نہ کالا
پیادھ[3] ونہ سوار رسالہ　　　کرچ، برچ نرُوار نہ بھالا

با ہنٹر کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّا ہے

یوہی روپیہ بُرا گلام　　　یوہی روپیہ مہا حرام
یوہی روپیہ کاڑھے کام　　　یوہی روپیہ مہا حرام

با ہنٹر کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام روپیا ہے

سب کا میت رُوپیّا ہی　　　سب کی ریت رُوپیّا ہی
سب کی پیت رُوپیّا ہی　　　سب کا گیت رُوپیا ہی

با ہنٹر کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّا ہے

یوہی روپیہ نیم دھرم ہی　　　یوہی روپیہ لاج سرم ہی
یوہی روپیہ تم اور ہم ہی　　　یوہی روپیہ رکھے کرم ہی

با ہنٹر کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّا ہے

---

[1] ربیع　[2] بُڈی　[3] پیادے

موہے روپیہ سپنے آئے   آنکھ کھولے تو چھولک جائے
سو سو ڈھب سوں من للچائے   کدھی جاگتوں ہاتھ نہ آئے

با ہنٹر کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّہ ہے

جو دَمڑی نے دئے رُوپیّا   اوہ ہے واکا دھرم کا بھیا
اوہ ہے واکا کنور کنھیا   اوہ ہے واکا کٹم[1] جو یا

با ہنٹر کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّا ہے

ہندوستانی کسان کی فلاکت کی تصویر کس انداز میں کھینچتا ہے ۔

پاؤں جوتی سر نا پاگ   ایسے ڈوبے ہمارے بھاگ
کے لاگے بھاگن میں سواد[2]   مکا کی روٹی چنے کا ساگ

شاعر ایک دردناک تصویر کھینچتا ہے ۔ بھوکے بچے گھر میں ماں سے لپٹ کر رو رہے ہیں۔ اور ڈیوڑھی پر شیخ جمال (ایک فقیر) اللہ کے نام پر بھیک مانگ رہا ہے ۔ خدا کے متعلق یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ ایسا سخی ہے کہ وہ چیونٹی کو بھی رزق دیتا ہے ۔ شاعر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

کن داتا نے بکسا[3] مال   مٹی کے ماہیں چون[4] نہ وال
چھورے روئیں مل کے نار   ڈیوڑھی مانگیں سیکھ جمال

کسان کی زندگی ختم نہیں ہوتی بس وہ جیت گئی ہے اور وہ ہار چکا ہے۔

سگڑی عمریا بیتی سو بیتی   ہم ہیں ہارے وہ ہے جیتی
جگ ماں آکے کے سکھ پایو   دھرتی جوتی کھیتی کھیتی

---

[1] خاندان زندہ کرنے والا [2] لطف، مزا [3] بخشا [4] آٹا

کواں چلائے باہن[۵۳] باہے　　　سدا لکھائی[۵۲] کوٹھی رہتی[۵۵]

جب تک فصل کی پیداوار اس کے دانت کے نیچے نہ آئے وہ اسے اپنی سمجھنے سے ڈرتا ہے:۔

ہاتھوں بڑھ کر آئی ایکھ　　　اب کے بھلی کمائی ایکھ

دنوں رکھاویں[۵۶] اپنا کھیت　　　راتوں ہڑپ[۵۷] پرائی ایکھ

کولھو گڑ گئے ایکھ کے ماہیں　　　گھر کوں ناہیں سمائی ایکھ

اودلمیر گنڈیری چونکھ

اب جان۔ رس پہ آئی ایکھ

ضلع میرٹھ کے رہنے والے حُسنو کی کنڈلیاں مشہور ہیں۔ لیکن ہمارے مضمون سے متعلق ہمیں صرف ایک کنڈلی ملی ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ ہم (کسانوں) سے تو فقیر اچھے ہیں:۔

کبھی تو اوڑھیں شال دوشالے کبھی جوگڈری چیرن کی

کبھی جو کھائیں باسی کوسی کبھی تو تھالی کھیرن کی

حُسنو کہے کھدا مرا جانے ہم سے مرج پھکیرں کی

گردھر جو غلطیاً برج کا رہنے والا ہے۔ اپنے کو کب رائے کے خطاب (شاہ شعراء) سے مخاطب کرتا ہے۔ اس میں یہ حسن ہے کہ رائے کے معنی بھاٹ کے ہیں اور وہ قوم سے بھاٹ ہے خلق خدا کے فائدے کے لئے گردھر اس طرح قربانی کی تلقین کرتا ہے:۔

پانی باڈھا ناؤ میں کہ گھر میں باڈھے دام

دونوں ہاتھ الیچئے[۵۸] یہی سیانا کام

یہی سیانا کام نام ہر کا لیجے

پرمارتھ کے کاج سیس اپنا دیجے۔

---

[۵۳] بنجر زمین کو نرم کرنا [۵۴] نظر آئی [۵۵] خالی [۵۶] نگرانی کریں [۵۷] چرائیں [۵۸] انڈیلنا، پھینکنا

کہیں گردھر کب رائے یہی مردن کی بانی
جان جائے تو جائے رہے آنکھوں کا پانی

گاؤں میں جو لوگ ذرا لنگواں[1] سا دوپٹہ باندھ کر اور سرکاری عہدے داروں سے میل بڑھا کر چودھری اور مقدم بن بیٹھتے ہیں اُن کے متعلق کہتا ہے:۔

سوہی[11] پگڑی باندھ کر ہوئے مقدم لوگ
ہوئے مقدم لوگ گلی میں راڑ[2] جمادیں   آپ نہیں جانیں اور رہے پے وکوف[3] بنادیں
کہیں گردھر کب رائے مرے نہ چوہی
گاؤں کو لگ گیا روگ باندھ کر پگڑی سوہی

جھونٹ بول کر کسانوں کو لوٹنے والے زمیندار کے گاؤں سے کہتا ہے کہ "کسانوں کو چلا جانا چاہیئے"۔

ٹھاکر تو جھوٹا بڑا جس کے من میں پاپ   رعیت تو بھوکن مرے چھپ کے جیمیں[4] آپ
چھپ کے جیمیں آپ بھید کہیں نہ چھوٹے   ایسا بے ایمان باہنہ دے رعیت لوٹے
کہے گردھر کب رائے انت کو ٹھے نہ لوٹھا
تج دیئو وہاں کا باس[5] جہاں کا ٹھاکر جھونٹا

مہاجن کی تول اور جھونک کی بے ایمانی اس طرح بیان کرتا ہے:۔

گھی میں سو گھی گھٹے، گھٹے دال میں دال   آٹا میں سو آٹا گھٹے میری تیری ہوگی راڑ
مری تری ہوگی راڑ ٹکہ نا دے سے
کہیں گردھر کب رائے ارے دنیا کے گنیہ[6]
سب جاتوں میں بد جات[7] تری ہے بیٹی چودنیا

---

[1] لنگواں [2] فساد [3] بے وقوف [4] کھانا کھانا [5] گاؤں، لباس
[6] تخمینہ یا اندازہ یا جانچ کرنے والا [7] ذات

برف اور انسان کا مقابلہ

ابھی کچھ روز ہوئے یہ خبر ساری دنیا نے حیرت سے پڑھی کہ ایک روسی ہوا باز نے قطب شمالی پر سے اُڑ کر روس سے امریکہ کا سفر کیا۔ یہ خبر دراصل اس طویل کشاکش کی ایک منزل کا پتہ دیتی ہے جو تخلیق آدم سے لے کر آج تک انسان اور اس کے ماحول میں جاری ہے۔ یہ کشاکش کہیں بہت سخت ہے، کہیں ذرا نرم، مگر تاریخ انسانیت کا بڑا حصہ ہے اسی سے عبارت کبھی انسان اپنی زندگی قایم رکھنے کے لئے مظاہر فطرت سے لڑتا اور ان پر قابو پاتا ہے، کہیں محض اپنی قوت کی آزمائش کے لئے بلا افادی وجوہ کے اس مہم کو سر کرتا ہے۔ کہیں دریاؤں کے طوفانوں کی بلا خیزی کو زمین کی زرخیزی کا ذریعہ بناتا ہے، کہیں سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنا علم وہاں نصب کرنا چاہتا ہے، کہیں اپنی ایجادوں سے زمین کی طنابیں کھینچ کر ربع مسکوں کو ایک شہر کی سی حیثیت دے دیتا ہے، پہاڑ کاٹتا ہے، سمندر پاٹتا ہے، تہ آب چلتا ہے، ہوا میں اُڑتا ہے۔ یہ سب اس لئے کہ اپنی زندگی کو ترقی دینے کے سامان کرے یا کائنات پر اپنی سرداری کے احساس کو قوی کرنے کے مواقع نکالے۔ اس جہاد میں انسانیت کے وہ گروہ پیش پیش رہتے ہیں جن میں ولولہ اور امنگ ہوتی ہے اور جو سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں، دوسرے ہم جیسے ان کے کارناموں کی خبریں پڑھتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں۔ آیئے آج اسی قسم کے ایک معرکہ کا حال سنائیں، شاید اس سے پڑھنے والوں میں بھی کچھ ولولہ پیدا ہو اور وہ انسانیت کے اس فرض کو بس دوسروں کے سر ڈال دینے پر قانع نہ رہیں، خود بھی کچھ ہاتھ پیر ہلائیں۔

انسان کو قدرت کا جو مظہر سب سے زیادہ تنگ کرتا ہے وہ سردی ہے اور برف۔ اس نے شمالی ملکوں کے باشندوں کی زندگی عذاب کرنا چاہی، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے

مقابلہ کرتے کرتے وہ محنت کش اور سخت کوش ہو گئے۔ اور اس کے خلاف وہ وہ حملے کئے کہ اب یہ زچ ہے۔ شمالی ممالک کو اسی برف کی وجہ سے ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے ملکوں تک جنوبی سمندروں ہی کے راستہ پہنچ سکتے ہیں۔ اس میں بڑا چکر پڑتا ہے اور بہت وقت لگتا ہے۔ اس لئے صدیوں سے ان ملکوں کے جہاز رانوں کے سامنے یہ مقصد رہا ہے کہ کسی طرح شمالی سمندریں سے ہو کر مشرقی ممالک تک پہنچ سکیں۔ امریکہ کی دریافت کے بعد سے تو برابر یہ مقصد سامنے رہا ہے کہ ایشیا تک اس شمالی راستہ سے پہنچا جائے۔ لیکن چونکہ یہ راستہ سال میں زیادہ مدت یخ بستہ رہتا ہے اس لئے اس کٹھن منزل کے طے کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا رہا ہے۔ غالباً پہلی مرتبہ ایک انگریز سر ہیو ولوبی نے اس راستہ سے چین پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ۲۰ مئی ۱۵۵۳ء کو لندن سے اپنے جہاز "ایڈورڈ بوناونچر" میں نکلے۔ لیکن مرمانسک کے قریب برف میں پھنس گئے اور ان کا جہاز، سازوسامان، سب تباہ ہوا اور انھوں نے خود بھی اس مہم میں اپنی جان ہاری۔

اس ناکامی نے ہمتیں پست کر دیں۔ اور مدت تک کسی نے پھر اس مہم کو سر کرنے کا خیال نہ کیا۔ مگر آدمی یونہی مستقل طور پر ہار مان لیا کرے تو ترقی کیسے کرے۔ کوئی ۳۲۶ سال بعد یعنی ۱۸۷۸ء میں سویڈن کے ایک جہاز راں، "نارڈنسکیولڈ" نامی نے یہ سفر کر ہی ڈالا۔ یہ گوٹیے بورگ سے اپنے جہاز "ویگا" میں روانہ ہوا اور ۱۲½ مہینہ میں آبنائے بیرنگ پہنچا۔ اس نے ایک مرتبہ راستہ میں اپنا جہاز برف میں جم جانے دیا اور پھر جب گرمی میں برف پگھلی تو آگے بڑھا۔ یہی طریقہ اس کے بعد کئی جہاز رانوں نے اختیار کیا، اور ایک سردی برف میں گذار گذار کر منزل مقصود کو پہنچے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک گرم موسم میں پورا سفر طے نہ کر سکا، نہ وِٹ کتسکی، نہ ٹول، نہ نانسن، نہ اُمنڈ سن۔

۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ ایک روسی برف شکن جہاز "سبریا کو" نے پروفیسر آٹو شمٹ کی کپتانی میں ارچنگلسک سے ولاڈی وسٹاک کا سفر ایک ہی موسم میں طے کیا۔ یہ ۲۸ جولائی کو چلے تھے

اور پہلی اکتوبر کو اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ پھر ۱۹۳۴ء میں ولاڈی وسٹاک سے چل کر مغرب کی طرف مرمانسک تک کا سفر ۱۹۳۴ء میں ایک دوسرے برف شکن جہاز "لیوٹکے" نے ۴۰ دن میں پورا کیا۔

ان دونوں کامیاب سفروں کے بعد سے روس کے حوصلہ مند جہاز راں اس فکر میں ہیں کہ اس برفستانی سمندر میں آمد و رفت کا مستقل اور باضابطہ سلسلہ قایم کر دیں اور یوں مشرق سے تعلق کے باب میں قدرتی جغرافیہ کی "تصحیح" کر دیں۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں ان کے دو جہازوں نے جو معمولی مال کے جہازوں سے بہت ہی کم مختلف تھے ایک ہی گرم موسم میں آمد و رفت کے دونوں سفر انجام بھی دیئے۔ ان کے ساتھ جو برف شکن جہاز تیار رکھے گئے تھے ان سے برائے نام ہی کام لینا پڑا۔ یہ چاروں جہاز خوب لدے ہوئے تھے، ہر ایک میں دو دو ہزار ٹن سے زیادہ وزن کا مال بھی تھا اور بہت سے مسافر بھی۔

اس راستہ کو مستقل بنانے کا کام ۱۹۳۲ء سے پروفسر اشمٹ اور پروفسر سمولیکو وچ کے زیر نگرانی انجام پا رہا ہے، پہلے یہ ایک کمیٹی کے افسر تھے اب ایک مستقل قومی وزارت ان کے سپرد ہے، جس کی نگرانی میں کوئی ۴۰ ہزار کلومیٹر لمبا شمالی ساحل ہے، اس کے قریب قریب کے تمام جزیرے ہیں اور مشرقی سائبیریا کا وہ تمام حصہ جو عرض البلد کے شمال میں ہے۔ یعنی ان ماہروں کے سپرد وہ سارا علاقہ ہے جو برف سے چھین کر انسان کو دلانا ہے۔ روسی حکومت نے ماہروں کو صرف وزارت کی خشک عزت ہی نہیں بخشی ہے بلکہ ان کے کام کی تکمیل کے لئے وسائل بھی دئے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ان کو نصف ارب روبل خرچ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا ؎

اس اہتمام اور اس صرف کثیر کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ روس کی بلا روک ٹوک رسائی کسی ایسے سمندر تک نہیں ہے جو عالمی تجارت کی شاہراہ ہو۔ روس دو سو سال سے اس کی فکر میں ہے، پر کوئی تدبیر راست نہیں پڑتی۔ اب اس نے اسی لئے اس صحرائے برف کو سر کرنے کی ٹھانی ہے۔ دوسری وجہ فوجی ضرورت ہے۔ یاد ہوگا کہ ۱۹۰۴ء کی روس و جاپان

والی جنگ میں روسی بیڑہ احتیاطاً نہر سویز میں سے نہیں گذرنا چاہتا تھا تو اسے سارے افریقہ کیا تقریباً ساری دنیا کا چکر کاٹ کر اپنے حریف کے مقابلہ کے لئے آنا پڑا تھا اگر یہ بیڑہ موقع جنگ پر جلد پہنچ سکتا تو کیا عجب ہے کہ جنگ کا رنگ ہی پلٹ جاتا۔ آج پھر روس و جاپان کے تعلقات کچھ بہت شگفتہ نہیں ہیں، کوئی ذرا سا واقعہ بھی ان میں ان بن کرا دینے کو بہت ہے۔ اور منچوریا پر عملاً قبضہ کرنے کے بعد سے تو روس کو بڑا ڈر یہ ہے کہ جاپان جب چاہے آسانی

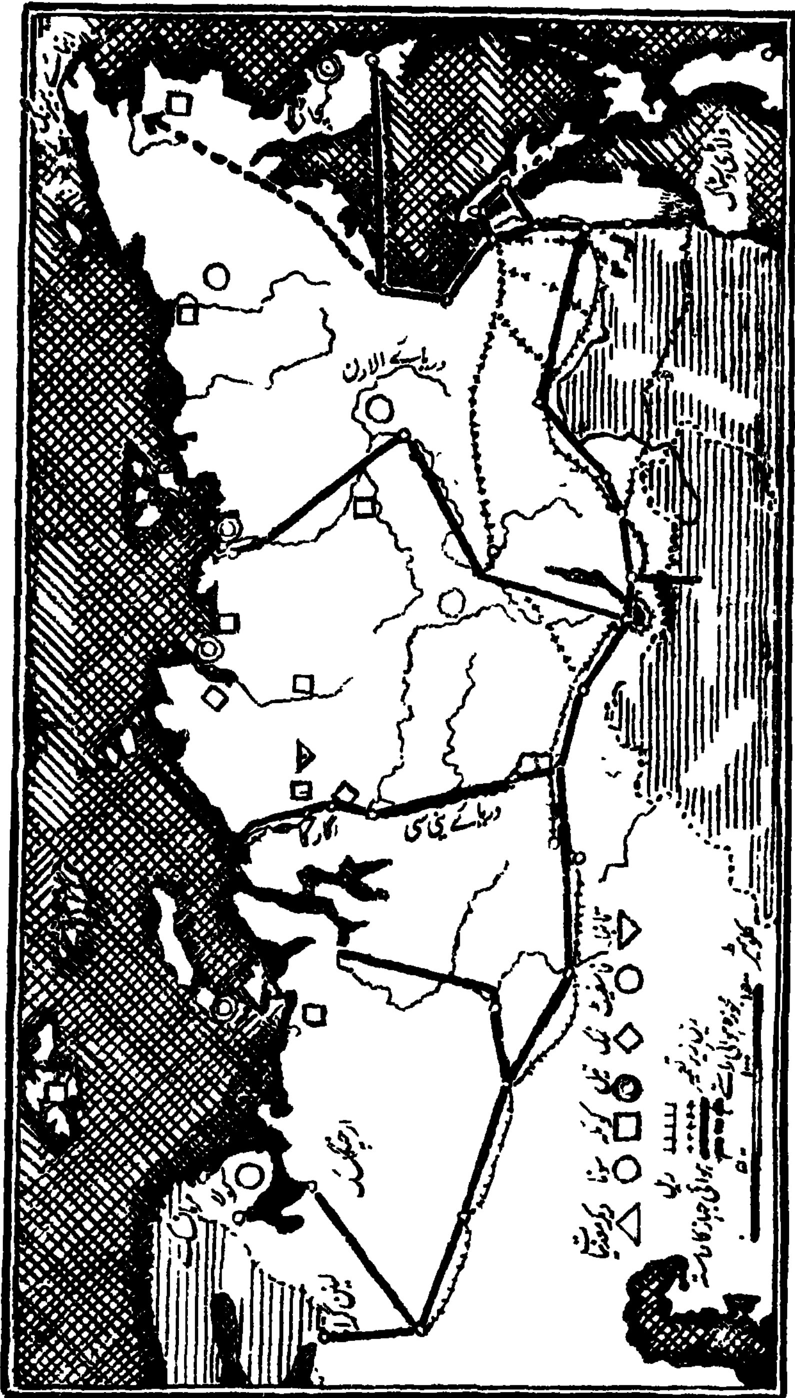


سے ماسکو اور بحر الکاہل کے تعلق کو توڑ دے سکتا ہے۔ اس لئے مشرقی سائبیریا اور بحر الکاہل کے روسی ساحل کی حفاظت کے لئے یہ شمالی بحری راستہ بہت ہی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنے بیڑے کو آسانی سے مشرق کی طرف بھیج سکنے ہی کی خاطر روسیوں نے ۳۱ء سے ۳۳ء تک کی دو سالہ شدید کوشش سے بالٹک اور بحر ابیض کو ملانے کے لئے ایک نہر تعمیر کی ہے۔ اس نہر کے لئے پہلے تو اُنھوں نے جھیل لڈوگا اور

جھیل اونیگا کو ملایا اور پھر اونیگا کے شمال میں سمندر سے جا ملایا۔ اس نہر کے بننے سے یہ ہوا کہ لینن گراڈ سے آرچنگلسک کا راستہ جہاں پہلے ۲۸۴۰ میل تھا اب کل ۶۷۴ میل رہ گیا ہے۔ اس نہر سے ایک تو شمالی علاقہ کے جنگلوں کی لکڑی کو یورپ کی منڈیوں تک پہنچانے میں سہولت ہوگی دوسرے اس کی گہرائی اور چوڑائی ایسی رکھی گئی ہے کہ اوسط درجہ کے جنگی جہاز اور خصوصاً آبدوز کشتیاں اس میں سے گذر سکینگی۔



اس شمالی راستہ کے کھل جانے سے روس کی معیشت ایک ایسے وسیع رقبہ سے استفادہ کریگی جو ابتک عملاً مردہ پڑا تھا۔ اس لئے کہ اس علاقہ میں صرف پوستین کے لئے برفستانی جانوروں کے چمڑے، یا مچھلی کے تیل اور لکڑی ہی کی پیداوار کا سامان نہیں ہے بلکہ جدید تحقیقات کی رو سے کوئی ۲۲۸ مقامات پر معدنی ذخیرے مل سکتے ہیں، کوئی ۴، جگہ تو کوئلہ ہے، پھر تیل بھی ہے اور سونا بھی، سیسہ بھی اور تانبا بھی، ٹین بھی جست بھی۔

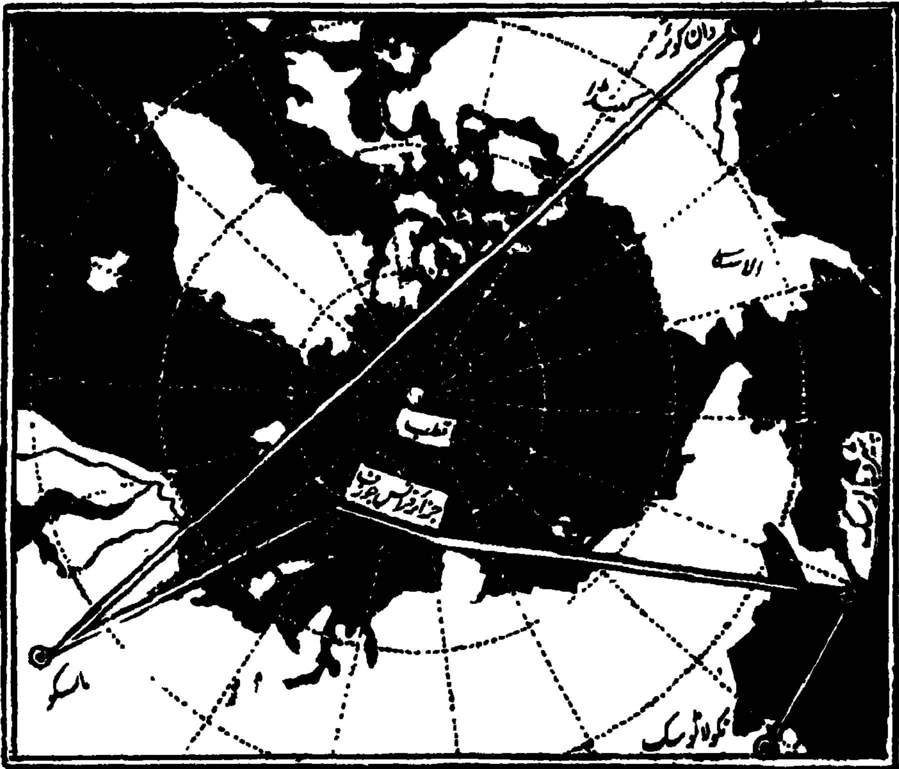


اس شمالی جہازرانی کے لئے اسی علاقہ میں کوئلہ کا ملنا بہت سازگار ہوگا۔ متعدد مقامات پر کوئلہ کی کانوں کا کام چالو بھی ہے۔ جزیرہ نمائے کولا میں نہایت قیمتی فاسفیٹ نکالے جارہے ہیں۔ نورلسک کے قریب تانبے کے ذخیرہ کا اندازہ کوئی پونے دو لاکھ ٹن کیا گیا ہے۔ بعض جگہ سونا بھی نکالا جانے لگا ہے۔ دریائے وِٹم کے علاقہ میں سونا کوئی دس پندرہ سال سے نکل رہا ہے۔ اب دریائے الدان کی وادی میں اس کا کام شروع ہو رہا ہے، یہاں ۲۳ء میں کل ۴۰۰ آدمی بستے تھے، آج ۵۰ ہزار کی آبادی ہے!

اس علاقہ کے اہم مقامات میں آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ بندرگاہ اگارکا جو دریائے ینیسی کے چوڑے دہانے پر واقع ہے کس تیزی سے بڑھا ہے۔ ابھی ۲۸ء میں اس ویران مقام میں ۴۴ آدمی بستے تھے، شاید اس لئے کہ آدمی بالکل نہ ہوں تو مقام پر ویرانی کا اطلاق نہ ہو پائے۔ اب گرمی کے زمانہ میں یہاں ۲۰ ہزار کی آبادی ہو جاتی ہے۔ پچھلی گرمی میں یورپ سے ۲۸۰ جہاز یہاں آئے۔ یہاں سے زیادہ تر لکڑی لد کر جاتی ہے، ۳۱ء میں کوئی ۶ ہزار ٹن لکڑی گئی تھی، ۳۵ء میں کوئی سوا لاکھ ٹن! روسی حکومت نے اس علاقہ میں ریڈیو کے مرکز قایم کر دئے ہیں، ہوائی جہازوں کا وافر انتظام ہے، اور برف شکن جہاز بھی وقت ضرورت مدد کے لئے مستعد رہتے ہیں اور ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ لندن کو اگارکا تک کا فاصلہ بلا کسی دقت کے ۱۸-۲۰ دن میں طے ہو جاتا ہے۔

اب شمالی ساحل پر اور اس کے قریب کے جزیروں میں روس نے ۷۰ ریڈیو کے مرکز قایم کر رکھے ہیں۔ ان میں سے ۴۰ پورے سال بھر کام کرنے والے مرکز ہیں۔ پھر قطبی تحقیق کے مرکز ہیں جن کے ساتھ ہوائی جہاز بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ مرکز موسم کے تغیرات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور جہازوں کے کپتانوں کو برابر اطلاع دیتے رہتے ہیں کہ انھیں کس طرف سے راستہ صاف ملیگا۔ ہوائی جہازوں کے ذریعہ ان مرکزوں کا تعلق ملک سے قایم رہتا ہے اور رسد پہنچتی رہتی ہے۔ اور اس برفانی علاقہ میں اُڑنے کا تجربہ روس والوں نے اپنے ہوابازوں کی ایک فوج کی فوج کو فراہم کر دیا ہے۔

سـ۳۷ـہ کے ختم تک ۲۷،۰۰۰ کلومیٹر کے ہوائی راستوں کی ترتیب کا تہیہ ہے۔ ماسکو سے ولاڈی وسٹاک کو جو ہوائی سروس ہے اس سے متعدد شاخیں اور نکالی گئی ہیں۔ لیکن روسی ہوابازوں کے پیش نظر جو سب سے بڑا مرحلہ مدت سے رہا ہے وہ یہ کہ کسی طرح قطب شمالی کے اوپر سے اڑکر امریکہ پہنچا جائے۔ مارچ سـ۳۶ـہ میں ایک دلیر روسی ہواباز نے ماسکو سے فرانس جوزف جزیرہ تک کا فاصلہ ۲۴ گھنٹہ میں طے کر لیا تھا۔ مگر خیال تھا کہ چند سال میں یہ لوگ اڑکر امریکہ پہنچ جایا کریں گے۔ مگر حوصلہ مند ہوابازوں کے لئے یہ انتظار کٹھن تھا۔ چنانچہ چند مہینہ بعد پچھلے ۲۰ جون میں ایک ہواباز روس سے امریکہ اڑکر پہنچ ہی گیا۔ اب یقین ہے کہ چند سال میں ہوائی سفر کا یہ راستہ عام ہو جائے گا۔ انسان اپنی کوشش سے زمین کی طنابیں کس طرح کھینچ رہا ہے!



عہدِ حاضر کا فلسفہ

ادھر قرونِ وسطیٰ کا خاتمہ ہوا اور ادھر فلسفہ پر تیزی سے عمرانی اور سیاسی رنگ چڑھنے لگا۔

ولیم اوکم جیسا جید فلسفی قیصر کے دربار میں ایک تنخواہ یاب ملازم تھا اور اس کا کام صرف یہ تھا کہ وہ پاپائے روم کے خلاف مضامین اور رسائل تصنیف کرے۔ ان دنوں بہت سے تیز و تند مسئلے ارباب کلیسا کے باہمی اختلافات سے وابستہ تھے۔ چنانچہ سترھویں صدی میں فلسفے کو جو فروغ نصیب ہوا وہ کم و بیش کاتھولکی کلیسا کی سیاسی مخالفت ہی کا نتیجہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ مالبرانش ایک پادری تھا۔ مگر پادریوں کو اب تک یہ اجازت نہیں کہ وہ اس کے فلسفے کو تسلیم کریں۔ اٹھارھویں صدی میں لاک کے جو معتقد فرانس میں، اور انیسویں صدی میں بینتھم کے جو پیرو انگلستان میں گذرے، وہ سب کے سب سیاسیات میں انتہا پسند لبرل تھے۔ اور موجودہ لبرل نظریات کی تشکیل انہیں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن ہم جوں جوں آگے بڑھتے جائیں۔ فلسفیانہ اور سیاسی عقائد کا یہ لزوم کہیں ٹوٹتا نظر آئے گا۔ ہیوم اگرچہ فلسفے میں انتہا کا آزاد خیال تھا مگر سیاسیات میں اسی حد تک شاہ پرست تھا۔ روس (جس پر عہدِ انقلاب تک قرونِ وسطیٰ کی کیفیت طاری رہی) البتہ ایک ایسی سرزمین ہے جہاں فلسفہ اور سیاسیات کا باہمی تعلق اور ممالک کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ سُرخ پوش مادہ پرست ہیں اور سفید پوش عین پرست۔ تبت میں یہ تعلق اور بھی زیادہ گہرا ہے۔ دربار کا دوسرا اعلیٰ افسر فلسفی ہوا کرتا ہے۔ اور فلسفے کی یہ ایک ایسی بڑی عزت ہے جس کی نظیر دوسری جگہ ڈھونڈھے سے نہیں ملتی۔

بیسویں صدی میں نظری فلسفہ تین مذاہب میں بٹ گیا

۱۔ پہلا مذہب ان فلسفیوں کا ہے جو مقبول عام المانی فلسفے کے حامی ہیں۔ یعنی جن کا مرجع اکثر و بیشتر کانٹ اور کمتر ہیگل کی ذات ہے۔

۲۔ دوسرا مذہب نتائجیین[1] اور برگسان کا ہے

[1] نوٹ صفحہ ۲۲۰ پر ملاحظہ فرمائیے

۳۔ تیسرا ان مفکرین کا جو مختلف فلسفوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا یہ عقیدہ ہے کہ فلسفہ نہ کوئی خاص قسم کی صداقت رکھتا ہے۔ اور نہ اس صداقت کے حاصل کرنے کا کوئی خاص اسلوب۔ سہولت تفہیم کی خاطر ان اصحاب کو موجودئیں کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر یہ اصطلاح پوری پوری صادق نہیں آتی۔ ان مختلف مذاہب کی حدود کچھ زیادہ سختی کے ساتھ معین نہیں ہیں۔ افراد وقت واحد میں مختلف مذہبوں کو مانتے اور مان سکتے ہیں۔ چنانچہ ولیم جیمس کو موجودیت اور نتائجیت دونوں کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر رائٹ ہیڈ کی تازہ ترین تصنیفات میں برگسانی مابعد الطبیعیات کی حمایت موجودیاتی طریقوں سے کی گئی ہے۔ اکثر فلسفی باوجود قوت استدلال کی کافی نمائش کے آئن شٹائن کے عقائد کی نسبت یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ وہ کانٹ کی زمانی اور مکانی موضوعیت کی بنیاد حکمیات کی سرزمین پر استوار کرتے ہیں۔ اس طرح مذاہب فلسفہ کا حقیقی فرق ان کے منطقی فرق کے مقابلے میں بہت کم واضح اور نمایاں ہے۔ لیکن منطقی فرق بہت مفید ہوتے ہیں کیوں کہ ان سے آرار کی تبویب میں مدد ملتی ہے

بیسویں صدی میں المانی تصوریت صرف رفاعی پہلو اختیار کئے ہوئے ہے کیونکہ ایسی نئی کتابیں ہر سال دھڑا دھڑ شائع ہوتی چلی جاتی ہیں جنھیں پروفیسروں نے تو نہیں البتہ دوسروں نے ضرور اہم تسلیم کیا ہے اور جنھوں نے متعدد نئے مذاہب کی بنیاد ڈالی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص "مطبوعات جدیدہ" کے تبصروں سے اندازہ لگانا چاہے تو وہ بھی خیال کرے گا کہ میدان انہیں نئے مذاہب کے ہاتھ ہے مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔ اگر امریکہ کی واحد مثال کو نظر انداز کر دیا جائے تو جرمنی، فرانس اور برطانیہ عظمیٰ میں فلسفے کے بہت سے معلم اب بھی ایسے ہیں جو دل و جان سے مستند المانی روایات کے حامی ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نوجوان اس جماعت میں شامل ہو جائے تو اسے ان ممالک میں پروفیسری کا عہدہ

(نوٹ صفحہ ۶۲۷) نتائجی ترجمہ ہے۔ (Pragmotist) کا جس سے وہ فلسفی مراد ہے جو سائنس فکر اور حوادث کو افادی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے یعنی ان کی صداقت یا قیمت کو وہ اس معیار پر پرکھتا ہے کہ وہ انسانی اغراض اور اعمال پر کیا اثر ڈالتے ہیں۔

حاصل کرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوگی۔ البتہ شامل نہ ہونے کی صورت میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان روایات کے مخالفین کہتے ہیں کہ ان میں خرابی یہ ہے کہ وہ سرتا بسر المانی ہیں اور ایک لحاظ سے بیجیم پر لشکرکشی کی ذمہ دار ہیں۔[1] لیکن ان کے حامی اتنے ممتاز اور جلیل القدر ہیں کہ یہ اعتراض پنپنے نہیں پاتا انھیں میں امیل لوترو اور برنارڈ بوسینکے کا بھی شمار ہے۔ جنھوں نے مرتے دم تک بین الاقوامی کانگریسوں میں فرانسیسی اور برطانوی فلسفے کی نمائندگی کی ہے۔ بے دینی اور انقلاب کے مقابلے میں مذہب اور قدامت پرستی کی حمایت اسی طریق فلسفہ کے حصے میں آئی ہے کیونکہ مذہب اور قدامت پرستی میں جہاں دیرینہ روایات کی ایک قوت ہے۔ وہیں نئے خیالات کے فقدان کی بڑی کمزوری بھی ہے

انگریزی بولنے والے ملکوں میں اس مذہب فلسفہ کی پیروی کا آغاز بیسوی صدی کی ابتدا سے کچھ پہلے ہوا۔ میں نے ۱۸۹۳ء میں فلسفے کا سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا اور یہ وہ سال تھا جب کہ بریڈلے کی مشہور کتاب "شہود و حقیقت" زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ بریڈلے ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے انگلستان میں المانی فلسفے کو مقبول عام بنانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کا امتیاز یہ تھا کہ وہ اپنے پیش رووں کی لکیر کا فقیر نہ تھا۔ اس کی دو تصنیفوں یعنی منطق اور شہود و حقیقت نے مجھ پر اور علیٰ ہذٰا میرے اکثر ہم عصروں پر گہرا اثر ڈالا اور اگرچہ میں اب ان کتابوں کے خیالات سے متفق نہیں ہوں لیکن پھر بھی انھیں نہایت احترام کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔

ہیگل کے فلسفے کا مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ حقیقی دنیا کے متعلق اگر ہم کو کچھ علم ہو سکتا ہے تو صرف منطق ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ بریڈلے بھی اس کا قائل ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ظاہری دنیا بالذات متناقض اور اس لئے محض فریب نظر ہے۔ اور حقیقی دنیا چونکہ از روئے منطق غیر متناقض ہے اس لئے اس میں حیرت انگیز خواص پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ زماں اور مکاں دونوں کے

---

[1] جارج سنتیانا۔ المانی فلسفے میں خودستائی۔ مصنف

مادرار ہے۔ اس میں ایک دوسرے سے علاقہ رکھنے والی متنوع چیزیں موجود نہیں ہیں۔ اسے ذوات کا اختلاف گوارا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ موضوع اور معروض کی تفریق بھی منظور نہیں ہے۔ حالانکہ علم میں یہ فرق لازمی طور پر متضمن اور موجود ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ دنیا صرف وجود مطلق پر مشتمل ہے جو فکر یا ارادے سے نہیں بلکہ احساس سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہماری تحت القمری دنیا یکسر فریب اور تمام تر التباس ہے۔ اور اس میں آئے دن جو باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں یا ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ حقیقتاً غیر اہم ہیں۔ ایک ایسا عقیدہ لازماً قاطع اخلاق ہونا چاہیے۔ لیکن ایک تو اخلاق کا تعلق طبائع سے ہے، اور دوسرے وہ منطق کا پابند نہیں ہے۔ پیروان ہیگل کا بنیادی اخلاقی اصول یہ ہے کہ ہمیں اپنے کردار کی بنا اس عقیدے پر رکھنی چاہیے کہ ہیگل کا فلسفہ برحق ہے مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر وہ برحق ہو تو ہمارے کردار کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

اس فلسفے پر دو جانب سے حملے ہوئے۔ ایک جانب تو منطقی تھے جنہوں نے ہیگل کے مغالطات کی دھجیاں اڑا دیں اور یہ ثابت کر دکھایا کہ تعینات اور کثرت، مکان اور زمان حقیقت میں بالذات متناقض نہیں ہیں۔ اور دوسری جانب وہ لوگ تھے جنہیں منطق کی پیدا کردہ دنیا کی ترتیب اور تنظیم ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ان کے سرخیل ولیم جیمس اور برگسان تھے۔ ان حملوں میں صرف فردی اختلاف تھا۔ کوئی منطقی تناقض نہ تھا۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف ضرور تھے کیونکہ علم کی مختلف قسموں کی پیداوار تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور فرق ان میں یہ بھی تھا کہ ان میں سے ایک یکسر علمی تھا اور دوسرا تمام تر انسانی۔ علمی تنقید کا استدلال یہ تھا کہ ہیگل کا فلسفہ باطل ہے اور انسانی تنقید کا یہ کہ وہ ناپسندیدہ ہے۔ کامیابی قدرتاً ثانی الذکر کی قسمت میں تھی جو اسے حاصل ہو کر رہی۔

انگریزی بولنے والی دنیا میں ولیم جیمس پہلا شخص ہے جس نے المانی تصوریت کو بری طرح پچھاڑا۔ لیکن یہاں ولیم جیمس نفسیات کا امام اور اصول نفسیات کا مصنف نہیں۔ بلکہ فلسفے کا استاد جس کے خیالات چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں دنیا کے روبرو اس کی زندگی کے آخری سالوں میں اور اس کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں اس کا ایک مضمون مائنڈ (MIND[۵]) میں چھپا۔ جس کو مصنف

[۵] انگریزی زبان کا ایک فلسفیانہ رسالہ جس کا مدیر مشہور فلسفی ایف سی ایس شلر ہے۔

کی وفات کے بعد اس کے مضامین کے اس مجموعے میں دوبارہ شامل کیا گیا۔ جس کا نام بنیادی تجربیت[1] ہے۔ اس میں وہ اپنے طبعی میلان کو غیر معمولی دلآویز پیرائے میں یوں بیان کرتا ہے۔

"مجموعی حیثیت سے ہم چونکہ شکلیین نہیں ہیں اس لئے نہایت آزادی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے مختلف عقیدوں کے محرکات کیا ہیں۔ چنانچہ مجھے اپنے عقیدے کا کھلے دل سے اعتراف ہی کیونکہ یہ معلوم ہے کہ سب عقیدوں کے محرکات اصل میں جمالیاتی ہیں۔ منطقی نہیں ہیں۔ کائنات کا یہ تصور کہ وہ کامل ہے۔ اور مکان کی پوری وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ایسا تصور ہے جس سے میرا دم الٹنے لگتا ہے۔ کیونکہ اس کا وجوب جس میں امکانات کو کوئی دخل نہیں اور اس کی وہ اضافات جس کے نہ مضاف ہیں اور نہ مضاف الیہ مجھے یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ گویا میں نے ایک ایسے عہد نامے پر دستخط کئے ہیں جس میں محفوظ حقوق کی کوئی دفعہ نہیں یا میں ایک ایسے وسیع دارالاقامہ میں رہتا ہوں جو سمندر کے کنارے واقع ہے اور جس میں کوئی ایسی علیحدہ خواب گاہ نہیں کہ بوقت ضرورت سماج کی سورشوں سے اس میں پناہ لی جاسکے۔ علاوہ اس کے اس میں فریبی اور گنہ گار کے پرانے جھگڑے کو بھی کچھ دخل ہے۔ شخصی طور پر اگرچہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ہیگل کے سب پیرو بہ خود غلط ناصح نہیں ہیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ سب بہ خود غلط ناصح آگے چل کر ہیگل کے پیرو بن جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی میت کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے غلطی سے دو پادریوں کو بلایا گیا۔ ان میں سے ایک نے جو ذرا پہلے پہنچا تھا اتنا ہی کہا تھا کہ میں حشر اور حیات ہوں کہ دوسرا آگیا اور کہنے لگا میں خود حشر اور حیات ہوں۔ کامل فلسفہ ہم میں سے بہتوں کو اس دوسرے پادری کی یاد دلاتا ہے۔ کیونکہ کائنات کی طرح وہ بھی کمال کا مدعی ہے .... "

مجھے یقین ہے کہ ولیم جیمس کے سوا کسی دوسرے کو یہ کبھی نہیں سوجھی کہ ہیگل کے فلسفے کو ایک ایسے دارالاقامہ سے تشبیہ دے جو سمندر کے کنارے واقع ہے۔ ۱۸۸۴ء میں اس مضمون کا شمہ برابر اثر نہ ہوا کیوں کہ یہ زمانہ فلسفہ ہیگل کے شباب کا تھا۔ اور فلسفیوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان

---

[1] مرتبہ رالف بارٹن پیری ص ۲۷۶ تا ۲۷۸۔ مترجم

کی طبائع ان کی آرا میں میں کتنا دخل رکھتی ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں جب "معرکۃ الآرا مضمون" شائع ہوا تو فضا بدل چکی تھی اس تبدیلی کے اسباب کئی تھے جن میں سے ایک ولیم جیمس کا وہ اثر بھی تھا جو اس کے تلامذہ پر مترتب ہوا۔ یوں تو شخصی طور پر اسے کما حقہٗ جاننے اور سمجھنے کا موقع مجھے کبھی نہیں ملا۔ لیکن اس کی تحریرات کے مطالعے سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ اس کی فطرت کے ترکیبی عناصر تین ہیں۔ اور انھیں سے اس کے زاویہ نظر کی تشکیل بھی عمل میں آئی ہے ا۔

(۱) پہلا عنصر وظائف اعضا اور طب کی تعلیم کا ہے جس نے آگے چل کر نہایت بلند پایہ اور دور رس نتائج پیدا کئے۔ چنانچہ فلاطوں، ارسطو، اور ہیگل کے خوشہ چین ادیب فلسفیوں کے مقابلے میں جو ایک سائنٹفک اور خفیف سا مادی میلان اس میں پیدا ہو گیا تھا وہ اسی تعلیم کی بدولت تھا۔ اس عنصر کا رنگ اس کی تصنیف "نفسیات" میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ البتہ جہاں اسے دو مفروضات میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا پڑا۔ وہاں یہ رنگ ضرور پھیکا پڑ گیا۔ چنانچہ اختیار کی بحث انھیں مستثنیات کی ایک مثال ہے۔

(۲) دوسرا عنصر متصوفانہ اور مذہبی میلان کا ہے جو اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا اور جس میں وہ اپنے بھائی کا شریک تھا۔ اس کا رنگ ایک تو اس کی کتاب "عزم للیقین" میں گہرے طور پر جھلک رہا ہے اور دوسرے اس کی دلچسپی میں جو اسے روحانیت کی تفتیش سے تھی۔ اور

(۳) تیسرا عنصر یہ ہے کہ اس نے امریکی ضمیر کے پورے جوش اور خلوص سے کام لے کر اپنی طبیعت کی اس نزاکت کو جس میں بھی وہ اپنے بھائی کا شریک تھا جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی، اور اس کے عوض والٹ وہٹ مین کا عمومیت پسندانہ رنگ پیدا کرنے کی سر توڑ کوشش کی ہے۔ اس کی طبیعت کی نزاکت اوپر کی محولہ عبارت سے بخوبی روشن ہے کیوں کہ اس میں ایک ایسے دار الاقامہ سے اس نے اپنی بیزاری کا اعلان کیا کہ جس میں کوئی علیحدہ خواب گاہ نہیں۔ (حالانکہ یہ چیز وہٹ مین کو بہت پسند آتی) اور اس کے عمومیت پسند ہونے کا ثبوت اس کے اس دعوے سے ملتا ہے کہ وہ گنہ گار ہے۔ فرلسی نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اس سے مدت العمر میں اتنے گناہ سرزد ہوئے ہوں گے کہ دوسرا انسان اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس مقام پر اس کا وہ شر میلا پن جو اس کی عادت میں داخل تھا۔ ہاتھ سے جاتا رہا۔

بہترین انسانوں کا حقیقی شرف عموماً ایسی صفات کے اجتماع کا نتیجہ ہوتا ہے جنھیں ایک دوسرے کے بالکل نقیض فرض کیا جاتا ہے۔ جیمس کا بھی حال یہی تھا۔ چنانچہ اس کے ہم عصروں نے اس کی اہمیت کا کبھی پورے طور پر اندازہ نہیں کیا۔ اور جو اندازہ کیا اس سے وہ کئی درجے بڑھا ہوا تھا۔ اس نے مذہبی امیدوں کو سائنس کے نظریات کی حیثیت دینے کے لئے نتائجیت کی وکالت کی اور مادہ و ذہن کے قدیم تضاد کو مٹانے کے لئے یہ انقلابی نظریہ ایجاد کیا کہ شعور کوئی چیز نہیں۔ اس کے فلسفے کے یہ دو حصے ہیں جن میں سے ہر ایک کے مؤید الگ الگ ہیں۔ شِلر اور برگسان پہلے حصے کے حامی ہیں اور نو وجودیئین دوسرے کے مشہور آدمیوں میں صرف ڈیوی ایک ایسا شخص ہے جو جیمس کا پورا پورا یار شاطر اور رفیقِ سفر ہے۔ ان دونوں حصوں میں ہر اعتبار سے چونکہ زبردست فرق ہے اس لئے ان پر جداگانہ غور اور فکر کی ضرورت ہے۔

جیمس کی کتاب "عزم للیقین" کا سال تصنیف ۱۸۹۷ء ہے۔ اس کی دوسری کتاب "نتائجیت" ۱۹۰۷ء میں چھپی۔ شِلر کی تصنیف "انسانیت" اور ڈیوی کی تصنیف "منطقی نظریہ پر چند خیالات" ۱۹۰۳ء میں طبع اور شائع ہوئیں۔ غرض بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں فلسفیانہ دنیا کی تمام تر توجہ نتائجیت کی طرف مبذول تھی۔ اسی زمانے میں برگسان نے اپنے فلسفے کا صور نہایت بلند آہنگی سے پھونکا اور دنیا کی نظریں اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ لیکن اس کے فلسفے میں بھی نتائجی رنگ نتائجیت سے زیادہ رچا ہوا ہے۔ نتائجیت کے بانی تین ہیں:

(۱) ولیم جیمس (۲) ایف سی۔ ایس۔ شِلر (۳) جان ڈیوی

یہ تینوں اگرچہ ایک ہی مذہب کے علمبردار ہیں لیکن آپس میں زبردست اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے پہلا نتائجیت کے مذہبی پہلو کی وکالت کرتا ہے، دوسرا ادبی پہلو کی اور تیسرا علمی پہلو کی۔ اس میں شک نہیں کہ ولیم جیمس ایک جامع الحیثیات شخص تھا، مگر یہ اس کی مذہبیت تھی جس نے نتائجیت میں اپنے لئے ایک راہ اظہار ڈھونڈھ نکالی۔ لیکن ان اختلافوں کی تفصیل کا یہ محل نہیں بلکہ برعکس اس کے ہمارے مقصد کے لئے مفید امر یہ ہے کہ ہم ان کو نظر انداز کر دیں اور اصل عقیدے کی طرف متوجہ ہوں۔

نتائجیت ایک قسم کی تشکیک پر مبنی ہے۔ روایتی فلسفے کا دعویٰ تھا کہ وہ مذہب کے اساسی

عقائد کو بہ دلائل صحیح ثابت کرسکتا ہے اس کے مخالفین کہتے تھے کہ وہ اُن کی تردید کرسکتے ہیں۔ یا کم ازکم اسپنسر کی طرح یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ انھیں ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن لوگوں نے پھر بھی یہ محسوس کیا کہ اگر انھیں ثابت نہیں کیا جاسکتا تو ان کی تردید بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال ان عقیدوں کا ہے جنھیں اسپنسر جیسے لوگوں نے مسلّم قرار دیا ہے۔ کسی علّت و معلول کا قضیہ، قانون کا تسلط، حافظے کا عموماً قابل اعتماد ہونا، استقرار کی صحت وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان کو کسی خالص عقلی نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو نتیجہ سوئے لا ادریت کے اور کچھ برآمد نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ ان پر جتنا بھی غور کیا جائے یہی معلوم ہوگا کہ وہ بنیادی طور پر نہ ثابت ہوسکتے ہیں اور نہ جھٹلائے جاسکتے ہیں۔ بنابریں جیمس کا استدلال اس بارے میں یہ تھا کہ اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو عام انسانوں کی طرح ان امور پر کبھی شک و شبہ نہیں کرنا چاہئے جس غذا نے کل تک ہماری پرورش کی ہے اس کے متعلق یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ آج ہمارے لئے زہر نہیں بن جائے گی۔ بعض اوقات ہم غلطی کرگذرتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ لہٰذا یقین کا معیار یہ نہیں کہ وہ حقیقت سے کتنا مطابق ہے (کیونکہ حقیقت تک ہماری رسائی کبھی ہوتی نہیں) بلکہ یہ ہے کہ وہ ہماری حیات کو بڑھانے اور خواہشات کو پورا کرنے کی کتنی اہلیت اپنے میں رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مذہبی یقینیات اکثر و بیشتر اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ اور بدیں وجہ حقیقی کہلانے کے مستحق ہیں۔ جیمس نے اپنی تصنیف "مذہبی واردات کے تنوعات" میں شروع سے آخر تک یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی بنا پر یہ کہتا ہے کہ سائنس کے جملہ مسلّمہ نظریے حقیقی کہے جاسکتے ہیں کیوں کہ وہ "چلتے" ہیں حق کی تعریف یہی ہے اور ہمیں اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ علم نہیں۔

اس نظریئے کا انطباق اگر سائنس اور مذہب کے عام مفروضات پر کیا جائے تو بحث و تمحیص کی بڑی گنجائش نکل آتی ہے، لیکن اگر نتائجین "چلنے" کے مفہوم کو ذرا احتیاط سے ظاہر کریں اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچادیں کہ سائنس اور مذہب کے عام مفروضات میں ہمیں واقعۃً حق کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ تو پھر ردّ و قدح کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن ہم کیوں نہ ایسی معمولی مثالوں کی طرف رجوع کریں۔ جن میں حقیقت کی معرفت اتنی دشوار نہیں ہے جتنی کہ نتائجیں بیان کرتے ہیں۔ فرض کیجئے

کہ آپ نے بجلی چمکتی ہوئی دیکھی۔ اب یا تو آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ گرج سنائی دے گی یا یہ خیال کرتے ہیں کہ بجلی اتنی دور کوندی ہو کہ گرج سنائی نہ دے سکی، یا اس کے متعلق کچھ سوچتے ہی نہیں ہیں۔ آخری صورت کی معقولیت میں تو کوئی کلام نہیں مگر ہم کیوں نہ یہ فرض کریں کہ آپ پہلی دو صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرتے ہیں۔ جب آپ کو گرج سنائی دیتی ہے تو آپ کے تعین کی یا تو تصدیق ہو جاتی ہے یا تردید۔ لیکن خواہ تصدیق ہو یا تردید' ان میں سے کوئی بھی فائدہ یا عدم فائدہ کی منت کش نہیں ہوتی، بلکہ اس "واقعہ" کی شرمندہ ہوتی ہے جسے گرج کے سننے کا احساس کہا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نتائجیین کی توجہ خاص طور پر ایسے یقینیات کی طرف منعطف ہے جن کی تصدیق تجربے کے واقعات سے نہیں ہوئی، حالانکہ دنیوی معاملات میں روزانہ کام آنے والے بیشتر یقینیات ——— مثلاً فلاں کا پتہ فلاں ہے ——— ایسے ہیں جن کی تصدیق تجربے سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ان صورتوں میں نتائجی معیار محض فضول اور غیر ضروری ہے۔ اب رہیں گرج جیسی لاتعداد مثالیں، سو ان میں بھی اس کا انطباق قطعاً نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہاں نہ حقیقی یقین کو باطل یقین پر کوئی عملی فوقیت حاصل ہے اور نہ ان میں سے کوئی مفید اور کوئی مضر ہے۔ فلسفیوں کی یہ ایک عامتہ الورود غلطی ہے کہ وہ ہمیشہ "پرشکوہ" مثالوں کے درپے رہتے ہیں۔ اور ان مثالوں کی طرف اعتنا نہیں کرتے۔ جن سے روزمرہ زندگی میں سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

ہر چند کہ نتائجیت میں انتہائی فلسفیانہ صداقت موجود نہیں، تاہم محض نہایت اہم اوصاف ضرور پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس حق کو ہم پا سکتے ہیں اس کو وہ مافوق الانسانی نہیں بلکہ انسانی قرار دیتی ہے۔ یعنی یہ مانتی ہے کہ وہ انسانوں کی طرح خطاکار اور تغیر پذیر ہے۔ اس طرح حق ہمیشہ انسانی سوانح کے دائرے ہی میں ہوتا ہے اس سے خارج نہیں ہوتا۔ جو چیز اس سے خارج ہوتی ہے وہ واقعہ ہوتی ہے حق نہیں ہوتی کیونکہ حق یقینیات کا ایک خاصہ ہے اور یقینیات نفسی حوادث ہیں۔ ما سوا اس کے یقینیات کو واقعات سے جو نسبت ہے اس میں منطق کے بدیہی تصور کی سی سادگی نہیں پائی جاتی۔ یہ دوسرا وصف ہے جو نتائجیت میں پایا جاتا ہے۔ یقینیات مبہم اور ملتف ہوتے ہیں۔ وہ کسی خاص واقعہ

کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ واقعے کے کئی مبہم مجموعوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ منطق تکبیری نصوری قضیوں کی طرح بالکل برحق یا بالکل باطل نہیں ہوتے بلکہ حق اور باطل کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ یکسر سپید یا یکسر سیاہ نہیں ہوتے بلکہ بھورے رنگ کے مختلف روپ ہوتے ہیں۔ پس جو لوگ حق کا ذکر نہایت ادب اور احترام سے کرتے ہیں ان کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ وہ اس کی جگہ "واقعہ" کو دیں۔ اور یہ ذہن نشین کریں کہ جن محترم صفات کے آگے اُن کا سرِ نیاز خم ہو جاتا ہے وہ انسانی یقینیات ہیں محض عنقا ہیں۔ اس عقیدے سے جس طرح نظری فائدے حاصل ہوتے ہیں اسی طرح عملی فائدے بھی مترتب ہوتے ہیں مثلاً عوام جو آپس میں ایک دوسرے کو ستاتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں اس کی وجہ اس عقیدے کے بموجب یہ ہے کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ انھیں "حق" کا علم حاصل ہے۔ گویا بڑا نصب العین جن کا ذکر عوام احترام آمیز خوف کے لہجے میں کرتے ہیں حقیقت میں ایک دھوکے کی ٹٹی ہے جس کی آڑ میں دشمنوں کا شکار کھیلا جاتا ہے۔

لیکن نتائجیت کا اس سے تاریک پہلو ایک اور ہے۔ اس کے نزدیک حق ایک ایسی چیز ہے جو یقینیات سے تعلق رکھتی اور انھیں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، لہٰذا ایسے یقینیات تیار کئے جا سکتے ہیں جو قانونِ تعزیرات کے ذریعے منوائے جاتے ہوں، چنانچہ سترھویں صدی میں کیتھولک کلیسا نے کیتھولک ممالک میں اور پروٹسٹنٹ مذہب نے پروٹسٹنٹ ممالک میں یہی کیا۔ قوت اور اقتدار والے حکومت پر قبضہ کرکے اور اپنے مخالفین کی رایوں کا گلا گھونٹ کر "حق سازی" کا باضابطہ کارخانہ کھول سکتے ہیں۔ یہ نتیجہ اس غلو کی پیداوار ہیں جس میں نتائجیت بے طرح مبتلا ہو گئی ہے۔ مانا کہ حق کے کئی درجے ہیں۔ اور وہ خالص انسانی حالات یعنی یقینیات کا ایک خاصہ ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ اس کے درجے بھی بالکل انسانی حالات پر منحصر ہیں اس کے سوا اگر ہم اپنے یقینیات کے حق کو بتدریج ترقی دیں تو "نصب العین" کے قریب ہوتے جائیں گے، اور "نصب العین" کی تعیین "واقعہ" کرتا ہے۔ جس پر ہمیں صرف ان چند چھوٹے چھوٹے حالات کی حد تک کچھ معمولی سا اختیار حاصل ہے۔ جو ہمارے گرد یا اس کے قریب رونما ہوتے ہیں۔ اصل میں نتائجی نظریے کا نمونہ وہ اشتہار باز ہے جو اپنی گولیوں کے متعلق بہ تکرار یہ بیان کرتا ہے کہ ان کے ایک ڈبے کی قیمت پچاس روپیہ ہے اور اس طرح لوگوں کو اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ اسے ایک روپئے میں مانگیں پھر جب سودا چک جاتا

ہے تو وہ اپنے کو حقیقت سے زیادہ قریب پاتا ہے کیونکہ اگر عوام کو اتنے وثوق سے نہ باور کرایا جاتا تو اتنی قیمت نہ اٹھتی۔ انسان کے خود ساختہ حقائق کی یہ مثالیں دلچسپ تو بے حد ہیں مگر مختصر بھی اتنی ہی ہیں۔ لوگ اس بارے میں مبالغے سے کام لیتے ہیں اور پروپیگنڈا کی شراب سے اتنے مخمور ہو جاتے ہیں کہ ان کی بدمستیوں کی تان آخر کو جنگ، وبا، اور قحط جیسے ناگوار واقعات پر ٹوٹتی ہے یورپ کی موجودہ تاریخ جہنم بنیا کے لئے نتائجیت کے اس پہلو کی غلطی کا ایک روشن ثبوت ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ نتائجیت کے ماننے والے برگسان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں حالانکہ ان دونوں فلسفوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نتائجین کہتے ہیں کہ حق کا معیار افادہ ہے اور برگسان کہتا ہے کہ ہماری عقل حق کی معرفت میں حائل ہے کیوں کہ وہ عملی ضروریات کی پیداوار ہے اور دنیا کے ان تمام پہلوؤں کو یک قلم نظر انداز کر دیتی ہے جو اس کی توجہ کو جذب کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ہمیں "وجدان" نامی ایک ایسا ملکہ حاصل ہے جس کا استعمال کچھ دشوار نہیں۔ اس کے ذریعے ہمیں مستقبل کے سوا ماضی اور حال کا پورا علم بخوبی ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ اتنے بڑے علم کا ہمیشہ حاضر رہنا دقّت کا باعث ہے۔ اس لئے ہم نے اپنے میں ایک ایسی چیز پیدا کر لی ہے جو دماغ کہلاتی ہے اور جس کا واحد وظیفہ "نسیان" ہے لیکن جہاں وہ بھول کا عادی ہے وہاں ضروری ہے کہ ہم اس کے متعلق ہر چیز کو یاد رکھیں۔ وہ بالکل ایک چھلنی کی طرح ہے جس میں چھننے سے صرف وہی چیزیں رہ جاتی ہیں جو مفید اور بنابریں غیر حائب ہوتی ہیں۔ برگسان کے نزدیک افادہ خطا کا معیار ہے اور حق صرف ایک ایسے باطنی غور و فکر کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جس میں عملی فائدے کے افکار کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔ بایں ہمہ برگسان نتائجین کی طرح عمل کو عقل پر اور آتشیلو کو ہیلمٹ پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ڈسڈیمونا کو وجدان کے ذریعے مار ڈالنا، یا دشاہ کو عقل کے ذریعے زندہ چھوڑ دینے سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نتائجین برگسان کو اپنا دوست جانتے ہیں۔

برگسان کی پہلی کتاب "زماں اور اختیار" ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی اور اس کی دوسری کتاب "مادہ اور حافظہ" ۱۸۹۶ء میں مطبع سے باہر نکلی۔ لیکن اس کو عالم گیر شہرت "ارتقائے تخلیقی" کی شہرہ آفاق تصنیف کی بدولت نصیب ہوئی جو ۱۹۰۷ء میں چھپی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ کتاب اول الذکر کتابوں

کچھ بہتر اور برتر ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس میں براہین کا حصہ کم اور ادبیت کی چاشنی زیادہ ہے۔ اسی لئے اس میں سحر حلال کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو اس میں شروع سے لے کر آخر تک بس شاعری ہی شاعری ہے کوئی دلیل نہیں ہے اور بنا بریں کوئی کم زور دلیل نہیں ہے۔ اس کے سوا اور کوئی بات اس میں ایسی نہیں ہے جو ہمیں اس کے پیش کردہ فلسفے کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں کچھ مدد دے۔ یہ سوال اگرچہ اہم ہے۔ لیکن برگسان نے اس کے جواب کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لی بلکہ اسے پڑھنے والوں کے سر جھونک دیا۔ اور یہ ایک لحاظ سے درست بھی ہے۔ کیونکہ جب ہم اس کے نظریات کا بہ امعان نظر جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حق وجدان کے ذریعے حاصل ہوتا ہے عقل کے ذریعے نہیں ہوتا، اور جب وہ عقل کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا تو دلیل اور برہان سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں ہو سکتا۔

برگسان کے فلسفے کا بڑا حصہ محض روایتی تصوف پر مبنی ہے۔ البتہ اسے ذرا انوکھے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ دنیا جہان کے صوفی خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی سب بالاتفاق یہ مانتے ہیں کہ چیزیں حقیقت میں الگ الگ نہیں ہیں۔ بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے اندر داخل اور ساری ہیں۔ اب جو وہ الگ الگ نظر آتی ہیں سو یہ قصور اُن کا نہیں بلکہ تحلیلی عقل کا ہے۔ جو انھیں ایسا سمجھتی ہے اس کو باہمی تداخل کا عقیدہ کہا جاتا ہے۔ اور یہ برمانیدس سے لے کر بریڈلے تک ہر صوفی منش انسان میں یکساں طور پر موجود ہے برگسان بھی اس کا قائل ہے۔ اس کی جدت پسند طبیعت نے اس عقیدے میں اپنی دو "اختراعات فائقہ" کے ذریعے ایک خاص ندرت پیدا کر دی ہے ایک تو یہ کہ وہ "وجدان" کو حیوانات کی جبلتوں میں سمو دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ "وجدان" ہی ہے جو "اکل کھری بھڑ" "امیو فلا" کو اس بات پر اکساتا ہے کہ جس پہل روپ میں اس نے اپنے انڈے رکھے ہیں اسے اس طرح ڈسے کہ وہ مرے نہیں، بلکہ صرف مفلوج اور بے حس ہو کر رہ جائے (لیکن ڈاکٹر پیک ہم اور ان کی بیگم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غریب بھڑ سہو و خطا کے میدان میں کسی سائنس داں سے کچھ پیچھے نہیں ہے)، اس جدت نے اس کے عقیدوں میں جدید سائنس کی ایک ایسی چاشنی پیدا کر دی ہے جو بے حد دلکش ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس کی وجہ سے بہت سی حیوانیاتی مثالیں ایسی پیش کر سکتا ہے جن کی بنا پر ایک انجان اور بے خبر آدمی یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اس کے نظریے

واقعی حیاتیاتی تحقیق کے جدید ترین نتائج پر مشتمل ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ "مکان" اور "زمان" کی بالکل نئی نئی تعبیریں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تحلیلِ عقل اشیاء کو فرداً فرداً دیکھتی ہے اور اُن کے اسی الگ الگ ہونے کا نام "مکان" ہے۔ علیٰ ہٰذا وجدان چونکہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اشیاء ایک دوسرے میں ساری اور نافذ ہیں لہٰذا یہ باہمی "داخل ہی "زمان" یا "مرور" ہے۔ اس جدت نے اسے "زمان" اور "مکان" کے متعلق ایسی بہت سی اچھوتی باتیں کہنے کا موقعہ دیا ہے۔ جن کو اگر ہم مذکورہ اصطلاحوں کے معمولی مفہوم کے لحاظ سے دیکھیں۔ تو اُن کی گہرائی اور جدت کا کوئی ٹھکانا باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح "مادہ" چونکہ "مکان" کا پابند ہے اس لئے عقل کی ایجاد ہے۔ چنانچہ جب ہم وجدان کے نقطۂ نظر سے اسے دیکھتے ہیں تو وہ واقعی ایجادِ بندہ ہی نظر آنے لگتا ہے

برگسان کے فلسفے کے اس جزو سے اگر اس کی بے نظیر انشار پردازی کو نکال دیا جائے تو باقی جو کچھ رہے گا وہ فلاطینوس کا فلسفہ ہوگا۔ سالبتہ اس کی یہ ساحرانہ انشار پردازی اس کی ذہانت اور قابلیت کی ایک روشن دلیل ہے۔ لیکن اس سے انسان صرف ادیب بن سکتا ہے، فلسفی نہیں ہو سکتا اور واقعہ میں اس کے فلسفے کا یہ حصہ اس کی عالمگیر ہر دل عزیزی اور عام پسندی کا ضامن بھی نہیں ہے اس کی شہرت تو اس کے اِس عقیدے کی پیداوار ہے جو "جوشِ حیات" اور "تخلیقِ دائم" کا عقیدہ کہلاتا ہے اس کے علاوہ اس کی عظیم الشان جدت یہ ہے کہ اس نے زماں اور ارتقار کی واقعیت کے یقین میں تصوف کو اس صناعانہ انداز میں سمو دیا ہے کہ انسانی عقل عش عش کر تی رہ جاتی ہے۔ آئیے ایک سرسری نظر اس موضوع پر بھی ڈال لیں کہ اس نے اس شعبے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کیسے کی؟

روایتی عمل کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ صرف فکر کا عادی ہے، وقت کو بے حقیقت جانتا ہے اور مجموعی طور پر کاہل انسان کا فلسفہ ہے۔ صوفیانہ صفائے قلب کی نفسیاتی صبحِ روح کی وہ تاریک شب ہے، جو انسانی زندگی کی وسعتوں پر اس وقت طاری ہوتی ہے جب کہ عمل کا آفتاب ترک یا بدلی کی اُفق میں غروب ہو جاتا ہے۔ اس طرح روح کا مکان جب عمل کے مکین سے خالی ہو جاتا ہے تو فکر کا دیو اس کا اپنا قبضہ جماتا ہے۔ ہماری ہستی کا ایک قانون یہ ہے کہ ہم ہمیشہ ایسے یقینیات اختیار کرتے ہیں

جو ہماری عزتِ نفس کے امین ہوتے ہیں۔ چنانچہ تحلیل نفسی پر اب تک جتنی کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں وہ سب کی سب اس قانون کی عجیب و غریب نظیروں سے اٹی پڑی ہیں۔ پس وہ انسان جو عمل سے بھاگ کر فکر کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ زندگی کا حقیقی مقصد فکر ہی ہے اور جو لوگ دنیوی کاروبار میں سر بسر غرق اور محو رہتے ہیں وہ حقیقی دنیا کو نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ روایتی تصوف کا بنیادی اصول یہی ہے۔ اور اس سے اس کے بقیہ عقاید بہ آسانی مستنبط ہو سکتے ہیں کہا جاتا ہے کہ لاؤزے[1] نے اپنی مشہور عالم کتاب[2] ایک چنگی خانہ میں اتنی دیر میں تصنیف کی جتنی دیر میں کہ چنگی والوں نے اور مسافروں کے ساتھ اس کے اسباب کا معائنہ ختم کیا۔ اور غالباً بڑے فلسفیوں میں وہ پہلا شخص ہے جسے یہ فخر حاصل ہے[3]۔ اس کتاب میں اس نے بس ایک ہی راگ الاپا ہے اور وہ یہ کہ عمل بے کار ہے۔

---

[1] نام "آر" "اورلی" لقب "لاؤ" عرف۔ مذہب تاؤ کے بانی۔ چین کے مشہور فلسفی، صوفی اور نبی، ان کا وطن "چو" تھا۔ اور وہ وہیں کے شاہی کتب خانے میں مہتمم تھے۔ یہیں پر ۵۱۷ ق م میں کنفیوشس ان سے ملنے آئے۔ مترجم

[2] تاؤتے کنگ یعنی منہاج یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے کیونکہ مختصر عرصے میں قلم بند ہوئی ہے تاہم اس میں چینی رسم الخط کے پانچ ہزار نشانات ہیں۔ اور دو حصوں اور اکیاسی فصلوں پر مشتمل ہے۔ زبان میں اجمال اور استعارات کی کثرت ہے۔ (مترجم)

[3] لیکن کہا جاتا ہے کہ کتاب چونکہ چھوٹی سی ہے اس لئے فخر کی کوئی بات نہیں۔

"بین الاقوامی سیاست"

اسپین میں یورپ کی مختلف قومیں جس طرح فریقین کی مدد کر رہی ہیں وہ کس سے پوشیدہ ہے مگر ساتھ ہی "عدم مداخلت" کی کمیٹی بھی بنی ہوئی ہے۔ اور اس کے جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ کہ یہی سیاست کا تقاضا ہے۔ پیرس کے ایک رسالہ (CANARD ENCHAINE) نے اس کمیٹی کی کارروائیوں کی ایک فرضی طنزیہ روئداد شائع کی ہے۔ نامہ نگار کسی طرح برطانوی دفتر خارجہ کے اس خوب صورت اور آراستہ کمرے میں پہنچ گیا ہے جہاں اس عدم مداخلت کی کمیٹی کا ایک اہم جلسہ ہونے کو تھا۔ موقع اچھا تھا، میز کے نیچے دبک بیٹھا جو کچھ سنا حاضر ہے:-

لارڈ پلائی متھ، انگلستان کے نمائندے (جلسے کا افتتاح فرماتے ہوئے): حضرات: اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آج کے جلسے میں ہم وہیل مچھلیوں کے تحفظ کا اہم مسئلہ لیں۔ حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ آج وہیلوں کی نسل کو سخت خطرے کا سامنا ہے! اس کی بنیادیں، سچ یہ ہے کہ، متزلزل ہو گئی ہیں۔

مائیسکی: روسی نمائندہ: لیکن، یور ایکسلنسی، اسپین کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

لارڈ پلائی متھ (سوکھے منہ سے): میرے مکرم دوست، میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ مجھے غیر متعلق معاملات میں الجھائیں۔ آپ پھر بھولتے ہیں کہ یہ عدم مداخلت کی کمیٹی ہے، عدم مداخلت کی۔ اور اس کے نام ہی سے واضح ہے کہ اسے اسپین کے معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ دینا چاہیئے۔

گرانڈی، اطالوی نمائندہ: بہت خوب، بالکل درست۔

فان ربن ٹروپ، جرمن نمائندہ: مسٹر مائسکی کو پرائی باتوں میں دخل دینے کی کچھ عجب افسوسناک لت ہے۔

مون تانیرو ، پرتگیزی نمائندہ ، (ترش روئی سے) اگر روس کے نمائندہ صاحب اپنا یہ ٹال مٹول کا انداز اور جاری رکھیں گے تو میں مجبور ہوں گا کہ اپنی حکومت سے درخواست کروں کہ وہ مجھے اپنی کمیٹی سے واپس بلالے۔

کوربن ، فرانسیسی نمائندہ : (دمانگی سے) چلو، چلو بھی، جانے بھی دو۔ ذرا صبر کرو، ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔

لارڈ پلائی متھ : جیسا کہ میں اس غیر ضروری قطع کلام سے پہلے کہہ رہا تھا، وہیل جو دریائی دودھ پلانے والے جانوروں کی ایک قسم ہے ایک زمانے میں بڑی تعداد میں دستیاب ہوتی تھی۔ اور اب وہ نہایت تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ ابھی کل کا ذکر ہے کہ ایک وہیل مچھلی بلباؤ کے قریب ساحل پر جا پڑی۔

گرانڈی (نہایت پھرتی سے کھڑے ہوکر) : بلباؤ کے قریب' بلباؤ کے ؟ کیوں' ان سُرخ انقلابیوں کا پیٹ بھرنے کے لئے ؟ یہ تو عدم مداخلت کے میثاق کی کھلی خلاف ورزی ہے (دمانگی سے مخاطب ہوکر) آپ نے سنا ، جنابعالی' آپ نے سنا ؟ ہمارا سردار اس کو ہرگز نہیں برداشت کرے گا میں کل ہی بارسلونا کو بیس آب دوز کشتیاں بھیج دوں گا۔

لارڈ پلائی متھ : مسٹر گرانڈی' ذرا' ذرا سہولت سے' ذرا ٹھہرئے۔ ایک ہی وہیل مچھلی تو تھی !

گرانڈی (ذرا ٹھنڈے ہوکر) بہت اچھا۔ خیر۔ تو میں دس ہی آب دوز بھیجوں گا۔

لارڈ پلائی متھ : یہ کمیٹی اپنے احساس تشکر کا اظہار کرتی ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ تعاون کی اس درجہ آمادگی ظاہر فرمائی۔ دلی شکریہ۔

فان ربن ٹروپ : اب جونکہ گفتگو اسپین کی آ ہی گئی ہے' میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ایک 'وفادار' قیدی کے پیروں میں روسی موزے تھے۔

مائسکی : لیکن میں نہایت ....

گرانڈی (نہایت شدت سے) : مسٹر مائسکی مجھے اصرار ہے کہ آپ ان اہانت آمیز لفظوں کو فوراً

واپس لیں۔

مائسکی ۔ مگر میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں ہے!

گرانڈی (دھمکانہ انداز میں) : بہر حال آپ کو وہ لفظ واپس لینے ہوں گے۔

(مائسکی نے لفظ واپس لے لئے!)

لارڈ پلائی متھ : اب کہ یہ معاملہ طے ہو گیا ہے۔ آیئے پھر اس اصل مسئلے کی طرف ، وہیلوں کے مسئلے کی طرف رجوع کریں .... ہمارا خیال ہے کہ نہایت سخت نگرانی ... . .

گرانڈی : میں معزز لارڈ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم یہاں آج نگرانی وغیرہ کے متعلق گفتگو کے لئے نہیں آئے تھے۔

لارڈ پلائی متھ (کچھ مایوسی کے سے لہجے میں) مگر صاحب! یہاں تو ذکر صرف مچھلیوں کا ہے ۔

گرانڈی (دوسرے کی بات بے سنے) علاوہ بریں واضح رہے کہ نگرانی ہو یا نگرانی نہ ہو، اٹلی نے جو رضاکار بھیج دیئے ہیں وہ انھیں کسی حال میں واپس نہیں بلا سکتا۔

کوربیں : (اُٹھ کر) یہ نہایت تشویشناک لفظ ہیں ۔

لارڈ پلائی متھ : ناقابل قبول لفظ ، ناقابل پذیرائی ۔

گرانڈی (عجلت میں) میں نے اپنا مطلب ٹھیک ظاہر نہیں کیا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اٹلی فرانکو کو جو بھیجنا چاہتا ہے اُسے کوئی بند نہیں کرے گا۔

کوربیں : اچھا تو یہ تو اور بات ہے' میں بھی یہی سمجھا تھا۔

لارڈ پلائی متھ : بھائی مسٹر گرانڈی ، آپ نے تو ایک منٹ کو مجھے ڈرا دیا تھا۔

گرانڈی (نہایت نرمی سے) معاف فرمایئے ، زبان کی لغزش تھی۔

مائسکی : (دبے دبے ، اگر میں ایک لفظ عرض کر سکوں تو ....

فان ربن ٹروپ : میں اس نفرت خیز اشتعال انگیزی کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا

مائسکی : مگر میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں ہے ۔

گرانڈی : صاحب میں یہاں اس تو تو میں میں کے لئے نہیں آیا تھا، میں جاتا ہوں۔

لارڈ پلائی متھ (انھیں روکنے کی کوشش کرتے ہیں) مسٹر گرانڈی، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جب تک دہیلوں کا مسئلہ طے نہ ہو جائے، آپ تشریف نہ لے جائیں۔

گرانڈی :۔ تو پھر مسٹر ہاسکی سے کہئے کہ زبان بند رکھیں۔

لارڈ پلائی متھ ! مسٹر ہاسکی، براہِ کرم آپ نہ بولیں

کوربیں ، چلو بھئی، جانے بھی دو، ہاسکی، واقعی ذرا ٹھنڈا لو۔ یہاں تو تمھارے سوا کسی اور کی آواز ہی سنائی نہیں دیتی۔

لارڈ پلائی متھ : ہاں، تو میں پھر عرض کرتا ہوں، کہ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فان ربن ٹروپ (جو پارلمانی تدبیروں سے خوب واقف ہیں) تو پھر، میری رائے یہ ہے کہ اس پر الیسٹر کی تعطیلات کے بعد بحث ہونی چاہیئے۔

لارڈ پلائی متھ : (سخت مایوسی کے ساتھ) لیکن ان بے شمار وہیلوں کا تو خیال فرمایئے جو اس دوران میں مر جائیں گی۔۔۔ ۔۔۔۔۔

کوربیں : (بلا قصد) جیسے کہ بہتیرے چھوٹے چھوٹے اسپینی بچے۔

گرانڈی ، فان ربن ٹروپ، اور مرن تائیر (ایک ساتھ اٹھ کر : بس حد ہو گئی، حد، یہ نہیں برداشت کیا جا سکتا (تینوں اٹھ کر کمرے سے نکل جاتے ہیں، اور دھڑ سے دروازہ بند کرتے ہیں۔)

لارڈ پلائی متھ (مسکرا کر) خیر اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بالآخر ہم اس مسئلے کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ اس دہیلوں کے مسئلے کی طرف جیسا کہ میں کہہ رہا تھا۔۔۔۔ ۔۔۔۔ (کوربیں اور ہاسکی بھی چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔ اور لارڈ پلائی متھ اپنی تقریر کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں) یہ دہیلوں کا مسئلہ ہمہ ۔۔۔ ۔ ۔ ۔۔۔۔ دہیلوں کا مستقبل۔۔۔۔۔ شدید نگرانی کی ضرورت۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ وقت آ گیا ہے۔ ۔۔۔۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔

مسلمان کانگریس اور مسلم لیگ

کانگریس میں شرکت کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے روز بروز اہمیت حاصل

کررہا ہے۔ ذیل میں ایک "قوم پرست مسلم" نے اسی موضوع

پر بحث کی ہے۔ اگر کوئی صاحب رائے بزرگ اس عنوان کے ماتحت

اپنے خیالات کا اظہار فرمانا چاہیں تو ہم بڑی خوشی سے شائع کریں گے

(ایڈیٹر)

جب سے فیض پور کانگریس نے عوام کے ساتھ رابطہ بڑھانے کا اعلان کیا ہے، کانگریس کے رہنماؤں خصوصاً جواہر لال جی اور اُن کے رفیقوں کی طرف سے اس بات کی کوشش کی جارہی ہے، کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلم عوام کو کانگریس میں شامل کیا جائے۔ اخباروں میں اس کی تائید میں زور دار مضامین نکل رہے ہیں۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے اس کی حمایت میں تقریریں کی جارہی ہیں۔ جواہر لال جی کی طرف سے اس سلسلے میں کئی بیانات شائع ہوچکے ہیں۔ کانگریس نے انتخابات میں کئی مسلمانوں کو کھڑا کیا اگرچہ ان میں سے اکثر ناکامیاب رہے۔ جھانسی کے مسلم حلقے کے ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدوار کے خلاف کانگریس نے اپنا امیدوار نثار احمد خاں صاحب شروانی کو بنایا' اور ان کے لئے نہایت سرگرمی سے کام کیا۔ کانگریس کے بڑے بڑے رہنما، مثلاً جواھر لال نہرو' پنڈت گوبند ولبھ پنت، خاں عبدالغفار خاں، مولانا حسین احمد، اچاریہ نریندر دیو، مسٹر رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر محمود اور بہت سے دوسرے رہنماؤں نے اس حلقے میں پہنچ کر رائے دہندگان کو نثار احمد خاں صاحب کے حق میں رائے دینے کی ترغیب دی۔ کانگریس نے اپنی بڑی قوت کو اس محاذ پر جمع کیا اور مسلم عوام کے اس فیصلہ کا تمام ہندوستان نے نہایت بے صبری سے انتظار کیا۔ لیکن مسلمانوں کا فیصلہ کانگریس کے امیدوار کے خلاف ہوا اور لیگ کے امیدوار مسٹر رفیع الدین منتخب ہوگئے

سوال محض ایک نشست یا چند نشستوں کا نہیں تھا بلکہ اصولی اور بنیادی سوال تھا۔ اب تک جتنے انتخاب ہوئے ہیں وہ جداگانہ حلقوں سے ہوتے رہے ہیں۔ مسلم حلقے مسلمانوں کے لئے مخصوص رہے ہیں اور ہندو حلقے ہندوؤں کے لئے۔ ہر فرقے نے اپنے حلقے کے کام کو ایک نجی اور ذاتی معاملہ سمجھا ہے، جس میں دوسرے فرقے کے لوگوں نے کبھی مداخلت نہیں کی۔ چنانچہ مسلمان حلقوں میں اب تک صرف مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ہی کام کرتی تھیں۔ اور اپنے فرقے میں جن افراد یا جماعتوں کو زیادہ طاقت حاصل ہوتی تھی اُن کے امیدوار منتخب ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن کانگریس اب ایک نئی روایت قائم کر رہی ہے۔ کانگریس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت ہے۔ اس لئے وہ پابندیاں جو فرقہ وار جماعتوں پر عاید ہوتی ہیں، اس پر عاید نہیں کی جا سکتیں۔ اسے مسلمان حلقے میں کام کرنے کا ایسا ہی حق حاصل ہے، جیسا اُسے ہندو حلقے میں ہے۔ کانگریس کے ہندو کام کرنے والے اپنے سیاسی و معاشی پروگرام کے نام پر مسلمانوں میں اسی طرح کام کر سکتے ہیں، جیسے اس کے مسلمان کام کرنے والے ہندوؤں میں کر سکتے ہیں۔ کانگریس مذہب کے نام پر رائے حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ وہ ایک سیاسی جماعت ہے۔ اس لئے اپنے سیاسی و معاشی پروگرام پر ووٹ حاصل کرتی ہے۔ اسے اس سے بحث نہیں کہ رائے دہندہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اگر وہ اس کے پروگرام سے متفق ہے۔ تو اُسے اُس کے امیدوار کو ووٹ دینا چاہئے۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب بلاشبہ دستور میں موجود ہیں۔ انتخاب مسلمانوں کی رائے سے مسلمان امیدوار ہی کا ہوگا۔ کانگریس کے نزدیک یہ باتیں بجائے خود ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن دستور دوسروں کا بنایا ہوا ہے اور انتخاب میں حصہ لینے کا کانگریس فیصلہ کر چکی ہے۔ اس لئے ان خرابیوں کو تو اسے فی الحال گوارا کرنا ہی پڑے گا۔ مگر قانون کے اندر رہ کر اس میں کچھ اصلاح کی جا سکتی ہے وہ تو کرنا ہی چاہئے۔ مثلاً ووٹروں کو مشورہ دینے اور اپنے مسلم امیدوار کے لئے کوشش کرنے سے ہندوؤں کو قانون منع نہیں کرتا۔ پھر جب یہ کوشش ہندو مذہب کا نام لے کر نہ کی جائے، بلکہ سیاسی اور معاشی پروگرام کو نمایاں کر کے، اور کانگریس کے مسلم رہنماؤں اور مسلم اراکین کے پورے اشتراکِ عمل کے ساتھ ہوتی ہو کی جائے تو دنیا کی نگاہ میں اس میں کوئی مذموم اور معیوب پہلو باقی نہیں رہتا۔ یہ تو کانگریس کی پوزیشن ہے۔

لیکن مسلم لیگ مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی کو یہ بات ناپسند ہے۔ وہ مسلمانوں کی سیاست میں کانگریس کی مداخلت گوارا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے نمایندے کو منتخب کرنا مسلمانوں کا نجی معاملہ ہے۔ کانگریس اُن کے نزدیک ایک غیر مسلم جماعت ہے، اس لئے کانگریس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی تنظیم، قوت، روپیہ، قابلیت، پریس اور اکثریت سے فائدہ اٹھاکر مسلمانوں کے انتخابات پر ناجائز اثر ڈالے۔ اُسے مسلمانوں سے کوئی رابطہ و تعلق براہ راست نہ پیدا کرنا چاہیئے، بلکہ اسے مسلمانوں کی مسلمہ سیاسی جماعتوں اور اُن کے رہنماؤں سے معاملہ کرنا چاہیئے۔ درحقیقت یہی لوگ سمجھوتہ اور صلح کرنے کے اہل ہیں کیونکہ یہ مساوی سطح پر رہ کر اور مسلمانوں کے مفاد کو پوری طرح سوچ سمجھ کر معاملہ کرسکتے ہیں۔ کانگریس کو ایسے لوگوں کی سرپرستی اور اُن سے معاملہ اور سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیئے جنھیں مسلمانوں کی جماعت میں کوئی اعتبار و اعتماد، عزت اور وقعت حاصل نہیں ہے اور جو محض اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ کانگریس سے گفتگو کرسکتے ہیں۔ جماعت کے نمایندہ بن کر نہیں کرسکتے۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ ایسے افراد کو کبھی بھی مسلمانوں کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا۔ اور جب مسلمانوں کے صحیح نمائندوں کو نظر انداز کرکے ایسے لوگوں کو وزارتوں میں شامل کیا جاتا ہے اور ان سے مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے اور ان کی رائے کو مسلم جماعت کی رائے تسلیم کیا جاتا ہے تو گویا دنیا کو دھوکا اور فریب دیا جاتا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس مسلمانوں سے من حیث الجماعت سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتی بلکہ چالاکی اور عیاری اور زور اور زبردستی سے انھیں اپنی بات تسلیم کرنے کے لئے مجبور کررہی ہے جو تحفظات مسلمانوں کو دستور میں دیئے گئے ہیں انھیں وہ دراصل ختم کرنا چاہتی ہے اور مسلم اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم کا پابند بنانا چاہتی ہے۔

جواہرلال جی اور ان کے کانگریسی رفقاء اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتوں خصوصاً مسلم لیگ اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ کو مسلم عوام کا صحیح نمایندہ تسلیم نہیں کرتے۔ وہ انھیں رجعت پسندی اور سرکار پرستی کا اڈا قرار دیتے ہیں اور زمینداروں، تعلقہ داروں، خطاب یافتوں اور سرکاری ملازموں کا آلۂ کار سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ ملک کے دوسرے باشندوں کی طرح مسلمانوں کو بھی انفرادی حیثیت کے ساتھ کانگریس میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ اس بنیاد پر کسی قسم کی جداگانہ جماعت بندی نہیں کی جاسکتی اور اگر کی جاتی ہے تو وہ محض چند خود غرض اور جاہ پسند لوگوں کے فائدہ کے لئے کی جاتی ہے جو مذہب کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھاکر عوام کو دھوکا اور فریب دیتے ہیں۔ اس فریب کو جس قدر جلد ممکن ہو ختم کردینا چاہیئے اور عوام کے سامنے معاملات کو صحیح روشنی میں پیش کرنا چاہیئے۔ عوام بھوکے اور ننگے ہیں۔ ان میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے لئے یہی مسائل سب سے زیادہ اہم ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ وارانہ جماعتیں ان اہم مسئلوں کو تو فراموش کردیتی ہیں البتہ مذہب تمدن اور زبان کی حفاظت کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتی ہیں۔ "پراگندہ روزی پراگندہ دل" جس غریب کی زندگی کا ہی کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہے وہ زبان و تمدن سے اپنی آتما کی آگ کو کیسے ٹھنڈا کرسکتا ہے۔

اس کے برخلاف کانگریس ان کی اس تباہ حالی کے اسباب بتلاتی ہے اور ان کے رفع کرنے کی تدبیریں پیش کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی ساری مصیبتوں کا سرچشمہ برطانوی سامراج ہے۔ جب تک یہ آکاش بیل موجود ہے ہندوستان کا کوئی پودا سرسبز نہیں ہوسکتا۔ مذہب تمدن اور زبان کی حفاظت اسی وقت کی جاسکتی ہے جب فراغت اور جمعیت خاطر ہو۔ جب تک یہ مفقود ہیں سب کام کم زور اور بے نتیجہ رہیں گے۔ پھر یہی نہیں بلکہ ہندوستان میں مذہب تمدن اور زبان کی ترقی میں بھی سب سے بڑی رخنہ اندازی غیر ملکی حکومت کی طرف سے ہورہی ہے جو کسی فرقے کو پنپنے نہیں دیتی اس لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس مشترک مصیبت سے کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کی جائے۔ ملکی آزادی اور خود مختاری حاصل کرنا اولین فرض ہے۔ ملک میں فی الحال دو سیاسی قوتیں برسرپیکار ہیں۔ ایک قوم پرست اور دوسری سرکارپرست۔ ان کے علاوہ کوئی تیسری قوت نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی کمزور جماعتیں ہوسکتی ہیں۔ افراد کے غیر متحد اور منتشر گروہ ہوسکتے ہیں۔ جاہ پرست اور خود غرض اشخاص اور ان کے حامیوں کا غول ہوسکتا ہے تمدن و مذہب کی حفاظت کے لئے ادارے ہوسکتے ہیں۔ لیکن جاندار طاقت ور واضح اور متعین سیاسی نصب العین رکھنے والی جماعتیں فی الحال صرف دو ہیں —— کانگریس اور برطانوی سامراج۔ اس لئے فی الحال کسی تیسری سیاسی جماعت کے قائم کرنے کا موقع

نہیں ہے۔ اس وقت سیاست میں شرکت کے معنی عملاً دو ہی ہو سکتے ہیں یا کانگریس کا ساتھ دیا جائے، یا حکومت کا یا پھر بے عملی اور کم ہمتی کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی کا ساتھ نہ دیا جائے، اور بیٹھ کر تماشا دیکھا جائے۔ مسلمانوں کی باعمل سیاسی جماعتیں یا تو ملک کی آزادی کی حامی ہو سکتی ہیں یا برطانوی سامراج کی۔ پہلی صورت میں انکے اور کانگریس کے اور دوسری صورت میں ان کے اور حکومت کے نصب العین میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس پوزیشن کو اگر تسلیم نہ بھی کیا جائے اور کہا جائے کہ نہیں ملک میں اور دوسری سیاسی جماعتیں بھی ہو سکتی ہیں تب بھی مذہب کو سیاسی معاملات سے علیحدہ رکھنا ہی مناسب ہے۔ مذہب اور سیاست کا اشتراک ساختی دفیوڈل، اور متوسط عہد کی یادگار ہے۔ یہ نصب العین موجودہ عہد میں اور کم از کم ہندوستان میں جہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے آباد ہیں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت ہے اور اس کا کوئی سیاسی نصب العین کانگریس کے نصب العین سے جدا ہے، تو اسے اپنے ہم مشرب اور ہم خیال لوگ ہندوؤں میں بھی بلاشبہ مل سکتے ہیں، اور اسے ان لوگوں کو اپنے درمیان ضرور شامل کرنا چاہیئے۔ اور اپنی سیاسی قوت کو اس طرح بڑھانا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ سیاسی نصب العین کا جہاں تک تعلق ہے۔ ہندو مہاسبھا یا لبرل لیگ اور مسلم لیگ کے نصب العین میں کوئی فرق نہ ہو۔ لہذا سیاسی معاملات میں ان جماعتوں کو باہم متحد ہو جانا چاہیئے۔ رہے مذہبی اور تمدنی معاملات سو اگر کچھ ایسے معاملات ہیں جن کا تحفظ کانگریس کے بنیادی حقوق کے رزولیوشن سے نہیں ہوتا تو ان کے تحفظ کی کوشش کو مذہبی اور تمدنی جماعتوں اور اداروں کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے جو زیادہ موثر اور معقول طریقے پر اپنے حقوق کی پیروی خود کر سکتی ہیں۔

لیکن جو مسلمان مذہبی بنیاد پر سیاسی جماعت بندی کے قائل ہیں وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ عوام بھوکے اور ننگے ہیں ملک میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی انہیں مذہب جان سے زیادہ عزیز ہے وہ نہ صرف مذہب بلکہ مذہبی توہمات کے لئے پروانوں کی طرح جانیں نثار کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی کی جزئی تفصیلات پر مذہب کا رنگ پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی تحریک کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے کانگریس کو اسے مذہبی رنگ دینا پڑا۔ اور

سیاست پر مذہب کے اس اثر نے مذہبی احساس کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا۔ سیاسی آزادی کو مذہبی آزادی کے مطلب میں پیش کیا جانے لگا، اور ہندو اور مسلمان اس کا مفہوم اپنے تمدن و مذہب کی ترقی اور احیاء اور اپنے فرقے کا اقتدار سمجھنے لگے۔ پھر چونکہ تاریخی اعتبار سے مسلمان ہندوؤں پر حکومت کر چکے ہیں اور تاریخ کو جس رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں ہندوؤں کو کافی ذلیل و خوار کیا۔ (محکومیت خود ایک ذلت ہے) اس لئے مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دلوں میں طالب علمی کے زمانے سے ایک دلی نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ انگریزوں کی طرح مسلمانوں کو بھی غیر ملکی فاتح سمجھتے ہیں اور دونوں کے ناپاک اثر سے ملک کو آزاد کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان اس کے برعکس اس زعم میں کہ جب ایک دفعہ حکومت کی ہے تو دوبارہ بھی کی جاسکتی ہے مسلم راج کے خواب دیکھتے ہیں لیکن خود چونکہ اکثر صوبوں میں اقلیت میں ہیں اور جاہل اور نادار ہیں اس لئے بیرونی امداد پر نظر رکھتے ہیں کہ افغان یا ترک بلکہ فلسطین اور شام و مصر کے عرب ہندوستان میں مسلم راج قائم کریں گے۔ اور جب تک وہ نہیں آتے برطانیہ سے اپنے حقوق کا تحفظ کرانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہندو فرقہ پرست غیر ملکی حملہ آوروں کے خوف کی وجہ سے جب تک ان میں پوری طاقت نہ آجائے مکمل آزادی لینا نہیں چاہتے بلکہ برطانیہ سے تعلق باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

جس ملک میں مذہبی احساس قوی ہو اور رواداری مفقود ہو وہاں مذہب کی اس رقابت اور تعصب کا اثر سیاسی اور معاشی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور اقلیت کے محض تمدنی و مذہبی اور لسانی حقوق کا تحفظ کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کو سیاسی اور معاشی تحفظات کی بھی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہندوستان میں آئے دن ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں اور ایک ہی ملک کے دو رہنے والے جس بے رحمی اور درندگی کے ساتھ اپنے پڑوسیوں کا خون محض مذہب کے اختلاف کی وجہ سے بہاتے ہیں اور جس طرح تعدی اور حب الوطنی کو بالائے طاق رکھ کر مذہبی جانب داریوں سے کام لیتے ہیں وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ اس وقت تو ایک بیرونی طاقت موجود ہے جو ملکی فریقین کو حدود سے متجاوز نہیں ہونے دیتی اور ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتی ہے لیکن جب فریقین میں سے خود ایک فریق کا عدالت کی کرسی پر قبضہ ہوگا اس وقت

کہاں تک اپنے مذہبی تعصب کو دبا سکے گا یہ مسئلہ ایسا ہے جس کے بارے میں گذشتہ تجربے سے کوئی امید افزا رہنمائی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کو ہندو حاکمانِ عدالت اور سرکاری عہدہ داروں، دفتر کے محرروں بلکہ ڈاکخانہ اور ریلوے کے ملازموں، اخباروں اور رہنماؤں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ جب کبھی ہندو مسلم سوال پیدا ہوتا ہے، وہ فرقہ پروری سے کام لیتے ہیں اور مسلمانوں کو ملزم ثابت کرنے اور انھیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ملک میں ایسی انجمنیں بھی موجود ہیں اور اُن کا اثر تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے اور ان کے رکن ملک کے نہایت معزز اور با اقتدار تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگ ہیں جو علی الاعلان اپنا مقصد یہ بیان کرتی ہیں کہ مسلمانوں کا نام ونشان ہندوستان سے مٹا دیا جائے۔ مہاسبھا کی تحریک موجود ہے۔ ہندی تحریک جاری ہے۔ خود کانگرس میں فرقہ پرست ہندو موجود ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو مستقبل کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے شہری حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور ضمانت چاہتے ہیں۔

محض لوگوں کے چیخ چیخ کر یہ کہنے سے کہ مذہب کی اہمیت کا زمانہ ختم ہوگیا اس بات کا یقین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عملاً اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ روزمرہ کی عملی زندگی کے فیصلے بے سروپا اور خیالی باتوں سے نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ان سے تسلی اور تسکین نہیں ہوسکتی۔ آپ کا یہ کہنا کہ صرف روٹی کا سوال اہم ہونا چاہئے کافی نہیں ہے کیونکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ لوگ پیٹ سے زیادہ اہم مذہبی باتوں کو سمجھتے ہیں اور اس کے لئے اپنا جان ومال ہر وقت نثار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مسجدوں، مندروں، دریاؤں کے گھاٹوں یا تراؤں اور اشنان کے میلوں میں کروڑوں آدمی روز مذہبی عقیدت کے ساتھ جاتے آتے ہیں۔ زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی بات میں مذہب کا اثر نمایاں ہے۔ انتخابات میں مذہب کے نام پر جو امیدوار کھڑے کئے گئے وہ کامیاب ہوئے اور سیاسی و معاشی پروگرام پیش کرنے والے امیدوار ناکام رہے۔ اس لئے یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مذہب کا زمانہ ختم ہوگیا۔ حقائق کو سامنے رکھ کر معاملات کا فیصلہ کیجئے۔ محض خیال پرستی اور مستقبل کے امکانات پر لوگوں کو اپنے جائز حقوق قربان کرنے کے لئے آمادہ نہ کیجئے کیونکہ اگر آپ ایسا کریں گے تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ آپ دوستی کے پردے میں دشمنی کر رہے ہیں۔

غرض کہ مسٹر جناح اور اُن کے طرف داروں اور پنڈت جواہر لال اور کانگریسیوں کی طرف سے اس قسم کے مباحثے کا ایک سلسلۂ لامتناہی جاری ہے۔ میں نے مسئلے کے پس منظر کو واضح کرنے کے لئے ذرا تفصیل کے ساتھ فریقین کی آرار اور افکار کو بیان کیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں اس مسئلے پر اپنی رائے کا بھی اظہار کردوں۔

میں مسئلے کی باریکیوں اور پیچیدگیوں میں الجھنا نہیں چاہتا نہ غیر متعلق بحثوں میں پڑنا چاہتا ہوں میں عملی پہلو سے مسئلے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ جب ہر چہار طرف ہماہمی، زندگی اور حرکت کا دور دورہ ہو، مسلمان جمود کی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ اگر وہ رہنا بھی چاہیں تو نئے حالات اور واقعات انھیں حرکت کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ انھیں ذاتی مدافعت اور تحفظ کے لئے حرکت کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ تعطل اور جمود کے معنی بربادی اور موت کے ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمان تین کام کرسکتے ہیں۔ یا تو جو قوتیں یورش کر رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ متحدہ طور پر یا مختلف قوتوں کے ساتھ فرداً فرداً شامل ہوکر آگے بڑھیں۔ یا اپنے لئے ایک نئی راہ نکالیں اور دوسری قوتوں کو اپنے اندر جذب کرکے آگے بڑھیں، یا اپنی موجودہ جگہ پر ایک چٹان یا آہنی دیوار کی طرح مضبوطی کے ساتھ کھڑے رہیں اور تمام مخالف قوتوں کا تن تنہا مقابلہ کرتے رہیں کہ پھر ان کے اس طرح پڑے رہنے کو لوگ جمود اور تعطل نہیں کہیں گے بلکہ مدافعتی اقدام و حرکت سے تعبیر کریں گے۔ بہرحال یہ تین راہیں ہیں ——— تیسری راہ کو میں سب سے پہلے لیتا ہوں۔ کیوں کہ اس کے متعلق مجھے سب سے کم کہنا ہے۔ اس راہ کو وہی لوگ اختیار کرسکتے ہیں جو اپنے موجودہ املاک اور مقبوضات کا تحفظ ضروری سمجھتے ہوں۔ یہ موجودہ نظم و انتظام میں مسلمانوں کو من حیث الجماعت کچھ ایسے امتیازی حقوق حاصل نہیں ہیں کہ جن کے پامال ہو جانے کا نئے انتظام میں اندیشہ ہو۔ چند زمیندار اور وہ مقروض، چندنا جن کی حالت کچھ مضبوط نہیں، اور چند حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار جو اپنی پوری تنخواہ مہینے کے پہلے ہی ہفتہ میں بلوں کی ادائیگی پر صرف کر دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ بقیہ بل کس طرح ادا کریں ——— یہ مسلمانوں کے طبقۂ امرار کی کل کائنات ہے۔ باقی سب جمہور ہیں۔ ان کی حالت کو کوئی بھی نیا انتظام

موجودہ حالت سے پست تر نہیں کر سکتا۔ ان کا سب سے زبردست مال و متاع اُن کی وہ زنجیریں ہیں جو انھیں پابند کئے ہوئے ہیں۔ انھیں کو ان سے چھینا جا سکتا ہے۔ ان کے پاس دوسری اور کوئی چیز ضائع کرنے کے لئے نہیں۔ اس لئے تبدیلی اور حرکت کا اُن سے زیادہ کون خواہاں ہو سکتا ہے۔ ان کا قیام اور عدم حرکت کسی لالچ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ خاص کاہلی، کم ہمتی اور بزدلی کی وجہ سے ہے۔ کاہلی دور کیجئے جوش دلایئے یہ ضرور آگے بڑھیں گے۔

اس بات سے برطانوی مدبر اور سیاست داں بہت چراغ پا ہوں گے۔ سر آغا خاں کو بھی غالباً غصہ آئے گا کہ نصف صدی کی پیہم اور مسلسل کوشش کا یہ نتیجہ نکلا! بات دراصل یہ ہے کہ یا تو بیج شور زمین میں ڈالا گیا، یا بیج بونے والوں نے سڑا ہوا بیج بویا۔ بہرحال سبب جو کچھ بھی ہو نتیجہ یہی برآمد ہوا ہے۔ ایم اے او کالج، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، اصلاحِ تمدن و معاشرت کی کانفرنس، ہر ضلع میں مسلم ہائی اسکول آل انڈیا مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی، تنظیم کانفرنس، تبلیغ کانفرنس، آل انڈیا مسلم کانفرنس۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب، ملازمتوں میں نمائندگی کا تحفظ، مخصوص نامزدگیاں، وزارت میں تناسب سے زیادہ شرکت، سیکڑوں ہندو مسلم فسادات، کمیونل ایوارڈ اور ہزاروں اور چھوٹی چھوٹی رعائتیں —— سب کا ماحصل یہی ہے اور مسلمانوں کے لئے جیسے [illegible]ء میں غیر مطمئن یا مطمئن ہونے کا موقع تھا ایسا ہی [illegible]ء میں بھی ہے۔ ان کے لئے ان تمام مقویات میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی قلب ماہیت ان چیزوں میں سے کسی سے نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ اپنی سخت جانی کی وجہ سے تو بے شک انھیں کنزرویٹو پارٹی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے پاس کنزرو کرنے یعنی محفوظ رکھنے کے لئے درحقیقت کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ ان کی اکثریت تو ہمیشہ کی انقلابی ہے، اور اب بھی جب کبھی موقع ملے گا انقلابی ہی بن سکے گی ورنہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو بیٹھی ہی ہے۔ اس لئے ان سے یہ توقع کرنا کہ یہ ہمیشہ اپنی موجودہ جگہ پر چٹان اور پہاڑ کی طرح کھڑے رہنا پسند کریں گے فضول ہے۔

اب رہ گئے دو باقی ماندہ راستے۔ ان میں سے دوسرے راستے یعنی اپنے لئے ایک نئی راہ نکالنے اور دوسری قوتوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے ایک عرصے سے کوششیں جاری ہیں۔ سید

جمال الدین افغانی نے اتحادِ اسلامی کی تحریک اُٹھائی۔ مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، غرضکہ سنہ ۱۹۲۰ء کے تقریباً تمام ہی مسلمان لیڈروں نے خلافت اور اتحاد اسلامی کی راہ کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ مسلمان عوام نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ان تحریکوں کا خیر مقدم کیا۔ اور اپنی بساط کے مطابق ہر قسم کی جانی اور مالی قربانیاں ان کے لئے کیں۔ ترکی کو میڈیکل مشن بھیجے۔ خلافت کی تحریک میں شورش و ہنگامہ برپا کر کے انگریزوں کو پریشان کیا۔ ملک سے ہجرت کی۔ موپلاؤں کی بغاوت ہوئی غرضکہ خوب جوش و خروش دکھلایا گیا۔ لیکن ہندوستان کی سیاست میں کس طرح حصہ لیا جائے اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات کو روا رکھا جائے، اس کا تعین نہ ہو سکا۔ خلافت کے مسئلے پر ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ اخباروں کے کالم، رسالوں کے صفحات اور لوگوں کے دماغ اس لٹریچر سے معمور کر دئے گئے۔ لیکن برادرانِ وطن جس چیز کے لئے شورش کر رہے تھے یعنی سوراج اس سے عامۃ المسلمین کو واقف کرنے اور دلچسپی پیدا کرانے کی زحمت بہت کم لوگوں نے گوارا کی۔ اسی لئے ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کی جو پوزیشن ہونی چاہیئے وہ کسی پر پوری طرح واضح نہ ہو سکی۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے ریفارم ایکٹ پر ملک میں عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی تحریک خالص سیاسی آزادی کی تحریک تھی۔ لیکن ہماری تحریک قیام خلافت اور آزادی جزیرۃ العرب کے لئے تھی۔ گویا تقسیم عمل یہ کی گئی تھی کہ سوراج ہندو لے لیں اور ہمیں ترکی کا خلیفہ مل جائے اور ہمارے مقاماتِ مقدسہ عربوں کے ہاتھوں میں رہیں۔ یہ ہو جائے تو پھر مسلمان مطمئن ہیں اور انھیں کچھ اور نہیں چاہیئے۔ شاعر نے اس شعر میں ؎

از صحن خانہ تا بہ لب بام از آنِ من
از سقف خانہ تا بہ ثریا از آنِ تو

جب حصہ تقسیم کیا تھا تو خاکساری سے کام لیتے ہوئے اپنے لئے صرف گھریلو چیزیں رکھی تھیں اور پوری فیاضی کے ساتھ باقی تمام چیزوں کو اپنے شریک کے حوالے کر دیا تھا۔ ہم نے اس کے بالکل برعکس کیا ہم نے آسمان کی سب چیزیں تو خود لے لیں اور زمین کی چیزوں کو اپنے برادرانِ وطن کے لئے چھوڑ دیا۔

آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما!

آج کل بھی مسلمانوں میں شورشیں ہوتی ہیں تو مسجد شہید گنج کے لئے جلسے کئے جاتے ہیں تو قادیانیوں کے خلاف اور مدح صحابہ کی تائید میں۔ پھر یہ ہنگامے بھی وقتی اور موسمی ہوتے ہیں۔ پھلجھڑی کی طرح کچھ دیر بہار دکھا کر ختم ہو جاتے ہیں اور اپنا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑ جاتے۔ کوئی واضح سیاسی نصب العین متعین ہونے نہیں پاتا، کوئی منظم مستقل اور مضبوط جماعت یا ادارہ نہیں بنتا۔ مسلمانوں کے افراد جیسے پہلے منتشر تھے ویسے ہی بعد میں بھی رہتے ہیں۔ اور ان تحریکات کے ردعمل سے لوگوں میں ایک مایوس کن بے حسی لاپروائی اور غیر ذمہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔

اس وقت لے دے کر مسلمانوں کا اگر کوئی واقعی سیاسی ادارہ ہے تو وہ مسلم لیگ ہے لیکن اس کی تنظیم جس قدر ناقص، اس کی لیڈرشپ جس قدر بودی اور پھسپھسی، اس کا نصب العین جس قدر کورا اس کے عناصر جس قدر غیر ہم آہنگ، اس کی رکنیت اور حلقۂ اثر جس قدر محدود اور غیر یقینی، اس کی آواز جس قدر کم زور اور اس کی جدوجہد جس قدر بے اثر ہے وہ شاید آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے لئے بھی باعثِ شرم ہوگی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری قوتوں کو اپنے اندر جذب کرنا تو کجا خود اپنے عناصر کو باہم متحد نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے ایک طاقت ور قوت بن کر اپنے واسطے ایک الگ سیاسی راہ نکالنے سے بالکل قاصر ہیں۔ یہ بات تلخ ہے، ناگوار معلوم ہوتی ہے لیکن ہے بہرحال حقیقت۔ اس وقت ضرورت حقیقتوں کو سامنے رکھنے کی ہے۔ ہم نے خیال پرستیوں میں بہت زمانہ گذار دیا۔ اب بھی موقع ہے کہ سنبھل جائیں اور بے نتیجہ کاموں میں اپنی قوتوں کو ضائع نہ کریں۔

اس راہ سے بھی مایوس ہونے کے بعد اب تیسری راہ یہ رہ جاتی ہے کہ ملک میں جو قوتیں ترقی پا رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ متحدہ طور پر یا مختلف قوتوں کے ساتھ فرداً فرداً شرکت کی جائے یہ ظاہر ہے کہ سیاسی فرقہ بندیوں کا جو موجودہ انداز ہے اس کے پیش نظر مسلمان من حیث الملت کسی ایک سیاسی جماعت کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتے۔ ان میں سے جو سوشلسٹ خیال کے ہیں وہ سوشلسٹ کے ساتھ ملیں گے اور جو کنزرویٹو یا برطانیہ پرست ہیں وہ کنزرویٹو جماعت اور برطانیہ کے شریک ہوں گے۔ یہ ناگزیر ہے۔ موجودہ صورتِ حالات میں اس رجحان کو کوئی قوت نہیں بدل سکتی۔ سیاسی

معاملات میں مسلمانوں میں افتراق اور انتشار ضرور ہوگا چنانچہ یہ نہایت تیزی سے شروع بھی ہوگیا ہے ۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ انفرادی حیثیت سے کانگرس میں شرکت کر رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔ لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ تمدنی اور مذہبی معاملات میں بھی اگر ان کو سیاست سے علیحدہ رکھا جائے یہی انتشار ظاہر ہو ۔ سیاسی حیثیت سے مختلف الخیال مسلمان مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے تحفظ کے لئے باہم مشترک ہو سکتے ہیں اور اگر خالص تمدنی اور مذہبی اداروں کو غیر سیاسی اصولوں پر چلایا جائے تو یہ چل بھی سکتے ہیں ۔ چنانچہ اس قسم کے کچھ ادارے مسلمانوں میں موجود ہیں جن کے ساتھ سب کو ہمدردی ہے ۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر مسلمان سنجیدگی سے اس بات کی خواہش کریں تو ملک کے ہر صوبے ضلع اور دیہات میں اس قسم کے اور بہت سے اداروں کی گنجائش نکل سکتی ہے اور ان کی موجودگی میں مسلمانوں کے تمدن مذہب اور زبان کی پوری حفاظت ہو سکتی ہے ۔

اب رہا اس بات کا اندیشہ کہ چونکہ ہندو اکثریت میں ہیں اور چونکہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات ایک عرصے سے نہایت ناخوش گوار چلے آ رہے ہیں اس لئے ہندوؤں کو حکومت کا اقتدار ملنے کے بعد اس بات کا پورا موقع مل جائے گا کہ مسلمانوں کے مذہب، تمدن اور زبان کو فنا کر دیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں جہاں وہ اکثریت میں ہیں اور جب تک ڈیماکریسی کا کام اکثریت کے فیصلے سے ہوتا ہے وہ موقع تو انھیں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی جماعت بندی کے بعد بھی ایسا ہی حاصل رہے گا، جیسا کہ ان کی جداگانہ سیاسی جماعت بندی نہ ہونے کی حالت میں ہوگا ۔ کیونکہ مسلمانوں کی تعداد بہر حال جداگانہ جماعت بندی کے بعد بھی اتنی ہی رہے گی جتنی پہلے تھی ۔

رہا سوال مناسب احتجاج کا تو وہ جداگانہ تمدنی تنظیم کے ذریعے بھی اتنے ہی شد و مد کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جتنا جداگانہ سیاسی جماعت بندی کے ذریعے ۔ بلکہ میرے خیال میں تمدنی تنظیم کا اثر زیادہ وسیع اور اس میں سیاسی پیچیدگیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمی کا امکان نسبتاً کم اور وسیع المشرب ہندوؤں کی ہمدردی حاصل کرنے کا امکان نسبتاً زیادہ ہوگا ۔ جب مسلمانوں کے دوسرے مذہب والوں سے سیاسی تعلقات خوش گوار ہوں گے تو وہ تمدنی اور مذہبی معاملات میں بھی ان سے تعلقات

بگاڑنا نہ چاہیں گے۔ اور رواداری سے کام کریں گے۔ چنانچہ جن جن غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعتوں میں مسلمان شامل ہیں اور اپنا کام وہاں خلوص اور دیانت سے انجام دیتے ہیں ان میں ان کے جذبات کا پورا احترام کیا جاتا ہے۔ تعصب کی جتنی مثالیں پیش کی جاتی ہیں وہ ان ہی جگہوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں جہاں سرکار برطانیہ کا اقتدار غالب ہے۔ قومی حلقوں میں یہ وبا بہت کم ہے اور جتنی زیادہ تعداد میں مسلمان ان میں شرکت کریں گے اور ان کی آواز وہاں اہمیت حاصل کرتی جائے گی، اتنی ہی ان کی پاسداری زیادہ کی جائے گی۔ چنانچہ اردو ہندی کے مسئلہ پر مہاتما گاندھی کے تازہ ترین بیانات اُن کے پچھلے بیانوں کے مقابلے میں زیادہ رواداری پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی اور صدہا مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں

نتیجہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے جداگانہ جماعت بندی نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ مذہبی اور تمدنی اغراض کے لئے اپنی تنظیم ضرور کرنا چاہیئے۔

[redacted]

رفتارِ عالم

مصر | ہمارا خیال تھا کہ تنسیخ مراعات کانفرنس کی کارروائیاں، بالتفصیل نہیں تو اختصار کے ساتھ ضرور اُردو اخبارات میں آجائیں گی، اسی لئے گذشتہ اشاعت میں مراعات کی تنسیخ پر ایک مختصر سا تبصرہ کافی سمجھا، لیکن اُردو اخبارات نے ضمنی تذکرہ کے سوا، مراعات پر بہت کم لکھا ہے اس لئے ضروری ہوا، مانترو کانفرنس کا ایک خلاصہ جامعہ میں شائع کردیا جائے۔

مراعات کی بلا مصر پر سولھویں صدی میں نازل ہوئی تھی، دنیا کا یہ واحد ملک ہے جہاں اتنے طویل عرصہ تک مراعات کا سلسلہ اپنی مکمل صورت میں جاری رہا در یں صورت کہ تمام متعلق طاقتیں یہ یقین رکھتی تھیں کہ مراعات کی بیڑیاں وقت کے تقاضے، زمانہ کی فضا، جمہوریت کے اصول کے سراسر منافی اور مصری حکومت کی ترقی میں سد راہ ہیں،

مراعاتی نظام کی ابتدا ترکی خلفا کے عہد میں ہوئی جنھوں نے مخصوص عیسائی حکومتوں کی رعایا کے لئے اپنے دائرہ سلطنت میں بعض داخلی آزادیاں نوازش فرمائی تھیں، مشہور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم نے جامعی تقاریر میں، ترکی کے اسباب زوال کی فہرست گناتے ہوئے ان مراعات کا بھی ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ "سلطنت کی معاشی بربادی کی رفتار کو تیز اور اس کی نحوستوں کو وسیع کردینے والی چیز یہ "مراعات" ہی تھیں، ترکوں کے قسطنطنیہ کو فتح کرنے سے پہلے بازنطینی سلطنت نے بھی غیر ملکیوں کو یہ حقوق دے رکھے تھے بحیرہ روم کے کنارے جتنے خطے واقع ہیں ان سب میں مختلف قومیں آباد ہیں اور سب تجارت پیشہ ہیں۔ ایسے ملکوں میں جہاں رسم و رواج اور تمدن میں اس قدر اختلاف ہو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ سب کے تحفظ کا انتظام کیا جائے اور ہر قوم اجتماعی مفاد کے لئے تھوڑی بہت قربانی کرے۔ غرض ایشیائے کوچک میں غیر ملکیوں کے

مخصوص حقوق تجارتی اور معاشی حیثیت سے ضروری تھے۔" پھر براؤن کی کتاب " ترکی میں غیر ترکی" کا حوالہ دیتے ہوئے بتلایا "عثمانی ترک جو بازنطینی سلطنت کے جانشین ہوئے اتنے قوی تھے کہ اگر چاہتے تو ان انتظامات کو منسوخ کردیتے۔ اس لئے ان کا ان حقوق کی توثیق کرنا نہ صرف ان کی رواداری کا بلکہ ان کی مصلحت شناسی کا بھی ثبوت ہے ...... سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۴ء میں اہل جنیوا کے حقوق کی توثیق کی، سلیمان[۵۱] اعظم نے ۱۵۳۵ء میں فرانس سے دوستی اور تجارت کا معاہدہ کیا اور اس کے بعد[۵۲] اور ریاستوں سے بھی تجارتی معاہدے کئے گئے۔ ان سے دونوں فریقوں کو فائدہ پہنچا اس لئے کہ دونوں کو اپنے مال کے لئے بازار کی ضرورت تھی۔

مگر جب عثمانی سلطنت کمزور ہوگئی تو ان حقوق کی جو ابتدا میں صرف تجارتی حقوق تھے، صورت بدل گئی، ترکوں کی ہر شکست کے بعد ہر فتح پانے والی قوم مراعات میں اپنے لئے ایک نئی

---

۵۱ سلیمان اعظم قانونی جس نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ شارلکان (اپنے وقت کا سب سے بڑا یورپی بادشاہ) کے مقابلہ میں فرانس کی مدد کی تھی، فرانس سے ایک دوستانہ تجارتی معاہدہ بھی کرلیا تھا، اس کی رو سے فرانسیسی تاجروں کو قلمرو عثمانیہ میں خاص مراعات حاصل ہوگئی تھیں۔

۵۲ سلطان سلیم ثانی نے فرانس کے ساتھ عہد سابق کی تجدید کی اور اس کے سفیر کو حق دیا کہ وہ فرانسیسی قیدیوں کو جو ترکی غلامی میں ہوں آزاد کرسکتا ہے۔ نیز تمام فرانسیسیوں پر سے جو عثمانی حکومت کے دائرہ اثر میں تھے، شخصی خراج اٹھادیا گیا، فرانسیسی کشتیاں محفوظ قرار دی گئیں اور جن کے نقصان کی تلافی حکومت عثمانیہ نے اپنے ذمہ لی، ان مراعات سے سواحل بحر روم پر فرانسیسی تجارت کو آزادی مل گئی۔ احمد اول کے زمانہ میں ہالینڈ کے ساتھ تجارتی معاہدہ ہوا اور جو مراعات فرانس کو دی گئی تھیں اس کے تاجروں کو بھی دی گئیں۔ اور فرانس کے حقوق میں کچھ اور اضافہ کردیا گیا اور پھر رفتہ رفتہ انگلستان، ہنگری، آسٹریا، سویڈن، سسلی، ڈنمارک، پرشا، اسپین، روس، امریکہ، بلجیم، جرمنی، پرتگال، اور یونان سب ہی نے مراعات حاصل کرلیں۔

دفعہ کا اضافہ کر دیتی تھی اور حکومت اس کو مجبوراً منظور کرتی تھی، اور پھر یہ حقوق صرف تجارت تک محدود نہیں رہے بلکہ عدالتی اُمور پر بھی حاوی ہو گئے۔ غیر ملکی لوگ اپنے مقدمات کے فیصلے کے لئے علیحدہ علیحدہ عدالتوں کا مطالبہ کرنے لگے یہاں تک کہ ترکی سلطنت کی رعایا میں سے بعض عیسائی فرقوں نے ان امور میں دوسری ریاستوں کی حمایت حاصل کر لی۔ اگر ان کا کوئی شخص عثمانی رعایا میں سے کسی شخص کو زدوکوب کرے تو مقدمے کا فیصلہ غیر ملک کے قنصل کی عدالت میں ہوتا تھا۔ اگر کہیں عثمانی رعایا میں سے کسی نے ان کے کسی آدمی پر ہاتھ اُٹھایا تو یہاں تک نوبت پہنچتی تھی کہ غیر ملکی جہازوں کے بیڑے باب عالی پر دباؤ ڈالنے کے لئے آ پہنچتے تھے اس کے علاوہ جہاں باب عالی نے کوئی نئی اقتصادی پالیسی اختیار کرنی چاہی تو وہ حکومتیں جن کی رعایا کو یہ خاص حقوق حاصل تھے فوراً مداخلت کرتی تھیں، بغیر ان کی مرضی کے کوئی تجارتی محصول عاید یا منسوخ نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ کسی جگہ ریل بنائی جا سکتی تھی۔ خواہ اقتصادی یا جنگی مصلحت سے کتنی ہی سخت ضرورت کیوں نہ ہو، پھر یہ مصیبت تھی کہ ان حکومتوں میں اکثر معاملات پر اتفاق رائے بھی نہیں ہوتا تھا۔"

مصر سلطان سلیم اول کے زمانہ میں مملکت ترکی میں شامل ہوا تھا اور ترکی کے ہر دوسرے علاقہ کی طرح یہاں بھی مراعات دی جاتی رہیں۔

جنگ عظیم کے بعد خود ترکی میں ان مراعات کا نام ونشان تک مٹ گیا، لیکن مصر چونکہ اب ترکی سے الگ تھا، اس لئے برطانوی اقتدار کے طفیل میں " نیل کا یہ فیضان" بڑی فیاضی کے ساتھ جاری رہا اور یہی نہیں بلکہ ۱۹۳۱ء میں ایک معاہدہ کے ذریعہ ان مراعات کی مدت غیر محدود عرصہ کے لئے بڑھا دی گئی۔

مصر میں مراعاتی ملکوں کی رعایا جن پابندیوں سے آزاد تھی ان میں ایک ٹیکس[۵] کسٹم اور ڈیوٹی اس

---

۵ مراعاتی ملکوں نے اپنی رعایا کے لئے جن محصولوں کی اجازت دی تھی وہ صرف دو ہیں ۱۔ مکان کا ٹیکس اور ۲۔ زمین کا ٹیکس، لیکن چونکہ یہ لوگ عام طور مکان اور زمین پر روپیہ ہی نہیں لگاتے، اس لئے ان مدوں کی آمدنی بہت کم ہے۔

میں شامل نہیں ہیں، بھی تھا، اِلّا یہ کہ متعلقہ حکومت خود راضی ہو، حکومت مصر ان اجنبیوں کو نہ رہنے بسنے سے روک سکتی تھی، اور نہ اس کو گرفتاری و جلاوطنی کا اختیار تھا، اور اس سے زیادہ یہ کہ یہ لوگ شہری حقوق میں صرف اپنے ملک کے قانون کے پابند تھے، گویا مصر میں ایک ہی حکومت کے اندر درجنوں مختلف قانون جاری تھے، جب قانون اس کثرت سے ہوں تو عدالت کی وحدت کیسی کافی ہوتی، بالآخر قنصلی عدالتوں کی ابتدا ہوئی (ہر ملک کے قونصل کے زیرِ نگرانی مقدمات فیصل ہوتے) ان عدالتوں کو ہر قسم کے مقدمات کی سماعت کا حق تھا خواہ وہ دیوانی ہوں یا فوجداری؛ لیکن ان عدالتوں نے مقدمات میں بڑی الجھن پیدا کر دی۔ فریقین اگر ایک ہی ملک کے ہوں تب تو کوئی دقت نہ تھی، لیکن جب دو مختلف ملکوں سے متعلق ہوں تو فیصلہ کس قانون سے ہو؟ اس لئے مخلوط عدالتیں وجود میں آئیں (۱۸۷۵ء) تاکہ قنصلی عدالتوں کی بے شمار خرابیوں کا انسداد کریں۔ تمام مقدمات فوجداری، دیوانی اور تجارتی اب مخلوط عدالتوں کی طرف منتقل کر دئے گئے، جہاں ہر قوم کا اپنا منصف[۹۱] فیصلہ کرتا۔ یہ عدالتیں جہاں تمام غیر ملکی رعایا کی تجارتی اور دیوانی مقدمات فیصل کرتی ہیں وہاں وہ تنازعات بھی ان ہی کے پیش ہوتے ہیں جو اجنبیوں اور مصریوں کے درمیان پیش آتے، مخلوط عدالتوں کو یہ بھی حق تھا کہ وہ اجنبیوں کے مسائل میں مصری قوانین کو مسترد کر دیں۔ اگرچہ مخلوط عدالتیں غیر معمولی طور پر اچھا کام کر رہی تھیں لیکن مراعات کا دیو، مصر کی بڑھتی بیداری اور مکمل خود مختاری میں حائل تھا، اور حکومت

---

۹۱ ان عدالتوں کے جج ساری عمر کے لئے مقرر کئے جاتے تھے اور مصری حکومت ان کا تمام صرفہ برداشت کرتی تھی، عموماً تمام مراعاتی ملکوں کو اپنے منصف کے نام تجویز کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ بعض اوقات غیر مراعاتی ملکوں کے نمائندے بھی مقرر ہو جاتے تھے۔ منصفوں کی تعداد اصل میں ۲۴ مقرر ہوئی تھی (۱۶ غیر ملکی ۸ مصری) لیکن غیر معین طور پر اس میں اضافہ کیا جا سکتا تھا تاکہ غیر ملکی منصفوں کا تناسب مصری منصفوں کے مقابلہ میں بے اثر نہ ہونے پائے، ۱۹۳۲ء کے شروع میں ان منصفوں کی تعداد ۷۰ تھی (۴۸ غیر ملکی، ۲۲ مصری) مدیر عدالت کا غیر ملکی ہونا ضروری تھا۔

کے لئے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ اجنبیوں پر قانوناً محصول عاید نہیں کر سکتی تھی، اور اس پابندی کی وجہ سے اسے مصریوں سے محصول وصول کرنے میں اور نئے محصول عاید کرنے میں بڑی دقتیں پیش آتیں، اور یہ کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ امیر طبقہ (غیر ملکی تجار وغیرہ) تو محصول سے یکسر مبری ہو اور ملک کے غریب طبقہ (مصری) پر محصول پر محصول بڑھاتے چلے جائیں' برطانوی مصری معاہدہ[۹۱] کے بعد مصر کی "مکمل آزادی" یعنی جمعیت اقوام کی رکنیت کے لئے صرف یہ مراعات ہی ایک رکاوٹ رہ گئی تھی۔ اس لئے ان کی تنسیخ اور بھی ضروری تھی۔

معاہدہ میں یہ طے ہوگیا تھا جتنی جلد ممکن ہو مصری حکومت مراعاتی ملکوں سے مل کر مراعات کو ختم کر دینے کی کوشش کرے۔ اور ان رکاوٹوں کو دور کرے جو مصری قانون کو غیر ملکیوں پر عاید کرنے میں حایل ہیں' اور وقفہ' انتقال' کی ابتدا کی جائے جس میں صرف مخلوط عدالتیں باقی رکھی جائیں گی اور کونسلر عدالتیں ختم ہو جائیں گی۔ اس سلسلہ میں برطانیہ نے بیش از بیش عملی قدم اٹھانے اور متعلقہ

---

۹۱ اگست ۱۹۳۶ء میں برطانوی، مصری معاہدہ مکمل ہوا جس کی رُو سے "نہر سوئز کا طبقہ" ۲۰ سال تک انگریزوں کے تسلط میں رہے گا، برطانیہ کو حق ہے کہ وہ دس ہزار سپاہی' چار سو ہوا باز' اور انتظامی افسروں کی ایک معقول تعداد یہاں رکھے' اندر صحرائی علاقہ میں' سب فوج تو نہیں مگر افسر داخل ہو سکتے ہیں' برطانوی ہوائی جہاز سارے مصر کو اپنی فضائی مشق کے لئے استعمال کرنے میں مجاز ہیں اور تمام ہوائی مستقر کا بلا برطانیہ کے اختیار میں رہیں گے، اسکندریہ ۱۹۴۴ تک خالص برطانوی بیڑہ کے لئے استعمال ہوگا، مصری حکومت کو نہر سوئز کی تمام چوکیاں اور بارکیں اپنے خرچ پر تعمیر کرنا ہوں گی' دہانہ نیل میں نئی سڑکیں اور ریلیں بنانا پڑیں گی' اور ایک اور ریلوے لائن بھی تیار کرنی ہوگی جو برطانوی فوجی علاقہ کو قاہرہ سے جوڑ دے۔

معاہدہ سے پیشتر ہر مصری وزیر ایک برطانوی مشیر رکھنے پر مجبور تھا' جن کی تنخواہوں کا بھاری بوجھ بھی مصری خزانہ پر تھا، اور عموماً برطانوی افسران اُن عہدوں پر قابض تھے جو صحیح معنی میں حکومت کی کنجیاں تھیں' اب یہ رفتہ رفتہ غائب ہو جائیں گے، سب سے پہلے مالیات اور عدلیہ کے افسران کی باری آئے گی' بس ٹکنیکل افسر

حکومتوں پر تنسیخ مراعات کے لئے اپنا اثر ڈالنے کا وعدہ کیا' شرط صرف یہ تھی کہ غیر ملکیوں پر کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو جدید اصول قانون سازی کے خلاف یا جس سے غیر ملکی لوگوں یا اداروں کے مالی معاملات میں کوئی تفریق پیدا ہو؛

وزارت خارجہ برطانیہ نے اس سلسلہ میں بڑی " تندہی " اور " درمندی " کا ثبوت دیا' فارن آفس کے مشیر قانونی دوم مسٹر ڈبلو' وی' بیکٹ ۱۲ جنوری کو مصر آئے' اور حکومت مصر سے ابتدائی گفتگو کر کے ۱۶ کو مراعاتی اقوام اور سوئزرلینڈ کے نام ایک گشتی خط بھیجا' جس میں ۱۲ اپریل کو مانتروہ میں کانفرنس

بقیہ گذشتہ:- باقی رہیں گے' تاوقتیکہ اچھے تربیت یافتہ مصری ان کی جگہ لینے کے لئے مہیا ہو جائیں لیکن اب انگریز کی حیثیت بالکل بدل گئی ہے پہلے ان کی پشت پر ریذیڈنسی تھی اور ریذیڈنسی کے پیچھے قلعہ کی حفاظتی فوج - اب ان غریبوں پر صرف ایک سفیر کا سایہ' اس سے ایک نئی نفسیاتی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک انگریز کی گفتگو سنئے جو مصری ریلوے کا ایک انجنیر ہے" میں سترہ سال سے کام کر رہا ہوں' اب مصریوں نے معاہدہ کر لیا ہے' اب میں مصر میں بس اسی وقت تک ہوں' جب تک میرے دلمنی دوست یہاں ہیں' میرے معاہدہ میں تین سال کی توسیع کر دی گئی ہے۔ لیکن مجھے ابھی سے معلوم ہے کہ میری جگہ کون لے گا۔ وہ ابھی ابھی برسٹل یونیورسٹی سے واپس آیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ان کا عہد نامہ بہت مناسب ہے' اب موقعہ ایسا ہی ہے کہ انگلستان کو ان لوگوں کے ساتھ دوست کی حیثیت سے رہنا ہی موزوں ہے' لیکن کسی کو یہ فکر نہیں کہ ہمارا کیا ہوگا؛

سے ۵ جنگ عظیم کے بعد سے ۱۲ حکومتوں کو مراعات حاصل رہی ہے' بلجیم' ڈنمارک' فرانس' برطانیہ' یونان' اٹلی' ہالینڈ' ناروے' پرتگال' اسپین اور سویڈن - سوئزرلینڈ قانونی طور پر کبھی مراعاتی ملک نہیں رہا' لیکن ہمیشہ مراعات سے مستفید ہوتا رہا ہے' جرمنی' آسٹریا اور ہنگری کو معاہدات امن نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے مراعاتی حقوق سے دست بردار ہو جائیں - انقلاب روس کے بعد روس بھی تعلقات کے بگڑ جانے کے باعث' مراعات کی لازمی شرط" کونسلر عدالت کا قیام" کو پورا

منعقد کرنے کی دعوت دی، ۲ر فروری کو دوسرا خط بھیجا گیا اس میں امور زیر غور کی فہرست تھی، بالآخر ۱۲ر اپریل کو کانفرنس شروع ہوئی، "وقفہ انتقال" (Transitional period) کے واسطے مخلوط عدالتوں کی تنظیم کے لئے مصری وفد نے ایک اسکیم پیش کی، یہی مباحثہ کی بنیاد قرار پائی، اور طے پایا کہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۹ء سے تمام مقدمات قونصلی عدالتوں سے مخلوط عدالتوں کی طرف منتقل کردے جائیں گے اور مصری حکومت ان مخلوط عدالتوں کے لئے فوجداری کا ایک ضابطہ تیار کرے گی۔ نیز یہ کہ اجنبی اب ہر معاملہ میں مصری قانون کی اطاعت پر مجبور ہوں گے اس میں دیوانی، فوجداری، تجارتی اور مالی مسائل کی تخصیص نہیں ہوگی، البتہ مصر کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا قانون، جدید اصول قانون سازی کے مطابق ہو۔ اس طرح ایک طرف تو قنصلی عدالتیں ختم ہوئیں اور صرف مخلوط عدالتیں باقی رہیں، اور پھر قانون کے مصری ہونے کی وجہ سے ان عدالتوں کی خود مختاری کا بھی خاتمہ ہوگیا، اجنبی باشندے اس بات سے بہت مطمئن ہیں کہ کانفرنس نے برطانوی مصری معاہدہ کی اس دفعہ کو جس میں اجنبی باشندوں اور اجنبی اداروں کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنے پر زور دیا گیا ہے، اور مضبوط کرلیا ہے، قانوناً یہ شرط محض وقفہ انتقال ہی کے لئے ہے، لیکن مصری حکومت نے اپنے ایک متعلقہ اعلان میں یہ تصریح کی ہے کہ اس شرط کے معنی یہ نہیں ہیں ہم وقفہ انتقال کے بعد اجنبیوں کے معاملہ میں امتیازی پالیسی پر عمل کریں گے معلوم نہیں کہ خواہ مخواہ اپنے اوپر یہ پابندی کیوں عائد کرلی گئی ہے؛

مخلوط عدالتیں بارہ سال تک جاری رہیں گی، اس کے بعد یہ عدالتیں اپنے فرائض مصر کی

بقیہ صفحہ گذشتہ:۔ نہیں کررہا ہے، کنونشن میں ۱۹ حکومتوں نے دستخط کئے ہیں، مصر اور بارہ مندرجہ بالا حکومتوں کے علاوہ اتحادی جنوبی افریقہ، آئرش فری اسٹیٹ، کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ہندوستان بھی شامل ہے، برطانوی نمائندے نے آخری چار ملکوں کی طرف سے دستخط کئے اور اطالوی نمائندے نے شاہ اطالیہ وشہنشاہ حبشہ کی جانب سے۔

وطنی عدالتوں کے سپرد کردیں گی، عدالتوں کے سلسلہ میں مصر سے یہ شرط بھی منظور کرالی گئی ہے کہ " وہ تمام اعلیٰ اور ادنیٰ قاضی، منصف اور ملازمین جو ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کی تاریخ تک برسرکار ہوں گے ان کے عہدے اور ملازمتیں برقرار رہیں گی"

مصری وفد چاہتا تھا کہ مخلوط عدالتوں کی قوت حاکمیہ مصری ہو، اس پر زبردست مباحثہ رہا، اس کی منظوری بہت دشوار تھی، اور بالآخر نہیں ہوسکی، اور یہ طے ہوا کہ عدالت مرافعہ میں ۱۸ اجنبی ہوں اور ۱۱ مصری، صدر اور پبلک پراسی کیوٹر کے تقرر کا اختیار اجنبیوں کو حاصل ہوگا۔ پراسی کیوٹر کے دو معاون ہوں گے معاون اول مصری ہوگا۔ اور معاون دوم اجنبی۔

سوال یہ تھا کہ کسی ملک کے باشندے صرف وہی ہیں جو اس ملک کے اندر رہتے ہیں۔ یا دوسرے علاقوں کے وہ باشندے بھی ہیں، جو اس ملک کے زیر انتداب یا زیر حفاظت ہیں، یعنی "فرانسیسی" صرف وہ ہیں جو فرانس کے اندر رہتے ہیں یا شام، لبنان، تری پولی، الجیریا، ٹیونس وغیرہ کے باشندے بھی "فرانسیسی" شمار ہوں گے، اس پر زبردست مباحثہ ہوا، "اجنبی" کے محدود مفہوم پر فرانس کو خاص طور پر اعتراض تھا، ادھر خود مصر بھی کچھ "وسعت" کی طرف مائل تھا تاکہ حبش کے باشندوں کو اطالوی رعایا کی حیثیت سے مراعات دے سکے، اس لئے "وسیع" مفہوم کی جیت ہوئی، البتہ شام، لبنان، فلسطین، اور شرق اردن کے "انتدابی" علاقے اس رعایت سے محروم قرار پائے۔ حکومت مصر نے جرمنی، آسٹریا، ہنگری، پولینڈ، رومانیا، سوئزرلینڈ، زیکوسلاوکیا، اور یوگوسلاویا کو از خود مراعات دینے کا اعلان کیا ہے موجودہ سیاسی حالات میں یہ بخششیں خلاف مصلحت نہیں معلوم ہوتیں۔

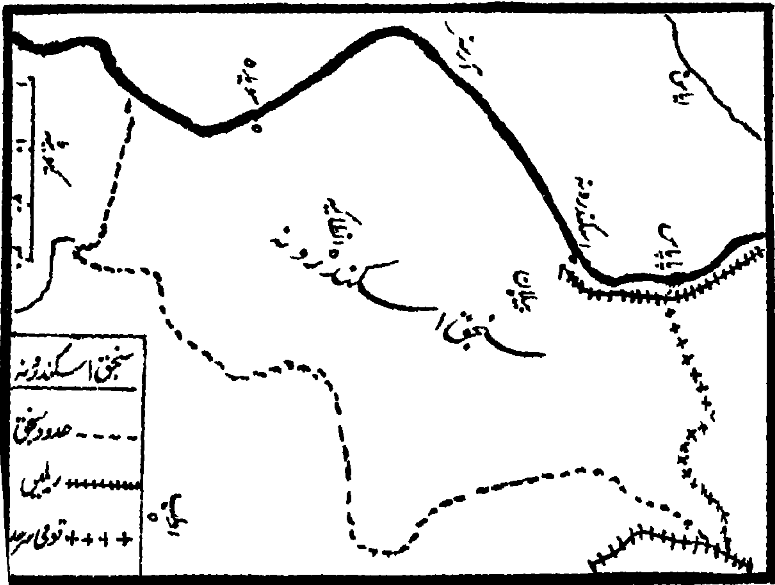
حکومت مصر نے اپنے ایک اعلان میں جس میں اقلیتوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کا اطمینان دلایا ہے یہ خواہش بھی ظاہر کی ہے کہ وہ دوسری قوموں اور ممالک سے دوستانہ معاہدے کرنا چاہتی ہے، اسی سلسلہ میں مصری امیر وفد مصطفےٰ نحاس پاشا نے امریکہ، فرانس، اطالیہ، یونان اور ہالینڈ وغیرہ کے نمایندوں سے تبادلہ خیالات بھی کیا۔

مانترو کے معاہدہ کی جن شقوں پر اعتراضات ہو رہے ہیں ان میں ایک تو یہ ہے کہ مجوزہ عدالتوں میں عربی، انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی چار زبانوں کو سرکاری حیثیت حاصل ہوگی، اندیشہ یہ ہے کہ عملی طور پر عربی کو کوئی اہمیت نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ مصر میں کیتھولک عیسائیوں کو تبلیغ مذہب کی وہ تمام آزادیاں بدستور حاصل رہیں گی جو اس وقت حاصل ہیں، اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ فرانس نے اس شرط پر شدید اصرار کرتے ہوئے یہ بتلایا کہ میں اسے منظور کرانے کے لئے پاپائے اعظم کی طرف مجبور ہوں، جنھوں نے حکم دیا ہے کہ میں مصر میں عیسائی مبلغین کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہونے دوں۔" اس معاہدہ کی تکمیل پر عام طور پر مصر میں جوشِ مسرت کا ثبوت دیا گیا، لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مصری وفد کی "کمزوری" پر سخت غم و غصہ کا اظہار کر رہا ہے، مصر کا ایک بلند پایہ اخبار پوچھتا ہے" مانترو کانفرنس میں مصر نے کیا پایا، یہ ایک سوال ہے جو بار بار زبان پر آتا اور اخبارات کے صفحے رنگین کرتا ہے۔ مگر اب تک نحاس پاشا کی حکومت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا" البلاغ مانترو کے عہد نامہ کو مصر کی شرمناک کمزوری اور بزدلی قرار دیتا ہے، اور نحاس پاشا کی خلاف توقع "برطانیہ نوازی" پر حیرت کا اظہار کرتا ہے جب برطانوی پریس مصر کی آزادی پر پیغام تہنیت پیش کرتا ہے اور مصر سے آواز اٹھتی ہے۔

"کیا ہم آزاد ہیں؟ ہاں مگر ہم کو دفاع کی اجازت نہیں، اور ہم سے کہا جا رہا ہے کہ برطانیہ پر اعتماد کرو، ہاں ہم آزاد ہیں! مگر ہم کسی غیر ملکی حکومت سے تعلقات قائم نہیں کر سکتے، ہاں ہم آزاد ہیں! مگر مصر کو لوٹنے کھسوٹنے والے انگریز تاجروں کے خلاف زبان نہیں ہلا سکتے، ہاں ہم آزاد ہیں! مگر دفاع اور دوسرے اجنبی معاملات اور وطنی ثروت کی حفاظت میں مجبور محض ہیں، ہاں ہم آزاد ہیں اور یقیناً آزاد ہیں اس لئے کہ وزارت کی کرسیوں پر شان کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں ——— اور انگریزوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔"

(البلاغ)

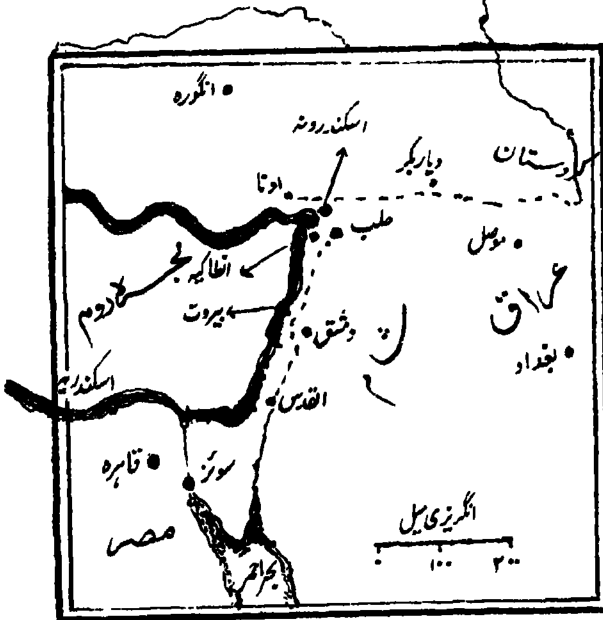
اسکندرونہ | سنجق اسکندرونہ، ایک چھوٹا سا زرخیز علاقہ ہے، ایک لاکھ اسی ہزار اس کی آبادی ہے، جن میں ۳۴ فی صدی ترک ہیں اور باقی ارمنی اور شامی۔ اسکندرونہ کا بندرگاہ بھی کوئی بڑا بندرگاہ نہیں ہے۔ یہ قدرتی بندرگاہ ہے۔ حلب کا واحد بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہ خاصا ترقی کر رہا تھا لیکن سنہ ۱۹۱۹ء کے معاہدات صلح نے اس کی ترقی کو صدمہ پہنچایا۔ اس کا مقابلہ رہا بیروت سے، اور بیروت سے یہ جیت نہیں سکا۔ ضلع حلب اور مشرقی سالیشیا جہاں مختلف قسم کی پیداوار اور مصنوعات ہوتی ہیں، اسی بندرگاہ سے جاتی تھیں۔ مگر جب سے ترکی حکومت کا دائرہ محدود ہوتے ہوتے



اسکندرونہ کے شمال میں جا پہنچا تو اسکندرونہ کو زوال آگیا، اور اس کی بندرگاہ بھی ایسی ہی مرا ہوگئی جس طرح مشرقی کاروانوں کے جنکشن حلب کے بازار سنسان ہوگئے۔

معرکہ میسلون (۲۵ جون سنہ ۱۹۲۰ء) میں کامیاب ہوکر فرانسیسی جنرل گورونے، ملک فیصل کو شہر بدر کیا اور شام کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ حکومت لبنان، حکومت لاذقیہ، حکومت حلب، حکومت دمشق اور سنجق اسکندرونہ اس کے بعد اس تقسیم میں رد و بدل ہوتی رہی لیکن سنجق کی حکومت قائم رہی، بحیرۂ روم کی موجودہ سیاست جس سے متاثر ہوکر برطانیہ نے عراق اور

"آزادی" بخشی، وادیٔ نیل کی مراعات کو بڑی کوششوں سے "منسوخ" کرایا، اور اب مسلم فلسطین کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے پر تیار ہے، اسی نے فرانس کو مجبور کیا کہ وہ انگلستان کی تقلید کرتے ہوئے شام و لبنان کے سرکش باغیوں کے دل ہاتھ میں لے، موقعہ نازک تھا اس لئے موسیو بلوم کی حکومت نے بڑی سرعت سے کام لیا اور ۹ ستمبر ۱۹۳۶ء کو شام اور ۱۳ نومبر کو لبنان کے عہد نامہ پر دستخط ہو گئے طے ہوا کہ ۲۵ سال تک شام اسی طرح فرانس کا حلیف رہیگا جس طرح مصر برطانیہ کا ہے، اور جنگ کے موقعہ پر ہر قسم کی مدد کرے گا۔ فوج کے نظم اور قیام کا بوجھ



شام کے خزانہ پر ہوگا لیکن نقل و حرکت فرانس کے احکامات کی پابند ہوگی، معاہدہ کے پانچ سال بعد تک، فرانسیسی فوجیں اس علاقہ میں مقیم رہیں گی تاکہ اقلیتوں کی حفاظت کما حقہ کی جاسکے۔ اسی قسم کا عہد نامہ لبنان کی جمہوریت سے ہوا، اس میں فرانس کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی بحری اور بری فوجیں لبنان میں رکھ سکتا ہے۔ شام کے مسئلہ کو اس طرح سلجھا کر، فرانس اطمینان کا سانس لینے نہیں پایا تھا کہ ترکی حکومت نے جمعیۃ اقوام میں یہ شکایت کی کہ "فرانس نے ناجائز طور پر سنجق اسکندرونہ کو شام کو دیدیا ہے"، اصل میں ۱۹۲۱ء میں ترکوں کا فرانس سے یہ معاہدہ

ہوگیا تھا کہ " اسکندرونہ کا علاقہ فرانس کے زیر انتداب رہیگا، لیکن تمدن اور زبان کی حفاظت و ترقی کے لئے ترکی آبادی کو پورے حقوق حاصل رہیں گے " اب ترکی نے یہ اعتراض کیا تھا کہ " اسکندرونہ ہم نے فرانس کے انتداب میں دیا تھا نہ کہ فرانس کے زیر انتداب ملکوں کے انتداب میں " اور مطالبہ یہ تھا کہ " اسکندرونہ کو لبنان اور شام کے مساوی حقوق دیکر آزاد کر دینا چاہیئے " فرانس نے اس ناگہانی مطالبہ کو ٹالنے کی بہت کوشش کی، لیکن پھر بھی جمعیۃ اقوام نے تحقیقات کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی کا تقرر کر ہی دیا، ۲۴ مئی ۱۹۳۷ء کو اس کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کر دیں، اور جمعیۃ اقوام میں یہ طے ہوگیا کہ سنجق کو کامل خود مختاری حاصل ہوگی، البتہ معاملات خارجہ میں شام ذمہ دار ہوگا، جمعیۃ نے ایک فرانسیسی کمیٹی کی سفارش کی ہے جس کا کام تنفیذ قانون کی نگرانی ہوگا۔ سنجق اور شام کی حکومتیں ایک دوسرے کے کمشنر کا تقرر کریں گی اور شام کے قنصلی نمائندے سنجق اور وہاں کے باشندوں کے معاملات کے ذمہ دار ہوں گے، اسکندرونہ قطعی طور غیر مسلح رہیگا، نظم قائم رکھنے کے لئے تھوڑی سی پولس کافی سمجھی گئی ہے اس کی تعداد زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار ہوسکتی ہے، اقلیتوں کے نسل و مذہب اور زبان کے تحفظ کا قانون میں پورا خیال رکھا گیا ہے اور پھر جمعیۃ خود اس کی نگراں رہے گی، ترکی کو اسکندرونہ کی بندرگاہ کے استعمال کا پورا حق ہوگا، مقننہ ایک واحد اسمبلی ہوگی جس کے چالیس ممبر منتخب ہوا کریں گے (چار سال کے لئے) عاملہ میں صدر سنجق کے علاوہ ۵ ارکان کی ایک کونسل ہوگی قانون کا نفاذ ۲۹ نومبر ۱۹۳۷ء سے عمل میں آئے گا "

اہل اسکندرونہ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ترکی حکومت اسکندرونہ کو خود لینا چاہتی ہے، دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ایک جماعت جس میں ترکوں کی اکثریت تھی ترکی الحاق کی حامی بن گئی اور دوسری عربوں کی جماعت نے اس الحاق کے خلاف غم و غصہ کا اظہار شروع کیا۔ حتیٰ کہ اسکندرونہ کے فسادات نے بڑی اہمیت حاصل کرلی، عام خیال یہ ہے کہ یہ سب فرانس کی شرارت ہے" اسکندرونہ والوں کو آپس میں لڑا کر دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ لوگ عام طور پر ترکوں سے بیزار ہیں، ناجی بک اصل وزیر خارجہ

عراق نے پچھلے دنوں "الاہرام" کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے فرمایا تھا " اپنے اس قیام دمشق سے جو اثر میرے ذہن و قلب پر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اہل شام ترکوں کو اپنا دینی بھائی سمجھتے ہوئے ان سے دوستی اور محبت رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسکندرونہ کا مسئلہ بہت جلد صلح و صفائی کے ساتھ طے ہو جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک یورپی حکومت کے جاسوس اور ایجنٹوں نے اہل شام کو ترکوں کے خلاف بھڑکانے کی انتہائی جدوجہد کی ہے اور یہ پروپیگنڈا ابھی تک جاری ہے لیکن میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ان اوچھے ہتھیاروں سے کامیابی نہ ہوگی اور بہت جلد ترکوں اور شامیوں کے درمیان از سر نو دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں گے" انگورہ میں وزیر اعظم اور وزیر خارجہ ترکی نے اہل شام سے محبت و مودت کا اظہار کیا ہے" ترکی اخبارات کا بھی یہ بیان ہے کہ " حکومت ترکیہ کی مخالفت اقلیتوں کے حقوق کی آڑ میں شروع کی گئی تھی مگر جب وہ ناکام رہی تو اب دین و مذہب کی آڑ میں مخالفت کا طوفان برپا کیا جا رہا ہے اور شہرت دی جا رہی ہے کہ ترکوں کی حکومت میں، اسکندرونہ والوں کے مذہب کی خیر نہیں (البلاغ)"

جمعیۃ اقوام کے فیصلہ کا اعلان ہونے کے بعد تو سنجق کے ترکوں اور عربوں کا جوش و خروش اور بھی بڑھ گیا ہے اخبارات میں شدید قسم کی قلمی جنگ چھڑ گئی ہے ترکوں نے جب یہ کہا " شام کے عرب فرانس کے پنجۂ استعمار سے آزاد ہو چکے ہیں تو ترک کسی غیر طاقت کے کیوں محروم ہو رہیں، اس کے علاوہ اس علاقہ کا جغرافیائی، تمدنی اور لسانی رشتہ ممالک عربیہ کی نسبت ترکی سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہے" اور جب شام فرانس کے اشارہ پر لبنان کی علیحدگی کو گوارا کر سکتا ہے تو اسے ترکی کی مرضی پر اسکندرونہ و انطاکیہ سے دست بردار ہونے پر کیوں اعتراض ہے" دوسری طرف سے جواب دیا گیا کہ " اگرچہ لبنان کی علیحدگی شام پر ایک ناقابل برداشت حملہ ہے لیکن اس تقسیم کی بنا نسلی اختلافات پر نہیں بلکہ مذہبی تفاوت پر ہے، لبنان میں چونکہ عیسائیوں کی کثرت ہے اس لئے وہ مذہبی تعصب کے باعث شام کی مسلم اکثریت کے محکوم نہیں رہ سکتے"

لیکن اس کے برخلاف سنجق کے ترک مسلمان ہیں اور وہ اسلامی اخوت کے باعث شامی مسلمانوں کی برادری میں شامل ہیں، انھیں حق نہیں پہنچتا کہ وہ مغرب کی ملحدانہ قومیت اختیار کرکے شام سے دامن چھڑانے کی کوشش کریں اس کے علاوہ شامیوں کا یہ بھی بیان ہے کہ فرانس غیر مسلم ہونے کے باعث مسلمان عربوں کا دشمن ہے اس لئے وہ شام کی اسلامی جمہوریت کو کمزور کرنے کی غرض سے علیحدگی لبنان کا حامی ہے، لیکن ترکی مسلمان ہے اس کو تو ایک اسلامی حکومت کی ضرورتوں کے پیش نظر ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہئے جو شامی جمہوریت کو معنوی طور پر کمزور کرنے کی موجب ہو، اس سلسلہ میں امیر شکیب ارسلان کا ایک بیان بھی پیش کیا جاتا ہے کہ" اسکندرونہ میں ترکی اقلیت کی خاطر حکومت انگورہ کو عربوں پر قیامت نہ توڑنی چاہئے اور اس خطہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کے خیال سے باز آجانا چاہئے۔ سب سے پہلے تو ترکوں کو یہ دیکھنا چاہئے کہ آج کتنے ترک اجانب کی محکومی میں زندگی بسر کر رہے ہیں، روس ڈھائی کروڑ ترکوں پر حکومت کر رہا ہے چین کی حکمبرداری میں ایک کروڑ ترک زندگی گذار رہے ہیں۔ ایران ستر لاکھ ترکوں پر حکمراں ہے، بلغاریہ میں پچاس لاکھ ترک محکوم ہیں، رومانیہ میں ایک لاکھ بیس ہزار ترک غیروں کے غلام ہیں، یونانی بھی تھریس کے ایک لاکھ ترکوں کے حاکم ہیں، یوگوسلاویہ کے جنوب میں ہزاروں ترک اور روڈس وغیرہ اطالوی جزائر میں ۱۵ ہزار ترک محکوم ہیں لیکن ترکی حکومت ان بے شمار محکوموں کا کوئی خیال نہیں کرتی اس کو اگر خیال ہے تو صرف ۸۵ ہزار اسکندرونہ کے ترکوں کا جو عربوں کی اکثریت میں آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں" اسکندرونہ اور انطاکیہ کے تازہ فسادات سے متاثر ہو کر عربوں کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت میں "الشباب" نے ایک مقالہ لکھا ہے " ان تمام واقعات کی اصل وجہ یہ ہے کہ فرانس نے ترکوں سے اسکندرونہ کا وعدہ بالکل اس طرح کر لیا ہے جس طرح انگریزوں نے یہودیوں سے فلسطین کا سودا کر لیا ہے، دونوں نے عربوں کے ساتھ صریح غداری کی ہے، جس طرح حکومت برطانیہ ہر ممکن طریقہ سے یہودیوں کی حفاظت کرتی ہے ترک بھی اسکندرونہ کے مٹھی بھر ترکوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اسلحہ اور سامان جنگ سے ان کی مدد کرتے ہیں، اسکندرونہ کے شہداء بارگاہ رب العزت میں فریاد کے سوا کیا کر سکتے ہیں"۔ شامی اخبار اور

رہنما ترکوں کے خلاف جس شد و مد سے پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اس سے یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ عرب اور ترکوں میں کوئی مذہبی تعلق بھی ہے، ہم کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتے لیکن یہ ضرور کہیں گے عربوں کے شور و غوغا سے اغیار بہت مسرور ہیں، فرانس خود نہیں چاہتا تھا اسکندرونہ کو آزادی ملے اور بندرگاہ پر ترکی قبضہ تسلیم کیا جائے لیکن اتنی ہمت نہیں ہے کہ ترکی کی کھلم کھلا مخالفت کر سکے۔ شام ولبنان اور فلسطین کے سر پہ ترکی کے مرد مجاہد کا مسلط ہو جانا فرانس اور برطانیہ کی استعماری پالیسی کے لئے یقیناً ایک مستقل خطرہ ہے لیکن عرب اپنے موجودہ رویہ سے اپنے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ جمعیت اقوام کے فیصلہ سے شام کی حکومت کو صدمہ پہنچے گا لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شام کا صدمہ صرف شام کا صدمہ ہوگا۔ لیکن اگر ان ہنگاموں سے ترکی کو نقصان پہنچا تو وہ نقصان محض ترکی کا نہ ہوگا۔ ترکی نے آج سیاسی طور پہ عالم اسلام کے قلب کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ترکی کی ذرا سی تکلیف تمام جسم اسلام کو مضمحل بنا دے گی۔ تعجب تو یہ ہے کہ امیر شکیب جیسے جہاں دیدہ رہنما کا زور قلم بھی، جسے ترکی کی حمایت میں سب سے آگے ہونا چاہئے تھا۔ مخالفت میں صرف ہوا۔ عربوں کو یقین رکھنا چاہئے کہ وحدت عرب کا خیال کبھی پائدار حقیقت بن سکتا ہے تو وہ بھی ترکی کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔

(ع.م)

ہندوستان کی صحت عامہ | صحت عامہ کا مسئلہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ مقدم ہے۔ لیکن یہی حکومت ہند کی غفلت کا سب سے زیادہ شکار ہے۔ بخلاف اس کے مغربی ممالک میں صحت عامہ کے لئے مستقل ادارے مقرر ہیں، اور حکومتیں صحت و صفائی اور عمدہ غذا کی فراہمی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتیں۔ وہاں کی بلدیات عوام کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرتی ہیں، بیماریوں کی روک تھام کے لئے آئے دن نئے نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں اور عوام کو حفظان صحت کے اصول تعلیم کئے جاتے ہیں، نیز طبی امداد پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔

ہندوستان دنیا میں مفلس ترین ملک ہے۔ یہاں کی قومی آمدنی کا اوسط فی کس چھ روپے ماہوار سے زیادہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حقیر آمدنی سے ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کو قوت

لاہوت حاصل کرنا بھی دشوار ہے چہ جائیکہ وہ اس میں سے صحت وصفائی، اور تعلیم جیسی اہم چیزوں کے لئے کچھ گنجائش نکال سکیں۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے فاقہ زدہ لوگ جہالت اور افلاس کے باعث حفظان صحت کے لئے انفرادی طور پر کوئی کوشش نہ کرسکیں تو انھیں کسی حدتک معذور خیال کرنا چاہیئے۔ عوام کی صحت کو برقرار رکھنے کی بیشتر ذمہ داری حکومت پر عاید ہوتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں اس کی سرگرمیاں ایسی نہیں ہیں جن کی تعریف کی جاسکے۔ غریب ہندوستانیوں کی صحت عامہ کا اندازہ کرنا ہو تو مندرجہ ذیل اعداد وشمار ملاحظہ کیجئے:۔

	تعداد اموات		میزان	شرح اموات فی ہزار
	مرد	عورت		
سنہ ۱۹۲۵ء	۳۱۴۰۱۹۷	۲۸۲۷۷۲۱	۵۹۶۷۹۱۸	۲۵٫۳۴
سنہ ۱۹۲۶ء	۳۳۷۵۲۶۶	۳۰۸۵۲۴۴	۶۴۶۰۶۱۰	۲۷٫۲۳
سنہ ۱۹۲۷ء	۳۱۴۲۴۱۱	۲۸۶۷۳۱۸	۶۰۰۹۷۲۹	۲۵٫۳۵
سنہ ۱۹۲۸ء	۳۲۱۵۳۲۷	۲۹۶۴۷۸۷	۶۱۸۰۱۱۴	۲۵٫۹۴
سنہ ۱۹۲۹ء	۳۲۵۵۴۰۲	۳۰۱۱۹۸۰	۶۲۶۷۳۹۱	۲۶٫۲۶
سنہ ۱۹۳۰ء	۳۳۷۵۹۲۹	۳۱۰۷۵۲۰	۶۴۸۳۴۴۹	۲۷٫۲۴

ان اعداد سے صاف ظاہر ہے کہ شرح اموات برابر بڑھتی رہی ہے۔

مختلف امراض کے اعتبار سے اموات کی شرح فی میل حسب ذیل ہے:۔

امراض	سنہ ۱۹۲۸ء	سنہ ۱۹۲۹ء	سنہ ۱۹۳۰ء
ہیضہ	۱٫۴۵	۱٫۲۲	۱٫۴۰
چیچک	۰٫۴۰	۰٫۳۰	۰٫۳۰
طاعون	۰٫۵۰	۰٫۳۰	۰٫۱۰
بخار	۱۴٫۲۰	۱۴٫۹۶	۱۵٫۶۹
بدہضمی اور پیچش	۰٫۹۲	۰٫۹۸	۰٫۹۸

امراض	سنہ ۱۹۲۸ء	سنہ ۱۹۲۹ء	سنہ ۱۹۳۰ء
امراض سینہ	۱ / ۵۹	۱ / ۶۵	۱ / ۶۶
حادثات	۰ / ۳۹	۰ / ۳۹	۰ / ۳۸

اتفاقی حادثات اور وبائی بیماریوں سے قطع نظر ہندوستانی اکثر ایسے امراض کا شکار ہوتے ہیں جو قابل علاج ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ماحول میں صحت و صفائی اور طبی امداد کا معقول انتظام نہیں ہے۔ غلیظ پانی، اور ناصاف اشیائے خوردنی کے علاوہ قلت غذا بھی امراض اور اموات کی بڑی حد تک ذمہ وار ہے۔ باوجودیکہ شرح اموات مغربی ممالک کے مقابلہ میں یہاں بہت زیادہ ہے پھر بھی آبادی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ دولت کی غیر مساوی تقسیم اور کسانوں اور مزدوروں کی فاقہ مستی کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔

پچھلے دنوں شملہ میں صحت عامہ کے مرکزی مشاورتی بورڈ کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں ہز ایکسلنسی وائسرائے نے مسئلہ حفظان صحت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ صوبائی حکومتوں کو جگہ جگہ مناسب صحتی ادارے قائم کرکے ان میں قابل تربیت یافتہ اسٹاف رکھنا چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ٹیکس دہندوں کے محاصل کا معتد بہ حصہ قومی صحت کو برقرار رکھنے پر صرف کیا جائے۔ ہز ایکسلنسی نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ چند سال پہلے وھٹلی کمیشن نے مزدوروں کی رہائش کے انتظام کے لئے کچھ سفارشات کی تھیں لیکن وہ ابھی تک شرمندۂ تکمیل نہ ہوئیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں مرکزی مشاورتی بورڈ کی تجاویز بھی "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مصداق ثابت نہ ہوں۔ کیونکہ ان کو عمل میں لانے کے لئے کثیر مصارف کی ضرورت ہے۔ اور میزانیہ کا ۸۰ فی صدی حصہ ایسا ہے جن کے متعلق ارکان اسمبلی قطعی کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ غریب ہندوستانیوں سے جو محاصل وصول کئے جاتے ہیں ان کا بیشتر حصہ فوجی مصارف، قیام امن و آئین، اور شاہی خدمات کی نذر ہو جاتا ہے۔ ان اخراجات کے بعد تعلیم، حفظان صحت اور دیگر 'غیر اہم' تعمیری خدمات کے لئے گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔ (ع۔ق)

چین اور جاپان | کسی کا قول ہے اور سچ ہے کہ انسانی تاریخ کا وہ دور شروع ہو رہا ہے جس کے اہم واقعات بحرالکاہل کے ساحل یا اس کے نواح میں ہوا کریں گے۔ یہ علاقہ آج کھلی رقابتوں اور چھپی سازشوں کا جولانگاہ ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت کیا ہو جائے گا۔ ابھی دریائے آمور میں جاپان کے اشارہ پر چلنے والے منچو سپاہیوں نے ایک روسی کشتی ڈبو دی، ۳۷ روسی ڈوب کر مر گئے۔ یہ واقعہ ایک عالمی جنگ کا نقطۂ آغاز بن سکتا تھا۔ وہ تو روس اپنی اندرونی مشکلات سے دوچار تھا، نئے دستور حکومت کو رائج کرنے سے پہلے تمام غیر معتبر عناصر سے ہیئت اجتماعی کو صاف کرنے میں لگا ہوا تھا، ملک میں تروتسکی اور اسٹالین کے ساتھیوں کی مخالفت ذرا تشویشناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی اور ان سب سے زیادہ یہ کہ روس اپنی معاشی تنظیم کو مکمل کرنے کے لئے دل سے امن کا خواہشمند اور جنگ سے نفور ہے اس لئے یہ کڑوا گھونٹ پی لیا اور معاملہ رفت گذشت ہوا۔ لیکن یہ وہ قوتیں ہیں کہ دراقلیمے نہ گنجند۔ آج نہیں کل روس اور جاپان میں ٹکر ہوگی اور کیا عجب ہے کہ دریائے آمور جسے آج نقشوں میں ڈھونڈ کر نکالنا پڑتا ہے اس کے ساحل انسانی خون سے رنگین ہونے کے بعد تاریخ میں وہی شہرت حاصل کرلیں جو رہائین اور ڈینیوب کو حاصل ہے۔

دریائے آمور والے واقعہ ہی کی قسم کا ایک حادثہ کہیں شمالی چین میں بھی ہوگیا۔ صحیح نوعیت ابھی متعین نہیں ہوسکی ہے۔ مگر تھی کوئی ذرا سی بات، کوئی غلط فہمی۔ کسی کمزور اعصاب والے سنتری کی گھبراہٹ یا متشدد دماغ افسر کی بوکھلاہٹ۔ اونچ نیچ ہوگئی، گولی چل گئی۔ تلافی کے مطالبے ہوئے، سمجھوتہ ہوا، جوشیلے فوجیوں نے سمجھوتہ توڑ دیا، معاملہ بڑھا اور نہایت وسیع پیمانہ پر فوج کشی شروع ہوگئی۔ اور اگر چین نے کچھ لے دے کر معاملہ نہ کرلیا تو کیا عجب ہے کہ ان سطروں کے طبع ہونے تک شمالی چین آدمیوں کے گرم خون سے سینچا جا رہا ہو۔ جاپانی فوجیں نہایت تیزی سے چین بھیجی جا رہی ہیں اور عجب یہ ہے کہ چین بھی جواب تک برابر دار خالی دیتا رہا ہے اور جاپان سے ٹکر لینے سے بچتا رہا ہے وہ بھی بڑی مستعدی سے اپنی فوجیں موقع واردات پر بھیج رہا ہے۔ آخر چین اس بار اس قدر مستعد کیوں ہے اور جاپان جس سے توقع تھی کہ اب کچھ دن چین کو چین سے بیٹھنے دیگا اور باقی دنیا سے

صلح صفائی کی تدبیریں کرے گا وہ پھر بیکایک ملک گیری پر کیوں آمادہ نظر آتا ہے۔

چین میں اتحاد قومی کی تحریک

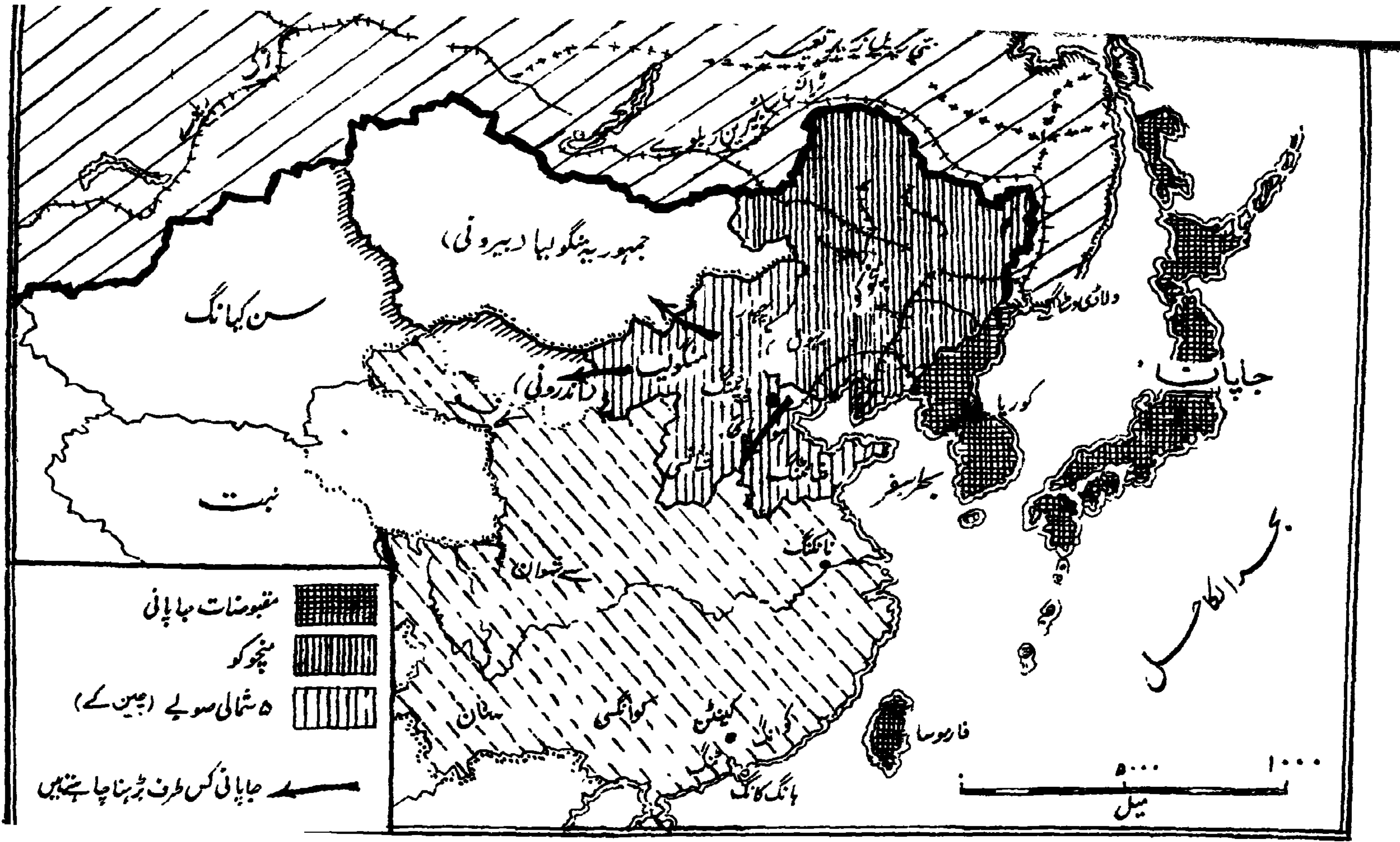
چین کی مستعدی کے لئے تو بس یہ دلیل کافی ہے کہ تنگ آمد بجنگ آمد۔ جاپان چین کے ساتھ پیہم زیادتیاں کر رہا ہے! اس کے احساس قومی کو ضرب پر ضرب لگا رہا ہے، اور برابر اس کے ملک کے گوشے کے گوشے چھینتا جا رہا ہے۔ چین اگر یہ سب کچھ جھیلتا رہا ہے تو اس لئے کہ کمزور ہے، جن سے مدد کی امید ہے وہ برابر ٹلے بالے بتا رہے ہیں، اور اسے ڈر ہے کہ اگر جاپان سے پوری پوری ٹکر ہوگئی تو شاید سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملے اور آگے چلکر بھی اپنے نقصانوں کی تلافی کا امکان ہاتھ سے نکل جائے۔ مگر صبر اور انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔ تحمل اور بردباری کی صفتیں مہذب چینیوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں لیکن تابکے۔ مصیبت اور پیہم مصیبت نے اب اس قوم کو بہت کچھ متحد سا کر دیا ہے اور قیاس ہے کہ اگر نانکنگ کی مرکزی حکومت اور اس کے سردار جنرل چیانگ کائی شک اب بھی جاپان کے مقابلہ کو نہ کھڑے ہوئے تو قوم کا غصہ ان کی طرف رخ کر لیگا اور انھیں ختم کر دے گا۔ اس لئے اندر اندر چیانگ کائی شک چاہے اب بھی ٹکر ٹالنے کی فکر میں ہوں مگر بظاہر مستعدی کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔

اتحاد قومی کی تحریک چین میں کوئی نئی تحریک نہیں ہے۔ سنہ ۳۱ء سے جب جاپان نے منچوریا پر قبضہ کیا اس تحریک کا کام جاری ہے۔ بات یہ ہے کہ چینی قومی زندگی اس وقت دو جماعتوں کے ہاتھ میں ہے جو کئی سال تک بر سر پیکار رہنے کے بعد اب ایک مشترک دشمن کے مقابلہ کے لئے مل رہی ہیں۔ ایک چینی اشتراکی جماعت ہے اور دوسرے چیانگ کائی شک کی جماعت کومن تانگ۔ پہلے تو یہ دونوں ایک ہی تھے اور سن یاٹ سین نے چینی ہیئت اجتماعی کے لئے جمہوریت، قومیت اور اشتراک کے جو اصول سہ گانہ مرتب کئے تھے وہ ان دونوں کا دستور العمل تھے۔ سنہ ۲۵ء سے سنہ ۲۶ء تک یہ دونوں عناصر ملے رہے اور یہ اپنے ملک کے تمام سامراجی دشمنوں اور ان کے دم چھلّوں کی مخالفت میں ہم آہنگ رہے۔ لیکن سنہ ۲۷ء میں ان کے ایک سربرآوردہ قاید چیانگ کائی شک نے شنگھائی کے ساہوکاروں سے ساز باز کر کے نانکنگ

میں اپنی حکومت قایم کرلی اور کمیونسٹ کو یکسر ختم کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ۔ کمیونسٹ جماعت بہت کچھ دب گئی مگر کچھ دن بعد پھر ابھری ۔ اس نے فوکیان اور کیانگ سی کے صوبوں میں اپنی سوویٹ حکومت قایم کرلی اور اتنا رقبہ اپنے زیر اثر کرلیا کہ نانکنگ کی حریف سمجھی جانے لگی۔

باوجود اس رقابت کے جب ۳۱ء میں جاپان نے منچوریا میں اپنا اقدام شروع کیا تو کمیونسٹ جماعت نے اتحاد قومی پر آمادگی ظاہر کی ۔ مگر نانکنگ کی حکومت اپنی قوت کو برادران کی بربادی میں صرف کرتی رہی ۔ یہ 'سرخ' فوجیں اپنے اشتراکی پروگرام سے بھی کچھ ہٹ کر قومی عزت کے برقرار رکھنے کے لئے بیقرار تھیں اور نانکنگ ان کے منصوبوں کو شکست دینے میں سرگرم۔ ۳۲ء میں ان اشتراکیوں نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ بھی کیا اور جنرل فانگ کے زیر کمان ایک بڑا لشکر بھی جاپانیوں سے لڑنے کے لئے شمال کی طرف بھیجا ۔ مگر تحفظ قومیت کا یہ جہاد خود اپنی قوم والوں کے ہاتھوں ناکام ہوا اور فانگ کو نانکنگ کی فوجوں نے گرفتار کرکے قتل کردیا ۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے ۔

۳۳ء میں چینی سوویٹ حکومت نے پھر اعلان کیا کہ جاپان کے مقابلہ میں وہ ہر چینی فوج کا ساتھ دینے کو تیار ہیں ۔ اشتراکیوں کی ناکامیوں اور قومی تحفظ کے لئے ان کی طرف سے جس آمادگی کا اظہار بار بار ہوا اس نے قوم کو بہت متاثر کیا ۔ اور ۳۳ء میں جو فوج ان کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی تھی اس نے ان پر ہاتھ اٹھانے سے انکار کیا اور ان سے مل گئی ۔ لیکن اس متحدہ فوج کو بھی نانکنگ کی قوت نے دبا دیا ۔ مگر اتحاد کی تحریک پھیلتی رہی ۔ ۳۴ء میں بیگم سن یات سین نے ایک اعلان شائع کیا جس کا عنوان تھا " جاپان کے خلاف چینی قوم کا بنیادی پروگرام "۔ اس پر بیگم سین کے علاوہ کوئی ۲ ہزار سربرآوردہ اور باا ثر چینی قائدوں کے دستخط تھے ۔ اس میں ساری قوم کو مسلح کرکے جاپان کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی ۔ ۳۵ء میں پھر کمیونسٹ جماعت کی طرف سے " سب چینی مرد عورتوں کے نام جاپان سے لڑنے اور اپنے تمام پرانے علاقوں کو واپس لینے کا پیام " شائع ہوا ۔ اس پیام میں ایک متحدہ قومی حکومت کے قیام اور ایک متحدہ قومی لشکر


جمہوریہ منگولیا (بیرونی)
سن کیانگ
تبت
(اندرونی)
ولاڈی وسٹاک
جاپان
کوریا
بحر اصفر
نانکنگ
کینٹن
ہانگ کانگ
فارموسا
بحر الکاہل
مقبوضات جاپانی
منچوکو
۵ شمالی صوبے (چین کے)
جاپانی کس طرف بڑھنا چاہتے ہیں
۱۰۰۰
۵۰۰
میل

کی ترتیب کی تجویزیں ذمہ داری کے ساتھ پیش کی گئی تھیں۔ ۱۹۳۵ء کے ختم ہوتے ہوتے یہ تحریک بہت عام ہو گئی تھی اور تقریباً ہر چینی نوجوان اور طالب علم اس سے متاثر تھا۔ چیانگ کائی شک نے ان طالب علموں کے مظاہروں کو بھی بڑی سختی سے دبایا مگر اس سے غیر جانبدار لوگ اور بھی تحریک اتحاد کے حامی ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء ہی میں اشتراکی لشکر نے ایک اور عجیب حرکت یہ کی کہ کیانگسی اور فوکیان کے علاقہ سے اُٹھ کر شمال کا رخ کیا، اور سارے جنوبی چین میں اور صوبہ سے شوان اور کانسو سے گذر کر شمالی مغربی چین میں اپنے قدم جمائے اور اس سفر میں سارے ملک کو اتحاد قومی کا پیام پہنچاتے گئے۔

شمال مغرب کو اس کمیونسٹ علاقہ سے متصل ہی کومن تانگ کی وہ فوج پڑی تھی جسے نانکنگ کی حکومت نے منچوریا سے بے لڑے واپس بلا لیا تھا۔ یہ جاپان سے بہت نفور تھی اور اپنے ملک کی خاطر اپنا خون بہانے سے محروم رہی تھی اس لئے نانکنگ کی جاپان دوستی سے سخت نالاں۔ چنانچہ اس نے اشتراکیوں کے پیام اتحاد کا اثر آسانی سے قبول کیا۔ اُدھر انیسویں فوج جسے اشتراکیوں سے ساز باز کے جرم میں نانکنگ والوں نے منتشر کیا تھا اس کے کچھ حصے کوانگ سی کے صوبہ میں آپہنچے۔ یہاں کھوبائی قائد جنرل لی اور پائی پہلے سے جاپانیوں کے خلاف تھے ہی، اس فوج نے انھیں اور تقویت پہنچائی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں کوانگ تنگ اور کوانگ سی دو صوبوں نے حکومت نانکنگ کے خلاف اس وجہ سے بغاوت کی کہ وہ جاپان کے خلاف قوم کے تحفظ کے لئے نہیں اُٹھتی۔ کوانگ تنگ کی بغاوت تو دب گئی مگر کوانگ سی میں جاری رہی، نانکنگ کی قوت اسے جبر سے نہ دبا سکی، اور قومی رائے عامہ کا دباؤ اس قدر تھا کہ ان کے ساتھ صلح و آشتی سے معاملہ کرنے پر مجبور ہوئی۔

پھر گذشتہ سال دسمبر میں وہ واقعہ پیش آیا جو بغاوت سیان کے نام سے مشہور ہے۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ چیانگ کائی شک کو ان کی اپنی فوج نے ۲ ہفتہ تک حراست میں رکھا تھا۔ یہ بغاوت دراصل اس بات کا ثبوت تھی کہ کومن تانگ کے اندرونی حلقوں میں بھی اتحاد قومی کی تحریک

نے پورا پورا اثر کر لیا ہے۔ اس کی غرض یہ تھی کہ جو بات اور کسی طرح چیانگ کائی شک کے ذہن نشین نہیں ہوئی اُسے یوں اس تک پہنچایا جائے۔ کہتے ہیں کہ باغی فوج کے سردار مارشل سوے لیانگ نے چیانگ کے سامنے بہ ادب تمام یہ مطالبات رکھے تھے کہ نانکنگ کی حکومت از سرِ نو مرتب کی جائے، اور سب قومی جماعتیں اس میں شریک ہوں، خانہ جنگی ختم کی جائے، شنگھائی میں جو محبان وطن گرفتار ہوئے تھے وہ رہا کئے جائیں، حق رائے اور حق اجتماع قوم کو پھر سے دیا جائے، قوم پرست عوام کو آزادیٔ عمل ملے، سن یات سین کی وصیت پر پورا پورا عمل ہو، اور نجات قومی کے لئے ایک عام قومی کانفرنس بلائی جائے۔ کوشش یہ تھی کہ چیانگ ان مطالبوں کو اپنی طرف سے نانکنگ کی حکومت کے سامنے پیش کرے اور انھیں منوالے۔ چنانچہ اس نے یہ سب مطالبات کومن تانگ کے سامنے پیش بھی کر دئے مگر اس وجہ سے کہ ان کی ابتدا ایک گستاخی سے ہوئی تھی یہ مطالبات قابل قبول نہ سمجھے گئے۔ مگر معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تقریباً اسی قسم کے مطالبات کوانگ سی صوبہ کی طرف سے بھی پیش ہوئے تھے اور کومن تانگ نے انھیں قبول کر لیا ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ کومن تانگ کے کارکنوں پر اتحاد قومی اور دفاع وطنی کے مطالبہ کی قوت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اب زیادہ عرصہ تک اس متحدہ قومی مطالبہ کا مقابلہ ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے اس مرتبہ چینی فوجوں نے آگے بڑھنے میں اس قدر مستعدی کا اظہار کیا ہے۔ اور اگر شاطران سیاست کی خفیہ ریشہ دوانیاں جاپان سے کھلے مقابلہ کو ٹال نہ سکیں تو چینی قوم اب اپنی پوری قوت کے ساتھ اس دراز دستی کا مقابلہ کریگی۔ پھر نتیجہ جو بھی ہو۔

جاپان کے منصوبے ہم نے پچھلے پرچہ میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جاپان اب کچھ دن ذرا خاموش رہنا چاہتا ہے۔ تاکہ اہل سیاست آئندہ فوجی اقدام کے لئے راستہ صاف کر دیں۔ جاپان کے اس فیصلہ میں ایک عنصر تو ہمارے نزدیک یہی تھا کہ اس مرتبہ غالباً چین مقابلہ پر آ جائے گا۔ یہ خیال صحیح نکلا۔ البتہ نئی وزارت کو برسر اقتدار آئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ یہ قصہ پیش آگیا۔

نہ معلوم چھیڑ کس طرف سے ہوئی ہے اور ممکن ہے بالارادہ کسی کی طرف سے نہ ہوئی ہو۔ مگر بہرحال ہوگئی ہے اور اگر جاپان کے لئے موقع ہوگا کہ وہ اس شمالی چین کے علاقہ میں اپنا اثر بڑھائے تو وہ اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائے گا۔ اس لئے کہ نئی وزارت میں بھی باوجود ان تمام باتوں کے جن کا ذکر ہم نے پچھلے مہینہ کیا تھا فوجی عنصر خاصا بااثر ہے۔ اور نئے وزیراعظم شہزادہ کونوئے کی میانہ روی اور صلح پسندی غالباً فوجی جماعتوں کے اثر کو کچھ بہت کم نہ کرسکے گی۔ پھر اس وزارت میں وزیرخارجہ وہی ہروتا صاحب ہیں جنھوں نے ابھی جنوری ۳۶ء میں چین اور جاپان کی سیاست کے تین اصول یوں بیان فرمائے تھے کہ (۱) اشتراکیت کے خلاف چین اور جاپان میں پورا تعاون ہو اور اگر ضرورت ہو تو اشتراکیوں کو دبانے کے لئے جاپانی فوجوں سے بھی چین میں مدد لی جائے!

(۲) چین جاپان کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے ملک سے تعلقات نہ رکھے۔

(۳) چین اور منچوکو میں معاشی اور سیاسی تعاون شروع ہو جائے۔ اور ہو سکے تو شمالی چین میں منچو سکہ رائج ہو جائے۔

اس وقت چھیڑ ہوگئی ہے۔ دریائے آمور کے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت روس لڑنا نہیں چاہتا۔ برطانیہ بھی یورپی سیاست کے جھمیلوں میں پھنسا ہوا ہے۔ امریکہ اکیلا میدان میں کیا کودیگا۔ جاپانی سوچتے ہیں کہ چلو لگے ہاتھوں اپنے پرانے منصوبے کو پورا کرلو۔

ان کے نزدیک جو کام منچوریا میں شروع کیا گیا تھا اس کی تکمیل اسی وقت ہوگی کہ شمالی چین پر تسلط ہو جائے۔ ان شمالی صوبوں میں کوئی ۹۰ ملین آدمی بستے ہیں یعنی جاپان کی آبادی سے کوئی ۲۰ ملین زیادہ۔ اپنی موجودہ گری پڑی حالت میں بھی یہ ایک بڑی منڈی ہے۔ ہر سال کوئی ۲۰۰ ملین ڈالر کا مال باہر سے آتا ہے۔ اگر یہ منڈی ہاتھ آجائے تو اور ملکوں میں جاپانی مال پر جو روک ٹوک محاصل کے ذریعہ ہے اس کی تلافی ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ جاپانی صنعت کے لئے کچا مال فراہم کرسکتا ہے۔ یہاں لوہا بھی ہے، تیل بھی، ٹن بھی نکلتا ہے تانبا بھی، صرف ہوپائی کے صوبہ میں ہر سال، ملین ٹن اچھی قسم کا کوئلہ نکلتا ہے۔ پھر اس علاقہ کی زمین اور یہاں کی آب وہوا

ایسی ہے کہ کپاس کی کاشت خوب ہوسکتی ہے ۔ آج جاپان، ہندوستان اور امریکہ سے کوئی ۰۰ ہ ملین ٹن سالانہ کی روئی خریدتا ہے۔ شمالی چین پر تسلط ہو جائے تو کپڑے کی صنعت دوسروں کی دست نگر نہ رہے ۔ مویشی پالنے کے لئے بھی اس علاقہ میں بڑے مواقع ہیں ۔ جاپان کو کھن، چمڑے وغیرہ کی جو ضرورت ہے وہ بھی اس علاقہ سے پوری ہوسکتی ہے ۔

معاشی اہمیت کے علاوہ فوجی ضرورتوں کے لئے بھی یہ علاقہ درکار ہے ۔ شمالی چین اور جنوب کے درمیان ریل کی جو لائینیں ہیں ان کے اہم مقام اسی علاقہ میں ہیں ۔ پھر پائینگ سے سوئی یوان کو جو لائن جاتی ہے وہ شمالی مغربی چین اور منگولیا کی کنجی ہے ۔ اور منگولیا اور اس کے نواح کے اشتراکی علاقہ کو بے بس کرنا مقصود ہے ۔ اس لئے کہ یہ علاقہ روس کے زیر اثر ہے، جاپانی سیاست کا نہایت اہم مقصد یہ ہے کہ چین کو منگولیا اور روس سے اس طرح الگ کردے کہ کہیں سرحد ملے ہی نہیں اور منچوریا سے سن کیانگ تک روس اور چین کے درمیان ایک درمیانی ریاست قایم ہو جائے جو جاپانی اثر میں ہو ۔

ان مقاصد کے پیش نظر جاپان مدت سے اس علاقہ میں طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کر رہا ہے ۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اگر تکمیل ہو سکے گی تو کیوں نہ کرے گا ۔ لیکن اگر سخت چینی مدافعت کا اندیشہ ہوا تو ممکن ہے کہ کچھ باتیں منوا کر باقی پھر کسی وقت کے لئے ملتوی کر دے ۔ طاقت ور کی سب سے بڑی جیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی لڑائی کا وقت بھی تو خود طے کر سکتا ہے !

آئرستان کے انتخابات آئرستان نے اپنی آزادی کے لئے جو جدوجہد کی ہے اس سے ہندوستانی بڑی گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں ۔ اس جدوجہد میں آئری قوم کے سردار ڈی ویلرا کی شخصیت میں بھی ہندوستانیوں کے لئے بڑی کشش رہی ہے اور انھوں نے بھی وقتاً فوقتاً ہندی تحریک آزادی سے اپنا تعلق خاطر ظاہر کیا ہے ۔ اس عام تعلق کے علاوہ ہندوستان کے اہل سیاست میں جو بحث برابر کامل آزادی اور نو آبادیاتی درجہ کے متعلق رہی ہے اس سلسلہ میں بھی آئری سیاست

ہم لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث رہی ہے۔

چنانچہ گذشتہ جولائی میں جو عام انتخابات آئرستان میں ہوئے ان کے نتائج کا انتظار ہندوستان میں بھی رہا۔ اس لئے کہ ان انتخابات میں ایک تو یہ دیکھنا تھا کہ ڈی ولیرا پھر برسرِ اقتدار آتے ہیں یا نہیں، لیکن اس سے زیادہ یہ کہ نیا دستورِ اساسی جس میں آئرستان کو ایک جمہوریہ قرار دیا گیا ہے اور جس میں سلطنت برطانیہ اور شاہ برطانیہ کا نام بھی نہیں آیا منظور ہوتا ہے یا نہیں۔

ڈی ولیرا اور ان کی پچھلی وزارت کے اکثر رکن پھر منتخب ہوگئے۔ قوم نے ان کے مجوزہ دستورِ اساسی پر بھی مہرِ قبول ثبت کردی۔ لیکن یہ توقع پوری نہ ہوسکی کہ ڈی ولیرا کی سیاسی جماعت فیانافیل کو اتنی اکثریت حاصل ہوجائے گی کہ وہ کسی دوسری جماعت کو ساتھ لئے بغیر حکومت کا کاروبار چلاسکیں گے۔ انتخاب کے نتیجہ نے کچھ عجب توازن سا پیدا کردیا ہے۔ ۱۳۸ نشستوں میں سے ۶۹ ڈی ولیرا کی جماعت کو ملیں، باقی ۶۹ دوسری جماعتوں کو۔ چونکہ صدر غالباً ڈی ولیرا کی جماعت کا آدمی ہوگا اس لئے پارلیمنٹ میں ان کی جماعت دوسری جماعتوں کی متحدہ قوت کے مقابلہ میں ایک کی اقلیت میں ہوگی، اور اس لئے وزارت بنانے کے لئے انھیں کسی دوسری جماعت کو ساتھ لینا ہوگا۔ یہ جماعت وہی پرانی مزدوروں کی جماعت ہوگی جو اب تک ان کے ساتھ تھی اور جو اس مرتبہ پہلے سے زیادہ قوی ہے۔ پہلے اس کے کل ۸ رکن تھے اب کے ۱۲ ہیں۔

اس انتخاب میں تین جماعتیں خاص طور پر قابلِ لحاظ تھیں:۔ (۱) ڈی ولیرا کی جماعت فیانافیل (۲) مسٹر کاسگریو کی جماعت یونائیٹڈ آئرش پارٹی اور (۳) مزدوروں کی جماعت۔ فیانافیل کا پروگرام تو یہ تھا کہ سیاسی اعتبار سے ملک کو جمہوریت تسلیم کیا جائے، نیا دستور منظور ہو؛ برطانوی سلطنت سے ایک خودمختار خارجی حکومت کی حیثیت سے جو تعلقات ہوسکیں قایم رکھے جائیں؛ حتی الوسع دوستانہ، مجبوری ہو تو مخالفانہ میں بھی مضایقہ نہیں۔ اندرون ملک میں پرانی معاشی سیاست کا جاری رکھنا، ملک کو حتی الوسع خودکفالتی بنانا، چھوٹی چھوٹی صنعتیں قایم کرنا، آبادی کے سمٹ سمٹ کر شہروں میں جمع ہونے کو روکا جائے، صنعت کو دیہات میں پہنچایا جائے، اور اس کی

سبیل نکالی جائے کہ کارکردگی تو کم نہ ہو لیکن صنعت کا کام چھوٹے کارخانوں میں انجام پائے : ہر شخص جو کام کرنے کو تیار ہے اور کام کر سکتا ہے اس کے لئے کام مہیّا کیا جائے ؛ کام جن حالات اور جس ماحول میں انجام پاتا ہے اسے سدھارا جائے ؛ بچوں اور عورتوں کی محنت سے کسی کو بیجا فائدہ نہ اٹھانے دیا جائے ، معاشی لحاظ سے پس ماندہ طبقوں کے اغراض کا خاص خیال رکھا جائے ؛ مریض، دکھی، بیوہ، یتیم اور بوڑھوں کی پرورش کا سامان ہو ؛ خاندان کی زندگی کی حفاظت کی جائے ۔

مسٹر کاسگریو کی یونائیٹڈ آئرش پارٹی نے بھی اس مرتبہ یہ سوچا کہ وعدوں میں کسی طرح ہم بھی ڈی ولیرا سے پیچھے نہ رہیں ۔ چنانچہ داخلی معاشی پروگرام ان کا بھی کم وبیش وہی تھا جو فیانا فیل کا ، بس ذرا لفظوں کا اُلٹ پھیر تھا ۔ یہ کہتے تھے کہ کسانوں کو اپنی حالت سدھارنے کے لئے ۳ فی صدی شرح سود پر سرمایہ فراہم کریں گے ! دیسی صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے ایک مفصل اور معین تجویز بنائیں گے ، بعض صنعتوں کی تامین کے لئے محصول لگائیں گے ، بعض کو روپیہ سے مدد دیں گے ، بعض کے لئے سستی شرح پر قرض کا انتظام کریں گے ؛ خام اجناس اور کھانے پینے کی چیزوں پر سے ٹیکس اٹھا دیں گے ؛ صنعتی مزدوروں کے لئے زندگی کے بیمہ اور بڑھاپے میں پنشن کا انتظام کریں گے اور بال بچوں کی پرورش کے لئے مخصوص الاؤنس مقرر کریں گے ؛ تعلیم پر صرف بڑھائیں گے اور ۱۶ سال کی عمر تک تعلیم ہر شہری پر لازم کردیں گے ، کھیل اور تفریح کے مواقع زیادہ کریں گے ؛ یادش بخیر، کمیونزم کا مقابلہ کریں گے ، معاشی طبقوں کے ساتھ انصاف کریں گے ، اور ملک کی موجودہ تقسیم کو مٹا کر ایک متحدہ آئرستان کے قیام کی کوشش کریں گے ۔ غرض تقریباً ہر وہ چیز کریں گے جو فیانا فیل کرنا چاہتی ہے ۔ پھر فرق کیا ہوگا ۔ یہ کہ برطانیہ کے ساتھ ہوں گے ، سلطنت برطانیہ میں ایک رکن کی حیثیت سے شریک ہوں گے ، اس شرکت کے تمام فوائد حاصل کریں گے اور اس کی تمام ذمہ داریاں اُٹھائیں گے۔

تیسری جماعت مزدوروں کی جماعت ہے ۔ ان کا اثر ابھی صرف شہروں تک محدود ہے ۔ حزب العمال کی جو جماعتیں اُنھوں نے بنائی ہیں وہ ناقص انگریزی ٹریڈ یونین کی اور بھی ناقص نقل ہیں ۔ انھیں سیاسی مسائل سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے ۔ ان کا پروگرام یہ ہے کہ معاشی زندگی میں حکومت کے

اثر کو بڑھائیں، دولت کی بہتر تقسیم کی تدابیر کریں، نجی شراکتوں کی جگہ کاروبار کو حکومت یا بلدیوں کے ہاتھ میں دیں۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ڈی ولیرا کو اپنی وزارت کے قیام و استحکام کے لئے اس مزدور جماعت کو ساتھ لینا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس جماعت کو سیاسی مسائل سے زیادہ لگاؤ نہیں اور ڈی ولیرا کی جماعت کے نزدیک جمہوریت کے اعلان اور برطانیہ سے ایک خارجی حکومت کے سے تعلقات کا قایم کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ زیادہ عرصہ تک نباہ نہ ہو اور شاید نئے دستور پر دونوں میں اختلاف ہو جائے۔ اور کیا عجب ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد پھر عام انتخابات کرنے پڑیں۔

آئرستان کا نیا دستور | عام انتخابات کے ساتھ ساتھ آئرستان میں نئے دستور اساسی پر بھی قوم کی رائے حاصل کی گئی تھی اور قوم نے بڑی اکثریت سے اسے منظور کیا۔ اس نئے دستور کے اہم دفعات کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

ملک کا نام Eire ہوگا۔ یہ نام کل جزیرہ پر حاوی ہوگا۔ البتہ ملک کی جبریہ تقسیم کے مٹنے تک یہ دستور صرف اس حصہ میں نافذ ہوگا جو اب تک فری اسٹیٹ کہلاتا تھا۔

ریاست کا حاکم اعلی صدر کہلائیگا۔ اسے قوم براہ راست ، سال کے لئے منتخب کیا کریگی۔ ۳۵ سال سے اوپر کا ہر شہری اس منصب کے لئے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اسے پارلیمنٹ کے ۲۰ رکن نامزد کریں یا چار بلدیوں کی طرف سے اس کا نام پیش ہو۔ اس کے فرائض یہ ہوں گے:- ڈیل (دارالمندوبین) کے اجلاس طلب کرنا اور اسے برخاست کرنا؛ قوانین پر اپنے دستخط ثبت کرکے انھیں شائع کرنا؛ سزاؤں کا کم کرنا یا معاف کرنا؛ عساکر قومی کی اعلی کمان اپنے ہاتھ میں رکھنا، اور حکومت وقت کے مشورہ سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کو اہم قومی امور کے متعلق پیام بھیجنا۔ صدر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں سے کسی کا رکن نہ ہوگا اور اپنے فرائض سے متعلق کسی ایوان کو جوابدہ نہ ہوگا۔ البتہ اگر سینٹ (ایوان اعلی) اپنی پلے اکثریت

سے اس پر غداری کا الزام لگائے اور ڈیل (ایوان ادنیٰ) کی ⅔ اکثریت بھی اس الزام کی تصدیق کرے تو اسے منصب صدارت سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈیل (ایوان ادنیٰ) کے ۱۴۸ مندوبوں کا انتخاب چناؤ کرنے والے براہ راست کیا کریں گے تناسب نمائندگی کے اصول پر۔ ہر عاقل بالغ چناؤ میں حصہ لے سکتا ہے۔ سینٹ (ایوان اعلیٰ) میں ۶۰ رکن ہوں گے۔ ۱۱ وزیراعظم کے نامزد کئے ہوئے باقی ۴۹ میں سے ۶ قومی یونیورسٹی اور ڈبلن یونیورسٹی کی طرف سے تین تین کرکے۔ باقی ۴۳ کو پیشہ وار فہرستوں میں سے وہ لوگ منتخب کریں گے جنھیں ڈیل کے پچھلے انتخاب میں ۵۰۰ سے زیادہ اول نمبر کے ووٹ ملے ہوں یا جو بلا مخالفت ڈیل کے رکن منتخب ہوئے ہوں۔ سینٹ مجاز ہوگی کہ میزانیہ اور خرچ سے متعلق قانونوں کو چھوڑکر باقی جس مسودہ قانون کو چاہے ۳ مہینہ تک روک رکھے، یا ان میں ترمیمیں پیش کرے بشرطیکہ پھر یہ ترمیمیں بعد کو ڈیل میں بھی منظور ہو جائیں۔

وزیراعظم کا تقرر صدر جمہوریہ ڈیل کی سفارش پر اور وزرار حکومت کا تقرر وزیراعظم کی سفارش پر کیا کرے گا۔ وزرار کے لئے ضروری ہے کہ ڈیل کے رکن ہوں یا سینٹ کے۔ لیکن سینٹ کے اراکین میں سے دو سے زیادہ وزیر نہ لئے جا سکیں گے۔ "بزرگوں" کی ایک کونسل بھی ہوگی، جس میں وزیراعظم، نائب وزیراعظم، چیف جسٹس، ڈیل اور سینٹ دونوں کے صدر ہوا کریں گے اور وہ لوگ جو پہلے ان عہدوں پر مامور رہ چکے ہیں یا وہ لوگ جنھیں صدر باختیار خاص رکن مقرر کرے۔ یہ مجلس صدر جمہوریہ کو اس کے فرائض کی انجام دہی میں مشورہ دیا کرے گی۔

عدالت عالیہ کے فیصلے ناطق اور قطعی ہوں گے۔ کسی مسودہ قانون کے متعلق یہ مسئلہ درپیش ہوگا کہ یہ دستور اساسی کے مطابق ہے یا نہیں تو صدر "بزرگوں کی مجلس" سے مشورہ کرکے اس کا فیصلہ عدالت عالیہ سے کرایا کرے گا۔

جدید دستور میں مندرجہ ذیل بنیادی حقوق کی ضمانت کی گئی ہے: اظہار رائے کا حق؛ مذہبی آزادی؛ ملکیت شخصی؛ اجتماع کا حق (بلا اسلحہ کے)؛ اور ہیئت اجتماعی کے بنیادی ادارہ،

خاندان' کا تحفظ۔ چنانچہ نکاح کا فسخ کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، کسی اور جگہ طلاق حاصل کر لی گئی ہو تو یہاں تسلیم نہ کیا جائے گا! ۔

سارے دستور میں بادشاہ یا سلطنت برطانیہ کا نام بھی نہیں ہے۔ (ذ۔ ح)

وفاقی حکومت اور اس کی دشواریاں | دنیا کے متمدن ممالک میں جہاں جہاں وفاقی طرز کی حکومتیں قائم ہیں وہاں مجالس آئین ساز اور محکمہ ہائے انصاف میں اختلافات رونما ہو رہے ہیں۔ حکومت اور عدالت کے اس تصادم کی اطلاعات ان دنوں امریکہ، کناڈا اور آسٹریلیا سے آ چکی ہیں۔ ہندوستان میں وفاقی حکومت کا دور شروع ہونے کو ہے اور عنقریب وفاقی عدالت کا قیام بھی عمل میں آنیوالا ہے۔ عجب نہیں کہ اہل ہند کو بھی اسی قسم کے مشکل مسائل سے دوچار ہونا پڑے۔ اس لئے لازماً ہمیں وفاقی حکومتوں کی کارگذاریوں اور ان کی راہ کی دشواریوں سے دلچسپی ہونی چاہیئے تاکہ ان حالات کی روشنی میں ہم اپنے ملک کے مستقبل کو کسی قدر بہتر بنانے کے لئے ابھی سے غور و فکر کرنا شروع کر دیں۔

اس سلسلہ میں جامعہ کے جون کے پرچے میں ہم امریکہ کی کانگریس اور عدالت عالیہ کے باہمی نزاع کا مختصر سا ذکر کر چکے ہیں۔ نیز یہ بھی بتا چکے ہیں کہ کیوں کر صدر جمہوریہ امریکہ عدالت عالیہ میں ایسے ججوں کی تعداد بڑھانا چاہتے ہیں جو اُن کے ہم خیال ہوں تاکہ عدالت میں اُن کے حامیوں کی اکثریت کانگریس کے پاس کردہ اصلاحی قوانین کو آئینی قرار دے سکے۔ اب کناڈا کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ پچھلے دنوں وہاں کی پریوی کونسل نے وفاقی مجلس مقننہ کے پاس کردہ اصلاحی قوانین کو خلاف آئین قرار دینے میں عدالت کے فیصلوں کی تائید کی ہے۔ اس معاملہ کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اگرچہ ملک کی تمام جماعتیں اس امر کے حق میں ہیں کہ ملک کی بہبودی کے لئے چند نئے قوانین کا وضع کرنا ضروری ہے مثلاً بیکاروں کے بیمہ کا قانون —— لیکن پریوی کونسل کے بیان کردہ دستوری مفہوم کے مطابق وفاقی مجلس آئین ساز کے لئے نا ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اس قسم کے مفید قوانین پاس کر سکے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مختلف تجویزیں کی گئیں لیکن کوئی بروئے کار نہ آسکی۔ بالآخر موجودہ حکومت نے ایک رائل کمیشن بٹھایا ہے۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ وہ کناڈا کی مالیاتی

حالات کی تحقیقات کرے، محاصل کے ذرائع پر غور کرے اور مرکز اور صوبوں کے درمیان ذمہ داریوں کی مناسب تقسیم کرے۔ اس کمیشن کی سفارشات دستوری اصلاح و ترمیم کے لئے دلیل راہ ثابت ہونگی۔

آسٹریلیا کی کامن ویلتھ کو بھی چند خاص حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ وہاں کی وفاقی پارلیمان کو بازاری نرخوں اور ہوائی پرواز کے بارہ میں مزید اختیارات دینے کی غرض سے براہ راست رائے دہندوں سے استصواب رائے کیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریت نے وفاقی ارباب حل وعقد کے خلاف فیصلہ دیا۔ آسٹریلیا کے دستور کے مطابق دستوری اصلاح کی تجاویز وفاقی پارلیمان کے سامنے پیش ہوتی ہیں قبل اس کے کہ براہ راست انتخاب کنندوں سے رائے طلب کی جائے۔ اس قبیل کی تجاویز قانون کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہیں جبکہ رائے دہندوں کی اکثریت انھیں پسند کرے۔ نہ صرف یہ بلکہ اکثر ریاستوں کی اکثریت اُن کے حق میں ہو۔ نرخوں میں ترمیم کی تجویز تمام ریاستوں میں مسترد ہوگئی۔ یہی حشر فضائی پرواز کی تجویز کا ہوا۔ اگرچہ مجموعی حیثیت سے اکثریت ان کے حق میں تھی لیکن کثرت رائے اسے صرف دو ریاستوں میں حاصل ہوئی۔ اس لئے دستور کی رُو سے اسے بھی مسترد کرنا پڑا۔ محکمۂ پرواز پر اصل اقتدار ریاستوں کو حاصل ہے کیونکہ باقی ماندہ آئین سازی کے اختیارات اُنھی کے ہاتھ میں ہیں، لیکن وفاقی پارلیمان کے بعض پاس کردہ قوانین کے ماتحت کامن ویلتھ بھی فضائی پرواز پر جزوی قبضہ رکھتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہنگامہ خیزی اور اندرونی خلفشار کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ وفاق اور ریاستوں میں اس قسم کا تصادم جاری رہیگا تاآنکہ کوئی خطرناک حادثہ پیش آئے اور آسٹریلیا کے ارباب فکر فوری آئینی اصلاحات پر مجبور ہو جائیں۔

دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں جہاں کے دستور بہتر خیال کئے جاتے ہیں اگر اس قسم کے افسوسناک حالات پیش آسکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں اُن کا اعادہ نہ ہو۔ جہاں کا وفاقی دستور سرے سے ناقص ہے اور اپنے اندر سینکڑوں پیچیدگیاں اور لاینحل گتھیاں پوشیدہ رکھتا ہے۔ مرکزی اور صوبائی ذمہ داریوں کی نامناسب تقسیم کے علاوہ دیسی ریاستوں کا مسئلہ یہاں اور بھی ٹیڑھا ہے۔ کیا یہ مسائل ہندوستانیوں کی توجہ کے مستحق نہیں ہیں؟

(ع۔ ق)

تعلیمی دنیا

ڈاکٹر وانگ شی، چی وزیر تعلیم چین کے بیان کے مطابق چین کی ۱م کروڑ آبادی میں سے ۸۰ فیصدی ناخواندہ ہیں اور ایک کروڑ بچے جو اسکولی عمر کے ہیں ابتدائی تعلیم حاصل نہیں کرسکے ۔ وزارت تعلیم، ابتدائی تعلیم پر خاص طور سے زور دے رہی ہے اور صوبائی حکام کو ہدایات کردی گئی ہیں کہ حکومت کے پنجسالہ تعلیمی لائحہ عمل پر پوری سرگرمی سے کام شروع کردیا جائے ۔ سنہ ۱۹۱۱ء کی نسبت آج اعلیٰ تعلیم گاہوں کی تعداد سو گنی ہے ۔ اور وسطانی مدرسوں کی تعداد آٹھ گنی ہوگئی ہے ۔ گذشتہ ۲۶ سال میں ابتدائی مدرسوں کی تعداد چوگنی ہوگئی ہے ۔

چین کی یہ تعلیمی ترقی باوجود قدامت پسندی، افیون نوشی، باہمی کشت وخون اور خارجی طاقتوں کے جارحانہ اقدام کے قابل مبارکباد ہے ۔ ہندوستان پچھلے ڈیڑھ سو سال سے ایک منظم اور طاقتور حکومت کے زیر سایہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے مگر ابھی تک پڑھے لکھوں کی تعداد ۸ و ۲ فی صدی سے زیادہ نہ ہوسکی ۔ طرفہ یہ کہ پچھلی صدی کے آغاز میں ایک سرکاری رپورٹ کے بموجب ہندوستان میں بالعموم اور بنگال میں بالخصوص تعلیم یافتگان کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی !

بین الاقوامی مونٹ سوری ایسوسی ایشن کی طرف سے بین الاقوامی مونٹ سوری کانگرس کا چھٹا اجلاس کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں یکم اگست سے دس اگست تک منعقد ہوگا۔ جملہ انتظامات وزارت تعلیم ڈنمارک کرے گی ۔ کانگرس کے مباحث کا عام عنوان "امن کی تعلیم" ہوگا ۔ کانگرس کا افتتاحی جلسہ یکم اگست کو ڈنمارک پارلیمان کے ایوان میں منعقد کیا جائے گا ۔ اور خطبات استقبالیہ وزیر تعلیم ڈنمارک اور میڈم مونٹ سوری پڑھیں گے ۔ کانگرس کے عام عنوان "صلح جوئی اور آشتی کی تعلیم" پر مادام مونٹ سوری چھ خطبے دیں گی ۔ اس سلسلے میں دنیا بھر کے مونٹ سوری بچوں کے دستکاری کے

نمونوں کی نمائش بھی کی جائے گی۔ یورپ کے مفکرین، سیاست داں اور ماہرینِ تعلیم قومی عصبیت کی اس آگ کو جو دیکھتے دیکھتے پورے براعظم کو جہنم زار بنا سکتی ہے، بہت خوف دہراس کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور ہر سمجھدار اور دور اندیش متنفس انفرادی اور اجتماعی طور پر صلح و آشتی کے لئے کوشاں ہے۔ امن پسند سیاسیئین اور مدبرین تو مختلف جماعتوں، حکومتوں اور بالغ آبادی کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر معلمین اس صلح و امن پسندی کی بنیاد زیادہ استوار رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جب تک نئی نسلوں کے دل سے نفرت اور قومی تعصب کے اثرات دور نہ ہوں گے، عالم گیر امن اک مستقل صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں کچھ عرصے سے تعلیمی دنیا میں سینکڑوں کتابیں امن کے موضوع پر نکل چکی ہیں۔ بین الاقوامی یک جہتی اور یگانگت کے مرکز جینوا میں اس مقصد کے لئے ایک خاص ادارہ قائم ہے۔ نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے مباحث کا ایک اہم عنوان ہمیشہ امن کی تعلیم ہوتا ہے۔

سوئٹ حکومت نے امسال مدرسوں کے کتب خانوں کے لئے ستر ملیون روبل کا میزانیہ منظور کیا ہے۔ اس میں سے ۴۵ ملیون تو ثانوی مدرسوں میں اور ۲۵ ابتدائی میں صرف ہوگا۔ تقریباً ۱۴ ملیون نئی کتابیں خریدی جائیں گی جو روسی بچوں کے بڑھتے ہوئے شوقِ مطالعہ کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ حکومت کی طرف سے بچوں کا اشاعت گھر قائم ہے جو آیندہ چند ماہ میں ۳۰۰ مختلف عنوانوں کی کتابوں کو بڑی تعداد میں چھاپ رہا ہے۔ ان میں روسی اور غیر ممالک کے مشاہیر کی تصانیف شامل ہیں۔ بچوں کے لئے مناسب کتابوں کی فراہمی ہر متمدن ملک کے لئے نظام تعلیم کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے۔ بعض ملکوں میں تو ان کی تصنیف اور اشاعت کسی بلند ہمت اور دلیر کتب فروش کی انفرادی کوششوں کی مرہون منت ہوتی ہے اور کہیں حکومت خود اس فرض کی انجام دہی اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ ہندوستان میں بدقسمتی سے یہ نازک کام ٹیکسٹ بک کمیٹیوں کے سپرد کر دیا گیا ہے اور جو اثرات کتابوں کو منظور کرانے میں ڈالے جاتے ہیں وہ کوئی راز نہیں۔ ان شرمناک خرابیوں کی وجہ سے بعض صوبوں میں تو یہ کمیٹی توڑ دی گئی ہے۔ روس میں کتابوں کی اشاعت کے علاوہ بچوں کے لئے

کتب خانوں اور عجائب گھروں کے قیام کا بھی انتظام ہو رہا ہے۔ اور یہ بھی کچھ کم اہم کام نہیں پچھلے دنوں کراچی میں بچوں کے لئے ایک تصویر گھر کھولا گیا ہے۔ اقتضائے وقت یہ ہے کہ بچوں کی کتابوں کی اشاعت کتب خانوں کی تنظیم وغیرہ کا کام مرکزی مشاورتی بورڈ اپنے ہاتھ میں لے۔ اور مرکزی تعلیمی کتب خانہ کا جو حال میں قائم ہونے والا ہے اک شعبہ اطفال کھول دے۔ جامعہ نے بھی اس سلسلے میں کچھ کام شروع کیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے ہمارے ادب کی ایک بڑی کمی کے پورا ہونے کا راستہ کھلے گا۔ اور مفید کام انجام پائے گا۔

پچھلے ماہ افغان نیشنل پارلیمان کا افتتاح کرتے ہوئے شاہ ظاہر شاہ غازی نے ایک تقریر کے دوران میں فرمایا :-

"تعلیم کے سلسلے میں ہم نے نوے وسطانی اور اعلیٰ اسکول قائم کئے ہیں مجھے یقین ہے کہ وزارت تعلیم اس تعداد میں جب اور جہاں کہیں بھی ممکن ہوگا اضافہ کرنے میں دریغ نہ کرے گی۔ آبادی کے ہر طبقے میں پشتو زبان کی تعلیم و تدریس کے لئے خاص طور پر کوشش کی جا رہی ہے"

حکومت ہند نے بیورو آف ایجوکیشن کو سال ۱۹۲۳ء میں تخفیف اخراجات کے سلسلے میں بند کر دیا تھا۔ یہ بیورو اب دوبارہ جاری کیا جائے گا۔ اس کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے :-

(۱) تعلیمی کتب اور رسائل کا ایک مرکزی کتب خانہ قائم کرنا،

(۲) تعلیمی مسائل پر لٹریچر جمع کرنا اور اس کی مختلف صوبوں میں اشاعت کرنا،

(۳) صوبجاتی محکمہ تعلیم کے لئے وقتاً فوقتاً تعلیمی رسائل، پمفلٹ اور رپورٹیں شائع کرنا۔ نیز دلچسپ اور مفید مطلب معلومات بہم پہنچانا،

(۴) ہندوستان کی تعلیمی ترقی پر سالانہ اور پنج سالہ رپورٹ مرتب کرنا،

(۵) صوباتی تعلیمی افسران اور حکام کی درخواست پر تعلیمی مضامین کے متعلق معلومات بہم پہنچانا۔

یہ بیورو تعلیمی کمشنر کے ماتحت ہوگا۔ اور سکرٹیری تعلیمی مشاورتی بورڈ اس کا کیوریٹر ہوگا۔ اس ادارے کی طرف سے پہلے بھی علاوہ سرکاری رپورٹوں کے ملک کے تعلیمی مسائل مثل دو زبانوں کی تعلیم دیہاتی تعلیم وغیرہ پر رسائل چھپتے رہیں گے، اگرچہ رسائل بالعموم محکمۂ تعلیم کے حکام کے قلم سے نکلتے تھے۔ اور تعداد میں بھی بہت کم رہے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ یہ ادارہ ہندوستان کے احیائے تعلیمی کے قائدین کو اس مفید کام میں دعوت شرکت دے گا۔ کیونکہ تعلیمی نصب العین کی تبدیلی، طریق اور نظام کی اصلاح ہر ملک میں بالعموم غیر سرکاری اداروں اور ان ماہرین تعلیم سے شروع ہوئی ہے جن کا حکومت کے ارباب اختیار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بیورو کا کتب خانہ اسی حالت میں زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے، جب اس میں مختلف قسم کے شعبے ہوں جو تعلیم کے ہر صیغے کے لئے مواد بہم پہنچا سکیں۔ صرف صیغۂ اطفال میں ہی، کتب کھیل، تصویر گھر، صنعت و دستکاری وغیرہ کے کئی ایک شعبے کھل سکتے ہیں۔

سر تیج بہادر نے لندن میں تقریر کرتے ہوئے مسئلہ بے کاری پر حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا "مجھے اپنے کام سے اتنا اطمینان ضرور حاصل ہوا ہے کہ عوام اور حکومت کی توجہ اس مسئلہ کی طرف مبذول ہوگئی ہے۔ بڑودہ اور ٹراونکور میں ہماری سفارشات پر عمل کرنے کی خاص کوشش کی گئی۔ آج کل مسئلہ بے کاری نازک حالت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اور اس سے بے پرواہی کا انجام بے حد خطرناک ہوگا۔ میں نے اپنے صوبے کی مجلس مقننہ میں بھی تقریر کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ اگر تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی مجھے دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہو تو میں ضرور اک وحشت انگیز انقلابی بن جاؤں گا آج ہندوستان میں سیاسی فکر کی رَو گذشتہ پانچ چھ سال کی نسبت مخالف سمت میں چل رہی ہے اور اس کا نقطۂ نظر اقتصادی ہے۔ ہمیں زمیندار اور مزارع کے تنازعہ اور تعلیم یافتہ نوجوان کی بے روزگاری کا حل فی الفور تلاش کرنا چاہیئے۔ اگر یہ گتھی نہ سلجھ سکے گی تو حکومت اور سماج کو سخت خطرے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر اس کا کوئی مناسب حل نہ ہو سکا تو میں ان نوجوانوں کو ہرگز مورد الزام نہ ٹھہراؤں گا۔ جو حکومت اور سماج کے خلاف اظہار نفرت و حقارت کریں گے"

اخبار وائس آف چائنا میں ایک مضمون غلامی کی تعلیم کے عنوان سے چھپا ہے جس میں اس نظام تعلیم پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے جو جاپان نے مانچوکو میں شروع کیا ہے۔ مصنف اس ضمن میں ایک تعلیمی اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جاپانی حکام نے مدرسوں کے پرنسپلوں کو بلا کر ان تعلیمی اصولوں کی تشریح کی جن پر حکومت تعلیمی اداروں کو چلانا چاہتی ہے۔ مانچوکو میں تعلیم جسمانی محنت و ریاضت کے نقطۂ نگاہ سے دی جائے گی۔ اہل مانچوکو کو اپنے جسمانی قویٰ کا استعمال سکھایا جائے گا۔ مگر ذہنی قویٰ کی تربیت ہرگز نہ دی جائے گی۔ جاپانیوں کا دعویٰ ہے اہل مانچوکو گھٹیا اور ارذل نسل سے ہیں۔ انھیں ذہنی نشوونما کی ضرورت نہیں۔

تقریباً تمام کالج اور سینئر مڈل اسکول بند کر دیے گئے اور اس طرح اعلیٰ تعلیم کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور نیچے کے درجوں میں بھی فنی اور صنعتی تعلیم پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ حکومت ہر ممکن طریق سے اعلیٰ تعلیم کے رستے میں مشکلات حائل کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ جاپانی سیاسیئین کا خیال ہے کہ یہ تعلیم عوام میں بیداری اور احساسِ خودداری پیدا کرتی ہے۔

چینی تاریخ اور ادب کے لئے مدرسوں میں کوئی جگہ نہیں۔ ان کی جگہ جاپانی کہانیوں، ضرب الامثال اور جاپانی مشاہیر کی سوانح عمریوں نے لے لی ہے۔

لڑکوں کو محنتی... اور جفاکش بنانے کے بہانے اُن سے ہر قسم کا رذیل کام لیا جاتا ہے۔ ان سے نہ صرف مدرسے کے کمرے، اساتذہ کے گھر، پرنسپل کا دفتر صاف کرایا جاتا ہے، بلکہ بالعموم شہر کی گلیوں کی صفائی بھی ان کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

طلبا کے داخلے پر حکومت کی طرف سے سخت اور بے جا پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ داخلے کے سلسلے میں کئی ایک اسناد داخل کرنا پڑتی ہیں۔ جن میں سے ایک پر طالب علم کے جائے پیدائش کے پولیس افسر کی بھی تصدیق ہونا چاہیے۔ غرضکہ جاپانی حکومت کی طرف سے اس امر کی پوری احتیاط کی جاتی ہے کہ ناپسندیدہ طلبا تعلیمی اداروں میں داخل نہ ہونے پائیں۔ حکومت ان اساتذہ سے بہت سختی سے پیش آتی ہے جو مدرسوں میں چینی ادب یا روایات کا ذکر کرنے کے مجرم ٹھہرا دیے جائیں جب کبھی کوئی غریب اس جرم میں ماخوذ ہو جاتا ہے تو اس کی جان کی خیر نہیں ہوتی۔ جیل خانے مانچوکو

کے اسائذہ سے پر ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض تو شدید عقوبت کی وجہ سے جاں بحق ہو گئے اور بعض کو قتل کر دیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ خون چکاں داستان ان کوششوں کی جو استعماریت پسند جاپان غریب مانچوکو کو مہذب بنانے کے لئے کر رہا ہے!

بنگال میں ایک ثانوی تعلیمی بورڈ قائم کرنے کی تجویز حکومت کے زیرِ غور ہے۔ اس قسم کے بورڈ کی کلکتہ یونیورسٹی کمیشن سنہ ۱۹۱۶ء نے سفارش کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹی کے ذمے سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ تعلیم اور امتحانوں کی نگرانی کا بوجھ ہٹ جائے، تاکہ یونیورسٹی اوپر کے درجوں کی تعلیمی اصلاح اور علمی تحقیقات وغیرہ کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لے سکے۔ اس سفارش کی بنا پر ایسے بورڈ، یوپی، اجمیر وغیرہ میں قائم ہوئے۔ حکومت بنگال نے بالآخر اس طرف توجہ کی ہے۔ بورڈ کے ممبر تعداد میں ۲۹ ہوں گے۔ کچھ منتخب کئے جائیں گے، باقی نامزد ہوں گے۔ بورڈ کا فرض ثانوی تعلیم کی صحیح رہنمائی، نگرانی اور انتظام کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کو اس بورڈ میں خاص نمائندگی دی گئی ہے۔

حکومت یوپی نے مسلمانوں کے تعلیمی زعماء کو اک مشاورتی کانفرنس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ جس میں ان سرکاری تجاویز پر بحث کی گئی جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ فروری ۱۹۳۶ء کے رزولیشن پر مبنی ہیں۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر ضیاء الدین، پروفیسر غلام السیدین، مسٹر عبدالمجید قریشی، نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب اور چند دیگر اصحاب شریک تھے۔ حکومت کی طرف سے وزیر تعلیم اور ڈائرکٹر تعلیمات نے نمائندگی کی۔ مسلم قائدین کو حکومت کی طرف سے یقین دلایا گیا ہے کہ وہ ان کی تعلیمی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہے اس سلسلے میں حکومت کی تجویز عام اطلاع یابی کے لئے عنقریب مشتہر کر دی جائے گی۔

ارجنٹائن (جنوبی امریکہ) ارجنٹائن میں نارمل اسکولوں کی چوتھی جماعت کے طلباء پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ناخواندہ بچوں اور بالغوں کو تعلیم دیں۔ مجلس ملی تعلیمی نے ہر صوبائی محکمہ انسپکٹری میں ایک مقامی تعلیمی عجائب گھر کھولنے کی تجویز پیش کی، جہاں ضروری اشیاء بیونس آئرس کے مرکزی عجائب خانے سے فراہم کی جائیں گی۔ اس کے علاوہ مقامی پیداوار پھول پتی وغیرہ کے نمونے بھی نمائش کے لئے رکھے جائیں گے۔ پچھلے چند سالوں سے بے علمی اور ناخواندگی کے خلاف ایک جہاد پیہم کیا جا رہا ہے۔ پچھلے سال مدرسوں کے بچوں کے لئے ایک مستقل آرٹ میوزیم پہلی مرتبہ کھولا گیا۔ جس میں مشہور مصوروں اور سنگ تراشوں نے اپنے فن کے نادر نمونے تحفتہً پیش کئے۔ ادبی اور تمدنی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے ایک نیشنل کمیشن فور کلچر موجود ہے۔ جس کا فرض تجربی کام کے لئے وظائف اور انعامات دینا اور اور ان اوقاف کا انصرام کرنا ہے جو کلچرل مقاصد کے لئے بنائے گئے ہیں۔

بمبئی سے ۲۰ ہندوستانی لڑکیاں جو مختلف کالجوں اور تعلیمی اداروں میں پڑھتی ہیں تعلیمی دورے پر یورپ گئی ہیں۔ اس دورے کی مہتمم مسز وِتا، پرنسپل فورمن کرسچن کالج لاہور کی بیوی ہیں یہ اپنی نوع کا چوتھا سفر ہے۔ اور ہر مرتبہ پروگرام مختلف ہوتا رہا ہے۔ اس مرتبہ یہ پارٹی فرانس، بلجیم، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، جرمنی اور سویٹزرلینڈ کی سیر کرے گی۔ اس دورے کا تعلق بین الاقوامی سٹوڈنٹ سروس سے ہے۔ یہ سروس اساتذہ اور طلباء کو غیر ممالک میں سیر و سیاحت کے لئے ہر قسم کی اطلاعات اور سہولتیں بہم پہنچاتی ہے۔ بعض ملکوں میں تو اساتذہ اور طالب علموں کے باہمی تبادلے کے باقاعدہ ادارے ہیں۔ مثلاً بعض یونیورسٹیاں آپس میں پروفیسر تبدیل کر لیتی ہیں۔ جرمنی میں خصوصاً ملک کے ایک حصے سے طلبا کسی ایسے اسکول میں منتقل کر دئے جاتے ہیں جو کسی اور حصہ ملک میں واقع ہے۔ اس طرح چند روز کے قیام سے وہ ملک کے ہر حصے کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۲۸	ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

پانچ روپے (صہ) — فی پرچہ آٹھ آنے (۸)

...بلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع برقی پریس، دہلی

شمالی ہند کے دیہاتی شعراء میں جدید انقلابی رجحانات

(بہ سلسلہ گذشتہ)

سعد اللہ میوات کا بہت پرانا اور اعلیٰ درجے کا شاعر ایک دوہے میں کہتا ہے جو آدمی اپنی ذات کو گروہ سے وابستہ نہیں رکھتا اور اس کے سو دوست اور پچاس دشمن نہ ہوں اس کی پیدائش ہی بے کار ہوئی۔

جاکے سنو ساہو نہیں بیری نہیں پچاس
ماتا ایسے پتر سے تو کیوں بوجھوں مری نواس

گھکلے بھی ایک پرانا میواتی شاعر ہے وہ کہتا ہے کہ غربت سے زیادہ ذلیل کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

دوہا

ٹوٹو[1] ایسی چیج ہے جیسے کتا کا ہنڈو[2]
کہیں سول جاوے ٹک کہیں سے ہو جاوے ٹرکو[3]

دوہا

ٹوٹے بیری تو برو، توپے چلے نہ گھات
سگھڑن کی اگھڑن لگے کوڑھن[4] کی سی بات

ایک دوہے میں کہتا ہے کہ اگر عقل ہو تو دولت بھی ہونی چاہیئے۔ دولت، عقل دونوں کا نہ ہونا بڑا غضب ہے۔

دوہا

چترائی دے تو دھن دیجئے نا تر اپنی چترائی بھی لے
چترائی اور نا دھنا سائیں دونوں دکھ مت دے

ایک دوہے میں کہتا ہے کہ دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا تو مردوں

---

[1] مفلسی [2] دھکے کھاتا پھرنا [3] نکالا جانا [4] بے وقوف

اور ناخلفوں کا کام ہے اور خود اپنے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا بہادروں، شیروں اور صحیح النسب لوگوں کا کام ہے۔

دوہا

لیک لیک گاڑی چلے لیک ہی چلے کپوت
یہ تینوں اوپٹ چلیں سورا، شگھ سپوت

جدید دیہاتی شاعروں میں شب لال ساکن کوٹ علاقہ میوات ہی ہے جو اپنی ایک چوپئی میں اہلکاروں کے حالات اس طرح بیان کرتا ہے۔ یہ اقتباس پوری چوپئی کے بجائے اس کا ایک حصہ ہے

دوہا

سن لے دھر کے دھیان میں کروں بیان حقیقت ساری
سبے یا پولیس میں کر رہے تھا نیداری
مقدم، چوکیدار ٹکے کے یار جلم پٹواری
رشوت کھا سلٹی کی الٹی کر ڈاری

چوپئی

نا یہ رحم کریں کائی پے   بھونٹی کر دھریں بھائی پے
اپنی ناچ کیں آئی پے   جھونٹی سونہہ کھا جائیں مائی پے

شعر

نیت بگڑی سبن کی جتنے اہلکار ہیں
بے بات کریں کید اور جرمانے کو تیار ہیں
دے کر رشوت چھٹا لاؤ یہی ان کا رہے
شرم کاہی کو نہیں چاہے کھاس رشتہ دار ہے

لہ بے راہ ۔ سورما، بہادر ۔ بے حیا ۔ کند ۔ قسم ۔ قید

پٹکا

ہے پیسہ کی لاج چاہے محتاج ناگھر میں ناج
ہوئے پیسہ اُن کو تیار نہ سمجھیں ست اہت میں

چھند ہریانہ

ایک بات اور نئی سُناؤں سبھی سنو سرداری
اُڑھ گئی رے دیس اپنے سے ساہوکاری
دھریں بیاج پہ بیاج ناکریں لحاج رکم ہوئے بھاری
وہ پٹے ناپستوں پشت اسامی ہاری

پٹکا

دیکھو آنکھ پسار، دھرم کی ہار، پاپ سوار
سبن کے اوپر ہوا سوار نا کلا[۱] رہی ہے مت میں

کوٹ (علاقہ میوات) کے ایک بالکل نوخیز شاعر موج خاں کے دو بھجن ہیں یہاں نقل کرنے کے قابل معلوم ہوتے ہیں:۔

بھجن نمبر ۱

بج رہے پاپ کے ڈھول دکھ پا رہے بھارت باشی

جھوٹے جال پولیس پھیلاوے — بن کانون سفر ٹھیرادے
رسنہ گیر کو جال لگا دے — ایک سونو کے پوے بول جب ہتھکڑی بھرے کھاسی[۲]
دکھ پارہے بھارت باشی

بیٹھے رہیں جو اپنے گھر میں — مکتی نہیں مال اور جڑ میں
وہ بھی کر دے دس نمبر میں — اُن پہ بنا کھتا[۳] دیا جھول مجھو سن آوے ہانسی

---

۱ تاثیر، قوت تاثیر ۲ خاصی ۳ خطا

دکھ پارہے بھارت باشی

تین روپے جو لیں رپٹ کے — یہ مجبور دیکھے ہیں کھاس کپٹ کے
آنکھ لال کرتے ہیں ہٹ کے — مارن کو لیں رول[1] تھانے والے ستیاناسی

دکھ پارہے بھارت باشی

سیدھی نہیں چلت باٹ ہیں — کسانن کا گلا کاٹ ہیں
دیواں سری کے بنے لاٹ ہیں — جن کا دو پیسے کا مول کتے بنے پھریں چپراسی

دکھ پارہے بھارت باشی

بج رہے پاپ کے ڈھول دکھ پا رہے بھارت باشی

بھجن نمبر ۲

دکھ پارہے بہت کسان پٹواری لگے ستاتے

جب پٹواری جمع اگھاتے — تین روپے کے آٹھ بتاتے
بناکام کی رشوت کھاتے — ٹیک نہ کرتے کام گوڑے باندھ لئے پرجانے

پٹواری لگے ستانے

نہر کے منشی کریں صفائی — تگنی، چوگنی کریں بھرائی
گرداور نے رشوت کھائی — چھوٹے سے اک کھیت پر، لگے مال مفت میں کھانے

پٹواری لگے ستانے

زمیندار پر ہے کنگالی — بری مصیبت کھدانے ڈالی مات پتا بچے گھروالی
جن نے رات دن پڑے کمانے — نہیں ملے وقت پر کھانے

پٹواری لگے ستاتے

---

[1] رول (لائن کھینچنے کا)

ٹھگی، جال حاکم کے چھایا　　گلوکال نے کھیال دکھایا
جس سے دکھ پاتی ہے رعایا　　لیں مفت گھاس اور دانے
پٹواری لگے ستانے
دکھ پا رہے بہت کسان پٹواری لگے ستانے

اننت لال ساکن انچھیر (نواح ۔ فرید آباد) کا شاعر ہے اس کا تازہ بھجن قابل ذکر ہے

بھجن

مرے ہم کیوں نا دکھیا دیں کسان ؛
جو طرفہ سے دکھ کے بادل ہمارے اوپر امنڈ رہی
کوئی ہوا نہیں جو انھیں ہٹادے امنڈ امنڈ کر گھمنڈ رہی
گرج گرج کر شور مچادیں ۔ سن سن کر ہم ڈرن لگے
دکھ روپی اولوں کے پھٹنے سے بنا موت مرن لگے
کبھن کہاں سے آئے گا یہ فکر رات دن کرن لگے
جب کوئی نہیں سہارا دیکھے دھیان ہری کا دھرن لگے
شاید رکھشا کرے ہماری دین بندھو بھگوان
مرے ہم کیوں نا دکھیا دین کسان ؛

کھیتی باڑی کرنا بھائیو ہمیشہ ایک ہمارا ہے
اور دوسرا پشو پالن اُن سے ہی فقط گذارا ہے
اس سے ہی بھارت کا چلتا سارا ساہوکارا ہے
ان ساہوکاروں کے بس مٹھی میں جان ہماری ہے
ران ہی کے لئے کہتے ہیں جو کچھ کھیتی کیاری ہے

علی الحساب سبھی لے جاویں جو ہو پیداواری ہے
پھر بھی ان کا سود مٹیے نا رقم بنی آہی ساری ہے
ہمارے نہیں ناج کا دانہ ان کے بھرے مکان
مرے کیوں نہ دکھیا دین کسان ۶

گھر پر بچے بھوکے رووں ساہوکار پہ جاتے ہیں
آج نہیں ہے پھر لے لینا ہم کو سو بات بناتے ہیں
بھوکے مر کر گھاس پھونس کھا کتنے ہی روز بتاتے ہیں
جوڑے ہاتھ گڑگڑائے پھر مہر ساہ کو آئی ہے
پچھلا میرا سود پٹا دو بس لو میرے بھائی ہے۔
بیل، بھینس اور گائے ہیں دو پھر یہ بات اڑائی ہے
وہ بھی ہم نے لگا دئے بس گھر کی کری صفائی ہے
باجے جوت پڑا ہے دنیا باقی سارا لگان
مرے ہم کیوں نہ دکھیا دیں کسان

نمبردار چڑھے چھاتی پے گالی دے نت پٹواری
اور تیسرے دن دیتا ہے جیل واٰر[1] دھمکی نیاری
. . . لگان بھرو نہیں بہت ہو تمھاری کھاری
چپراسی کو بلا بلا کر بس ہم کو پٹواتے ہیں
برتن بھانڈے بیچ انھیں دے اپنی جاں بچاتے ہیں
پھر بھی نہیں لگان پٹا پھر یہ وارنٹ کراتے ہیں
ہیں جیل میں ٹھونس پھیر گھر در نیلام کراتے ہیں
پھر بھی روزی داتا دنیا کے ہم مانے جاتے ہیں

---

[1] ذیلدار

اتنے پر بھی نہیں نکلتے پاپی بے یا پران۔
مرے ہم کیوں نہ دکھیا دین کسان
روزی داتا بھوکے مرتے، کرتے موج بھکاری ہیں
ہمارے چھپر نہیں رہنے کو اُن کے محل اٹاری ہیں
ہمارے پیسے سے اُن کے موٹر کار سواری ہے
چالاکوں کے مجّے[۵] یہاں سیدھوں کا جینا بھاری ہے
قلاقند کھائیں وہ امرتی، دیکھ دیکھ ہم للچائیں
بھاگ کا دوش بتاکر، من مار مار کر رہ جائیں
سرپر جوتی پڑیں سینکڑوں، کیا مجال کچھ کہہ جائیں
ہم کو بے ایمان گنوار کہیں سن کر سب کی سہہ جائیں
انت لال کہے مکاروں کی، چل رہی خوب دکان
مرے ہم کیوں نہ دکھیا دین کسان

وہ کلام جن کے کہنے والوں کا سراغ نہیں ملتا مندرجہ ذیل ہے۔ جس میں سب سے پہلے ایک ٹیسو کا گیت نقل کیا جاتا ہے جو بچپن سے آج تک سنتے ہوئے عمر گذری ہے۔ ذرا اس کا تمسخرانہ انداز بیان بھی ملاحظہ ہو:۔

ٹیسو

اک بنئے کی کا حال کہوں، جیسے ڈونڈ[۶] پہاڑی کا
اسّی گز کی انگیا پہنے کچھ نا بدن بچاری کا
دوسو گز کا لہنگا باندھے ناجک بدن بچاری کا

---

[۵] مزے [۶] ناف

چار کھیت گا جسر کے کھا گئی، گجرا کھا گئی کیاری کا
کچھ نہ بدن بچاری کا، نا جیک بدن بچاری کا
سود میں گاؤں بیٹھی کھا گئی، پیٹ پھٹا ناداری کا
کال سے دنیا بھوکی مر گئی، دھن نا گھٹا بیپاری کا
اک بنئے کی کا حال کہوں جیسے ٹونڈ پہاڑی کا
چار چرس پانی کے پی گئی سانس نہ ٹوٹے واری کا
کوٹھے اوپر موتن بیٹھی، پل ٹوٹا پنیاری کا
تین گھر جاٹن کے بہہ گئے، چوتھا گھر بھٹیاری کا
کچھ نہ بدن بچاری کا، نا جیک بدن بچاری کا

ایک شاعر نے بیان کیا ہے کہ کس طرح زمیندار زمین دیتے وقت کسان سے فریب کرتے ہیں اور وصولی کے وقت سختی، جس سے کسان برباد ہو جاتے ہیں۔

پرسو، سا ڈھو مینہہ مکدم میٹھا بولے
بڑہ تو ستا کیا سکلر کیا العام — آیا موسم کاتک کا تو سبکے مانگے دام
سب کے مانگے دام رام تینے کیسی کینی — باگ پچھوڑی بیچ گا نٹھ کی بدیا دینی

ان جملہ اقتباسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیہاتی دنیا میں عرصے سے یہ تلاش ضرور جاری ہے کہ سرمایہ داروں کی لوٹ اور اپنی فاقہ کشی کا حل کیا ہے۔ مذہب اُن کے نزدیک ان مشکلات کا قابلِ عمل حل پیش کرنے سے قاصر ہو گیا ساہوکار اور بڑے بڑے زمیندار کوئی حل ڈھونڈھنا نہیں چاہتے اور ان کے خیال میں سرکاری اہلکار بھی ان ہی کے زمرے میں شامل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب اُن سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرنا اور روپیہ والا بن جانا چاہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری نظر سے اب تک کسی دیہاتی شاعر کا ایسا کلام نہیں گذرا ہے جس میں کوئی حل پیش کیا گیا ہو۔ لیکن وقت آ گیا ہے کہ دیہات سے ایسے شاعر نکلیں جو اس مشکل الجھن کا کوئی حل پیش کریں ۔

ہندوستان کا کسان

ذیل کا مضمون ایف، ایم، ڈی میلو کے ایک مضمون سے اخذ کیا گیا ہے

جو امریکہ کے رسالے کرنٹ ہسٹری بابت جون ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا ہے

سرکار کی طرف سے جو کتابیں ہندوستان کے اسکولوں کے نصاب میں داخل کی جاتی ہیں ان میں برطانوی عہدِ حکومت کی برکات کا دل کھول کر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اور ان میں خصوصیت کے ساتھ برطانوی عہد کے امن و امان کو خوب سراہا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کل جنگوں کی قتل و غارت گری سے ہندوستان کو نجات مل گئی ہے۔ لیکن بھوک سے سسک سسک کر جان توڑنے کی لعنت و مصیبت اب بھی باقی ہے

ہندوستان کسانوں کا ملک ہے۔ اس لئے ہندوستان کی مرفہ الحالی کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ یہاں کا کسان مرفہ الحال ہو۔ لیکن جب تحقیقات کی جاتی ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسان کی معاشی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ خصوصاً جب سے زرعی اشیا کی قیمتیں گرنا شروع ہوئی ہیں۔ اس وقت سے تو کسان کی حالت بہت ابتر ہو گئی ہے۔ زمینداروں اور ساہوکاروں کے خلاف جذبہ بڑھتا جارہا ہے جسے قوم پرست جماعتیں حکومت کی مخالفت میں استعمال کر رہی ہیں۔

معاشیات کے ایک ماہر نے بیان کیا ہے کہ گذشتہ سو سال سے دنیا کی غذا جس قیمت پر فراہم کی جارہی ہے وہ لاگت سے (اگر لاگت میں اس کے تمام ضروری عناصر کو شامل کیا جائے) کم ہے مغربی ملکوں کی سرمایہ دارانہ زراعت پر ممکن ہے یہ قول صادق آئے یا نہ آئے لیکن ہندوستان کی زراعت کے بارے میں اس کی صداقت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوستان کے کسان کو زراعت کے کاروبار میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔ برسات مشتبہ اور غیر یقینی ہوتی ہے۔ مویشی کثرت کے ساتھ مرتے رہتے ہیں۔ قیمتوں میں تلون کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زراعت میں نفع کی صورتیں کم

اور نقصان کی بہت زیادہ ہیں۔ ہندوستان کے لوگ نقصان کے باوجود اس پیشے سے محض اس لئے لگے ہوئے ہیں کہ زندگی بسر کرنے کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

پیداوار کی کمی | غذا کی فصلوں کو پیدا کرنے سے جو خالص بچت کسان کو معمولی سالوں میں ہوا کرتی تھی وہ عموماً بہت کم بنی ہوئی تھی۔ لیکن جب سے قیمتیں گر کر اپنی موجودہ حالت کو پہنچی ہیں اس وقت سے تو بچت کی جگہ کسان کو صاف اور کھلا ہوا نقصان ہو رہا ہے۔ کسان کی جوت میں جو آج رقبہ ہے اس پر صدیوں سے کاشت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لئے زمین کی قدرتی زرخیزی سے جتنا انتہائی کام لیا جاسکتا تھا وہ لیا جا چکا ہے۔ اب اس کی زرخیزی میں اضافہ کھاد کے ذریعے سے کیا جاسکتا ہے لیکن کسان زمین میں کھاد یا تو اس لئے نہیں ڈالتا کہ زمین اس کی اپنی نہیں ہے یا اس لئے کہ گوبر جو سب سے سستا کھاد ہے اس کا فائدہ ایندھن کی طرح استعمال کرنے میں زیادہ ہے ہندوستان کی برسات کا تلون مشہور ہے۔ اگر ایک سال خشک سالی ہوتی ہے تو دوسرے سال سیلاب آجاتے ہیں۔ آبپاشی کے انتظام سے جزئی طور پر اس کی کچھ تلافی ہوئی ہے۔ حکومت نے تقریباً ایک ارب پچاس کروڑ روپیہ ، تین کروڑ ایکڑ غیر مزروعہ رقبے کو کاشت میں لانے کے لئے صرف کیا ہے۔ لیکن آبپاشی شدہ رقبہ کا تناسب اب بھی بہت کم ہے پھر ایک طرف تو پانی کی رسد ناقابلِ اعتماد ہے۔ دوسری طرف اولے، پالے، جنگلی جانوروں، ٹڈیوں، چوہوں اور دوسرے موذی جانوروں سے پیداوار کو نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کاشت کے طریقے بڑے دقیانوسی ہیں۔ جو اوزار استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً لکڑی کا ہل اور ہنسیا وہ نہایت ہی ابتدائی اور قدیم ہیں۔ غلے کی گہائی یا ہاتھ سے کی جاتی ہے یا لکڑی سے پیٹ کر یا بیلوں کے کھروں کے نیچے روندا کر۔ جدید آلات کے خریدنے کے لئے کسان کے پاس روپیہ نہیں ہوتا۔ مویشیوں کی نسل کشی بلا امتیاز کی جاتی ہے۔ بیمار مویشیوں کو الگ نہیں رکھا جاتا جس سے ان میں امراض اور وبائیں پھیلتی ہیں۔ پھر ایک فصل کاٹنے کے بعد کھیتوں کو عرصے تک پرتی یا خالی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بے کار مویشیوں کو جیو ہتیا کے خوف سے مارا نہیں جاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ میں تو مویشی کا وزن اوسطاً چودہ سو پونڈ ہوتا ہے لیکن ہندوستان میں چار سو سے سات سو پچاس پونڈ تک

ہوتا ہے۔

اوپر کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ کسان کی مشکلوں کا سبب (اگرچہ ان میں سے بعض اس نے اپنے لئے خود پیدا کی ہیں) پیداوار کی کمی ہے۔ ہندوستان میں فی ایکڑ صرف ۱۳ بشل گیہوں پیدا ہوتا ہے حالانکہ انگلستان میں گیہوں کی پیداوار ۳۱ بشل اور ڈنمارک میں ۴۹ بشل فی ایکڑ ہے۔ ہندوستان میں فی ایکڑ ۹۰۰ پونڈ چاول پیدا ہوتا ہے لیکن امریکہ میں ایک ہزار نوے اور جاپان میں دو ہزار ستر پونڈ۔ ہندوستان میں فی ایکڑ ۸۹ پونڈ روئی پیدا ہوتی ہے لیکن امریکہ میں ۱۸۱ پونڈ اور مصر میں ۴۵۳ پونڈ۔ ہندوستان کے ایک ماہر معاشیات نے تخمینہ کیا ہے کہ برطانوی ہندوستان میں پیداوار کا اوسط فی ایکڑ جس میں آبپاشی شدہ فصلیں بھی شامل ہیں جاپان کے مقابلے میں صرف ۱/۳ ہے۔

پیداوار کی اس کمی کے باوجود کھانے والوں کی تعداد ۳۵ کروڑ ہے اور ان میں سے ۷۰ فیصدی کو زراعت کے پیشے سے ہی اپنا گذارا تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جس رقبے پر غذا کی فصلوں کی کاشت کی جاتی ہے اس کا تناسب جب برطانوی ہندوستان کی آبادی پر پھیلایا جاتا ہے تو اس کا حصہ رسد فی کس ۳/۴ ایکڑ پڑتا ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۱ء میں آبادی کی تعداد میں ۴۰ کروڑ تک اضافہ ہو جانے کی امید ہے! اس لئے صورت حال نازک ہوتی جا رہی ہے۔ چند سال گذرے ایک ماہر زراعت نے دکن کے ایک نمائندہ گاؤں کی حالت کا مطالعہ کر کے دریافت کیا تھا کہ زمین کے مالکوں میں صرف ۸ خاندان ایسے تھے جنھیں اپنی زمین سے کافی آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ ۲۸ ایسے تھے جو زراعت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے اپنی آمدنی میں اضافہ کر کے محض گذارے کے لائق کما رہے تھے اور ۷۰ خاندان ایسے تھے جو سخت افلاس میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُن مہاراجوں اور لکھ پتیوں کے باوجود جو دنیا کی اسٹیج پر موروں کی طرح دم پھیلا کر ناچتے اور اپنے پروں کی چمک دمک دکھلاتے ہیں، ہندوستان غریبوں کا ملک ہے۔ لوگوں کی غذا سے اُن کی معاشی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ کرنل میک کریسن کی ہندوستان میں غذا کی تحقیقات کا کام کر رہے ہیں انھوں نے جب ملک کی آبادی کے خاص خاص گروہوں مثلاً سکھوں، مرہٹوں، پٹھانوں، گورکھوں، بنگالیوں

اور مدراسیوں کی غذا کے بارے میں تحقیقات کی تو اس سے بعض دلچسپ حقائق ظاہر ہوئے جب مختلف گروہوں کی غذاؤں پر تجربہ چوہوں کو کھلا کر کیا گیا تو اس آزمائش سے سکھوں اور بنگالیوں کی غذا کا فرق نمایاں طور پر ظاہر ہو گیا جن چوہوں نے سکھوں کی غذا کھائی تو تندرست، چاق و چوبند اور اس پسند بن گئے۔ لیکن جنھوں نے بنگالیوں کی غذا کھائی اُن کی تندرستی خراب اور اُن کا مزاج سخت اشتعال پذیر ہو گیا۔ اس لئے بنگال میں جس قدر سیاسی شورش ہے۔ وہ سب ناکافی غذا کی وجہ سے ہے۔ لارڈ لنلتھگو موجودہ وائسرائے نے حال میں تغذئے کے مسائل سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔ انھیں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ صرف ۰ ۲ فیصدی آبادی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے کافی غذا ملتی ہے۔

انسانی عنصر | انسانی عنصر ظاہر ہے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں، اسی کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کسان جن حالات میں کام کرتا ہے وہ سخت ہمت شکن اور حوصلہ فرسا ہیں۔ اسے نہ صرف پیداوار کی کمی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ زمیندار، ساہوکار اور سرکاری ملازم سب اس کی جان کے لاگو بنے رہتے ہیں۔ زمیندار ایسا لٹیرا ہے کہ فصل چاہے اچھی ہو یا خراب وہ اپنا لگان ضرور وصول کرتا ہے۔ ساہوکار اتنا لالچی ہے کہ جب وہ ضرورت سمجھتا ہے کہ کسان کو عمر بھر کے لئے اپنا مقروض بنائے رکھے تو اسے اپنے ہی کھاتوں میں جعل سازی کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا پھر سرکاری ملازموں کی بیرحمی ہے جو محاصل وصول کرنے کے سلسلے میں کسان کی سب چیزیں قرق کر لیتے ہیں اور خانماں برباد کر کے اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ یہ دیہاتی زندگی کے ایسے واقعات ہیں جن سے ہر شخص واقف ہے، کسان، جاہل، ناواقف اور ناعاقبت اندیش ہوتا ہے۔ اس کی زندگی پوری طرح اپنے ان دوست نما دشمنوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اُسے سرکاری چپراسیوں، منشیوں اور محرروں کو جن کی تنخواہیں بہت کم ہوتی ہیں۔ رشوتیں دینا پڑتی ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے ملازموں پر بڑے افسر ہوتے ہیں جن کو اس لوٹ مار سے حصہ ملتا ہے اور اس طرح غریب کسان کو جس کا شکار کرنا بہت آسان ہے پوری طرح نوچ کھسوٹ لیا جاتا ہے۔ ساہوکار کی

معمولی شرح سود ۲۵ فیصدی سے ۷۵ فیصدی تک ہوتی ہے اس کے علاوہ کسان اپنی فصل کو ساہوکار کے ہاتھ سستے داموں فروخت کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اسے مزید نقصان پہنچتا ہے۔ کسان جب زمین کی حیثیت بڑھاتے ہیں یا زراعت کو ترقی دیتے ہیں یا جب اُن کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے تو ان سب باتوں کا نفع زمیندار کو ملتا ہے۔ کیوں کہ اسے لگان بڑھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ساہوکاروں کا ظلم اتنا بڑھا ہوا ہے کہ خود کاشت کرنے والے زمینداروں کے ہاتھوں سے زمینیں تیزی کے ساتھ نکلی جارہی ہیں۔ دس سال کے اندر اندر صرف پنجاب میں محض لگان وصول کرنے والے زمینداروں کی تعداد (جو اپنی زمین کی کاشت خود نہیں کرتے بلکہ لگان پر اُٹھاتے ہیں) ۶ لاکھ ۲۶ ہزار سے ۱۰ لاکھ ۰ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ زمین کے معاملے کی اصلاح، دور حاضر کا ایک ضروری مسئلہ ہے۔ لیکن حکومت کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کچھ سال گذرے سود کے خلاف ایک قانون بنایا گیا تھا، لیکن اس پر عمل درآمد کرانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ مالدار لوگوں کو اقتدار حاصل ہے اور حکومت ان سے بگاڑنا مناسب نہیں سمجھتی۔

نتیجہ یہ ہے کہ کسان تقدیر پرست بن گیا ہے۔ صرف حال کی باتیں سوچتا ہے اور مستقبل کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ بات اس کی سرفانہ عادتوں سے پوری طرح ثابت ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں دلچسپیوں کی اس قدر کمی ہے کہ جب کبھی کوئی شادی یا موت واقع ہوتی ہے تو ان تقریبوں کو غنیمت سمجھ کر وہ نہایت بے دردی سے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ اپنی ذاتی پونجی کوئی نہیں ہوتی اس لئے قرض کے اژدہے سے معاملہ کرتا ہے اور عموماً اکثر ایمان دار اور محنتی کسانوں کی تباہی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ قرض کی وجہ سے ہزاروں مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور آخر میں ہر طرف سے ہار کر صنعتی شہروں میں کام کی تلاش میں کسان نکل کھڑا ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں سے اس کی کارکردگی میں کمی پیدا ہو جاتی ہے صحت خراب ہو جاتی ہے اور امراض کے دفع کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی۔ ہندوستان میں بہت سی وبائیں پھیلتی رہتی ہیں۔ مثلاً پلیگ، ہیضہ اور چیچک۔ لیکن ان وبائی امراض سے زیادہ تباہ کرنے والے وہ امراض ہیں جو مستقل طور پر موجود رہتے ہیں مثلاً ملیریا، کالا آزار، سپرپٹ، تپ دق

پیٹ کے کیچوے اور ہک ورم (HOOK WORM)۔ حکومت کی طرف سے علاج کا انتظام برائے نام ہے جو لوگ امراض میں مبتلا ہوں اور جن کے علاج کا کوئی بندوبست نہ ہو ایسے لوگوں سے کھیتی اور دوسرے کاروبار میں اعلی معیار کارکردگی کی توقع کرنا فضول ہے۔

جہالت کا مسئلہ | دیہاتوں کی ترقی کی اگر کوئی امید کی جاسکتی ہے تو وہ تعلیم کے ساتھ وابستہ ہے لیکن یہ بیان کرتے وقت افسوس ہوتا ہے کہ صرف ۱۰ فی صدی آبادی پڑھنا اور لکھنا جانتی ہے۔ لارڈ مکالے کو تعلیم کے بارے میں اپنا مشہور مراسلہ لکھے ہوئے اور کمپنی کو ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا وعدہ کئے ہوئے سو سال گذر گئے ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ پر نظر ڈالئے تو وہاں کم وبیش ۵۰ سال کے عرصے میں ۹۰ فیصدی حبشیوں میں تعلیم پھیلادی گئی ہے اور جاپان نے ۴۰ سال کی مدت میں اپنی پوری آبادی کو تعلیم یافتہ بنادیا ہے لیکن ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ سو سال میں حکومت زیادہ سے زیادہ ۱۰ فیصدی لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں کامیاب ہوئی ہے

لیکن جب حکومت کی نصف سے زیادہ آمدنی فوج پر خرچ کردی جائے اور جو باقی بچے اس میں سے بڑا حصہ مختلف سروسوں کے عہدہ داروں کو نذر کردیا جائے تو اس سے زیادہ تعلیم کی توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے۔ ہر صوبے میں جبری تعلیم کا قانون پاس ہوچکا ہے۔ لیکن یہ سب کاغذی کارروائی ہے۔ تعلیم روپیہ سے پھیلتی ہے اور سرکار کے خزانے میں اس کام کے لئے روپیہ ہی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ جہالت کی وجہ سے کشمکش حیات میں کم زور ثابت ہوتے ہیں۔ اور ترقی کی تمام راہیں ان کے لئے مسدود رہتی ہیں جب تک تعلیم کے ذریعے ہندوستان کے کسانوں کو نئے طریقوں کے فائدے سے آگاہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک نہ تو کاشت کے سائنٹیفک طریقے پھیلائے جاسکتے ہیں نہ ساہوکار سے نجات دلانے کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں قائم کی جاسکتی ہیں۔ نہ صفائی اور حفظان صحت کو ترقی دی جاسکتی ہے اور نہ امراض پر فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔ غرضیکہ کوئی کام نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن حکومت ...... سستے اور زود اثر نسخوں کی فکر میں ہے۔ چنانچہ پنجاب میں زراعتی کالج کے گریجوایٹ سرکار کے خرچ سے زمینوں پر لبائے جارہے ہیں تاکہ وہ اپنے پڑوسیوں کو پیداوار بڑھانے کا سبق دے سکیں۔

احاطہ بمبئی میں ایک تجویز ہے کہ ڈاکٹروں کو وظیفہ دے کر دیہات میں پریکٹس کرنے کے لئے مائل کیا جائے حکومت دیہات میں بہت سے ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے تاکہ سوویٹ روس کی طرح ریڈیو کے ذریعے تعلیم بالغان کو ترقی دے سکے۔ مگر ریڈیو کا سٹ خریدنا کسان کے بل بوتے سے باہر ہے اس لئے حکومت کو سرکاری روپے سے کسانوں کے لئے ریسیونگ سٹ فراہم کرنا ہوں گے۔

دیہات کی بے کاری دیہات کا ایک دوسرا بڑا مسئلہ بے کاری ہے کسان کم سے کم تین مہینے ضرور بے کار رہتا ہے۔ علاوہ ازیں محنت کو پس انداز کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی اور زمین کو ہزاروں ایسے بے روزگار لوگوں کی پرورش کرنا پڑتی ہے جن کی محنت سے فائدہ سال کے صرف چند مصروف دنوں میں ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس زائد آبادی کو دیہاتی صنعتوں۔ مثلاً پارچہ بافی، دری بافی، کپڑے کے کام وغیرہ میں مصروف رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن جب سے برطانیہ اور بعد میں جاپان نے اپنا سامان ہندوستان کی منڈیوں کو بھیجنا شروع کیا ہے۔ تمام مقامی صنعتیں تباہ ہو گئی ہیں۔ ہندوستان میں بڑے پیمانے کی چند صنعتیں ہیں۔ مثلاً سوتی پارچہ بافی کے کارخانے، لوہے اور فولاد کے کارخانے، شکر کے کارخانے لیکن ان کا وجود محض تامینی محاصل کی وجہ سے قائم ہے اور ان سے دیہات کے لاکھوں بے روزگاروں کے لئے کام نہیں نکل سکتا اور چونکہ سرکاری پالیسی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کو ایک زراعتی ملک رکھا جائے چاہے زراعت میں لوگوں کے لئے نفع ہو یا نہ ہو، اس لئے صنعت کی ترقی ابھی تک ابتدائی منزل میں ہے اگر ہندوستان میں بھوکے لوگوں کے جلوس" اور روٹی یا خون" کے مظاہرے نہیں ہوتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی غریب جاہل رعایا ابھی تک یہ نہیں جانتی کہ بے روزگاری سماج کے ظلم و ناانصافی سے پیدا ہوتی ہے۔

روپیہ کہاں جاتا ہے؟ بہرکیف صورت حال امید افزا معلوم نہیں ہوتی حکومت کی بیشتر آمدنی جو کاشت کاروں اور دوسرے غریب طبقوں سے وصول کی جاتی ہے وہ ان بڑے عہدہ داروں کی تنخواہوں پر صرف کر دی جاتی ہے جو ملک میں امن و امان اور اس سے تھوڑا کچھ زائد قائم رکھنے کے لئے مامور ہیں مثال کے طور پر صوبہ آسام میں جس کی آبادی کا ۹۰ فی صدی حصہ زراعت پیشہ ہے حکومت کے کل مصارف

میں سے صرف ایک فیصدی زراعت کے محکمے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء کے دستور کے نفاذ کے بعد سے کروڑوں روپیہ مجالس قانون ساز کے اراکین اور ان عہدہ داروں کی تنخواہوں پر صرف ہوگا۔ جو نئے سیاسی کاموں کو نپٹانے کے لئے ملازم رکھے جائیں گے، لیکن لوگوں کی معاشی حالت میں وہ ترقی نظر نہیں آتی جس کے محاصل سے زائد خرچ کو پورا کیا جا سکے گا۔ ہندوستان کا توازن تجارت پہلے تقریباً ہمیشہ موافق ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب یہ ناموافق ہوگیا ہے۔ اگر گذشتہ پانچ سالوں میں ہندوستان سے سونا برآمد کیا جاتا تو ہندوستان میں سخت مالی دشواریاں پیدا ہو جاتیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں برطانیہ نے معیار طلائی ترک کیا تھا۔ اس وقت سے اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء تک ہندوستان سے ۲ ارب ۸۶ کروڑ ۸۰ لاکھ ۷۰ ہزار ۹۱۰ روپے کا سونا برآمد کیا گیا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ہندوستان کی عورتیں اپنا زیور بیچ بیچ کر اپنے شوہروں کا قرض ادا کر رہی ہیں۔

ہندوستان کا کسان سینکڑوں سالوں کی برائیوں اور ناانصافیوں کی وجہ سے اپنی موجودہ مشکلات میں مبتلا ہے اور برسراقتدار طبقے جو بوجھ اس پر لادتے رہے ہیں۔ انہیں اب تک وہ کسی نہ کسی طرح برداشت کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن بوجھ اٹھانے کی ایک حد ہوتی ہے اور غالباً اب وہ زمانہ دور نہیں ہے جب کسان اپنا یہ سارا بوجھ اتار کر پھینک دے گا۔

ہندوستان میں مزدور تحریک

"ابتدائی قانونی کوششیں"

(۱۸۶۳ء سے ۱۸۸۱ء تک)

<u>دیسی صنعتوں کا زوال</u> | ۱۸۵۷ء کے مشہور غدر نے جہاں برطانوی حکومت کی متزلزل دیواروں کو پایہ استحکام تک پہنچایا وہاں ہندوستان کی قدیم دستکاریوں کے ساتھ بھی جو احسان کیا وہ تا ابد فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ غدر سے سو سال قبل کا زمانہ ہندوستان کی دستکاریوں اور صنعتوں کے لحاظ سے بہترین دور کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں دیسی سامان تجارت نہ صرف مغربی یورپ بلکہ بلقان، عراق اور چین تک روانہ کیا جاتا تھا[۹۱] سوتی کپڑوں میں ڈھاکے کا ململ اب تک یادگار رہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں اس کا ذکر فخر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اونی کپڑوں کا کاروبار بھی زمانہ کے لحاظ سے حد عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے والوں میں قرب و جوار کے دیگر ممالک کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی تھی۔ اس صنعت کا وجود درحقیقت زمانۂ لامعلوم سے بتایا جاتا ہے لیکن مسلمان بادشاہوں کا دور خصوصاً اکبر کا عہد حکومت اس کی ترقی کے لئے حیرت انگیز ثابت ہوا[۹۲]۔ اس صنعت کی یادگار اونی شالیں، قالین اور کمبل اب بھی اپنی جگہ مایۂ ناز تصور کی جاتی ہیں[۹۳]۔

---

[۹۱] بین الاقوامی تجارت کا دستور ہندوستان میں بہت قدیم ہے۔ اور اس کا وجود رگ وید کے زمانے سے بتایا جاتا ہے۔

[۹۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۸۰، "ہندوستان اکبر کی موت کے وقت" از مورلینڈ

[۹۳] قالینوں کے لئے آگرہ، جونپور اور مرزا پور۔ شالوں اور گرم کپڑوں کے لئے لاہور، لودھیانہ اور کشمیر (صفحات ۸۹۱ تا ۲۰۸ "ہندوستانی صنعت و حرفت کا فروغ" از بہس و دیو لال کر۔

اسی طرح ریشمی کپڑوں کا کاروبار بھی ہندوستان کی مخصوص صنعتوں میں تھا اور سولہویں صدی عیسوی میں یورپ کے ساتھ تجارت نے اس کی اہمیت کو چار چاند لگا دیئے تھے، اول اول یہ صنعت گجرات اور بنگال تک محدود رہی مگر ٹیپو سلطان کے زمانے میں بڑھتے بڑھتے میسور تک جا پہنچی[۹۱] اس کے علاوہ صنعت لطیف میں معماری۔ مصوری اور نقاشی وغیرہ کو جو درجہ دورِ مغلیہ میں حاصل ہو چکا تھا۔ اس کی زندہ مثالیں اس قدر ہیں کہ محتاج بیان نہیں۔

ملوں اور فیکٹریوں کی ابتدا | لیکن غدر نے جو انقلاب عظیم برپا کیا وہ ان تمام صنعتوں کے لئے موت کا پیغام تھا۔ کاروبار مٹ گئے۔ کاروباری فرقے نیست و نابود ہو گئے۔ اور صنعتی خاندانوں کا عروج پستی کے عمیق غاروں میں دفن ہو گیا غرض کہ دیسی صنعتوں کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہا۔ مانچسٹر اور لنکا شائر کا دَور دورہ ہوا۔ سوتی اونی اور ریشمی ہر قسم کے کپڑے برطانیہ سے آکر فروخت ہونے لگے۔ اور بھولے بھالے ہندوستانی جلد ہی بھول گئے کہ ان کا ملک خود بھی کبھی انہی صنعتوں کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ اس طرح ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۲ء تک ہندوستانی کپڑوں کا بازار پوری طرح برطانوی تجار کے ہاتھ میں رہا۔

اس کامیابی نے بدیشی پیشہ وروں کو ولایتی مشینیں اور پرزے ہندوستان میں لانے اور سوتی کپڑوں کے کارخانے قائم کرنے کی ہمت دلائی۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک اصولوں پر کاربند ہونے والی پہلی فیکٹری بمبئی میں قائم ہوئی۔ اس طریقۂ پیداوار نے ہندوستان میں تجارت کی ایک نئی راہ کھولی۔ اور ملکی ملوں کے تیار کردہ کپڑوں کا خیر مقدم دیہات دیہات اور گھر گھر ہوا۔ انکی مقبولیت اس قدر عام ہوئی کہ دن بدن نت نئے کارخانوں کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ اور ۱۸۷۴ء میں بمبئی کے شہری علاقہ میں ملوں کی تعداد ۲۸ اور پریسیڈنسی میں ۸ تھی۔ ان ملوں نے ایک طرف تو موٹے موٹے سوتی کپڑوں کی درآمد کو بالکل بند کر دیا اور دوسری طرف اپنا حلقہ تجارت روس، امریکہ اور

---

[۹۱] ”ریشم کی صنعت و تجارت“ از آر۔ سی۔ رائے

چین تک وسیع کر لیا۔

ہندوستانی فیکٹریوں کے خلاف برطانیہ میں یورش

دیسی ملوں کی یہ ترقی برطانوی کاروبار کے لئے جس قدر خطرناک تھی اظہر من الشمس ہے کیونکہ دراصل ہندوستان میں مغربی سلطنت کی بنیاد شہنشاہی اور حکومت پر نہ تھی بلکہ تجارت پر تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے پہلے پہل عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی خود بھی بادشاہوں اور سپاہیوں کے کسی فرقے سے تعلق نہ رکھتی تھی بلکہ بعض برطانوی تجار کی ایک کمپنی تھی جس کو قضاء قدر نے مال تجارت کے عوض میں نہ صرف دولت بلکہ تخت وتاج بھی عطا کر دئے تھے۔ برطانوی حکومت کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ہندوستان کو یورپ اور خصوصاً برطانیہ کے تیار کردہ مال تجارت کے لئے ایک زبردست منڈی بنائیں۔ یہاں کے لوگوں کی ضروریات میں اضافہ کریں مگر اس طرح کہ ان کے پورا کرنے کے لئے برطانیہ کی مدد درکار ہو۔ یہاں کی خام پیداواروں کو ترقی دیں مگر اس لئے کہ وہ یہاں نہ استعمال ہو سکیں بلکہ انگلستان کی ملیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ایسی صورت میں یہاں کی صنعتی اور تجارتی ترقی اطمینان کی نظر سے کیوں کر دیکھی جا سکتی تھی؟ ہندوستان کا وسیع بازار لیں ہاتھ سے نکلتے کون دیکھ سکتا تھا؟۔ خصوصاً اس وقت جو تجارتی خسارہ لنکا شائر کو اٹھانا پڑا اس نے برطانوی ممالک میں ایک خوفناک ہنگامے کی بنا ڈالی۔ پارلیمنٹ اور حکومت ہند کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ ہندوستانی مزدوروں کے اوقات کار کو محدود کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو قانونی تحفظ میں لانے کی درخواست کی گئی، ہفتہ وار تعطیلوں کے تعین کو ضروری قرار دیا گیا[۵]۔ مختصر یہ کہ ایسا فیکٹری قانون وضع کرانے کی کوشش ہونے لگی جو دیسی کپڑوں کی قیمتوں میں خاطر خواہ اضافے کا سبب ہو اور دور

---

[۵] بمبئی کی ملوں کے حالات پر میجر مور کی رپورٹ میں تحریر ہے کہ "بمبئی کی ملیں عورتوں اور بچوں کی ایک کثیر تعداد سے کام لیتی ہیں جس کی وجہ سے مزدوری کا نرخ بہت گر گیا ہے۔ اس کے علاوہ کام کے اوقات بہت طویل ہیں اور مزدوروں کی صحت و آرام کا کوئی انتظام نہیں ہے نہ ہفتہ وار تعطیلوں کا کوئی دستور ہے۔

دراز لنکاشائر سے آنے والے مال کو تجارتی مقابلے سے محفوظ رکھے۔ ان مطالبات کی تائید میں اکتوبر ۱۸۷۲ء میں الگزنڈر ریڈگریو[۱] نے اپنی ششماہی رپورٹ میں تحریر کیا کہ:-

"اس (سوتی) کاروبار کے ساتھ ترقی کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس لئے جبکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ اس ملک (برطانیہ) کو فیکٹری قوانین نے گراں قدر فوائد پہنچائے ہیں تو کیا یہ اُمید کرنا بیجا ہوگا کہ ہندوستانی مزدوروں کو ان مصائب سے جو برطانوی مزدوروں کو زمانہ گذشتہ میں برداشت کرنا پڑے تھے محفوظ رکھا جائے۔ اور ان کو موقع دیا جائے کہ اوقات کار کی کمی۔ مہلت کی زیادتی، کھانے پینے کے بہتر انتظام اور چھوٹے بچوں کے تحفظ کے قوانین سے فائدہ اُٹھائیں۔"

لنکاشائر کے مطالبات | ۱۸۷۷ء میں مسٹر ہومس نے "ہندوستانی ملوں کی ترقی" کے عنوان سے ایک مقالہ لندن سوسائٹی آف آرٹس رُوم میں پڑھا۔ اس میں دیسی ملوں کی روزافزوں ترقی کے ان تمام اثرات پر بحث کی گئی تھی جو لنکاشائر پر پڑنے والے تھے اور دکھلایا گیا تھا کہ "اگر ہندوستان کی ملیں اسی رفتار سے ترقی کرتی رہیں تو جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جبکہ نہ صرف دیسی منڈیاں بلکہ برطانوی بازار بھی ہندوستان ہی کے تیار شدہ کپڑوں سے پٹے ہوئے نظر آئیں گے۔" اس مقالے نے لنکاشائر کے مزدوروں میں شدید ہیجان پیدا کیا رشک کی خوابیدہ چنگاریاں بھڑکنے والے شعلوں کی طرح نمودار ہونے لگیں۔ اور لنکاشائر کے کونے کونے سے برطانوی مزدوروں والے قوانین کو ہندوستان میں نافذ کرانے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

دوسری جانب محصولات کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور یہ دکھلایا گیا کہ ۵ فیصدی (قیمت پر) محصول درآمد کو جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے وصول کئے جاتے تھے بڑھا کر دس فیصدی کر دینا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ لنکاشائر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

---

[۱] یہ ایک برطانوی فیکٹری انسپکٹر تھے۔

اور دیسی کاروبار کو کھلم کھلا اعانت پہنچائی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں محصولات درآمد کی آہنی دیواروں کو پاش پاش نہ کر دینا برطانوی حب الوطنی کے خلاف تھا۔ اس لئے مجلس قانون ساز و دیگر اراکین سلطنت برطانیہ سے اپیل کی گئی کہ دیسی منڈیوں کو محصولات سے آزاد کر کے برطانیہ اور ہندوستان کو یکساں طور پر مقابلہ کا موقع دیا جائے[۵۱]

اس ہنگامے نے ۱۸۷۵ء میں وزیر ہند لارڈ سالسبری اور وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک کی توجہ لنکا شائر کے حقوق کی طرف مبذول کی اور انھیں ہندوستان میں مزدور قوانین نافذ کرانے کی تیاریاں شروع کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اسی سال ہندوستان کی مجلس محاصل نے اختلاف عام کو ٹھکراتے ہوئے اور گذشتہ مجلس محاصل کی سفارشات کو رد کرتے ہوئے محصول درآمد کی مقدار میں تخفیف کی تجویز کی جو فوراً عمل میں لائی گئی[۵۲]

تحقیقاتی کمیٹی | ابھی محاصل کا مسئلہ پوری طرح طے بھی نہ ہو سکا تھا اور برطانوی کاروبار میں دلچسپیاں رکھنے والے دیسی منڈیوں کی مکمل آزادی کا مطالبہ کر ہی رہے تھے کہ وائسرائے ہند کے ایما سے حکومت بمبئی نے مزدوروں کے حالات کی جانچ کے لئے ایک کمیٹی کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ اور حسب ذیل معاملات کے متعلق ان کی رائے طلب کی:-

(۱) مشینوں کے خطرات اور ان سے تحفظ کی تدابیر

(۲) فیکٹری میں کام کرنے والے بچوں کی عمر کا تعین

(۳) اوقات کار کے حدود

---

۵۱ اس موقع پر یہ بات قابل غور ہے کہ ہندوستانی کارخانے ابھی ابتدائی دور میں تھے۔ اور ان کی ترقی کے لئے بیرونی مقابلے کو روکنے کی سخت ضرورت تھی۔

۵۲ تجویز ۵ر اگست ۱۸۷۵ء کی ایک نئی محصولی کمیٹی کے ذریعہ کرائی گئی تھی جس نے گذشتہ کمیٹی کی تجویز کی جو محصول درآمد کی موافقت میں تھی تردید کی۔

(۴) تعطیلات

(۵) صفائی وحفظان صحت

(۶) پیشہ وروں کے بچوں کی تعلیم

(۷) فیکٹری قوانین کی ضرورت

کاروباری حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے جو تجاویز اس کمیٹی نے پیش کیں وہ لنکا شائر کی امیدوں کے خلاف تھیں۔ اگرچہ انھیں یہ تسلیم تھا کہ بمبئی کے کارخانوں میں اوقات کار طویل ہیں وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سوتی کاروبار کے اس ابتدائی دور میں جس سے ہندوستان گذر رہا تھا مزدور قوانین کا نفاذ غیر ضروری تھا۔ اور ملوں کی مجموعی حالت ایسی ابتر نہ تھی کہ انکی درستگی کے لئے قانونی حربے کی ضرورت ہو۔ عورتوں اور بچوں کے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ جس "قدرتی حالات" کے تحت وہ کام کرنے کے عادی ہیں وہ ان کے لئے مہیا ہیں۔ اور ان پر کسی قسم کی سختی یا زیادتی نہیں کی جاتی۔ برخلاف اس کے اگر قانونی پابندیاں عائد کرکے ان کی اُجرتوں کو کم کر دیا گیا یا ان کی ایک بڑی تعداد کو برخاست کر دیا گیا تو یقیناً انھیں ایسا شدید نقصان پہنچے گا کہ جس کو سکون کے ساتھ برداشت کرنا ناممکن ہوگا۔[۵]

<u>لنکا شائر اور ہندوستان</u> ہندوستانی مزدوروں میں بیداری کا فقدان اور ان کے حالات کو سدھارنے کا بیرونی اصرار۔ لنکا شائر کی چیخ پکار۔ مانچسٹر کا شور وغل کتنے ہی عجیب وغریب واقعات کیوں نہ ہوں ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایسا کیوں تھا۔ اس کے متعلق ماہرین مزدور تحریک میں اختلاف ہے۔ عام پبلک اور کثیر التعداد اہل قلم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ برطانوی یورشیں درحقیقت ہندوستانی مفاد کے لئے نہ تھی بلکہ یہاں کے تیار کردہ سوتی کپڑوں کے مقابلہ کو روکنے کی

---

۵ ہندوستانی مزدوروں کی بے سروسامانی اور زراعتی کاروبار کی بے بضاعتی کو جس کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی تھی مدنظر رکھتے ہوئے بمبئی تحقیقاتی کمیٹی کا نظریہ صداقت سے خالی نہ تھا۔

ایک تدبیر تھی۔ مندرجہ ذیل بحث میں ہم دیکھیں گے کہ برطانوی لیڈروں اور لنکا شائر کے خیر خواہوں نے خود بھی اس مقصد کو پوشیدہ رکھنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ اور اپنے اپنے حلقوں کے اراکین نے ایوان عامہ پر اپنے خیالات کا کھلے الفاظ میں اظہار کیا تھا۔ پھر بھی کچھ تعداد ایسے مصنفین کی موجود ہے جو برطانوی تحریک کو نیک نیتی، اخلاص اور سخاوت پر محمول کرتی ہے۔

ایک نظریہ | اس سلسلہ میں ڈاکٹر احمد مختار نے جس نظریے کو پیش کیا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب[۵۱] "ہندوستان میں فیکٹری لیبر" کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ "ہندوستان کی فیکٹریوں میں خرابیاں اور بے عنوانیاں غائت درجے تک پہنچ چکی تھیں اس لئے خدا ترس (برطانوی فرقے) فوراً اپنے فرائض کو پورا کرنے کے لئے کمر بستہ ہو گئے اور انھوں نے ہندوستانی مزدوروں کو قانونی تحفظ میں لانے کی کوششیں شروع کر دیں" آگے چل کر انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ لنکا شائر کی ہندوستانی دلچسپی میں خود غرضی کا شائبہ ہونا اس وجہ سے بھی ناممکن تھا کہ "وہاں کا کاروبار ویسی کاروبار کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی پا چکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ 'مزدوری حالات' کی اہمیت کو وہ پوری طرح محسوس کرنے لگے تھے"۔ ایسی حالت میں ان کا یہ خیال ہے کہ مسٹر ایڈ گر یو۔ میجر مور۔ مسٹر بلیزڈ اور اخبار لندن ٹائمس کے نامہ نگار ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ محض جذبہ سخاوت کی بنا پر ہمدردی کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ لنکا شائر کی عرضداشتیں بھی بدنیتی پر محمول نہیں کی جاسکتیں کیوں کہ ہندوستانی مزدوروں کے بہی خواہ لیڈر سہراب جی شاپور جی بنگالی خود بھی انہی کا دست اعانت طلب کر رہے تھے۔

ہندوستان میں مزدور قوانین کے مسائل پر الگزنڈر گریو اور مسٹر ہومس کے نظریے ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اس موقع پر چند اور اقتباسات پیش کر دئے جائیں جو برطانوی اہل الرائے اور اہل قلم کی تقاریر اور بیانات سے لئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ناظرین خود فیصلہ

---

[۵۱] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵ تا ۱۸

کر سکیں گے کہ برطانیہ کی تحریک میں صداقت اور سخاوت کا جذبہ کہاں تک موجود تھا۔

جولائی ۱۸۷۵ء میں مسٹر اینڈرسن نے پارلیمنٹ کے ایوان عام میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان میں مزدور قوانین کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان سے صاف ظاہر ہے کہ برطانوی یورش جذبہ حسد ورشک سے لبریز تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"ہم کو یہ امر فراموش نہ کر دینا چاہئے کہ ہندوستان میں خام پیداوار کا کثیر ذخیرہ موجود ہے اور مزدوری کا نرخ کم ہے۔ ایسی صورت میں اگر ہم وہاں کے مزدوروں کو ۱۶ یا ۱۷ [۹۱] گھنٹے روزانہ کام کرنے سے باز نہ رکھیں گے تو ہم ان کو اپنے ہی ملک کے کاروباریوں کے مقابلہ میں بے جا فائدہ اٹھانے کا موقع دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی پیداوار کی قیمت ہماری پیداوار کی قیمت سے نسبتاً کم ہوگی اور ممکن ہے کہ ان کے کپڑے ہمارے ہی بازاروں میں آکر مانچسٹر کے مقابلہ میں ارزاں فروخت ہونے لگیں۔"

اسی خیال کا اظہار آئندہ چل کر لارڈ شیفٹس بری (Shefts Bury) نے بھی دارالامرا میں کیا ہے جس کے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

لیکن سب سے زیادہ واضح اور صاف وہ تقریر ہے جو ۲۸ فروری ۱۸۷۶ء کے ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے نقل کرتے ہوئے چند جملے واقعات حال پر پوری روشنی ڈالیں گے۔ وہ یہ ہیں:۔

"اگر یہ (ہندوستانی) پیشہ ور اسی طرح ترقی کرتے رہے تو اندیشہ ہے کہ

---

۹۱ بلیمے (Blemey) کمیشن کی رپورٹ کے لحاظ سے جو ۲۳ مارچ ۱۸۷۵ء کو مقرر ہوا تھا ملوں کے اوقات کار گرمیوں میں ½ ۱۲ گھنٹے روز اور جاڑوں میں ½ ۱۰ گھنٹے روز تھے اس کی رو سے مسٹر انڈرسن کا مندرجہ بالا الزام غلط ثابت ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تمام تجارت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس لئے اس وقت ہمارا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اس نوخیز پودے کو جڑ پکڑنے سے قبل ہی اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔"

اس کے علاوہ میجر مور، مسٹر جان کرافٹ اور دیگر برطانوی مشاہیر کے بیانات موجود ہیں جو کھلم کھلا برطانوی مفاد کی طرف مائل ہیں اور اس کا اعلان فخر کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کیوں کر تسلیم کر لیا جائے کہ مزدور قوانین کی برطانوی تحریک خلوص اور نیک نیتی پر مبنی تھی اور اس میں سراسر ہندوستانی مزدوروں ہی کا فائدہ مد نظر تھا۔

دوسرا ثبوت برطانیہ کی نیک نیتی کا یہ دیا جاتا ہے کہ کاروباری لحاظ سے جو ترقی لنکاشائر کو حاصل ہو چکی تھی وہ ہندوستان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی اس لئے دیسی ملوں کی ترقی کا برطانیہ کو خائف کر دینا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان میں ملوں کی ابتدا ہوتے ہی موٹے سوتی کپڑوں کی درآمد بالکل بند ہو گئی تھی۔ اور برطانوی کپڑوں کے فروخت میں بھی تقریباً ۲۰ لاکھ پونڈ سالانہ کی کمی ہو گئی تھی۔ نقشہ مندرجہ ذیل ملاحظہ ہو۔

نقشہ درآمد

سال	برطانوی سوتی کپڑوں کی درآمد (دس لاکھ پونڈ میں)
۱۸۷۰ — ۷۱	۱۹ ، ۰۵
۱۸۷۱ — ۷۲	۱۷ ، ۴۹
۱۸۷۲ — ۷۳	۱۷ ، ۲۳
۱۸۷۳ — ۷۴	۱۷ ، ۷۸

اور اگر اس تجارت کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی سوتی تجارت سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ

لنکا شائر کے سوتی مال کی درآمد میں جو دیسی منڈیوں میں آکر فروخت ہوتے تھے تقریباً ۵۰ فیصدی کی کمی واقع ہوگئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانوی ملیں اب بھی ہندوستان کی ملوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں لیکن پھر بھی دیسی بازاروں میں وہاں کی تیار کردہ چیزوں کی مانگ کیوں کم ہوتی جارہی ہے؟ کیا یہ کمی برطانیہ کے مفاد کے لئے خطرناک نہیں ہے؟ کیا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لنکا شائر اور مانچسٹر کے تجار ہر ممکن کوشش کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے؟ ۔ پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ ترقی یافتہ ہونا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ ان کا برتاؤ ہمارے ساتھ ہمیشہ خلوص اور سخاوت ہی کا ہوگا اگرچہ ہماری ذات سے انھیں کتنا ہی بڑا تجارتی خسارہ کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

(۲) مسٹر سہراب جی شاپورجی بنگالی کے اس خط کا معاملہ جس میں انھوں نے جان کرانٹ (مانچسٹر) کو لکھا تھا کہ[۵] ...." کہ اب میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں ہے کہ برطانوی اثرات سے کام لے کر دیکھوں۔ کیونکہ یہ اثرات ہمارے حکام کے لئے ایسے ناگزیر ہیں کہ ان کی زد سے بچنا بہت مشکل ہے" اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ مسٹر بنگالی ان تمام برطانوی حکام سے جو ہندوستانی حکومت کے نظم و نسخ کے مالک تھے غیر مطمئن تھے۔ اور وہ اپنی مسلسل کوششوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ برطانوی مفاد کو ہاتھ میں لے کر اگر برطانیہ ہی سے مدد کی درخواست کی جائے گی تو شاید کام چل سکے۔

لیکن سہراب جی کا یہ خط اور وہ کوششیں جو انھوں نے مزدور سدھار کے لئے برطانیہ میں کیں یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ برطانوی تحریک ہندوستان کے بہبود کے لئے تھی اور اس میں ذاتی اغراض شامل نہ تھے۔ درحقیقت لنکا شائر اور مانچسٹر سے مدد طلب کرتے ہوئے ان کا یہ گمان ہرگز نہ تھا کہ وہ ایک مخلص دوست کی طرف دست اعانت دراز کر رہے تھے بلکہ وہ صرف اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جو اس وقت انھیں حاصل تھا۔ علاوہ بریں اگر شاپورجی کو

---

[۵] منقولہ از ڈاکٹر احمد مختار " ہندوستان میں فیکٹری لیبر"

برطانوی ہی خواہوں پر اعتماد ہوتا تو اس امداد کے بدلے میں جو ان کو مان چسٹر سے ملنے کی اُمید تھی وہ خود بھی ہندوستان میں محاصل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے۔

اس زمانے کی مزدوری کیفیت اس سلسلہ میں یہ بھی فراموش نہ کردینا چاہیئے کہ ۱۸۷۴ء میں جب ہندوستان کی فیکٹریوں کے لئے قانون سازی کے مطالبات لنکاشائر اور مان چسٹر میں درپیش تھے تو دیسی ملوں کی تعداد علاقہ بمبئی میں ۲۶[5] سے زیادہ نہ تھی اور ان کی عمر بھی صرف ۱۰ سال کی تھی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دیہاتی اور خانگی کاروبار کا قلع قمع ہوچکا تھا۔ مزدوروں اور پیشہ وروں کی ایک بڑی تعداد فاقہ کشی کی مصیبت میں مبتلا تھی۔ زراعتی کاروبار کے خسارے کی تھوڑی بہت تلافی انہی ملوں کے ذریعے سے ہو جاتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ملوں میں ملازمتیں تلاش کرنے والے مزدوروں کی تعداد کثیر تھی اور اسامیاں نسبتاً قلیل۔ ایسی صورت میں خصوصاً جبکہ ملوں کی تعداد بڑھانے یا سوتی کپڑوں کے کاروبار کی توسیع کی تدابیر پیش نظر نہیں تھیں (برطانوی) فیکٹری قوانین کے نفاذ کا مطلب بیکاری کو بڑھانا یا اجرت کے نرخ میں کمی کردینے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

کیا برطانوی مزدوروں والے قوانین ہندوستان کے لئے موزوں تھے؟ ان حالات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برطانوی مزدوروں والے قوانین اور محاصل درآمد سے آزادی ہندوستان کے لئے کہاں تک مفید تھی؟ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے مزدور غیر مکلف اور آزاد دیہاتی زندگی کے عادی تھے ان کے اخراجات نسبتاً قلیل اور ضروریات کی تعداد مختصر تھی۔ انھوں نے فیکٹری کی ملازمتوں کو صرف اوقات گذاری اور زراعت کی کمی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ دیہات اور دیہاتی کاروبار سے جو قدرتی لگاؤ انھیں تھا اس کی گرمی ان کے دلوں میں اب بھی باقی تھی اور وہ اپنی فرصت کے اوقات اب بھی دیہاتوں ہی میں بسر کرتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر ان میں کاروباری بیداری اور حقوق کی پاسداری موجود نہ تھی تو حیرت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ وہ موقع تھا

---

[5] اس وقت سوتی کپڑوں کی ملوں کی تعداد ۲۶۵ ہے (صفحہ ۲۴۶ انڈین ایر بک ۲۷-۱۹۲۶ء۔

جبکہ حکومت ہند کو برطانوی مفاد سے الگ ہو کر ایسی ہمدردانہ تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کی ضرورت تھی جو ایسی تجارت وکاروبار کو محفوظ رکھتے ہوئے غریب مزدوروں کی ملازمتیں قائم رکھنے، ان کی اجرت میں اضافہ کرنے اور صحت و دیگر آسائشیں فراہم کرنے کے ذرائع پر روشنی ڈالتی۔ نہ کہ برطانوی ساہوکاروں سے مرعوب ہو کر انہی قوانین کے نافذ کرانے کی تجویز کرتی جو ایک پختہ کار طریقۂ پیداوار کے لئے موزوں تھے۔

علاوہ بریں اس وقت ہندوستان ایک خاص معاشی دور سے گذر رہا تھا۔ فیکٹری پیداوار کی ابھی ابتدا تھی۔ دیہاتی اثرات ابھی زائل نہ ہوئے تھے۔ کاروباری نفع نقصان کا ابھی تجربہ نہ ہوا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ بیرونی مقابلے کو جو سرعت کے ساتھ بڑھ رہا تھا روک دیا جاتا اور ہندوستان کی شیر خوار تجارت کو لنکاشائر اور مانچسٹر کی دست برد سے محفوظ رکھا جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا کیونکہ برطانوی سخاوت اور خدا ترسی کا جذبہ صرف اس حد تک عمل پیرا تھا جہاں تک کہ برطانوی مفاد پر آنچ آنے کا خدشہ تھا۔ اس کی زد سے بچنے کے لئے فیکٹری قوانین کا نفاذ ضروری تھا۔ اس میں اس سے بحث نہیں کہ وہ ہندوستانی فضا کے لئے مناسب تھے یا غیر مناسب۔ اسی زمانہ میں جب محصول درآمد کو بالکل اُٹھا لینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ہندوستانی مزدوروں کے برطانوی خیر خواہوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والا نہیں ملتا۔ اور سب کے سب ہم آہنگ ہو کر محاصل کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

محاصل درآمد اور مزدور قوانین

بعض مصنفین[۵۱] کا خیال ہے کہ "سوتی کپڑوں کے محاصل اور مزدور سدھار کے مطالبات دو مختلف مسئلے ہیں جن کو ملا دینا ایسی غلطی تھی جس سے زمانہ ماضی کے ماہرین معاشیات بھی نہ بچ سکے۔ لیکن اس کا سبب صرف وہ بدگمانی تھی جو ان کے دلوں میں برطانیہ کے خلاف سرایت کر چکی تھی" درحقیقت محاصل کو مزدوری سے جدا کرنا ناممکن ہے خصوصاً جبکہ ہندوستانی کپڑوں کی تجارت اور پیداوار پر دونوں کا اثر یکساں پڑنے والا ہو۔ کیا یہ بات قابل غور نہیں کہ ہندوستانی فیکٹریاں

---

۵۱ ڈاکٹر احمد مختار "ہندوستان میں فیکٹری لیبر"

اپنے ابتدائی دَور میں ایک گونہ تحفظ کی مستحق تھیں؟ - اور تحفظ کی سوائے اس کے کیا صورت ہو سکتی تھی کہ بیرونی مقابلے کی روک تھام کی جاتی؟ مگر یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ سوتی کاروبار کے عہد طفلی سے لے کر اس زمانہ تک کبھی تامینی محصولات عائد نہیں کئے گئے[۹۱] پھر بھی مان چسٹر سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ ہندوستان کی منڈیوں میں تجارتی آزادی نصیب نہیں - اور محاصل کی دیوار اصول تجارت کے بالکل منافی ہے - اس لئے جہاں ایک طرف یہ کوشش کی جارہی تھی کہ مزدوری قوانین جاری کرائے جائیں وہاں دوسری طرف یہ شور ہو رہا تھا کہ محصولات بھی اٹھادئے جائیں - دونو تحریکوں کا مطلب ایک ہی تھا یعنی مقابلہ کی طاقت کو کچل دینا۔

کیا برطانیہ اور ہندوستان کا مقابلہ غیر معاشی تھا؟

اکثر برطانوی مصنفین اور مشاہیر کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ محصولات درآمد کی موجودگی میں برطانیہ کو صحیح معاشی مقابلہ کا موقع حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں مان چسٹر کی مجلس تجارت نے جو عرضداشت وزیر ہند کے سامنے پیش کی تھی یہ دکھلایا تھا کہ :-

ا[۹۲] وضع محصولات کا جو طریقہ ہندوستان میں رائج ہے اس سے سوتی کپڑوں کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔

ب یہ محاصل سوت، اور موٹے اور کم قیمت کپڑوں کی تجارت کے بالکل منافی ہیں۔

ج ان کا مقصد امریکہ اور مصر سے روئی خرید کر ہندوستان ہی میں بہتر کپڑوں کا تیار کرنا ہے جس سے صریحاً برطانیہ کو نقصان پہنچنے کی امید ہے۔

---

۹۱ اس مسئلہ کو آنریبل ڈبلو - اسٹروکس نے اپنے اختلافی نوٹ مورخہ ۱۳ / مارچ ۱۸۷۹ء میں (جس کا تعلق ابتدائی زمانہ سوتی کاروبار سے ہے) تصریح کے ساتھ پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ "سوتی سامان کی موجودہ محاصل کے متعلق یہ شکایت سوائے مان چسٹر کے اور کسی کو نہیں ہے کہ یہ تامینی ہیں" اس کے علاوہ لارڈ نارتھ برک نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ محاصل تامینی نہ تھے (صفحہ ۲۰۴ - ان - جے - شاہ)

۹۲ تاریخ محاصل از ان - جے - شاہ صفحہ ۱۹۸

اور (۵) ان کا سب سے زیادہ مضر اثر بیرونی سامان تجارت کی قیمتوں میں اضافہ کرکے دیسی کاروبار کو فروغ دینا تھے۔

ان الزامات کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستانی محصولات درآمد تجارت کے لحاظ سے غیر معاشی ہیں۔ لیکن اس خصوصی ماحول کے ماتحت جس میں دیسی کارخانے مصروف کار تھے مندرجہ بالا الزامات بعید از قیاس ہیں۔ ابھی یہ کاروبار ترقی کے اس زینے پر پہنچے ہی نہ پائے تھے جہاں برابری کے مقابلے کا سوال پیدا ہوتا۔ ابھی تو درامل ہندوستانی تجارت میں مقابلے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ اس کی مثال اس شیر خوار بچے کی تھی جو گھٹنیوں چلنے میں تیزی سے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کر رہا ہو مگر اس کو سہارا دیکر کھڑا کرنے والا کوئی نہ ہو۔ رہا ۵ فیصدی کا محصول جو حقیقی بنائے مخاصمت تھا، کسی حالت میں تاپنی نہیں ہوسکتا۔ (حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سوتی کاروبار کا تحفظ عمل میں نہ لانا صریح ناانصافی تھی) کیونکہ تجارتی آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ محاصل کو سرے سے اڑا ہی دیا جائے۔ آخر کار ملکی نظم و نسق کے لئے بھی کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اسی طرح پر مختلف مال تجارت کو آزادی مل جائے تو حکومت کا خزانہ تباہی سے ہمکنار نظر آنے لگے۔ اس کے علاوہ ۵ فی صدی محصول کی حقیر رقم کسی ملک کی تجارت کو شدید نقصان پہنچانے سے قاصر تھی۔ ان نکات کا خیال کرتے ہوئے لارڈ سالسبری نے اپنے مراسلہ جولائی ۱۸۷۵ء میں وائسرائے ہند کو لکھا کہ:-

"اگر یہ صحیح ہو[۱] کہ محصولات درآمد کا مقصد برطانوی مقابلہ سے مفر حاصل کرنا اور ملک میں عام طور پر استعمال ہونے والی اشیائے ضروری کو گراں کرنا ہے تو اس معاملہ میں کچھ بھی کہنا غیر ضروری ہے کیونکہ ایسے محاصل معاشی نقطہ نظر سے قطعی طور پر قابل اعتراض ہیں۔ مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ان کے مقاصد

---

[۱] منقولہ در صفحہ ۲۰۷ "ہندوستانی محاصل کی تاریخ" از ان۔ جے شاہ۔

درحقیقت یہی ہیں۔ پھر بھی ان کے خطرناک سیاسی اثرات سے میں غافل نہیں ہوسکتا۔"

لارڈ سالسبری کے اِن جملوں کو نقل کرنے کے بعد ہندوستانی محصولات درآمد کے معاشی ہونے پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن جہاں تک سیاسی بین الاقوامی کشیدگی اور رنجش کا تعلق ہے ان محاصل کے اٹھادینے سے ان کے اور بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ دنیا کی ہر تجارتی قوم ہندوستان پر نگاہ التفات رکھتی ہے اور یہاں کی وسیع منڈیوں پر حاوی ہونا چاہتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر تجارتی آزادی عام کردی جاتی تو خود برطانیہ کے لئے شدید خطرہ تھا اور اگر برطانیہ کے لئے مخصوص کی جاتی تو دیگر ممالک اور برطانیہ میں پرخاش کا اندیشہ تھا۔

برطانوی پالیسی | لیکن ان تمام خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے بالآخر حکومت ہند کو یہی رائے دی گئی کہ محاصل کی دیوار کو منہدم کردینا ضروری ہے۔ اور اس معاملہ میں ہندوستان کی برطانوی حکومت کے اختلافات کو فرو کرنے اور ملکی مالیات اور اقتصادیات کی بے دریغ قربانی کرنے کا عزم بالجزم لیکر سر جان اسٹریچی ہندوستان تشریف لائے۔ انھوں نے اپنی ۱۸۷۷ء کی مالیاتی تقریر میں جس پالیسی کا اعلان کیا اس کے مطالعے کے بعد یہ صاف طور پر ظاہر ہوجاتا ہے کہ حکومت ہند کے لئے برطانوی مفاد بالاتر اور افضل تھا۔ اس تقریر کا اقتباس ذیل میں نقل ہے:۔

"اکثر (حکومت ہند) کا یہ فرض بتلایا جاتا ہے کہ ہندوستانی مفاد کو کسی حالت میں نظر انداز نہ ہونے دے۔ اگرچہ اس میں مانچسٹر کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچ رہا ہو۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اس نظرئے کی سختی سے مخالفت کرتا ہوں کیونکہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں صرف کرنے کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ میں برطانوی وطنیت کی فہرست سے خارج کردیا جاؤں۔ مانچسٹر کا مفاد جسے احمق لوگ غیرضروری اور مضحکہ خیز تصور کرتے ہیں نہ صرف ایک عظیم الشان اور ذہین قوم بلکہ لاکھوں انگریزوں کا مفاد ہے جن کا تعلق براہ راست سوتی کپڑوں کی تجارت اور ان کے کاروبار سے ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی

ندامت نہیں ہے کہ اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے بھی جو مجھ پر ہندوستان کی ہیں ۔ میں اپنے ملک کی ذمہ داریوں کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ میرے لئے وہ بہت زیادہ اہم اور گراں بہا ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ انگلستان میں میرے ہم وطنوں کو جو شکایات ہیں وہ حقیقتاً مناسب اور صحیح ہیں ۔ اور انھیں صرف خیالی اذیت تصور کرنا سخت غلطی ہے .... اس لئے جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے یقین ہے کہ اگر (تجارتی آزادی کی) اس زبردست ترمیم کو عمل میں نہ لانا ہوتا تو میں اپنے موجودہ عہدے کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا "

ان کوششوں کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ۱۸۸۱ء میں پہلا فیکٹری قانون نافذ ہوا اور ۱۸۸۲ء میں دیسی منڈیوں کو سوتی سامان کے لئے تجارتی آزادی عطا کی گئی ان قوانین کے متعلق اس وقت یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ یہ دونوں سوتی کارخانوں کی ترقی کے منافی تھے ۔ اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ ہندوستان میں مزدور سدھار کی اشد ضرورت تھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کام کے لئے جو قوانین وضع کئے گئے وہ یہاں کے حالات سے بالکل مناسبت نہ رکھتے تھے ۔ اس کے علاوہ فیکٹری قانون کے ماتحت مزدوروں اور کارخانوں کا مطالعہ اور معائنہ کئے بغیر محصولات درآمد بھی اٹھائے گئے ۔ اس سے نہ صرف دیسی کاروبار بلکہ کل مزدور طبقے کو جو شدید نقصان پہنچا اس کا تفصیلی بیان انشاءاللہ کسی آئندہ موقع پر پیش کیا جائے گا ۔

عہدِ حاضر کا فلسفہ

(۲)

لیکن برگسان نے تصوّف کو ان لوگوں کی طبیعت کے موافق بنانے کی کوشش کی ہے جو حرکت اور حیات پر ایمان رکھتے ہیں، ترقی کی واقعیت سے مطمئن ہیں اور اپنے تحتِ فلکی وجود کے متعلق کسی قسم کے فریب یا التباس میں مبتلا نہیں۔ تصوف کا قائل طبعاً عملی انسان ہوتا ہے مگر ایسا عملی انسان جو جمود پر مجبور ہے اور حیاتیت کا ماننے والا طبعاً جامد ہوتا ہے۔ مگر ایسا جو اپنے میں عمل کی بے پناہ خواہش رکھتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے دنیا میں اسی قسم کے لوگ آباد تھے ان کے مزاجوں میں شکّیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جس کی وجہ سے وہ جوش اور ہیجان کے پیچھے اندھے اور غیر عقلی ایمان کے لئے دیوانے ہو رہے تھے۔ یہ غیر عقلی ایمان آخر میں انھیں ایک ایسے یقین کی صورت میں دستیاب ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ دوسرے انسانوں کو آپس میں کٹ مرنے پر آمادہ کرنا ان کا فریضہ ہے لیکن سنہ ۱۹۰۷ء میں انھیں چونکہ اس جذبے کی تسکین کا کوئی موقع حاصل نہ تھا اس لئے برگسان نے ایک بدل پیش کیا اور الحق کہ نعم البدل پیش کیا۔

برگسان بعض اوقات اپنا نظریہ ایک ایسی زبان میں پیش کرتا ہے جس سے ناظر کو سخت دھوکہ ہوتا ہے کیوں کہ جن چیزوں کو وہ فریب اور التباس سمجھتا ہے ان کا تذکرہ کبھی کبھی ایسے لفظوں میں کر گذرتا ہے جن سے پایا جاتا ہے کہ وہ حقیقی ہیں۔ لیکن اگر ہم ان غلط فہمیوں میں مبتلا نہ ہوں تو زمان کے متعلق اس کے نظریے کا خلاصہ یہ ہوگا۔ زمان جدا جدا لمحات یا حادثات کا سلسلہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی متواتر اُپج اور بالیدگی ہے جس میں مستقبل کی پیش گوئی کی گنجائش نہیں کیوں کہ وہ سرتاسر نئی اور بدیں وجہ ایک بعید از قیاس چیز ہے جو چیز حقیقت میں واقع ہوتی ہے وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ مثلاً درخت بڑھتا ہے اور اس کے متوالی حلقے جوں کے توں سلامت رہتے ہیں (یہ مثال برگسان کی نہیں ہے) اس طرح دنیا روز بہ روز کامل سے کامل تر اور شاداب سے شاداب تر ہوتی جارہی ہے۔

جو چیز واقع ہوتی ہے وہ وجدان کے حافظے میں (جو دماغ کے جبلی حافظے کا عکس ہے) علی حالہٖ باقی رہتی ہے اس بقا کا دوسرا نام "مرور" ہے اور نئی تخلیق کا تہیج "جوشِ حیات"[1] کہلاتا ہے۔ وجدان کے خالص حافظے کی صحت و ثبات کا تعلق تہذیبِ نفس سے ہے اور اگرچہ برگسان یہ نہیں بتاتا کہ نفس کی اس تہذیب کے لئے کون سے اعمال ضروری ہیں لیکن تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ وہ یوگیوں کی ریاضتوں سے زیادہ فرق نہیں رکھتے۔

اگر کوئی شخص برگسان کے فلسفے پر منطق جیسی بیہودہ اور بازاری چیز کے انطباق کی جرأت کرے تو اس "فلسفۂ تغیر" میں اسے بعض پیچیدگیاں اور الجھنیں نظر آئیں گی۔ برگسان ماہر ریاضیات کی مذمت اور تضحیک سے کبھی تھکتا یا چوکتا نہیں کیوں کہ اس غریب کا قصور یہ ہے کہ وہ وقت کو ایک ایسا سلسلہ سمجھتا ہے جس کے اجزا ایک دوسرے سے علٰحدہ ہیں۔ لیکن برگسان کے دعوے کے مطابق اگر دنیا میں واقعی کوئی خالص جدّت ہے اور اس میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ حقیقت میں ہمیشہ باقی رہتا ہے تو کسی ابتدائی زمانہ کے موجودات کا موقت مجموعہ بعد میں آنے والے زمانہ کے مجموعہ کا لازماً ایک جزو ہوگا پس کل اور جزو کے اس علاقہ کی رو سے مختلف اوقات میں دنیا کی حالتوں کے مجموعوں سے ایک ایسا سلسلہ مرتب ہوگا جس میں وہ تمام خصوصیات پائی جائیں گی جن کی ایک ماہر ریاضیات کو ضرورت ہوتی ہے اور جنھیں برگسان دریا برد کر دینے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ماسوا اس کے دنیا کی پچھلی حالتوں پر جن نئے عناصر کا وقتاً فوقتاً اضافہ ہوا ہے وہ اگر پرانے عناصر سے جدا نہیں ہیں تو خالص جدّت کہاں باقی رہی اور تخلیقی ارتقا نے کیا خاک خلاّقی کی۔ بہرحال برگسان فلوطینوس کے نظامِ فلسفہ سے انچ بھر تجاوز نہیں کرتا۔ اس دشواری کو وہ ہرچند یہ کہہ کر رفع کرتا ہے کہ ہر وقوعہ ایک بالیدگی یا اپج ہے جس میں ہر چیز بدل جاتی ہے اور پھر جوں کی توں باقی رہتی ہے لیکن یہ تصوّر ایک چیستان سے زیادہ نہیں جیسے ایک شخص جو خوش اعتقاد نہ ہو کبھی بوجھنے کی

---

[1] Elan vital کا ترجمہ ہے اور کسی اور صاحب کا کیا ہوا مترجم

توقع نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ برگسان کا خطاب یکسر صوفیانہ ایمان سے ہے عقل سے نہیں ہے اور جہاں ایمان منطق کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہاں ہم جیسے بے بال و پر برگسان کی پرواز کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اسی اثنا میں فلسفیانہ دنیا کی سطح زمین پر ایک پودا اور ایسا ابھرا جسے مختلف اور متعدد سمتوں سے سینچا اور پروان چڑھایا گیا۔ اسے عموماً موجودیت[۵۱] کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی خصوصیات صرف دو ہیں (۱) ایک اس کا اسلوب جو تحلیلی ہے اور (۲) دوسری اس کی مابعد الطبیعیت جو کثرت وجود کی قائل ہے۔ لیکن یہ فلسفہ سرتاسر موجودیتی نہیں کیوں بعض اعتبارات سے اس میں اور برکلے کی تصوریت میں خاصی مماثلت ہے البتہ کانٹ اور ہیگل کی تصوریت سے اسے دور کی بھی نسبت نہیں، اس لئے کہ یہ نظامات جس منطق پر مبنی ہیں اس کو یہ فلسفہ سختی سے رد کرتا ہے اس فلسفہ میں جیمس کے اس نظریہ کو اختیار کرنے اور ترقی دینے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے جو یہ بیان کرتا ہے کہ دنیا کا بنیادی مسالہ یا مورورثہ ذہنی ہے اور نہ مادی بلکہ ان دونوں کے برخلاف ایک ایسی چیز ہے جو ذہن اور مادہ دونوں سے زیادہ بسیط اور زیادہ اساسی ہے اور جن سے مادے اور نفس دونوں کی ترکیب اور تشکیل عمل میں آئی ہے۔

انیسویں صدی کے قرنِ آخر میں جو مشاہیر بہ قید حیات تھے ان میں جیمس ہی وہ پہلا اور آخری شخص تھا جس نے اطالوی تصوریت کا طبقہ اُلٹ دینے کی پر زور کوشش کی شیلر اور ڈیوئی کو ان دنوں میں نہ کوئی جانتا تھا اور نہ مانتا تھا خود جیمس کی حالت یہ تھی کہ دنیا اسے صرف ایک نفسیات داں سمجھتی تھی جس کی فلسفے میں کوئی خاص اہمیت یا وقعت نہیں ہوا کرتی۔ لیکن ۱۹۰۰ء کے آغاز سے بالکل کایا پلٹ ہوگئی المانوی تصوریت کی مخالفت کا طوفان چاروں طرف اس شدت سے اٹھ کھڑا ہوا جس کا کسی کو سان گمان تک نہ تھا۔ لیکن اس سے یہ خیال نہ کیجئے کہ یہ ساری مخالفت صرف

---

۵۱ Realism کا ترجمہ ہے۔ مترجم

نتائجیت ہی کی طرف سے تھی ۔ بلکہ اس میں خالص نفسی نقطہ ہائے نظر کو بھی بہت زیادہ دخل تھا بسرزمین المانیہ میں فریگ کی تصانیف (جو ہر چند ۱۸۷۹ میں شائع ہوئیں مگر ابھی تھوڑے دن تک کسی نے سنجیدگی سے ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا) کے علاوہ ہسترل کی کتاب "منطق پر چند خیالات" نے (جو ۱۹۰۰ء میں چھپی اور ایک یادگار تصنیف ثابت ہوئی) بہت جلد اپنے وسیع اثرات پیدا کر لئے اس کے سوا مینانگ کی دو تصنیفوں یعنی "مسلّمات" (مطبوعہ ۱۹۰۲) اور "نظریۂ اشیاء اور نفسیات" (مطبوعہ ۱۹۰۴ء) نے بھی اس معاملہ میں بہت اثر ڈالا ۔ انگلستان میں جی۔ای مور اور میں نے انھی کے مماثل نظریات کی وکالت شروع کی ۔ "تصدیق کی ماہیت" کے عنوان سے مور کا ایک نہایت معرکتہ الآرا مضمون ۱۸۹۹ء میں شایع ہوا ۔ اس کے علاوہ اس کی تصنیف "مبادی اخلاقیات" ۱۹۰۳ء میں چھپی ۔ میری پہلی کتاب "فلسفۂ لائب نز" ۱۹۰۰ء میں مطبع سے باہر آئی اور دوسری "مبادی ریاضیات" ۱۹۰۳ء میں تصنیف اور طبع ہوئی فرانس میں اسی قسم کے فلسفہ کو کوتزات نے بڑی آب و تاب سے پیش کیا ۔ امریکہ میں ولیم جیمس کی "بنیادی تجربیت" کو (جس میں اس کی نتائجیت کا کوئی شائبہ نہ تھا ۔) نئی منطق میں سمو دیا گیا ۔ جس سے ایک بالکل نیا فلسفہ نمودار ہوا ۔ یہ فلسفہ نو موجودیت کہلاتا ہے اور باوجودیکہ ماخ کی تصنیف "تحلیل احساسات" (مطبوعہ ۱۸۸۹ء) میں اس کے بعض اجزا موجود تھے اور وہ مذکورہ بالا یوروپی تصانیف کے مقابلہ میں زماناً مؤخر تھا لیکن وہ ان سب سے بدرجہا زیادہ انقلاب انگیز ہے ۔

اس نئے فلسفہ نے اب تک کوئی قطعی صورت اختیار نہیں کی بلکہ بعض اعتبارات سے ہنوز خام اور ناکمل ہے ۔ مزید بریں اس کے مختلف وکیلوں اور داعیوں میں زبردست اختلافات بھی ہیں پھر اس کے اجزا رکسی قدر عسیر الفہم اور اوق بھی ہیں ۔ غرض ان تمام وجوہ کی بنا پر ہم یہاں اس کے صرف چند نمایاں پہلو پیش کر سکتے ہیں اس سے زیادہ کی نہ ہم سے اُمید رکھنی چاہئے اور نہ ایک مختصر مقالے میں تفصیل کی گنجائش ہوتی ہے ۔

اس نئے فلسفہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کوئی خاص فلسفیانہ اسلوب نہیں اور جب کوئی خاص اسلوب ہی نہیں تو پھر اس کے ذریعہ کسی خاص قسم کے علم کے حصول کا سوال ہی سرے سے بے معنی ہے۔ یہ فلسفہ سائنس اور فلسفہ دونوں کو ایک جانتا ہے اس کے نزدیک ان میں آپس میں فرق صرف اتنا ہے کہ مخصوص علوم جزئی مسائل سے بحث کرتے ہیں اور فلسفہ ان سے زیادہ عام اور کلی مسئلوں پر نظر ڈالتا ہے پھر ایک اور فرق ان میں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ فلسفہ ایسے فرضیات مرتب کرتا ہے جن کا تجربی استشہاد ہنوز انسانی دسترس سے بالکل باہر ہے اس فلسفہ کی نظر میں علم سراسر سائنس ہے یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ علم کی جانچ اور تصدیق سائنس کے اصولوں اور طریقوں پر ہونی چاہیے۔ اس فلسفہ کا مقصد یہ کبھی نہیں کہ کائنات پر مجموعی حیثیت سے بحث تحیص کی جائے یا کسی جامع و مانع نظام کی تشکیل عمل میں لائی جائے بلکہ اسے اپنی منطق کے بل بوتے پر اس بات کا پکا یقین ہے کہ دنیا کی سخت سخت اور بے ترتیب فطرت سے انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ اُسے دنیا کے "عضوی" ہونے سے انکار ہے مگر صرف وہیں تک جہاں تک کہ اس لفظ سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ اگر جزو کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے تو کل کا استنباط بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ علاوہ ان تمام باتوں کے وہ المانوی تصوریت کی غلطی کا ارتکاب اور اعادہ خاص طور پر نہیں کرتا۔ یعنی یہ کوشش کبھی نہیں کرتا کہ علم کی ماہیت سے دنیا کی ماہیت کا استنباط عمل میں لایا جائے۔ وہ علم کو محض ایک طبعی واقعہ سمجھتا ہے جس کی نہ کوئی صوفیانہ وقعت ہے اور نہ کوئی کونیاتی اہمیت۔

اس نئے فلسفہ کے خاص سرچشمے تین ہیں (۱) علم کا نظریہ (۲) منطق اور (۳) ریاضیات کے اصول۔ کانٹ اور اس کے بعد کے لوگ عام طور پر یہ سمجھتے تھے کہ علم ایک باہمی تعامل ہے جس میں معلوم شئے ہمارے علم کی بدولت کچھ بدل جاتی ہے اور بنا بریں بعض ایسے خواص ہمیشہ اپنے میں رکھتی ہے جن کو ہمارے علم سے نسبت حاصل ہے۔ اس کے سوا وہ (بہ استثنار کانٹ) یہ بھی مانتے تھے کہ جو چیز علم میں نہیں آتی اس کا وجود محال منطقی ہے۔ لہٰذا علم کے

ذریعہ جن خواص کا ہم ادراک کرتے ہیں وہ واقع میں ایسے ہیں جن کا ہر چیز میں پایا جانا ضروری ہے اس طرح مدار بحث امر یہ تھا کہ اگر ہم شرف علم کی شرائط ہی کا غائر نظر سے مطالعہ کریں تو حقیقی دنیا کے متعلق بہت کچھ انکشافات عمل میں لا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس نئے فلسفہ نے ایک دعویٰ تو یہ کیا کہ علم کو معلومہ اشیا کی کوئی پروا نہیں اور دوسرا یہ کہ علم میں نہ آنے والی چیزوں کے معدوم ہونے کی کوئی معقول تو کیا نامعقول وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ ان دعووں کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم کا نظریہ جواب تک کائنات کے طلسم اسرار کی لوح بنا ہوا تھا اپنی ساری اہمیت یک لخت کھو بیٹھا اور ہم کو سائنس کی محنت طلب تحقیقات کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

علیٰ ہذا القیاس منطق میں سالیت نے "عضوی" نظریہ کی جگہ حاصل کی۔ اب تک عام خیال یہ تھا کہ جب کوئی چیز کسی طرح متاثر ہوتی ہے تو دوسری چیزوں کی داخلی فطرت بھی اس کا اثر قبول کرتی ہے۔ کیونکہ جملہ چیزیں ایک رشتہ میں منسلک اور مربوط ہیں۔ اسی طرح اگر ہمیں کسی چیز کا مکمل علم حاصل ہو تو پوری کائنات کا مکمل علم بھی بخوبی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن نئی منطق نے بلند آہنگی سے یہ دعویٰ کیا کہ کسی چیز کی ذاتی ماہیت سے منطقی طور پر یہ استنباط کبھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس چیز کو دوسری چیزوں کے ساتھ فلاں فلاں علاقے حاصل ہیں۔ اس اجمال کو ہم ایک مثال سے واضح کئے دیتے ہیں۔ لائب نز ایک جگہ کہتا ہے (اور اس باب میں وہ جدید تصوریئین سے لفظ بہ لفظ متفق ہے) کہ اگر کوئی شخص یوروپ میں ہو اور اس کی بیوی ہندوستان میں وفات پا جائے تو انتقال کے وقت اس میں ایک معنوی تغیر پیدا ہوگا لیکن فہم عامہ کا فتویٰ اس بارے میں یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی معنوی تغیر پیدا نہ ہوگا جب تک کہ وہ اپنی خانہ بربادی کی خبر نہ سن لے گا۔ نئے فلسفہ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے اور اس کے نتائج اتنے دور رس ہیں کہ بادی النظر میں ہم ان کا احصار نہیں کر سکتے۔

ریاضیات کے اصولوں کو فلسفہ سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے وجہ یہ ہے کہ ریاضیات میں اعلیٰ درجہ کا یقینی بدیہی علم پایا جاتا ہے اور فلسفہ کا بڑا حصہ بدیہی علم کا دلدادہ ہے۔ ایلیائی زینو اور

اس کے بعد کے جملہ تصوری فلسفی اس بات کے دل و جان سے خواہش مند رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ریاضیات کی ساکھ میں بٹہ لگائیں۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے ایسے تناقضات بہت سے گھڑ لئے جن کا واحد مدعا یہ ثابت کرنا تھا کہ ماہرانِ ریاضیات کی رسائی مابعد الطبیعی حقیقت تک ہرگز نہیں ہو سکتی۔ صرف فلاسفہ ہی بہتر قسم کے مابعد الطبیعی حقایق بہم پہنچا سکتے ہیں۔ کانٹ کے فلسفے میں اس قسم کے دعوے بڑی تعداد میں موجود ہیں اور ہیگل تو اس بارے میں اس سے میلوں آگے ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے دوران میں ماہران ریاضیات نے کانٹ کے فلسفہ کے اس حصہ کو بڑی بے دردی سے کچلا چنانچہ لوباچیوسکی[۵۱] نے غیر اقلیدسی ہندسہ ایجاد کر کے کانٹ کی قبل تجربی حسیات کی ریاضیاتی دلیل کے پرزے اڑا دئے۔ ویرسٹراس[۵۲] نے بہ دلائل یہ ثابت کر دیا کہ تسلسل میں اقل لا متناہی (یا اجزائے لا تتجزیٰ) کو کوئی دخل نہیں۔ گیارگ کنتار[۵۳] نے تسلسل اور لا متناہیت کے ایسے نظریئے وضع کئے جنھوں نے فلاسفہ کے مقبول عام استعاروں کا خاتمہ کر دیا اور فریگ[۵۴] نے یہ منوا کر چھوڑا کہ حساب منطق سے حاصل ہوا ہے حالانکہ کانٹ کو اس سے انکار تھا۔ غرض کہ یہ تمام نتیجے معمولی ریاضیاتی طریقوں سے حاصل ہوئے ہیں اور بنا بریں شک و شبہ سے ویسے ہی بالاتر ہیں جیسے کہ ریاضی کے پہاڑے۔ فلسفیوں نے اس صورتِ حال پر توجہ تو کی مگر ان مصنفوں کی تحریرات کا مطالعہ گوارا نہیں کیا جن کا اوپر ذکر آیا ہے البتہ نئے فلسفہ نے ضرور ان نتائج سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس میں کامیاب رہا۔

---

۵۱ پورا نام نکولائی آئوانووچ لوباچیوسکی ۱۷۹۳ - ۱۸۵۶ روسی ماہر ریاضیات

۵۲ جرمن ماہر ریاضیات اس نے ۱۸۹۷ میں وفات پائی جامعہ برلن میں ریاضیات کا پروفیسر تھا۔

۵۳ ۱۸۴۵ - ۱۹۱۸ جرمن ماہر ریاضیات۔

۵۴ گاٹ لوب فریگ سرزمین المانیہ کا مشہور ریاضی داں۔ مترجم

جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ آج طویل جہالت کے ان طرفداروں کے مقابلہ میں ہر طرح سرخرو اور کامراں ہے۔

نیا فلسفہ محض تنقیدی ہی نہیں بلکہ تعمیری بھی ہے لیکن اس کی تعمیر ہو بہو سائنس کی تعمیر ہے۔ کوئی فرق نہیں۔ سائنس ہی کی طرح وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے اور ہر طرح اطمینان اور جانچ کر لینے کے بعد بڑھتا ہے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہے اور پھونک پھونک کر اٹھاتا ہے۔ اس کی تعمیر کا ایک خاص فنی اسلوب ہے جسے ریاضیاتی منطق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ منطق ریاضیات کی ایک نئی شاخ ہے اور اس کی دوسری تمام اور نئی شاخوں کے مقابلہ میں فلسفہ سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اس منطق کی ایجاد سے پہلے نہ یہ پتہ چلایا جا سکتا تھا کہ سائنس کے کسی نظریے کا فلسفے پر کیا اثر پڑتا ہے اور نہ یہ تعین کیا جا سکتا تھا کہ عوامل میں سے کن کو تسلیم کرنا چاہیے اور کن کو نہیں۔ لیکن اس ریاضیاتی منطق نے ان سب کو ممکن کر دکھایا۔ ریاضیات اور طبعیات کے فلسفہ نے اس اسلوب کی مدد سے بڑی زبردست ترقیاں حاصل کی ہیں۔ چنانچہ اس کی برکت سے طبعیات کو جو پھل ملے ہیں ان کے ایک جزو کو ڈاکٹر[1] وائٹ ہیڈ نے اپنی تین جدید تصنیفوں میں شرح و بسط سے قلم بند کیا ہے۔ توی توقع ہے کہ اس اسلوب کی بدولت دوسرے میدانوں میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگی اور یہ توقع کچھ بے بنیاد نہیں۔ یہاں پر ہم اس اسلوب کو اس لئے ہدیۂ ناظرین نہیں کر سکتے کہ وہ بے حد فنی ہے اور یہی اس کا نقص ہے اگر یہ کوئی نقص ہے۔

جدید فلسفہ کثرت وجود کا بڑا حصہ قضایا کی منطقی تحلیل پر مشتمل ہے لیکن اس اسلوب کو جب پہلے پہل استعمال میں لایا گیا تو صرف و نحو کا بڑا اہتمام کیا گیا چنانچہ میناگ کہتا ہے کہ جب ہم واقعتہً یہ کہہ سکتے ہیں کہ " گول مربع موجود نہیں ہے " تو ایسے معروض کا ہونا ضروری ہے جو

---

[1] علم طبعی کے مبادیات مطبوعہ ۱۹۱۹۔ تصور فطرت مطبوعہ ۱۹۲۰ اور اصول اضافیت مطبوعہ ۱۹۲۲۔ یہ تینوں کتابیں جامعۂ کیمبرج کے مطبع میں چھپیں۔ مصنف

گول مربع ہو خواہ وہ غیر موجود ہی کیوں نہ ہو ۔ راقم الحروف بھی پہلے پہل اس قسم کے استدلال سے محفوظ نہیں رہا ۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس سے گریز کیونکر ممکن ہے ۔ کیوں کہ اس سنہ میں اس نے " بیانات " کا نظریہ دریافت کر لیا جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ جب ہم " گول مربع موجود نہیں ہے " کہتے ہیں تو گول مربع کا ذکر نہیں کرتے کیوں کہ گول مربع جیسے مہمل موضوع پر وقت صرف کرنا ایک خاصی بیہودگی ہے لیکن ایسے قضایا سے منطقی نظریوں کے بہترین معیار ہاتھ لگتے ہیں ۔ بہت سے منطقی نظریئے صرف اس لئے رد کر دئے جاتے ہیں کہ وہ بیہودگیوں کی طرف مودّی ہوتے ہیں ۔ لہٰذا منطقی کو ہمیشہ بیہودگیوں سے واقف اور ہوشیار رہنا چاہئے جو شخص عملی (تجربہ خانہ کے) اختیارات کے افادہ سے بے خبر ہوتا ہے ۔ وہ انھیں ہیچ اور ناچیز شمار کرتا ہے حالانکہ وہ عظیم الشان نتائج کا پیش خیمہ ہوتے ہیں ۔ یہی حال بیہودگیوں کا ہے جو منطقی کے اختیارات اور اس کی زرّین کامیابیوں کے مقدّمے ہیں ۔

نئے فلسفے میں چونکہ قضایا کی منطقی تحلیل کا کافی حصہ ہے ۔ اس لئے شروع شروع میں فلاطون اور قرون وسطی کی موجودیت کا رنگ اس پر بے حد غالب رہا ۔ اس زمانہ میں وہ مجردات اور مادّیات دونوں کو یکساں سمجھتا تھا یعنی اس کی نظر میں دونوں کی حیثیت وجود بالکل ایک تھی ۔ مگر جیسے جیسے اس کی منطق پختہ ہوتی اور کمال کو پہنچتی گئی ویسے ویسے اس نظریہ سے وہ دست کش ہوتا گیا اب جو اثر اس پر پھر بھی باقی رہ گیا ہے وہ کچھ ایسا نہیں ہے جس سے فہم عامہ کو کوئی صدمہ پہنچ سکے ۔

نئے فلسفہ پر شروع میں نظری ریاضیات کا اثر بے حد غالب تھا لیکن موجودہ زمانہ میں اس کی جگہ طبعیات نے لے لی ہے ۔ یہ انقلاب آئن سٹائن کا پیدا کردہ ہے ۔ جس نے زمان ، مکان اور مادہ کے پرانے تصوروں کی دنیا بالکل ہی بدل ڈالی ۔ ہر چند یہاں نظریۂ اضافیت کی تشریح کا کوئی محل نہیں تاہم اس کے فلسفیانہ نتائج کو مختصر لفظوں میں بیان کر دینا بالکل ناگزیر ہے ۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اضافیت کے نظریہ میں دو نہایت اہم نکات پوشیدہ ہیں :-

(۱) ایک یہ کہ ایسے واحد اور ہمہ گیر زمان کا کہیں وجود نہیں جس میں کائنات کے جملہ حوادث اپنی اپنی جگہ پر متمکن ہوں اور (۲) دوسرا یہ کہ طبیعی مظاہر کے مشاہدہ میں اگرچہ وضعی یا موضوعی جزو بہت بڑا ہے ـــــ اتنا بڑا کہ اب سے پہلے اس کا پورے طور پر کبھی احساس نہیں کیا گیا ـــــ لیکن اس کو ایک ریاضیاتی اسلوب کے ذریعہ بہ آسانی رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسلوب پیمائشی رقموں[۵۱] کا احصار کہلاتا ہے اور میں اس پر ایک لفظ نہیں کہوں گا کیوں کہ اس کی فنی عبوست ناقابل برداشت ہے۔

زمان کے متعلق شروع ہی میں یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہم یہاں کسی فلسفیانہ تخمین میں سر نہیں کھپا رہے ہیں بلکہ ایک ایسے نظریہ سے بحث کر رہے ہیں جو اختباری نتائج کی پیداوار ہے اور ریاضیاتی ضابطوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان دونوں زمانوں میں بالکل وہی فرق ہے جو ماں تس کیو[۵۲] کے نظریوں اور امریکی دستور میں ہے۔ مختصر یہ کہ زمانی نظام ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ جو حوادث مادے کے ایک قطعے پر رونما ہوتے ہیں وہ اس ناظر کے نقطۂ نظر سے ایک خاص زمانی نظام رکھتے ہیں جو مادے کے مذکورہ قطعہ کے ساتھ ساتھ گردش کر رہا ہے۔ اور جو حوادث مادے کے دوسرے قطعوں پر ـــــ ان قطعوں پر جن کے مقامات مختلف ہیں ـــــ رونما ہوتے ہیں۔ ان کا لازماً کوئی خاص یا متعین زمانی نظام نہیں ہو سکتا۔ اپنے مافی الضمیر کو ہم ایک مثال کے ذریعہ واضح کئے دیتے ہیں۔ اگر کوئی روشنی زمین سے سورج کی طرف روانہ کی جائے اور وہاں سے پھر وہ زمین کی طرف لوٹے تو اس کی روانگی اور واپسی میں سولہ منٹ صرف ہوں گے یعنی وہ جس وقت زمین سے روانہ ہوئی تھی۔ اس کے ٹھیک سولہ منٹ بعد زمین پر واپس ہوگی اب ان سولہ منٹوں میں جو حوادث زمین پر رونما ہوں گے وہ سورج پر اس کے ورود سے

---

[۵۱] Tensor Calculas کا ترجمہ ہے۔ مترجم

[۵۲] Montesquieu شارل ماں تس کیوٗ ۱۶۸۹-۱۷۵۵ فرانسیسی فلسفی اور مصنف۔ مترجم

نہ ماقبل ہوں گے اور نہ مابعد۔ فرض کیجئے کہ ناظروں کی ایک بڑی تعداد زمین اور سورج کے لحاظ سے جملہ ممکن سمتوں میں گردش کر رہی ہے اور ان سولہ منٹوں میں زمین پر رونما ہونے والے حوادث کو اور سورج پر اس روشنی کے پہنچنے کو بہ نظر غور دیکھ رہی ہے پھر یہ بھی مان لیجئے کہ ان میں سے ہر ایک کی رفتار روشنی کی رفتار کے مساوی ہے اور ہر ایک کے پاس ایک صحیح وقت موجود ہے تو اب یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض تو یہ خیال کریں گے کہ ان سولہ منٹوں میں جو حادثہ زمین پر رونما ہوا وہ سورج پر روشنی کے پہنچنے کے پہلے کا تھا بعض یہ سمجھیں گے کہ وہ اس کے ورود کے ہم وقت تھا اور بعض یہ جانیں گے کہ وہ اس کے بعد کا تھا۔ اگر صحت پر ہیں تو سب ہیں اور غلطی پر ہیں تو سب ہیں۔ لیکن طبیعیات کے غیر شخصی زاویۂ نظر سے ان سولہ منٹوں میں جو حوادث زمین پر رونما ہوتے ہیں وہ سورج پر روشنی کے پہنچنے سے نہ پہلے کے ہیں نہ بعد کے اور نہ برابر کے۔ پس مادّے کے ایک قطعہ پر جو حادثہ ل رونما ہوا ہے اس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مادّے کے دوسرے قطعہ پر رونما ہونے والے حادثہ ب سے بالتحقیق مقدم ہے کیوں کہ بہ صورت اثبات یہ لازمی ہوگا کہ نور ل سے ایسے وقت نکلے جبکہ پہلا حادثہ رونما ہوا (ل کے وقت کے مطابق) اور ب پر ایسے وقت پہنچے جبکہ دوسرا حادثہ ابھی رونما نہیں ہوا (ب کے وقت کے مطابق) ورنہ دونوں حوادث کا زمانی نظام تو ناظر کے ساتھ ساتھ بدلتا جاتا ہے اور کسی طبعی واقعہ کا استحضار نہیں کرتا۔

اگر نور کی رفتار کے مقابلے کی رفتاریں عام ہوتیں تو نہ ہم اطبا کے پھندے سے آج چھٹکارا پاتے اور نہ طبعی دنیا پر سائنس کے اسالیب کے ذریعے بحث کرنے کی نوبت آتی۔ لیکن اگر طبیعیات کا انکشاف ہو چکا ہے تو اس کا آئن شٹائنی طبیعیات ہونا ضروری ہے۔ اس واسطے کہ نیوٹنی طبیعیات صریحاً بیکار اور ناقابل انطباق ہے۔ تاب کار جواہر ایسے ذرات خارج کرتے ہیں جو قریب قریب نور کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں۔ لہذا ہم اگر اضافیت کی نئی طبیعیات کو کام میں نہ لائیں تو ان کے طور طریق اور کردار کو سمجھنا ہمارے لئے قطعاً ناممکن ہو۔

قدیم طبیعیات کا ناقص ہونا کسی مزید ثبوت کا محتاج نہیں۔ اور اس نقص کا "بالکل معمولی" ہونا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کوئی معقول عذر نہیں۔ ہمیں غور اس واقعہ پر کرنا چاہیئے کہ جو حوادث مختلف مقامات پر رونما ہوتے ہیں ان میں آپس میں ایک حد تک کوئی معین زمانی نظام نہیں ہوتا۔ اور اسی واقعہ پر سے "مکان" اور "زمان" کی دو مختلف اصطلاحوں کی جگہ "مکا[1] زمانہ" کی واحد اصطلاح کو دی گئی۔ پس جس زمان یا وقت کو ہم اب تک کائناتی سمجھا کئے وہ حقیقت میں "مقامی وقت" ہے یعنی ایک ایسا وقت جو زمین کی گردش کا پابند اور کلیّت کے منصب سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ اس جہاز کا وقت جو بحر اوقیانوس کو عبور کرتے ہوئے اپنے گھنٹوں کو نہیں بدلتا۔

جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ زمان کو ہمارے معمولی معمولی ادراکات میں کتنا زبردست دخل حاصل ہے اور اس کی اصلی حالت کیا ہے تو فوراً یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر میں ایک نہایت گہری اور اہم تبدیلی کا پیدا ہونا ضروری بھی ہے اور یقینی بھی۔ مثال کے طور پر "ترقی" کے ادراک کو لیجئے۔ اگر زمانی نظام کسی اصول اور قاعدہ کا پابند نہیں ہے تو وقت کی پیمائش کے متعلق جو قرار واد طے پائیگی اس کے مطابق ترقی اور تنزل دونوں کا احتمال یکساں ہوگا۔ اسی طرح مکانی بُعد کا ادراک بھی بہت متاثر ہوتا ہے فرض کیجئے کہ دو ناظر دو مقاموں کے درمیانی فاصلہ کو انتہائی صحت کے ساتھ ناپنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن اگر ان کی اضافی حرکت تیز ہے تو ان کے تخمینے بالکل مختلف ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ فاصلہ کے تصور میں بے حد ابہام پیدا ہوگیا ہے کیونکہ فاصلہ ہوگا مادی چیزوں کے بیچ میں۔ خالی مکان کے نقطوں کے بیچ میں نہیں جو محض مفروضات ہیں۔ اس کے سوا یہ فاصلہ ایک خاص وقت کا پابند ہوگا کیوں کہ دو اجسام کا درمیانی بُعد ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور خاص وقت کی

---

[1] Space Time کا ترجمہ ہے مکان، زمان۔ مترجم

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک موضوعی ادراک ہے اور اس راہ پر موقوف ہے جس سے ناظر گذر رہا ہے مزید براں آج ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں جسم فلاں وقت موجود تھا البتہ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں اور کہنا چاہئے کہ فلاں حادثہ فلاں وقت حاضر اور واقع تھا۔ دو حوادث کے بیچ میں ہمیشہ ایک خاص علاقہ ہوا کرتا ہے جو ان کا درمیانی "وقفہ" کہلاتا ہے۔ اور ہر قسم کے ناظر سے بے نیاز اور مستغنی ہوتا ہے اس "وقفہ" کی تحلیل مختلف ناظر مختلف مکانی اور زمانی مرکبوں میں کرتے ہیں لیکن یہ تحلیل خارجیت سے گراں بار نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ وقفہ تو بے شک ایک خارجی طبیعی واقعہ ہے لیکن مکانی اور زمانی عناصر میں اس کی تقسیم خارجی طبیعی واقعہ نہیں ہے۔

مادہ کے متعلق ہمارا پرانا اور سہل تصور یہ تھا کہ وہ "ٹھوس" ہے لیکن یہ "ٹھوس پن" اب رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ مادہ کا کوئی ٹکڑا آج "حوادث کے ایک سلسلہ" سے زیادہ نہیں جو بعض قوانین اور نوامیس کا پابند ہے۔ اور ان کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مادہ کے مذکورہ بالا تصور نے ایسے وقتوں میں جنم لیا جب کہ فلاسفہ کو "جوہر" کے تصور کے صحیح اور مستند ہونے میں کوئی شک اور شبہ نہیں تھا۔ مادے کو انھوں نے ایک ایسا "جوہر" سمجھ رکھا تھا جو ہمیشہ مکان اور زمان میں پایا جاتا ہے اور ذہن ایک ایسا "جوہر" تھا جو صرف زمان کا پابند ہے۔ اور مکان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ مابعد الطبیعیات میں "جوہر" کے ادراک "ٹھوس پن" رفتہ رفتہ "غائب" ہوتا گیا۔ لیکن طبیعیات میں وہ جوں کا توں باقی رہا۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے کوئی نقصان متصور نہ تھا۔ لیکن اضافیت کے نظریہ نے ایجاد ہو کر پرانی کائنات بالکل بدل دی۔ جوہر کا روایتی ادراک دو عناصر سے مرکب تھا جن میں سے (۱) پہلا عنصر تو یہ تھا کہ جوہر میں ایک منطقی خاصہ پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ کسی قضیہ میں وہ جب کبھی واقع ہوگا ہمیشہ موضوع (مبتدا) کی حیثیت سے ہوگا محمول (خبر) کی حیثیت سے نہیں۔ اور (۲) دوسرا یہ کہ وہ ایک ایسی چیز تھا جو زمانا دائم اور قائم رہتی ہے۔ یا زمان سے بالاتر ہوتی ہے ان دو خاصتوں میں کوئی لازمی ربط نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا ادراک نہیں کیا گیا۔ کیونکہ طبیعیات

کہتی تھی کہ مادّے کے ذرّے لافانی ہیں اور الٰہیات کہتی تھی کہ روح لافانی ہے۔ لہٰذا دونوں کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ ان میں جواہر کے دونوں خواص پائے جاتے ہیں۔ لیکن اب طبیعیات ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم سریع الفنا حوادث کو حقیقی معنوں میں "جواہر" جانیں یعنی انہیں ایسے موضوع سمجھیں جو محمول نہیں ہو سکتے۔ مادّے کے جس ٹکڑے کو ہم ایک اور دوامی کائن سمجھتے ہیں۔ وہ حقیقت میں بہت سے کائنوں کی ایک لڑی ہے۔ گویا وہ سینما کا ایک منظر ہے جو بظاہر دکھلائی تو ایک دیتا ہے مگر حقیقت میں بہت سی چھوٹی چھوٹی تصویروں کا مجموعہ ہوتا ہے جب مادّہ کا یہ حال ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہی بات ذہن کے متعلق نہ کہیں واقعہ یہ ہے کہ دائم الحال نفس لافانی سالمہ کی طرح بالکل فرضی اور افسانوی ہے دونوں کے دونوں حوادث کی لڑیاں ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بعض دلچسپ علایق رکھتی ہیں۔

ماخ اور جمیس نے کہا تھا کہ ذہنی اور طبیعی دنیاؤں کا "سالہ یا مواد" ایک ہے اور جدید طبیعیات اس بارے میں ان کی تائید کرتی ہے۔ "ٹھوس مادّہ" اب تک افکار اور دائم الحال نفس دونوں سے قطعاً مختلف تھا لیکن اب حالت اور ہو گئی ہے اب تو مادّہ اور نفس دونوں نے حوادث کے مجموعوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کرنا چنداں دشوار یا مشکل نہیں کہ ان دونوں کی تشکیل ایک ہی مواد سے عمل میں آئی ہے۔ اس کے سوا اب تک ذہن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نقطۂ نظر کا مالک یا موضوع ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ خصوصیت اب تو طبیعیات میں بھی پائی گئی ہے اور جہاں کہیں پائی گئی ہے ذہن سے بالکل بے لوث پائی گئی ہے۔ مثلاً فوٹو کے کیمروں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کو اگر مختلف مقامات پر نصب کر کے کسی ایک حادثہ کی تصویر لی جائے تو وہ اسی ایک "حادثہ" کو تو پیش ضرور کریں گے لیکن ان کے عکسوں میں اختلاف ہوگا۔ علیٰ ہذا جدید طبیعیات نے وقت پیماؤں [illegible] پیمائشی جریبوں کو بھی موضوعی بنا دیا ہے۔ اب وہ براہ راست جو کچھ ظاہر کرتے ہیں وہ کوئی طبیعی واقعہ نہیں بلکہ طبیعی واقعہ کے ساتھ ان کی اضافت ہے اس طرح طبیعیات اور نفسیات کی درمیانی خلیج بڑی حد تک

پٹ گئی ہے اور ذہن اور مادہ کی پرانی ثنویت کی دھجیاں فضائے بسیط میں کبھی کی اڑ چکی ہیں۔

اگر ہم یہاں پر اتنا بتلا دیں کہ جدید طبیعیات میں " قوت " جیسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔ بشرطیکہ اس لفظ سے اس کے پرانے یا مستعمل معنے مراد لئے جائیں پہلے عام طور پر ہم یہ خیال کرتے تھے کہ سورج زمین پر ایک قوت صرف کرتا ہے۔ مگر اب خیال یہ ہو گیا ہے کہ سورج کے قرب وجوار میں جو مکانی زمانی نظام ہے اس کا ڈول کچھ ایسا ہے کہ زمین کو دوسرے مداروں کے مقابلہ میں موجودہ مدار پر گردش کرنے میں بہت کم مزاحمت اُٹھانی پڑتی ہے۔ اس طرح جدید طبیعیات کا بڑا اصول " اقل عمل کا اصول " ہے یعنی کوئی جسم ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتے ہوئے ہمیشہ وہی راہ اختیار کرے گا جس میں عمل کی سب سے کم ضرورت ہو۔ (عمل اگرچہ ایک ٹھیٹھ فنی اصطلاح ہے لیکن یہاں پر اس کے مفہوم کی وضاحت چنداں ضروری نہیں ہے) اخبارات اور بعض اہل قلم حضرات اپنی تحریروں میں لفظ " حرکت " کا استعمال بڑے زور و شور سے کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے استعمال سے ان کی عبارتوں میں قوت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ لیکن خود " حرکت کے علم[؎۱] " کا حال یہ ہے کہ اس میں حرکت کی قسم کی کوئی چیز پائی ہی نہیں جاتی اس کے برعکس وہ تو کاہلی کی بڑی دلدادہ ہے اور اسی بناء پر یہ چاہتی ہے کہ ہر چیز کا استنباط سستی کے ہمہ گیر قانون سے عمل میں لایا جائے۔ علاوہ اس کے کسی جسم کو دوسرے جسم کی حرکتوں پر کوئی " اقتدار " بھی حاصل نہیں ہے۔ جدید سائنس کی دنیا کو ان لوگوں کی دنیا سے کوئی نسبت نہیں جو " بڑے بڑے قانونوں " اور " طبیعی قوتوں " کی بڑ ہانکتے ہیں۔ البتہ لازو کی دنیا سے اسے گہری مشابہت حاصل ہے۔

پرانے فلسفوں کے مقابلہ میں کثرتیت اور موجودیت کا جدید فلسفہ بعض اعتباروں سے بہت کم نتیجہ خیز ثابت ہوا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں فلسفہ الٰہیات کا خانہ زاد غلام تھا۔ اور کتب

؎۱ Dynamics کا ترجمہ اور حرکیات کا مترادف لفظ مترجم

فروشوں کی فہرستوں میں آج تک وہ دونوں ایک ہی عنوان کے تحت جگہ پاتے ہیں فلسفہ کا فریضہ عام طور پر یہ سمجھا گیا تھا کہ وہ مذہب کے حقایق عظمیٰ کو بہ دلائل و براہین ثابت کرے لیکن نئی موجودیت کو نہ یہ دعویٰ ہے کہ وہ انھیں ثابت کرسکتی ہے اور نہ اس پر اصرار کہ انھیں جھٹلا سکتی ہے۔ اس کا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ علوم کے اساسی تصورات کو چھانٹ لے اور مختلف علوم کو باہم ملا کر کائنات کے اس جزو کے متعلق ایک ہمہ گیر اور واحد نظریہ ترتیب دے جس کا علم سائنس کو ہو چکا ہے اور جس کی تحقیق اور کھوج میں اس نے زبردست کامیابی حاصل کی ہے ۔ اسے یہ علم نہیں کہ معلومہ جزو کائنات کے ماوراء کیا ہے اور نہ اس کے پاس کوئی ایسا طلسم ہے جس سے وہ لاعلمی کو علم میں بدل دے۔ وہ عقلی لذات کے قدردانوں کو عقلی لذات بخشتی ہے لیکن بیشتر فلسفوں کی طرح ان میں زعم باطل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اگر وہ خشک اور فنی ہے تو یہ قصور اس کا نہیں کائنات کا ہے جو شاعروں اور صوفیوں کے احساسات کا مطلق پاس نہیں کرتی اور ریاضیات کی بڑی دلدادہ واقع ہوئی ہے۔ یہ امر غالباً افسوس ناک ہے لیکن ایک ماہر ریاضیات اس پر کوئی افسوس محسوس نہیں کرسکتا ؎

مسلمان اور کانگرس

جامعہ کے پچھلے نمبر (اگست) کا مضمون "مسلمان کانگرس، اور مسلم لیگ" غور و توجہ سے پڑھا گیا۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ "ایک مسلمان" نے بھیجا ہے آئندہ پرچوں میں اس موضوع پر اور مضمون بھی شائع کئے جائیں گے، انشاء اللہ (ایڈیٹر)

جامعہ کے پچھلے پرچہ میں "ایک قوم پرست مسلمان" نے کانگرس کے مسلمان حامیوں کا نقطۂ نظر نہایت خوبی اور وضاحت سے پیش کیا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کے ماننے سے انکار نہیں کہ مسلمانوں کا سیاسی انتشار حد سے گذر چکا ہے۔ سر سید کی حکمت عملی کبھی کی پرانی ہوگئی۔ لیگ نوابوں اور "سروں" کی سرپرستی میں گھٹ کر دم توڑ رہی ہے۔ مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی کے خلوص کے ہم لاکھ معترف ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ نوجوان نسلوں کی پریشانیوں اور متوسط اور عام طبقوں کے خیالات کو یہ بزرگ نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اُن کے مطالبات کے ترجمان ہوسکتے ہیں۔ طرابلس، بلقان، جزیرۂ عرب اور خلافت کے ہنگاموں کی یاد بھی اب باقی نہیں رہی۔ نئے زمانے کی سیاسی اور معاشی ضرورتوں نے مسلمانوں کو من حیث القوم ایک ایسی بھنور میں ڈال دیا ہے جس سے باہر نکلنے کی تدبیر ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بزرگوں کے بتائے ہوئے رستے بند ہوچکے تھے۔ ضرورت تھی کہ نئے حالات کے پیش نظر زندگی کی کوئی نئی شاہراہ سوچی جاتی لیکن جنگ عظیم سے پہلے کے اور بعد کے ہنگاموں نے قوم کو اتنا تھکا دیا ہے کہ وہ اس اضمحلال میں دماغ کی قوتوں سے کام لینے کے قابل نہیں رہی۔ جمہور نہ کبھی سرکار پرست تھے اور نہ اُنھوں نے نوابوں اور "سروں" کو کبھی اپنا رہنما بنایا، اُن کی اپنی دنیا ۱۸۵۷ء سے نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے تاریک ہوچکی تھی۔ سر سید نے صرف مسلمانوں کے اعلیٰ متوسط طبقوں کی ٹمٹماتی ہوئی شمع کو بجھنے سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ علی گڑھ تحریک کو عام جمہور اسلام کی خوشنودی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ دراصل خلافت کے ہنگاموں نے زندگی میں پہلی بار مسلمان عوام کو اپنا ہم نوا بنایا۔ اس تحریک کے اثرات کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کو خود اس میں شریک ہونے کا موقعہ ملا، جامعہ کے مضمون نگار حسب

کا طنزیہ انداز میں اس تحریک پر رائے زنی کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اگر سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۱ء میں جزیرۂ عرب اور خلافت کے نام پر مسلمان اُٹھے تو کیا، گاندھی جی کے رام راج' نے ہندوؤں کو اپنی طرف نہ کھینچا تھا۔ سچ یہ ہے کہ سیاسی اور معاشی مقاصد اس وقت نہ ہندوؤں کے سامنے تھے اور نہ مسلمانوں کے دونوں قوموں کو قوتِ صدمے میدان میں لائے۔ عقل کی عنان گیری جذبات کو روک نہ سکی، اگر بقول "قوم پرست مسلمان" ہندو سوراج کا طالب تھا تو کیا مسلمان حالات میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے بے چین نہ تھا آزادی کی تڑپ اس کے دل میں موجود تھی۔ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ آزادی کی جنگ میں وہ برابر کا شریک تھا۔ لیکن جنگ کی ہماہمی کے بعد جب جذبات کی جگہ عقل نے لی تو جامع مسجد دہلی میں آزادی ہند کی دعوت دینے والے ہندو رہنماؤں کو جس نے شدھی کی جنگ میں مصروف پایا جذباتی مسلمان سیاست کی یہ بھول بھلیاں نہ سمجھ سکا اور دل برداشتہ ہو کر جس نیند سے دو برسوں کے بعد جاگا تھا پھر اس میں غرق ہو گیا۔ ہندو کی "آزادی" "رام راج" کے ہم معنی تھی اس لئے وہ سیاسیات کے آثار چڑھاؤ سے متاثر نہ ہوا۔ اور برابر آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن مسلمان "اللہ اکبر" اور "اسلام زندہ باد" کہہ کر ہندوستانی قومیت میں رچ نہ سکتا تھا اسی لئے وہ ٹوڈی اور رجعت پسند کہلایا۔

افسوس تو یہ ہے کہ جس طرح مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی جمہور اسلام کے جذبات سمجھنے سے قاصر ہیں اسی طرح ہمارے کانگرسی مسلمان رہنما بھی عوام سے رابطہ بڑھانے کے اعلان کو کافی سمجھ لیتے ہیں۔ نہ اول الذکر ہماری مشکلات کو جانتے ہیں اور نہ آخر الذکر کو ہمارے احساسات کا خیال ہے۔ ایک نے اگر جزیرۂ عرب اور بقول مضمون نگار "آسمان کی چیزوں کے لئے" ہمیں اکسایا تو یہ جماعت موہوم آزادی کے دل پذیر تخیل کی دیوی کے نام پر، ہماری قربانی مانگتی ہے۔ "قوم پرست مسلمان" کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ

"ان دکانگرسیوں کا کہنا ہے کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے، اس بنیاد پر کسی قسم کی جداگانہ جماعت بندی نہیں کی جا سکتی اور اگر کی جاتی ہے تو وہ محض چند خود غرض اور جاہ پسند لوگوں کے فائدے کے لئے کی جاتی ہے جو مذہب کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کو دھوکا اور فریب دیتے ہیں۔ اس فریب کو جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہتے اور عوام کے

سامنے معاملات کو صحیح روشنی میں پیش کرنا چاہیئے۔ عوام بھوکے اور ننگے ہیں۔ ان میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے لئے یہی مسائل سب سے زیادہ اہم ہیں۔

ہم خود چاہتے ہیں کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہ ہو اور بھوکے ننگے عوام کی مدد سب سے اہم مسئلہ بنایا جائے لیکن رونا تو یہ ہے کہ نظری حیثیت سے گذر کر جب ہم علی دنیا میں آتے ہیں تو بھوکے اور ننگے عوام کی حالت زار پر آنسو بہانے والے عوام کی ہمدردی کو فرقہ وارانہ رنگ دیتے ہیں۔ ممکن ہے یو پی میں مسلمانوں کے ساتھ کانگرس کا وطیرہ منصفانہ ہو لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے بڑے مرکز بنگال، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد ہیں، بنگال کا مسلمان آسمان کی چیزوں کو آج چھوڑنے کے لئے تیار ہے اگر آپ اسے دنیا کی چیزیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ پنجاب کا لوڈی طبقہ غریب کسانوں کا وہاں کی کانگرس سے زیادہ ہمدرد ہے۔ صوبہ سرحد کا ہندو اس وقت تک کانگرس کے ساتھ ہے جب تک کانگرس ہندی گورمکھی سرکلر منسوخ کرنے کو تیار ہے اور اگر سر عبدالقیوم اس سرکلر کو منسوخ کرنے کا ذمہ لے لیں تو ہندو اسی کو آزادی کا پرستار سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان فرقہ پرستی سے بے زار ہیں لیکن اگر وہ اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ صوبے کی کثیر آبادی کو ننگے اور بھوکے رہنے دینا قومیت کے بلند آہنگ دعاوی کے منافی ہے تو اُن کو رجعت پسند اور فرقہ پرست کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے۔

ہمیں پنڈت جواہر لال کے تمام معاشی اور سیاسی اصولوں سے کلی اتفاق ہے۔ ہم ننگے بھوکے عوام کی مدد کو سیاست نہیں بلکہ مذہب کا سب سے اہم فرض سمجھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جواہر لال جی کی یہ تمام نظریہ سازی صرف زیب قرطاس یا رونق محفل سے آگے نہیں بڑھتی۔ کانگرس کی عنانِ اختیار حقیقت میں اس جماعت کے ہاتھ میں ہے جو معاشی انقلاب سے اتنی ہی لرزاں ہے جتنے ہمارے لیگ کے ارباب اقتدار۔ ان حالات میں ہم کس منہ سے مسلمان عوام کو کہیں کہ آؤ کانگرس میں شریک ہو جاؤ۔ کانگرس عوام ہندوستانیوں کی جماعت ہے۔ اور وہ تباہ حال لوگوں کی خدمت اپنا فرض سمجھتی ہے۔

اگر محترم مضمون نگار صاحب ننگے بھوکے مسلمان عوام کو کانگرس کی حسن نیت کا یقین دلانے کی

کوشش کریں تو ان کو معلوم ہوجائے کہ مسلمان عوام کیلئے کانگرسی رہنماؤں کی تقریر یا زبان مسٹر جناح کے دعووں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ مسلمانوں کے پبلک جلسوں میں شریک ہوکر دیکھئے۔ ایک طرف خوش بیان مقرر کی تقریر ہورہی ہے۔ لیکن سامعین کی ایک بڑی جماعت کو آپ یہ سرگوشیاں کرتے سنیں گے کہ "میاں! ان لیڈروں کا کیا بھروسہ"۔ عوام کا اعتماد نہ مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی کو حاصل ہے اور نہ ہمارے کانگرسی رہنماؤں کو، اُن کے نزدیک نہ لیگ کا نظام دل کش ہے اور نہ کانگرس کا عوام سے ربط پیدا کرنے کا اعلان اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نظام ان کی زندگی کے حقائق سے بے گانہ ہیں ایک کو "سردوں" اور نوابوں کی سرپرستی کا فخر ہے تو دوسرے کو نئی قسم کے سرمایہ داروں کی اعانت کا شرف۔

بالفرض اس وقت اگر جنگ آزادی کا ہنگامہ کارزار گرم ہوتا اور کانگرس پردیسی دشمن کے خلاف معرکہ آرا ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس وقت مسلمانوں کو عقل کی دور اندیشیوں سے بے نیاز ہوکر بے دھڑک جنگ کی آگ میں کود پڑنا چاہیئے۔ لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کانگرس کا انقلابی عنصر دستوری جماعت کے مقابلے میں اپنی ہار مان چکا ہے۔ کانگرس کی تحریک کا تمام زور صرف اصلاحی کوششوں تک محدود ہوکر رہ گیا ہے اس وقت مسلمان سے محض جذبات کے نام سے اپیل کرنا دانش مندی سے بعید ہے۔ آزادی کی دیوی واقعی دل کش ہے۔ لیکن خدارا اُسے یہ تو بتائیے کہ اس پرستش کا اُسے کیا صلہ ملے گا۔ ہندو تو گمن ہے ملک اس کا۔ ملک کا جو تمدن ہے۔ جس تمدن کو وہ زندہ کرنا چاہتا ہے وہ اس کا۔ وہ مذہب کو خیرباد کہہ کر بھی ہندو رہے گا لیکن مسلمان کے لئے آزادی کے اس تخیل میں اپنے آپ کو کھپانا مشکل ہے۔

ہماری رائے میں کانگرس کی تحریک خالص قومی تحریک نہیں ہے۔ اس کی پچاس سالہ روایات بالکل ہندوانہ ہیں۔ جن کے اثرات آج بھی کانگرس کی ہر سرگرمی میں خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر "بندے ماترم" کے قومی گیت کو لیجئے اس گیت سے بنگالی مسلمانوں کو چڑ ہے۔ کیونکہ یہ گیت انہیں بنگال کی سیاسی زندگی کے اس دور کو یاد دلاتا ہے جس کا ذکر ہر مسلمان کے لئے سوہان روح ہے۔ دوسری مثال مہاتما جی کی ہے۔ ان کی عظیم المرتبت شخصیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن مہاتما جی کی سرگرمیاں بہت حد تک ہندو قوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کی بنیاد صرف

سیاسی اور معاشی اصولوں پر رکھی جاسکتی ہے یعنی یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ متحدہ قومیت کی ترجمان جماعت کس حد تک مذہبی اثرات سے بالاتر ہو چکی ہے۔ کانگرس کا وجود معجون مرکب بن کر رہ گیا ہے، نام کو تو یہ سیاسی جماعت ہے لیکن اس کا رنگ روپ بالکل مذہبی ہے۔ اور جب تک اس کا یہ چلن رہے گا مسلمان من حیث القوم کبھی اس میں شریک نہیں ہوں گے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک کانگرس کی سال خوردگی خاص اہمیت رکھتی ہو لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ وہ ملک جہاں بدیسی حاکموں کے خلاف آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں اور وہاں کی اقلیتیں اپنے مخصوص تمدن کا قومی شعور رکھتی تھیں۔ ان ملکوں کے قومی رہنما کٹر وطن پرست تھے انھوں نے مختلف فرقوں کو یک جا کرنے کے لئے قومی جماعت کی بنا نئے اصولوں پر رکھی۔ مصر میں جنگ عظیم سے پہلے حزب الوطن کا زور تھا۔ گو کہ یہ آزادی خواہ جماعت تھی لیکن اس کا رنگ ڈھنگ بہت حد تک اسلامی روایات سے متاثر تھا سعد زغلول نے قومی تحریک شروع کی تو اپنی نئی جماعت بنائی جس کی روایات اول تو تھیں ہی نہیں اور اگر تھیں تو خالص قومی۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال نے یہی کیا۔ عراق اور شام میں اسلامی اکثریتوں نے اقلیتوں کو اسی طریق سے اپنا ہم نوا بنایا لیکن ہندوستان کی دنیا ہی نرالی ہے۔ مہاتما جی کی تقریروں تحریروں اور اسکیموں کو لیجئے ان کا ہر لفظ دو ہزار سال پہلے کی زندگی کا آئینہ دار ہے، ان کی تحریک کو سمجھنے کے لئے بدھ مت جینی روایات اور بھگوت گیتا کا مطالعہ ضروری ہو گیا ہے۔ اگر ہمارے قوم پرست مسلمان اپنے ہم مذہب بھائیوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ مسلمان سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے جداگانہ جماعت بندی نہ کریں تو سب سے پہلے ان کا فرض ہے کہ وہ کانگرس کو صحیح معنی میں ایک سیاسی ادارہ بنائیں۔ درحقیقت کانگرس خالص ہندو قومی تحریک کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اگر آپ حضرات کو امپیریلزم کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی خواہش ہے تو کوئی نئی جماعت بنایئے جو ہندو تمدن کی حفاظت کی بجائے ہندوستانیوں کے حقوق کی محافظ ہو۔

نظری مذہب اور خیالی تمدن کی حمایت کے زعم میں ہم سیاسی اور معاشی آزادی کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن جماعتوں کے سامنے کوئی نصب العین رکھتے وقت یہ سوچ لینا چاہئے کہ یہ نصب العین

کہاں تک جمہور کی حسیات اور خیالات کا مظہر ہو سکتا ہی۔ بے شک معیشت زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے لیکن ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ محض معیشت انسانی زندگی کا قبلہ مقصود نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو دھرم کی طرح اسلام کا دائرہ اثر محض فکری دنیا تک محدود ہوتا تو مسلمان کو ہندو تمدن میں گھل مل جانے میں دقت نہ ہوتی لیکن اسلام محض ایک نظری عقیدہ نہیں، خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی تیرہ سو سال کی زندگی میں اسلام نے تمدن معاشرت اور سیاست کے متعلق زندگی کا ایک خاص زاویہ نگاہ بنا لیا ہی اور ہندوستانی مسلمان اس زاویہ نگاہ کا نہایت گہرا شعور بھی رکھتا ہے۔ نیز آپ سیاست اور مذہب کی تفریق کے ہزار اعلان کیجئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر سیاست اجتماعی زندگی کا ایک شعبہ ہے تو مذہب اسلام کو آپ مذہب اور سیاست سے الگ نہیں کر سکتے۔ مذہب کے نام سے ووٹ لینا۔ عوام کو اپنا آلہ کار بنانا اور اس کو ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا اور چیز ہے۔ اور زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر رکھنا دوسری چیز۔ مسلمان کو جب آپ یہ کہیں گے کہ سیاست سے مذہب اور تمدن کو جدا کر دو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ اسے مذہب اور تمدن کو چھوڑنے کو کہہ رہے ہیں، ایک مسلمان کے سامنے جب قرآن کریم، رسول اللہ صلعم، صحابہ کرام اور خلافت راشدہ کا نام لیا جاتا ہے تو اس کی چشم تصور کے روبرو فوراً تمدن اور سیاست کی ایک ملی جلی شکل آ جاتی ہے۔ مذہبی اور تمدنی اداروں کی آزادی اور سیاسی جماعت بندی کی مخالفت کی دعوت دینا اسلامی تعلیمات سے بے خبری کا اعلان کرنا ہی، اگر آپ اسلام کو بحیثیت مذہب اور مسلمانوں کو بلحاظ ایک جداگانہ تمدن رکھنے والی جماعت کے زندہ دیکھنے کے متمنی ہیں تو انھیں سیاسی جماعت بندیوں سے نہ روکئے بے شک جمہور اسلام کافی عرصہ غلط مذہب، خود غرض قیادت اور جاہ پسند امارت کا تختہ مشق بن چکا ہے زمانے کی نئی روش نے اب اسے بے چین کر دیا ہے۔ بڑے بڑے خطاب یافتہ اشخاص سے عوام مسلمانوں کا اندازہ نہ کیجئے۔ بھوک، برہنگی، سامراج کی لوٹ کھسوٹ اور ہمسایہ قوم کی زرطلبی نے اُن کو نئے انقلاب کے لئے تیار کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ننگے بھوکے عوام کو غلط مذہب، خود غرض قیادت اور جاہ پسند امیروں سے نجات دلائی جائے۔ زندگی کی کلی کھلے بغیر نہیں رہ سکتی، بنگال، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کا فلاکت زدہ مسلمان نہ ہندو کی برتری سے خوش رہ سکتا ہی اور نہ سرکار پرست مسلمان زمیں

اس کی اٹھان کو روک سکتے ہیں شمالی ہند کے مسلمان کو آپ زوال آمادہ (DEMORALIZED) نہیں کہہ سکتے۔ اس کے قوائے زندگی اب تک تمدن کے سرطان سے محفوظ رہے ہیں۔ اب اس کو زندہ ہونے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ نوابوں اور "سروں" کا زمانہ اب گیا۔ انقلاب کا دھارا عوام کو بلند و بالا کر کے رہے گا۔

ہم چاہتے ہیں کہ عوام کی بیداری کی عمارت کانگرسی معماروں کے ہاتھ سے نہ بنے۔ ہم مذہب اسلام اور اسلامی تمدن کو دنیا کا مفید ترین عنصر سمجھتے ہیں۔ اور انسانیت نو کی تخلیق میں اس عنصر کا وجود ضروری جانتے ہیں۔ اس وقت کانگرسی نصب العین کو قبول کرنے اور اپنی سیاسی وحدت کو ختم کرنے کے معنی اپنے مذہب، اور تمدن سے ہاتھ دھو لینے کے ہیں۔ اس لئے ہم اپنی ملی زندگی کا نصب العین کانگرس نہیں رکھنا چاہتے۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلمان عوام کی بیداری اُن کی خالص قومی زندگی کے معیاروں پر ہونی چاہیئے، اُن کو "مہاتما گاندھی جی کی جے" اور "بندے ماترم" کے نعروں کی بجائے۔ رسول اللہ صلعم صحابہ کرام اور سلف صالحین کا اُسوۂ حسنہ پیش نظر رکھنا چاہیئے، وہ ضرور بغاوت کریں۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم پر لڑیں۔ زندگی کی سوتوں کو بہنے سے روکنے والی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوں غلط مذہبیت اور خود غرض قیادت کے بتوں کو بے دریغ توڑیں لیکن اُن کی نشوونما میں ہم الفیس ہندو اثرات سے مامون رکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ جمود، توہم پرستی اور عقلی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد فضا میں رہنے کے قابل ہو جائیں تو پھر وقت آئے گا کہ مسلمان اپنی سیاسی جماعت بندی کو چھوڑ کر بھی اپنے تمدن اور مذہب کو محفوظ رکھ سکے گا۔

سادہ لوح اور انجان، چالاک اشخاص کی جماعت میں رہ کر ان کا ذیل ہی بنتا ہے، خدارا مسلمان کو روٹی کے نام سے گمراہ نہ کیجئے۔ ممکن ہے کانگرس میں شامل ہو کر وہ بھوک اور برہنگی کو کچھ کم کر سکے (اگرچہ ہمارے خیال میں یہ بھی ممکن نہیں)، لیکن بحیثیت ایک انسان کے نہ اس کا ذاتی وقار رہے گا، اور نہ اس میں عزت نفس کا جذبہ باقی رہ سکے گا۔

"موسمِ بہار اُن کا"

جلوۂ بہار اُن سے، موسمِ بہار اُن کا
جان منتظر اُن کی، دل امیدوار اُن کا

دم لبوں پہ پھرتی ہے جانِ بیقرار اُن کا
اور کچھ نہیں حسرت، صرف، انتظار اُن کا

تابعِ نظر نکلا رنگِ روزگار اُن کا
خار کو بھی گل کردے حسنِ نوبہار اُن کا

لاکھ حسبِ سابق ہو، یوں ہی انتظار اُن کا
کیا کریں، نہیں جاتا، دل سے اعتبار اُن کا

گو مرے تڑپنے پر، ہنس وہ دیں تجاہل سے
حالِ دل کا رکھتا ہے، رنگ بیقرار اُن کا

وہ نگاہِ عشرت خیز، وہ تبسمِ گل ریز
اک اشارۂ رنگیں، موسمِ بہار اُن کا

اے فلک! جو اُس در سے، خاک ہو کے لپٹے ہیں
قسمتِ رسا اُن کی، بختِ سازگار اُن کا!

وہ رُلائیں یا تڑپائیں، خیر، یہ خوشی اُن کی
ہم ہیں دل کے قابو میں، دل پہ اختیار اُن کا

ایسی سینکڑوں راتیں، کاٹ دی ہیں آنکھوں میں
اور ابھی دکھائے کیا، دیکھیں انتظار اُن کا

گو چھٹے ہوئے اُن سے، مدتیں ہوئیں نشترؔ!
ہے مگر خیال اب تک، دل سے ہمکنار اُن کا

تنقید و تبصرہ

A Monograph on Moslem Calligraphy، کچھ عرصہ ہوا اس نام سے محمد ضیاءالدین صاحب پروفیسر علوم اسلامیہ شانتی نکتن نے اپنی یونیورسٹی کے رسالے میں اسلامی فن خطاطی پر ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا وہ مضامین اب کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب آرٹ پیپر کے ۷۲ صفحوں پر مشتمل ہے، جس میں ۱۶۲ کے قریب فن خطاطی کے شہکاروں کی تصویریں ہیں۔ طباعت نہایت پاکیزہ۔ قیمت چار روپیہ ہے ملنے کا پتہ یہ ہے:-

Visva-Bharati Book Shop,

210, Cornwallis Street, Calcutta.

اسلامی تمدن کے جمالیاتی عنصر کے روشن ترین مظاہر دو ہیں، فن تعمیر اور فن خطاطی۔ اسلامی روایات نے تصویرکشی اور مجسمہ سازی کی حوصلہ افزائی میں ہمیشہ تامل کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے جذبۂ حسن پرستی نے عمارت اور خط کو مقصود فن بنایا۔ ان دو فنوں میں مسلمان کسی پیشرو کے خوشہ چیں نہیں تھے۔ انھوں نے ان میں تمام قوموں سے الگ اپنی راہ نکالی اور اس پر چل کر وہ فنی کمال کے معراج کو پہنچے۔

خطاطی کا جوہر صرف کتابوں اور مرقعوں تک محدود نہیں رہا بلکہ عمارات کے حسن کو دوبالا کرنے میں بھی خطاطی سے مدد لی گئی۔ تاج محل آگرہ، مسجد رفاعی قاہرہ اور الحمرا غرناطہ کو زندہ جاوید بنانے میں خطاطی کا بھی حصہ ہے۔ قرون وسطیٰ میں اسلامی خطاطی نے یورپ کے اہل فن سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اور خطاطی کے بعض طغرے مسیحی کلیساؤں، اور عیسائی حکومتوں کے سکوں کی زینت بنے۔ اس مختصر سی کتاب میں مصنف نے اجمالی طور پر فن خطاطی کی نشوونما اور اس کے ارتقا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ خط کوفی کی ابتدا، اس کی تدریجی ترقی، خط نسخ اور نستعلیق کا معرض وجود میں آنا، اور خطاطی کی مختلف

قسموں کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے اور جا بجا مختلف خطوں کے نمونے بھی دئے ہیں؛

خطاطی پر فنی نقطہ نظر سے بحث کرتے ہوئے آپ نے خطاطوں کو ممالک اسلامیہ میں جو ہر دلعزیزی حاصل تھی اُس کا ذکر کیا ہے اس ضمن میں بغداد، مصر، اسپین اور شام کی لائبریریوں اور نشر و اشاعت کے اداروں کے نظام پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب مذکور کا یہ باب نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، اور اس کا مطالعہ تاریخ اسلام کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

خطاطی کے فنی تجزیہ اور اس کی تدریجی ترقیوں کی تاریخ بیان کرنے میں مصنف ذاتی خوش ذوقی، فنی بصیرت اور علمی تحقیق کا ثبوت دیا ہے۔ اسلوب بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ الغرض موصوف کی یہ کوشش ہر لحاظ سے کامیاب اور قابل تعریف ہے۔ اُمید ہے اسلامی تمدن سے دلچسپی رکھنے والوں میں یہ کتاب بہت مقبول ہوگی۔

م۔س

مبادی سیاسیات جلد اول (مملکت) مولفہ ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے (کینٹ) صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ، ضخامت ۱۹۶، کاغذ معمولی، طباعت و کتابت مناسب، قیمت عہ ملنے کا پتہ :- غلام دستگیر بک ڈپو۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن۔

سیاسیات کی اہمیت سے آج کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ متمدن اور ترقی یافتہ ممالک تو ایک طرف رہے موجودہ زمانے کی کشمکشوں نے معمولی لکھے پڑھے آدمیوں میں بھی سیاسیات کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ آج کرہ زمین کا کون سا خطہ ہے جہاں سیاسی ہنگاموں کی گرم بازاری نے عوام کے کانوں اور دلوں کو اپنی طرف نہیں کھینچا، اور خاص طور پر جنگ عظیم کے بعد سے تو ہمارے ملک کی تمام سرگرمیوں پر سیاسیات کا ہی رنگ چھایا ہوا ہے۔ لیکن سیاسیات سے غیر معمولی شیفتگی کے باوجود ہماری زبان میں علم سیاست کے متعلق کوئی مختصر سی کتاب نہ تھی جس سے اردو جاننے والے مستفید ہو سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصہ سے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں علم سیاسیات بھی نصاب تعلیم میں داخل ہے لیکن درسی کتابیں ایک تو انگریزی میں ہیں جن کی علمی اصطلاحات اُس زبان میں کلی مہارت حاصل کئے بغیر بآسانی سمجھ میں نہیں آسکتیں دوسرے اس قسم کی کتابوں میں ہندوستانیوں کے معیار لیاقت کا

خیال نہیں رکھا گیا۔ مبادی سیاسیات نے اُردو جاننے والوں کے لئے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

کتاب کے گیارہ باب ہیں۔ ہر باب میں مملکت کے مختلف اداروں اور اُس کی خصوصیات کو فرداً فرداً لیا ہے۔ سیاسی نظریات پر بحث کرتے ہوئے مسلمان مفکرین ابن خلدون اور امام غزالی اور ہندو روایات کو بھی سامنے رکھا ہے اور مطالب کی توضیح میں مثالوں سے بھی کام لینے کی کوشش کی ہے بہر حال علم سیاست کے مبادی کو پیش کرنے میں مصنف کی یہ سعی ہر لحاظ سے کامیاب ہے اور اس علم کا مبتدی بھی اس کتاب سے پورا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

مصنف نے عہد حاضر کی جملہ سیاسی تحریکوں پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس سلسلہ میں جرمنی اور اٹلی کی فسطائیت اور روس کی اشتراکیت پر خاص طور پر تنقید کی ہے دوران بحث میں دوسرے ملکوں کے حکومتی اداروں کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ الغرض ہر اخبار بیں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے کیونکہ بین الاقوامی واقعات اور قوموں کی باہمی چپقلشوں کا صحیح اندازہ کرنا سیاسیات کے مبادی کو جانے بغیر مشکل ہے۔

کتاب کی زبان زیادہ مشکل نہیں۔ظاہر ہے کہ اس موضوع کو علمی اصطلاحات کے بغیر بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن موصوف نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اصطلاحات کے اشکال کو تشریح کی مدد سے عام فہم بنایا جائے۔ بعض اصطلاحات کے ترجمہ کے متعلق ہماری چند گذارشات ہیں۔ مصنف نے Discipline کا ترجمہ تادیب کیا ہے، ہمارے خیال میں "نظم" اور "ضبط" سے یہ معنی بہتر ادا ہوتے ہیں اسی طرح Politician کا ترجمہ "سیاس" بھی غیر مانوس ہے، کتابت کی بھی چند غلطیاں ہیں، مثلاً صفحہ ۱۵ پر دہی کو بہی، مملکتوں کو ملکوں لکھا گیا ہے۔ صفحہ ۵ پر زمانہ کو زبان، صفحہ ۵۹ پر رواداری کو رازداری۔ صفحہ ۱۱۴ پر جامہ کو جامعہ لکھا ہے۔ امید ہے دوسری اشاعت میں ان غلطیوں کی تصحیح کر دی جائے گی۔

کتاب کے آخر میں ۱۴ صفحوں پر اصطلاحات کی فہرست ہے۔

م۔س

طب العرب حصہ دوم | یہ کم و بیش ایک سو صفحے کا رسالہ ہے جس میں پروفیسر براؤن مرحوم کے ایک لیکچر کا اُردو ترجمہ ہے۔ موصوف نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں عربی طب کی تاریخ پر چار لیکچر دئے تھے جو بعد میں " طب العرب " کے نام سے کتابی صورت میں چھپے۔ زیر نظر رسالہ پروفیسر براؤن کے دوسرے لیکچر کا ترجمہ ہے۔ پہلا لیکچر گذشتہ جنوری میں اُردو میں منتقل ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ مترجم صاحب ان چاروں لیکچروں کے ترجمہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پروفیسر براؤن کے نام سے مشرقی علوم کا کون طالب علم ہے جو واقف نہیں موصوف کو مشرقی علوم سے محض نہ شغف نہیں بلکہ والہانہ عشق تھا۔ اُن کی تاریخ ادبیات ایران فارسی ادب کی بے مثل تصنیف ہے۔ خوش قسمتی ہے کہ فن طب کے عالم اور لاہور کے مشہور حاذق طبیب حکیم سید نیر واسطی صاحب کو موصوف کی کتاب " طب العرب " کے ترجمہ کا خیال ہوا۔ واسطی صاحب نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جہاں کہیں مصنف کی غلطی پائی ہے طب کی کتابوں کے حوالوں سے اس کی تصحیح کی ہے۔ ترجمہ کی زبان صاف ہے، اور مترجم کے حاشیے اُن کی محققانہ کاوش اور عالمانہ ژرف نگاہی کا پتہ دیتے ہیں۔

ناشر نے رسالہ کے کاغذ میں بخل سے کام لیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ چاروں لیکچروں کا ترجمہ مکمل کر کے اُن کو ذرا اچھے کاغذ پر کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے۔ یہ مضمون اس قابل ہے کہ اس کو مستقل کتاب کی صورت دی جائے۔

رسالہ کی قیمت ۸عہ ہے اور ملنے کا پتہ :- مینیجر رسالہ شمس الاطبا، بھاٹی گیٹ لاہور

م۔س

اسلامی طب | (شاہانہ سرپرستیوں میں) از قاضی معین الدین صاحب رہبر فاروقی، ضخامت ۱۱۰ صفحے کاغذ معمولی۔ کتابت و طباعت عمدہ ملنے کا پتہ :- سن برج ہاؤس، عابد بلڈنگ مصطفےٰ بازار حیدرآباد دکن قیمت ۸عہ

" اسلامی طب " میں مسلمان بادشاہوں کے زیر سایہ طب کے نشوونما پانے اور پروان چڑھنے کو بیان کیا گیا ہے، اسلامی حکومتوں میں طب کو شروع ہی سے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے چنانچہ اسلامی روایتوں میں " علم الادیان " کے بعد " علم الابدان " کا ہی درجہ ہے۔ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت

میں اس فن کو خوب ترقی دی۔ یونان، مصر اور ہندوستان کی طب کو نئی زندگی بخشی۔ شفا خانے بنائے۔ دوا سازی کے فن کو کمال تک پہنچایا۔ معرکۃ الارا کتابیں تصنیف کیں جو عرصہ دراز تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ "اسلامی طب" میں طب کی اس طویل داستان کو نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کی ضخامت، اور مصنف کی محنت کا خیال کرتے ہوئے قیمت کل عہ بہت کم ہے۔

م۔س

ہندوستان کے مسلمان کا نصب العین کیا ہے | یہ ۴۰ صفحے کا چھوٹی تقطیع کا ایک رسالہ ہے جس میں عزیز ہندی صاحب نے مسلمانوں کے نصب العین کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ موصوف زمانہ کے بہت نشیب و فراز دیکھ چکے ہیں۔ افغانستان کے امانی انقلاب، سرزمین پنجاب کی سیاسی شورشوں اور آئے دن کے ہنگاموں، مسلمانانِ ہند کے عام انتشار اور بے مقصدی کے الم ناک واقعات سے متاثر ہو کر عزیز ہندی صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ آپ کا طریق فکر مجتہدانہ ہے مگر افسوس زبان مصنف کے افکار کی صحیح ترجمانی سے قاصر ہے۔ موصوف کی یہ کوشش بہرحال قابل تحسین ہے، یہ رسالہ آن کی زیر تصنیف کتاب کا باب اول ہے۔ قیمت کل ۲۰ر اور ملنے کا پتہ پنجاب اکاڈمی امرتسر ہے۔

م۔س

ندائے حق | شائع کردہ ینگ مینز نیشنل لیگ، ملتان شہر۔ تقطیع $\frac{20\times30}{16}$ ضخامت ۲۴ صفحات۔ کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت ۲ر ملنے کا پتہ:۔ ینگ مینز نیشنل لیگ، قدیر آباد ملتان شہر۔

یہ ایک اصلاحی ٹریکٹ ہے۔ پہلے یہ "پکار" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، زیر نظر نسخہ ٹریکٹ کا دوسرا ایڈیشن ہے جس میں عنوان بدل کر ندائے حق رکھا گیا ہے۔

شروع میں ایک مقدمہ ہے، جس میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے بعد مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی پر تبصرہ ہے، اور آخر میں "ہمیں کیا کرنا چاہیے" کے زیر عنوان چند مشورے دئے گئے ہیں۔

مقدمے میں مقدمہ نگار صاحب نے "مولویوں کے طبقے" سے خاص طور پر بحث کی ہے، اور اپنی تنقیدات کا انھیں کو مرکز بنایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رشد و ہدایت کو کچھ لوگوں نے ذاتی اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بنایا اور اس سے مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی پر اثر پڑا۔ لیکن صاحب مقدمہ نے جس انداز میں اس چیز کو پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے حالات کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ اور حد اعتدال سے بہت بڑھ گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ حالت ان کی سیاسی غلامی کا نتیجہ ہے۔ مولویوں کا طبقہ اس الزام سے بڑی حد تک مبرا ہے۔

اس کے علاوہ مرض کا جو درماں صاحب مقدمہ نے تجویز کیا ہے، ممکن ہے۔ اس سے مرض کم ہونے کے بجائے اور مہلک ہو جائے۔ موصوف نے مذہب کی موجودہ مسخ صورت پر حملہ تو کیا ہے، لیکن یہ نہ فرمایا کہ اس کی اصلی صورت کے احیا کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ اصل چیز مذہب کی اصلاح ہے، اور اس کی طرف سے کنارہ کشی اختیار کر کے جماعتی اصلاح کا مشورہ دینا ریت پر عمارت کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہوگا۔ ب۔ ع

آکسفورڈ | از فضل احمد کریم صاحب فضلی بی۔ لٹ۔ (آکسن) آئی۔ سی۔ ایس۔ تقطیع ۲۰×۲۰ ضخامت ۱۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

فضل احمد کریم صاحب نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے تفریحی مشاغل کو نظم کیا ہے۔ نظم میں ۲۲۶ اشعار ہیں ایک کافی بڑا حصہ اردو شاعری کی تنقید کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ حالانکہ تمہیداً چند اشعار کافی تھے۔ تمہیدی اشعار میں فاضل مصنف نے کسی قدر زیادتی اور غلو سے کام لیا ہے۔

اصل موضوع پر مصنف نے ایک ہلکے طنز کے ساتھ اچھے اور رواں اشعار لکھے ہیں اور مغربی تہذیب کو اس کے اصلی روپ میں پیش کیا ہے۔ جھوٹی محبت جو نفس کی ہوس رانیوں کی تحریک کا نتیجہ ہوتی ہے، مغربی جمالیات کا خاص پہلو ہے، جسے مصنف نے نہایت دلکش پیرائے میں باندھا ہے۔

خاتمے پر دو شعر ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جذبۂ "حب الوطن من الایمان" کی

کسک سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی ہے :-

یہ دریا کہاں یہ کنارے کہاں ❊ یہاں کے سے واں چاند تارے کہاں
نہیں یہ کہ واں چاند تارے نہیں ❊ بہت ہیں پہ "ندیا کنارے" نہیں

اور یہی اس نظم کی جان ہے۔

طنزیات مانپوری | از حضرت مانپوری، متوسط تقطیع، ضخامت ۱۲۰ صفحے، مجلد، کاغذ کتابت وطباعت معمولی۔ ملنے کا پتہ :- ندیم گیا۔ قیمت عہ۔

طنزیات مانپوری کا موضوع ہمارا سماج ہے، قدیم وضع کو مغرب زدہ سوسائٹی میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن کا بیان دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مفید بھی ہے۔ مرحوم اکبر اس صنف ادب کے امام تھے ۔موصوف نے مشرق اور مغرب کے اس تمدنی تصادم کو ایک حکیم اور شاعر کی نظر سے دیکھا، اُن کی شاعری نوحہ تھی سال خوردہ مشرق کی پسپائی کا جو اُسے نوجوان مغرب کے مقابلہ میں ہوئی۔ بیشک اکبر کے زمانہ میں صرف ایک مختصر سی جماعت تھی جو مغرب کی جادوگری کی تاثیر سے اپنے آپ کو بچا سکی تھی لیکن آج ہمارا یہ حال نہیں، مغرب کا دیوالہ نکل چکا ہے، اور اس کی "مرعوبیت" بھی قصہ ماضی بن چکی ہے۔ ضرورت تھی کہ شکست خوردہ مشرق نے اس دس سال کے عرصہ میں جو کروٹ لی ہے اس کو ہمارے ادیب اور اہل قلم موضوع سخن بناتے۔ اس میں شک نہیں کہ عہد ماضی کی مرثیہ گوئی اب" بال جبریل" اور " ضرب کلیم" کی شکل اختیار کر چکی ہے لیکن " اکبری رنگ" کے " اقبال" کا ہنوز انتظار ہے۔

" طنزیات" میں تمدن کی موجودہ کشمکش کو ایک ظاہر بین ادیب کی نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ زبان بہت صاف اور طرز بیان دلچسپ ہے۔ ظرافت میں کہیں کہیں ہلکا پن ہے، شروع میں ۸۰ صفحے کا جو طویل مقدمہ ہے اس کی اہمیت باوجود غور و فکر کرنے کے معلوم نہ ہو سکی۔ بحیثیت مجموعی کتاب اچھی ہے۔

م ۔ س

دکن کی پری | مصنفہ حکیم ناصر نذیر صاحب فراق مرحوم، تقطیع $\frac{22 \times 29}{16}$ ضخامت ۶۰ صفحات قیمت ۶ ۔ ملنے کا پتہ

کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی۔

حکیم ناصر نذیر فراق اُردو کے مشہور انشا پرداز تھے، دہلی کی ٹکسالی زبان میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ روزمرہ اور محاورے کو اس خوبی سے نبھاتے تھے کہ پڑھئے اور مزے لیجئے۔

دکن کی پری ایک تاریخی افسانہ ہے۔ اس کے کردار کا انتخاب مصنف نے دکن کی بہمنی سلطنتوں کے زمانۂ عروج سے کیا ہے۔ افسانے کی ہیروئن ایک غریب سنار کی لڑکی ہے جو حُسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ بیجاپور کا راجکمار اُسے اپنی ہوس پرستیوں کا مرکز بنانا چاہتا تھا، مگر ایک بزرگ کی عنایات سے وہ بچ جاتی ہے، اور آخر میں شاہی حرم میں آتی ہے جہاں اس کے والدین اور خود اس کی رضا سے اس کا عقد ولیعہد سلطنت سے ہو جاتا ہے۔ افسانہ پلاٹ کے لحاظ سے کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اور نہ اس سے پڑھنے والے پر کوئی خاص اثر ہوتا ہے۔ مگر زبان کے اعتبار سے اسے اور دوسرے افسانوں پر فوقیت ہے۔ م۔س

کتابت و طباعت بھی اچھی ہے، سرورق سہ رنگی بلاک کا ہے۔ اور کتاب کی معنوی حیثیت کے مناسب ہے۔

قلعہ معلی کی جھلکیاں | از عرش صاحب تیموری۔ ناشر مکتبہ جہاں نما جامع مسجد دہلی، قیمت ۸ر ضخامت ۷۲ صفحے۔

مرزا احمد سلیم شاہ صاحب عرش خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں سے ہیں۔ موصوف نے اپنے بزرگوں سے قلعہ معلی کے دور اقبال کی جو باتیں سنی تھیں ان کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ مصنف نے شاہی خاندان کے آداب اور شہزادوں کے طریق بود و باش کو نہایت اختصار سے لکھا ہے، یہ موضوع جتنا تفصیل طلب اور دلچسپ تھا، عرش صاحب نے اس کے بیان میں اسی قدر اختصار اور بخل سے کام لیا ہے۔ اُمید ہے موصوف قلعہ معلی کی عبرت خیز داستان کو کبھی زیادہ تفصیل سے لکھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔

ذخیرہ ثواب اُخروی | از مولنا محمد مشتاق صاحب ناشر کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی۔

اس رسالہ میں "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ" کی عربی تفسیر اور اس کا ترجمہ درج ہے۔

کلید قرأت | از مولنا خلیل احمد صاحب

علم قرأت کی یہ ابتدائی کتاب ہے جس میں مصنف نے نہایت آسان اور عام فہم الفاظ میں عربی حروف کے مخرج بتائے ہیں، قرآن کریم کی تلاوت کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے، بچوں کو تو یہ کتاب ضرور پڑھانا چاہیئے۔ قیمت درج نہیں۔ اور ملنے کا پتہ:۔ ناظر بک ایجنسی لکھنؤ ہے۔ م۔س

بقیہ کتب و رسائل پر آئندہ پرچے میں تبصرہ کیا جائے گا۔

رفتارِ عالم

شمالی افریقہ اسپین کی خانہ جنگی اور مسولینی کی سامراجی چالوں نے شمالی افریقہ کے حاکموں اور محکوموں دونوں میں بڑی بے چینی پیدا کر دی ہے یوں تو افریقی عرب برسوں سے فرانس کی غلامی کے جوئے کو اٹھائے رہا اور جنگ عظیم میں اس نے فرانس کی خاطر اپنے بھائیوں کو قتل کرنے سے گریز نہ کیا لیکن ۱۹۱۸ء کے بعد ترکی، شام، عراق اور مصر سے بیداری کی جو لہر اٹھی وہ بحرِ ظلمات تک بڑھتی چلی گئی، چنانچہ الجزائر میں بے اطمینانی پھیلی، ٹیونس کے عرب رہنما جلاوطن کئے گئے، مراکش میں خون کی ندیاں بہیں اور ریف میں غازی عبدالکریم نے آزادی کا جھنڈا بلند کیا۔ سامراجی حکومتیں محکوموں کی اٹھتی ہوئی قوتوں کو دبانے میں مصروف تھیں کہ اسپین میں جنگ شروع ہوگئی اور جنرل فرانکو نے عربوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا، ادھر مسولینی نے برطانوی اور فرانسیسی سلطنتوں کا زور توڑنے کے لئے عربوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کی حکمت عملی اختیار کی، چنانچہ طرابلس کے عربوں کو یقین دلایا گیا کہ اطالیہ عربوں میں مسیحی تبلیغ کی اجازت نہیں دے گا نیز حبش کی مسلمان آبادی کو مراعات دی گئیں، اور اہل فلسطین کی جنگ آزادی سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا، مسولینی کی اس سیاست سے برطانیہ اور فرانس بدکے، برطانیہ نے مصر کو معاہدہ پر راضی کر لیا، اور فلسطینی عربوں سے صلح د صفائی کی طرح ڈالی، فرانس نے ایک طرف تو شام اور لبنان کو خوش کیا اور دوسری طرف افریقہ کے عربوں کی شکایات کو "دور کرنے کی تگ و دو شروع کی"، الجزائر اور مراکش کے عربوں اور فرانس کی موجودہ کشمکش کا ذکر ذرا تفصیل سے سنئے۔

الجزائر فرانس کو اس ملک پر قبضہ کئے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے، اس طویل مدت میں فرانس کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ اہل جزائر کو اپنی زبان، مذہب، تمدن اور قومیت سے بیگانہ کر کے انہیں حقیقی معنوں میں ہمیشہ کے لئے فرانس کا غلام بنا دیا جائے، اس ناپاک

تجویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے عربی زبان کی ترویج و تدریس پر پابندیاں عائد کی گئیں، اصلاح پسند علمار کو دبایا گیا اور توہم پرست صوفیوں اور پیروں کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ "روشن خیال" نوجوان اپنے مسخ شدہ مذہب سے نفرت کرنے لگ جائیں اور نئی نسلیں مذہب سے عاری اور فرانسیسی تمدن کی شائق بن کر نکلیں - جزائری عربوں کی قومیت کو ختم کرنے کے لئے یہ چال چلی کہ جو جزائری اپنی قومیت چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کرے اُس کے ساتھ خاص رعائتیں کی جائیں، اور اس کو اپنے حکمراں فرانسیسی کا درجہ دیا جائے فرانسیسی قومیت اختیار کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ نکاح، طلاق، وراثت اور شخصی قوانین میں شریعت کی بجائے فرانسیسی قانون کا پابند ہو جاتا ہے، حکومت چاہتی ہے کہ اس طرح سے جزائریوں کو فرانسیسی بنا کر اس ملک سے عربی زبان، اسلامی تمدن، اور عربی قومیت کو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔

اہل جزائر کو فرانسیسی بنانے کی مہم کو سر کرنے کے لئے حکومت عیسائی مشنریوں کو استعمال کر رہی ہے، سرکاری خزانے سے ان کو مدرسے کھولنے اور شفا خانے قائم کرنے کے لئے رقمیں ملتی ہیں۔ حالت یہ ہے کہ ایک طرف تو عربی زبان کی تعلیم اور اسلام کی تبلیغ کو روکا جاتا ہے اور دوسری طرف مسیحی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

جزائریوں کو اپنی زبان، مذہب، تمدن اور قومیت کھو کر اگر تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی مل جاتی تو شاید آج الجزائر میں بے اطمینانی اتنی نازک صورت اختیار نہ کرتی فرانس نے عربوں کو صرف اپنی زبان، تمدن اور مذہب سے محروم نہیں کیا، بلکہ اُس نے ساحل کی زرخیز زمینیں اصلی باشندوں سے چھین کر فرانسیسی آباد کاروں کو دے دیں تجارت، صنعت و حرفت اور دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع پر بدیسی قابض کر دئے، جزائری مزدور بن کر رہ گیا لیکن مزدوری میں خون پسینہ ایک کر کے بھی اس کے لئے آرام کی زندگی حرام ہو گئی۔ حکومت نے "جاہل، کندہ ناتراش اور مفلس عوام" پر قانون کی خاص لاٹھی مسلط کی اور متمدن آباد کاروں کے لئے دوسرے قوانین بنائے، فرانس کی یہ حکمت عملی آخر رنگ لا کر رہی، اہل جزائر کی بے چینی کا نقشہ

فرانسیسی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے جو الجزائر کے تحقیقاتی کمیشن کا رکن تھا ان الفاظ میں کھینچا ہے ۔

" الجزائر کا سب سے بڑا مسئلہ بھوک کا ہے ، موسم گرما میں تو جزائری موت کا مقابلہ کر لیتے ہیں لیکن سردی میں ہزاروں کو بھوک اور ٹھنڈ کی شدت ہمیشہ کی نیند سلا دیتی ہے ، پچھلے سال بدقسمت رعایا کو فاقہ کی موت سے بچانے کے لئے حکومت نے بڑے جتن کئے ، پچاس کروڑ فرانک سے زیادہ تو نقد رقم تقسیم کی گئی ۔ اس کے علاوہ منوں گندم باجرہ اور چاول کی رسد بانٹی گئی ، اس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگ کام پر فاقہ کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اکثر تعداد تو ان کی ہے جو کام مانگتے ہیں لیکن ان کو کام نہیں ملتا ۔"

آگے چل کر رکن مذکور عرب محلوں کی بے کسی اور بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

" ہم نے بہت سے ایسے شہر دیکھے جہاں سینکڑوں ہزاروں اشخاص اس طرح رہتے ہیں کہ بدن پر چیتھڑے ، چہرے پژمردہ ، ہڈیوں پر گوشت کا نام نہیں ، مکانات خستہ ، ان کی بدحالی کا یہ عالم ہے کہ جب تک انسان ان کو آنکھوں سے دیکھ نہ لے کبھی باور نہ کرے ، دیکھنے کو تو بڑے بڑے شہر ہیں لیکن مکانات سب کے سب ٹین اور تختوں کے جو غلاظت اور تعفن کے مرکز ہیں ، اس گندگی میں ننگے بھوکے بچوں کے غول کے غول پلتے ہیں ، جب صفائی کی یہ حالت ہو تو الجزائر جیسی اچھی آب و ہوا میں ہزاروں بچوں کا اندھا اور دق میں مبتلا ہونا کوئی تعجب کی بات ہے ؟ "

فرانس کی صد سالہ حکومت کی یہ برکات ہیں جو اہل جزائر کو دنیا کی سب سے بلند دعویٰ کرنے والی جمہوریت سے ملی ہیں ، حیرت تو یہ ہے کہ جزائریوں کی بدحالی کا اعتراف کرنے کے بعد رکن مذکور ان کی شورش اور بے چینی کا ذمہ دار چند شوریدہ سر اور فتنہ پسند لیڈروں کو ہی گردانتا ہے ، فرانسیسی آباد کاروں کی محنت نے الجزائر کی ساحلی زمینوں کو واقعی بہشت بنا دیا لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ بہشت بنانے والے جزائری کاشتکار کے لئے اس میں جگہ ہے یا نہیں ، گو اہل جزائر نے اب تک صبر سے کام لیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تباہ حالی نے انھیں احتیاجات کی بجائے اب گولیوں

سے کام لینے پر آمادہ کر دیا ہے، رکن مذکور لکھتا ہے کہ " اوران " کے ضلع میں شورشوں اور بلوؤں کا زور ہے، جلسوں میں پستولوں اور طمنچوں کا علی الاعلان مظاہرہ ہوتا ہے، ایک اور مقام پر تحقیقاتی وفد کے جانے سے کچھ دیر پہلے موٹروں کے جلوس میں اسلحہ کی نمائش کر کے اہل جلوس نے اپنے مطالبات کے حق بجانب ہونے کا نمایاں طور پر اعلان کیا؛

اہل جزائر فرانس کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے بھی مخالف ہیں، اگر فرانسیسی آباد کار ہر وقت عربوں کے حملوں سے پریشان رہتے ہیں تو یہودی تاجر بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی دکانوں پر بیٹھتے ہیں، اہل جزائر کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ان کی تمام مصیبتوں کا سبب فرانس ہے اور ان کے ہم وطن یہودی اس کے حلیف ہیں۔

فرانس نے اہل ملک کی بے چینی کو دور کرنے کے لئے عربوں کو جزائر کی اسمبلی میں ابھی ابھی اپنے نمائندے بھیجنے کا حق دیا ہے لیکن مرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ بقول رکن موصوف ان تدبیروں سے اس کا علاج ممکن نہیں، عوام روٹی چاہتے ہیں، اور زمانہ ہوتا تو حکومت روٹی کی بجائے گولہ اور بارود برساتی لیکن اب وقت بدل گیا، فرانس اہل جزائر کو کچل کر خود اپنی جان سلامت نہیں رکھ سکتا، آزادی اور غلامی کی اس کشمکش میں بظاہر تو آزادی کی جیت یقینی نظر آتی ہے۔

سلسلہ بیان میں ایک بات رہ گئی، فرانس نے پچھلے سالوں میں عرب قومیت کو ختم کرنے کی یہ تدبیر کی کہ اہل جزائر کو یہ طمع دیدی کہ اگر وہ عرب قومیت کی بجائے فرانسیسی قومیت اختیار کرلیں تو انھیں حکمرانوں کے حقوق دئے جائیں گے، ایک طبقہ نے اس پیشکش کو قبول کر لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ قوم نے ان کا بائیکاٹ کر دیا، ان کے مُردوں کو اپنے قبرستانوں میں دفن ہونے سے روکا اس پہ حکومت نے اپنے وفاداروں کا ساتھ دیا۔ نوبت کشت وخون تک پہنچی، الغرض اہل جزائر کی سخت مخالفت کی وجہ سے یہ تحریک تقریباً مردہ ہو چکی ہے اور اب تک بیس پچیس ہزار جزائری جو فرانسیسی قومیت میں داخل ہو چکے ہیں ان کی جان بھی عذاب میں ہے۔

مراکش | سنہ ۱۹۰۴ء میں فرانس اور برطانیہ کے درمیان مراکش کے متعلق ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی

رُو سے اول الذکر کو مراکش میں اپنی سیادت قائم کرنے کا حق دیا گیا، فرانس نے سلطنت کے نظم ونسق کو تو اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن "امیرالمومنین، خلیفۃ المسلمین" یعنی سلطان مراکش کی ذات گرامی کو باقی رکھا، دوسرے لفظوں میں حکم اور اختیار تو فرانسیسی ہائی کمشنر کو دیا گیا اور نام سلطان کا رہا، الجزائر کی طرح مراکش میں بھی اہل ملک جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، شروع میں جلوسوں اور اجتماعات تک معاملہ رہا لیکن فرانسیسیوں کی سختی سے تحریک آزادی روز بروز زیادہ قوت پکڑتی گئی اور باتوں اور تقریروں سے نوبت بلوؤں اور خونریز معرکوں تک پہنچ گئی، فرانس نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے اہل مراکش کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔

مراکش میں دو نسلوں کے مسلمان آباد ہیں۔ ایک تو عرب ہیں جو زیادہ تر ساحلی علاقوں میں اقامت گزیں ہیں اور دوسرے بربر ہیں جو اندرون ملک اور پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ عرب بیشتر تعلیم یافتہ ہیں، عربی ان کی مادری زبان ہے۔ لیکن بربر عربی زبان سے ایک حد تک بے گانہ اور اسلامی تمدن سے بہت کم متاثر ہیں، فرانس نے بربروں کو عربوں کے خلاف اکسایا اور انھیں عربی زبان، عربی تمدن اور اسلامی قومیت سے قطعی طور پر الگ کرنے کے لئے بربری قومیت کا خیال پیدا کیا۔ بربروں کی آبادی میں عربی زبان کی درسگاہیں بند کر دی گئیں، مسلمان واعظوں اور مدرسوں کو بربروں تک پہنچنے سے روک دیا گیا۔ اب تک بربر اسلامی قانون کے تابع تھے۔ فرانس نے شرعی عدالتیں منسوخ کر کے ان کی جگہ فرانسیسی قانون نافذ کیا، ان سلبی کوششوں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی مشنریوں کو بربروں پر ریل دیا گیا۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں بربری آبادیوں میں پھیل گئے ہیں اور مدرسے اور شفاخانے بنا کر بربروں کو اپنے حلقہ اثر میں کر رہے ہیں۔

فرانس کے اس اقدام سے مراکش میں بڑی بے اطمینانی پھیل چکی ہے، نہ صرف یہ کہ عرب اس قانون کے خلاف ہیں بلکہ بربر بھی فرانس کے ان الطاف کو استحسان کی نظروں سے نہیں دیکھتے، کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ کسی نہ کسی شہر میں ہنگامہ نہ ہوتا ہو، فرانس بُری طرح رعیت کو دبا رہا ہے

لیکن بے چینی کم ہونے کی بجائے برابر بڑھ رہی ہے، مراکش کی اس صورت حال نے اسپین کی خانہ جنگی کی وجہ سے اور بھی نازک حالت اختیار کر لی ہے مراکشی عرب دیکھتے ہیں کہ ان کے پڑوسی فرانکو کی فوج میں بھرتی ہو رہے ہیں، اسپین کے ماتحت علاقہ میں جرمنوں نے باقاعدہ فوجی مدرسے کھول رکھے ہیں جہاں عربوں کو فوجی تعلیم دی جا رہی ہے، پچھلے دنوں یہ خبر ملی تھی کہ بہت سے مراکشی سرحد عبور کر کے اسپینی علاقہ میں جا رہے ہیں۔ ان حالات نے فرانس کو بہت پریشان کر دیا ہے، اب کوشش ہو رہی ہے کہ مراکشیوں کو دم دلاسا دے کر خوش کیا جائے اور فرانکو اور ہٹلر کے اثر سے ان کو مامون کر دیا جائے۔ عربی جرائد "الجزائر" اور "شہاب" سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی افریقہ میں ہٹلر کو خاص طور پر ہردلعزیزی حاصل ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عرب یہودیوں سے تنگ ہیں اور ہٹلر کی یہود دشمنی ان کے دل کو لگتی ہے، دوسرے فرانس کے بیر نے ان کو اس کے دشمنوں کا دوست بنا دیا ہے۔

عراق | ایک سال ہونے کو آیا کہ عراق کے فوجی افسروں نے کابینہ کے ارکان کو توپ و تفنگ کی زود اثر منطق سے قائل کر کے استعفے دے دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے عراق کی سیاسی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، عہد فیصلی کے پرانے گھاگ سیاسیین یا تو گولی کا نشانہ بنے یا انھوں نے عراق سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ ہاشمی پاشا جو عراق کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور شاہ فیصل کے عہد حکومت میں اس کا شمار انگریز دشمن اور انتہا پسند سیاست دانوں میں ہوتا تھا، غدار وطن قرار دیا گیا اور بیچارے کی بے کسی کی شرم خدا نے دیار غیر میں وطن سے دور موت دے کر رکھ لی، موت کے بعد نئی حکومت نے مرحوم کے لاشے کو وطن میں جگہ دینے سے انکار کر دیا، عسکری پاشا جیسا جہاں دیدہ سیاستداں ایک فوجی کے ہاتھوں قتل ہوا، نوری پاشا جو شاہ فیصل کا دست راست اور برطانی عراقی معاہدہ کا بطل تھا روپوش ہو کر موت سے بچ سکا۔ پرانے زمانے کے بااثر سیاسیین نوجوان عنصر کی جرأت سے دم بخود ہو کر بیٹھ گئے اور کسی کو مخالفت کی ہمت نہ ہوئی۔

اس فوجی انقلاب کا ہیرو کرنل باقر صدقی تھا، وزارت کا قلمدان سلیمان حکمت کو دیا گیا۔

اس نوآموز نوجوان نے تدبیر مملکت میں غیر معمولی لیاقت کا ثبوت دیا چنانچہ انقلابی وزارت کے حسن انتظام کی داد برطانی اخبار "ٹائمز" تک نے دی، بظاہر عراق کی فضا سکون بخش معلوم ہوتی تھی اور خیال کیا جاتا تھا کہ یہ نوجوان حکومت کی کشتی کو کھینے میں مشاق نا خدا ثابت ہوں گے لیکن اچانک "رائٹر" کی اطلاع ملی کہ کرنل با قرصدقی کو موصل کے ہوائی اسٹیشن پر کسی سپاہی نے قتل کر دیا۔ دوسرے تیسرے دن خبر آئی کہ سلیمان حکمت نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا، اور نئی وزارت مرتب ہو گئی۔

تفصیلات کا ہنوز انتظار ہے امید ہے آئندہ پرچہ میں اس پر مفصل بحث ہو سکے گی،

مصر | مصر کے نوجوان تاجدار ملک فاروق کی رسم تاج پوشی ۲۹ر جولائی کو مصری پارلیمنٹ میں ادا کی گئی، اس تقریب میں مصری حکومت سے زیادہ مصری رعایا نے خلوص اور جوش عقیدت کا مظاہرہ کیا، شیخ الازہر مصطفےٰ مراغی چاہتے تھے کہ تاج پوشی کی تقریب کو مذہبی مراسم کے ساتھ منایا جائے لیکن وفد پارٹی کے صدر موجودہ وزیر اعظم نے یہ کہکر ٹال دیا کہ شاہ فاروق صرف مصری مسلمانوں کے بادشاہ نہیں بلکہ عیسائی بھی ان کی رعایا میں سے ہیں، بہر حال شیخ الازہر نے یہ کیا کہ تاج پوشی کے دن عشار کی نماز شاہ فاروق کو جامع ازہر میں پڑھائی اور ایک سادہ سی تقریب کے بعد قرآن کریم اور بخاری شریف کا ایک ایک نسخہ شاہ موصوف کی خدمت میں پیش کیا۔

مصری اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ وفد بادشاہ کی ہر دلعزیزی سے زیادہ خوش نہیں فواد مرحوم کے زمانہ میں قصر شاہی اور "بیت الامہ" یعنی صدر دفتر وفد پارٹی میں برابر تصادم رہا۔ اب وفد کو خطرہ ہے کہ ان کے مخالفین شاہ فاروق کی ہر دلعزیزی کی آڑ میں وفد کو گرانے کی کوشش نہ کریں۔ وفد سے اب مذہبی طبقے عام طور پر خوش نہیں ہیں۔ نحاس پاشا اور اُن کے ساتھیوں کی قبطیت پرستی سے بعض جماعتیں پہلے بھی نالاں تھیں لیکن اب مسلمان عوام کے کان بھی زغلول کی بعض حرکات سے کھڑے ہو رہے ہیں، شاہ فاروق نوجوان ہیں، اُن کے والد تو زمانہ کے بہت سے رنگ دیکھ چکے تھے، اس لئے دھڑا بندیوں اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے

ڈاکٹر اپنا کام نکالنا خوب جانتے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ ہر موقعہ پر برطانی ریذیڈنٹ کا مشورہ اُن کے شامل حال رہتا تھا۔ لیکن اب حالت بالکل بدل گئی ہے، انگریزی دخل ختم ہو گیا، وفد والے برسر اقتدار آ گئے، اور بادشاہ ناتجربہ کار ہے، اگر قصر شاہی اور وفد میں صلح و صفائی سے کام چلتا گیا تو خیر ہے ورنہ بادشاہت اور جمہور میں ٹکر ناگزیر ہو جائے گی۔

مصری اخبار "المصور" لکھتا ہے کہ حکومت کو اپنی حلیف سلطنت سے ہدایت ملی ہے کہ جنگی تیاریوں کی رفتار کو تیز کر دیا جائے، مصر کی طرابلس کی سرحد کو خاص طور پر محفوظ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہوائی جہازوں اور مشین گنوں کی دھڑا دھڑ فرمائشیں انگلستان پہنچ رہی ہیں، بازاری گپوں کا لذیذ ترین موضوع آئندہ جنگ بن گیا ہے۔" م۔ ۱۹۳۶ء

ترکی | ترکی حکومت نے حال میں اوقاف کے متعلق ایک قانون پاس کیا ہے، جس کی رُو سے اب تمام اوقاف متولیوں کے زیر انتظام رہیں گے، البتہ یہ متولی وزارت اوقاف کو جواب دہ ہوں گے، اور متولیوں کو ملکی ضروریات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ اس ضمن میں مناسب ہے کہ ہم اوقاف کے پچھلے انتظامات پر ایک سرسری نظر ڈال لیں۔

سلاطین ترکی کے زمانہ میں تین طرح کے اوقاف تھے، ایک وہ جو کلیتہً متولیوں کے ہاتھ میں تھے اور سلطنت کی ان پر کوئی نگرانی نہیں تھی، دوسرے وہ جن کا انتظام تو متولی ہی کرتے تھے لیکن وزارت اوقاف ان کی نگراں تھی، اور تیسرے وہ جن کا اہتمام براہ راست وزارت کے سپرد تھا، جمہوریہ ترکیہ نے پہلی قسم کے اوقاف تو بالکل ختم کر دئے تھے، یعنی تمام اوقاف وزارت کے ہاتھ میں دے دئے تھے۔ اس وقت تک کوئی ۷ ہزار اوقاف وزارت کے اہتمام میں تھے، جن کی ۵ فی صدی آمدنی وزارت کے دفتری اخراجات پر صرف ہوتی رہی ہے۔

وزارت کی طرف سے ایک جنرل ڈائرکٹر تمام اوقاف کا ذمہ دار تھا اور اس کا تعلق براہ راست وزیر اعظم سے تھا، جنرل ڈائرکٹر کے ماتحت متعدد ڈائرکٹر تھے، جو ملک کے تمام اوقاف کی دیکھ بھال کرتے تھے، باوجود اس کے کہ اوقاف کی جائدادوں کا ایک بڑا حصہ ملک کے داخلی محکموں، تعلیم او،

میونسپلٹیوں کو دیدیا گیا ہے مگر پھر بھی ان کی آمدنی نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے، ملک کی تمام مسجدوں کے علاوہ کئی ہزار عمارتیں تین لاکھ ایکڑ جنگلات، تین لاکھ ساٹھ ہزار زیتون کے درخت، دس میدان، شاہ بلوط کے درختوں کے ۱۲ باغات، دو سو سے زیادہ سبزیوں کے باغ، چار ہزار کے قریب میدان، کانیں اور تقریباً دس ہزار جائدادیں اس وقت وزارت کے پاس ہیں۔

شروع میں تمام اوقاف اپنے متولیوں کے زیر انتظام تھے، اس کے بعد کچھ کو وزارت اوقاف نے اپنی نگرانی میں لے لیا اور بعض جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بالواسطہ وزارت کی نگرانی میں رہے یعنی انتظام متولیوں کا تھا اور نگرانی وزارت کی۔ غیر مسلم اقلیتوں کی جائدادیں بھی اوقاف میں شمار ہوتی تھیں لیکن ان کا اہتمام منتخب کمیٹیوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا، جن کا انتخاب اقلیتیں الگ الگ کرتی تھیں۔

اقتصادی اعتبار سے ۱۹۳۶ء ترکی کے لئے بہت مبارک سال رہا۔ فصلیں بہت اچھی ہوئیں، مقدار بھی زیادہ رہی اور پھر قیمت بھی زیادہ اٹھی، بہت سے پیداواروں کا نفع بالخصوص گیہوں اور تمباکو کا، ۱۹۳۵ء کی نسبت بہت زیادہ رہا۔ اور یہی نہیں کہ زراعت غیر معمولی طور پر اچھی ہوئی بلکہ معدنیات نے بھی بہت ترقی کی، یہی وجہ ہے کہ ترکی حکومت نے اب "معدنیات" کو "قومی" بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے، یعنی اب غیر ملکی کمپنیوں کو اس کا اجارہ نہیں دیا جائے گا اور ملک میں انفرادی تاجر بھی ان سے نفع طلبی نہیں کر سکیں گے۔

اس سال ۴۵۰ کیلو میٹر ریل کی لائن تیار کی گئی، اس وقت ترکی کے قبضہ میں ۶ ہزار ۲ سو بیاسی کیلو میٹر ریلوے لائن ہے، حکومت نے طے کیا ہے ۱۹۳۷ء کے لئے عثمان بینک سے ۵ فیصدی سود پر روپیہ قرض لے لیا جائے۔

ترکی تجارت کی خوشحالی کا اندازہ کرنے میں ذیل کے نقشہ سے مدد ملے گی۔

غیر ملکی تجارت	برآمد	۱۱۷،۷۳۳،۰۰۰	ترکی پونڈ	۱۹۳۶ء
	"	۹۵،۸۶۱،۰۰۰	"	۱۹۳۵ء
	درآمد	۹۲،۵۳۱،۰۰۰	"	۱۹۳۶ء
	"	۸۸،۸۲۴،۰۰۰	"	۱۹۳۵ء

فاضل برآمد	۲۵،۲۰۲،۰۰۰	ترکی پونڈ	۱۹۳۶ء
"	۷،۰۳۸،۰۰۰	"	۱۹۳۵ء

اس نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی کی برآمد بڑھ رہی ہے اور درآمد کو حکومت کم سے کم کر رہی ہے، صرف دو سال کے اندر اندر درآمد کے مقابلہ میں برآمد کا یہ اضافہ حیرت انگیز ہے۔

مالیات عامہ کی حالت اس سال بھی نہایت اطمینان بخش رہی حکومت نے اس سال کوئی نیا محصول عاید نہیں کیا، اور نہ کسی ضروری مد کا روپیہ کم کیا اس کے باوجود ۳۶-۱۹۳۵ء کے میزانیہ میں ایک بہت بڑی رقم فاضل رہی:

ترکی حکومت اپنی آبادی میں اضافہ کے لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت معلوم ہوتی ہے، اس وقت یورپ میں عام طور پر شرح پیدائش کم ہو رہی ہے لیکن ترکی میں شرح پیدائش (روس کے بعد) سب سے زیادہ ہے، ۱۹۲۷ء میں شرح ۲ر۱۴ فی ہزار تھی اور ۱۹۳۵ میں ۲ر۱۶ فی ہزار۔

ایران | اس سال کا میزانیہ کئی مہینے ہوئے پارلیمنٹ پاس کر چکی ہے، اس میں گذشتہ سال کی نسبت دو سو پچاس ملین ریال اضافہ ہوا ہے جو پونڈ کے حساب سے تین ملین سے کچھ زیادہ (اکتیس لاکھ ۶۵ ہزار پونڈ) ہوتے ہیں۔ کل میزانیہ ۱۲۵۰ ملین ریال یعنی ایک کروڑ چھپن لاکھ بیس ہزار پونڈ کے قریب ہے، (انگریزی ایرانی تیل کمپنی کی سالانہ رقم جو دو ملین پونڈ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اس میں شامل نہیں ہے) ریلوے اور فوج کے شعبوں کے لئے اس دفعہ بھی بھاری بھاری رقمیں رکھی گئی ہیں۔ ایران کی کل فوج اس وقت ۹۲ ہزار ہے، جس میں ۱۲ ہزار محفوظ فوج ہے۔

انگریزی ایرانی تیل کمپنی، حکومت ایران کو جو سالانہ رقم ادا کرتی ہے، اس کو حکومت کے سالانہ میزانیہ میں شامل نہیں کیا جاتا بلکہ محفوظ میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور دوران سال میں جس مد میں کمی پڑتی ہے یا کسی نئے خرچ کے لئے اس رقم میں سے روپیہ لیا جاتا ہے اس سال اس محفوظ رقم میں سے ۲ ملین پونڈ جنگ کی مد میں خرید دیا گیا (بجٹ میں ۲۵ ملین پونڈ منظور ہوئے تھے یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ کل آمدنی کا ½ ہے) اور ۶ لاکھ ریل میں صرف کئے گئے اور ۸ لاکھ شکر فیکٹری میں لگایا گیا۔

آمدنی کی سب سے بڑی مد تو اجارہ ہے جس سے ہر سال کم از کم ۴ملین تومان مل جاتے ہیں، اس کے علاوہ ۱۲ملین کسٹم سے وصول ہوتا ہے اور ۱۸لاکھ ٹیکس ست (۹ لاکھ بالواسطہ ٹیکس اور ۹لاکھ بلا واسطہ) اس کے علاوہ جرمانہ بھی آمدنی کی ایک معقول مد ہے یعنی ۱۲لاکھ تومان (تقریباً ۲لاکھ پونڈ) کا سرکاری خزانہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲۵ر فروری ۱۹۳۱ء ایک قانون کے ذریعہ تمام غیر ملکی تجارت حکومت ایران کا اجارہ قرار دی گئی ہے۔ مذکورہ بالا ۴ملین تومان (تقریباً ۵۶ لاکھ روپے) ان ہی اجاروں سے ملتے ہیں۔

پچھلے دنوں شاہ ایران نے ترستان سے خلیج ہند تک دورہ کیا۔ اس دورہ میں ملک کی زرعی، صنعتی اور حرفتی حالات کا بغور مطالعہ فرمایا۔ ایران کی صنعت جس نے پچھلے دس سال میں ترقی کی بہت سی منزلیں یکایک طے کر ڈالیں روز بروز بڑھ رہی ہے، ریشم، چمڑا، شیشہ اور قالین کا کام زور شور سے ہو رہا ہے، اور زراعت اس وقت صنعت و حرفت سے بھی آگے آگے ہے۔ زراعت میں نئے نئے آلات اور جدید طریقوں سے کام لیا جا رہا ہے اس لئے روئی اور غلہ کی کاشت خوب ہو رہی ہے، روئی اور تمباکو کی کاشت پر براہ راست حکومت کی نگرانی ہے اس لئے یہ اور ترقی کر رہے ہیں، روئی کاتنے اور کپڑا بننے کی مشینیں بھی کھل گئی ہیں، اور روئی کی زراعت میں حکومت بڑی دل چسپی کا اظہار کر رہی ہے، ملک کے ذمہ دار لوگوں کا خیال ہے کہ زراعت میں لگایا ہوا روپیہ زیادہ بار آور ہو رہا ہے۔ صنعت و حرفت اس کی نسبت کم مفید ثابت ہو رہی ہے، اس لئے اس سال صنعتی جوش و خروش میں کمی ہو گئی ہے، صنعت و حرفت کے بہت سے سرکاری اور نجی پروگرام منسوخ کر دئے گئے ہیں، اور ساری توجہ زراعت پر مرکوز ہو گئی ہے۔ روئی، گیہوں، چاول اور گنے کی زراعت میں بیش از بیش مدد دی جا رہی ہے۔

گیہوں کی زیادہ مقدار اب بھی جرمنی کو جاتی ہے، روئی کی بڑی مقدار تو روس لے لیتا ہے باقی کو جرمنی ہاتھوں ہاتھ لے جاتا ہے، ملک کی ضروریات کے بعد جتنا چاول بچتا ہے اُسے بھی روس خرید لیتا ہے۔ شکر کے کارخانوں میں گنے کی موجودہ مقدار ناکافی ہوتی ہے۔ ایران میں بے کاری اور بے روزگاری کا نام نشان نہیں ہے۔

ایران، بیرونی مصنوعات کی درآمد کو کم کرنے میں لگا ہوا ہے، ۱۹۳۵ء میں ۶۵ لاکھ سے زیادہ روسی تیل ایران میں آیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں ۳۲ لاکھ ہی رہ گیا ہے۔ عام درآمد جس میں لوہے کی مصنوعات اور زراعتی مشینیں وغیرہ ہیں ابھی روس سے آرہی ہیں۔ روس کی کل برآمد ایران میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ سالانہ کے قریب ہے۔

آج کل ایران میں جرمن بڑھ رہے ہیں، تبریز جو ایران کے بڑے شہروں میں دوم نمبر کا شہر ہے اور روسی سرحد سے ۸۰ میل ہے یہاں کے مغربی باشندوں میں نوے فیصدی جرمن ہیں، اور خود پایۂ تخت (طہران) میں بہت سی جرمن کمپنیاں، کارخانے اور دوکانیں ہیں۔ کل ایران میں کوئی بارہ سو جرمن ہیں۔

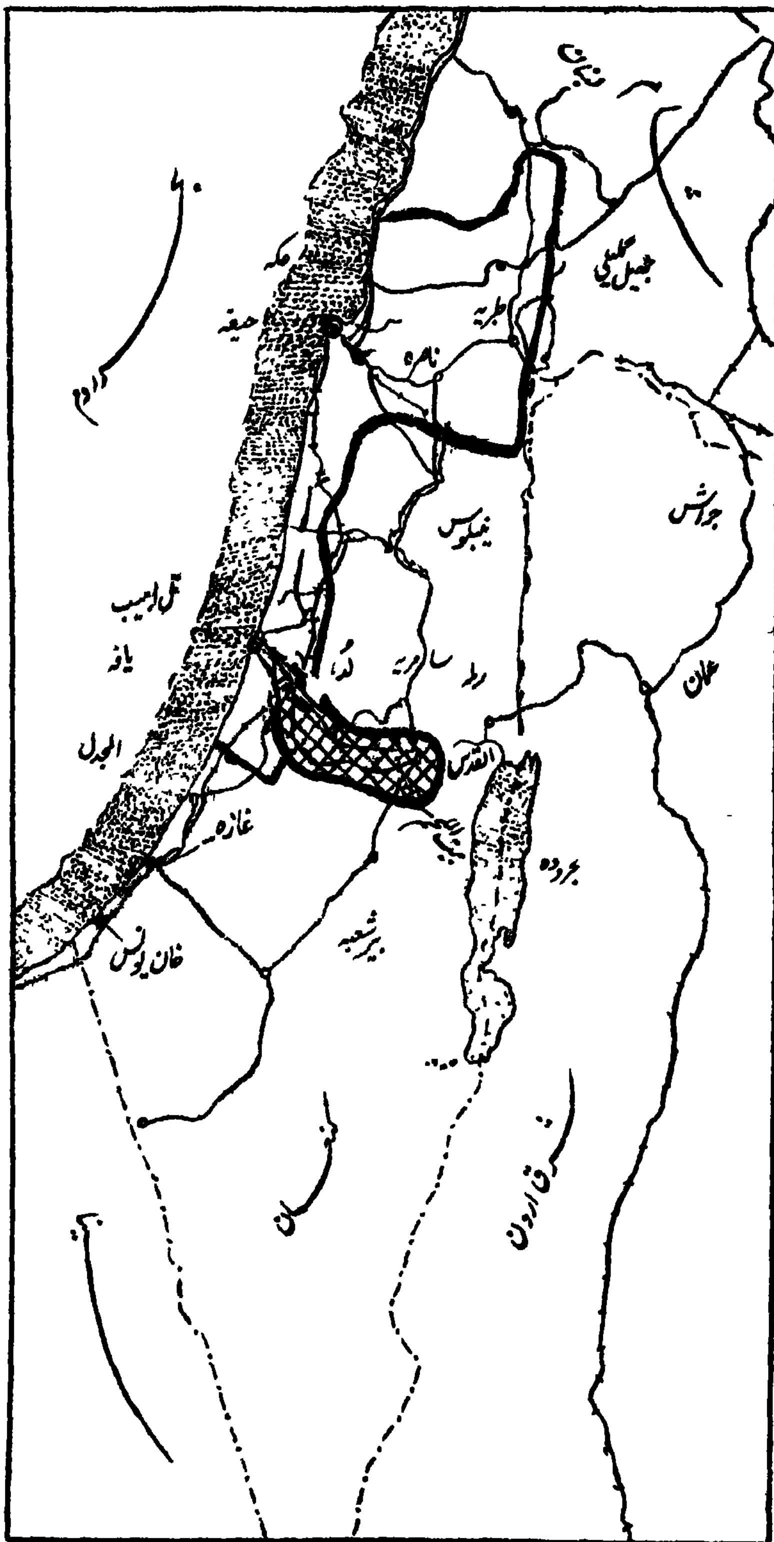
انگریزی ایرانی تیل کمپنی نے اس سال اسی لاکھ ٹن سے زیادہ تیل نکالا، جس سے پچانوے لاکھ پونڈ کے قریب نفع ہوا۔ یہ نفع گذشتہ سال کی نسبت ۲۵ لاکھ پونڈ کے قریب زیادہ ہے، عراق کے تیل کا ٹھیکہ بھی اسی کمپنی کے پاس ہے اس سال تک ان دونوں جگہ سے نوے کروڑ ٹن تیل نکالا جا چکا ہے۔

فلسطین | شاہی کمیشن کی رپورٹ مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے اور حکومت برطانیہ نے ان سفارشات کو منوانے کا بھی فیصلہ کر لیا ہے اس لئے کہ برطانیہ کے نزدیک مسئلۂ فلسطین کا اس سے بہتر کوئی حل ہو نہیں سکتا۔ ان سفارشات کی رُو سے فلسطین کے زرخیز اور اہم ترین ساحلی علاقہ کے مالک یہودی ہوں گے، معمولی اور بنجر سا علاقہ عربوں کو دیا جائے گا۔ اور 'بیت المقدس' شہر برطانیہ کی تحویل میں رہے گا۔ عربوں پر یہ کیا کم ظلم ہے کہ ان کے ملک کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے جائیں، غضب بالائے غضب یہ ہے کہ ساحل کا تمام عمدہ علاقہ، ساری زرخیز زمینیں، اور پھر خود قبلہ اول، بیت المقدس کا شہر ان سے چھین لیا گیا، یہ ہے صلہ ان تمام وفاداریوں کا جو عربوں نے اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے کی تھیں۔ خود شاہی کمیشن کو اعتراف ہے کہ "جنگ عظیم میں اتحادیوں کی کامیابی کو عرب اپنی مکمل آزادی سمجھے ہوئے تھے اور یہی ولولہ ان کو جنگ میں ہمت دلا رہا تھا"۔ جہاں تک برطانوی وعدوں کا تعلق ہے ہم عربوں کے

اس خیال کو بے جا نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ شریف حسین نے بالتفصیل حدود ــــ کا حوالہ دیکر سر ہنری میکموہن کو یہ لکھا تھا کہ وہ کل جزیرۂ عرب کی آزادی چاہتے ہیں، اور اسی شرط پر اتحادیوں کا ساتھ دیں گے۔ میکموہن نے اپنے دوستانہ خطوط میں حدود کے مسئلہ کو قبل از وقت کہہ کر ٹال دیا لیکن یہ بہر حال طے تھا کہ عربی ممالک جس میں نجد و حجاز، عراق و شام شامل ہیں آزاد کر دئے جائیں گے۔ فلسطین ترکی حکومت میں شام میں شامل تھا اس لئے لازماً اس کے معنی یہ تھے کہ فلسطین بھی آزاد ہوگا سر ہنری میکموہن کا خط تو آج تک شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکا، شاید رموز حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی لیکن یہ سب کو اقرار ہے کہ جزیرۂ عرب میں سے صرف وہ علاقے مستثنیٰ تھے جن کی آبادی واکثریت) غیر عرب ہے یعنی اڈانا اور حلب وغیرہ۔ شریف حسین کو اگرچہ یہ کاٹ چھانٹ بھی منظور نہ تھی لیکن بہر حال دلیل معقول تھی کہ ان علاقوں کی آبادی عرب نہیں ہے مگر فلسطین میں تو اس وقت بھی ۹۰ فیصدی عرب آباد تھے، اُسے کس طرح علیحدہ قرار دیا جا سکتا تھا؟ شریف حسین کو جزیرۂ عرب کی کمل آزادی کا یقین دلانے کے بعد برطانیہ اور فرانس کے درمیان کچھ راز کی باتیں شروع ہوئیں اور انھوں نے آپس میں ایک خفیہ معاہدہ کر کے شمالی عرب (شام و عراق) کو اپنے درمیان تقسیم کرلیا اور" اتحادیوں کے مذہبی جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے" بیت المقدس کے لئے طے ہوا کہ وہ" ترکی حکومت سے علیحدہ کر کے آپس (فرانس، برطانیہ، روس) میں سے کسی ایک کو دیدیا جائے اور" بقیہ عرب'' عرب حکومت کے لئے چھوڑ دیا جائے"

ایک ہی علاقہ کے لئے یہ دو معاہدے تھے، اسی لئے دوسرا معاہدہ خاص طور پر پردہ راز میں رکھا گیا، اور ۱۹۱۷ء تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، مگر گھر کے بھیدی روس نے راز فاش کر دیا۔

انہی دنوں یعنی نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے یہودیوں سے بات چیت شروع کی، اور اس کا نتیجہ" اعلان بالفور" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس میں" فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن بنانے اور اس سلسلہ میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا گیا" اور ساتھ ہی ساتھ فلسطین کی غیر یہود آبادی کو یہ اطمینان بھی دلاو یا گیا کہ" ان کی مذہبی، اور معاشرتی حقوق بالکل محفوظ ہوں گے" مسٹر لائڈ جارج نے



لبنان
عکہ
حیفہ
طبریہ
ناصرہ
نابلس
تل ابیب
یافہ
لد
رملہ
سامریہ
المجدل
القدس
غازہ
خان یونس
بیرشعبہ
بحر مردہ
جرش
عمان
شرق اردن

جو اس وقت برطانیہ کے وزیراعظم تھے اس سلسلہ میں کمیشن کو بیان دیا ہے کہ "یہودی رہنماؤں نے ہم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر اتحادی فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن بنانے میں خاطرخواہ مدد کریں تو وہ اپنی تمام کوشش اتحادیوں کی حمایت میں صرف کریں گے" مسٹر لائڈ جارج پوری ایمانداری کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں ان معاہدوں میں تضاد ہے اور وہ غریب اس طوفان حوادث کا ذکر بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ وعدے کئے گئے تھے

"اہل روما پسپا ہو چکے تھے، روسی فوج میں اختلال و بیدلی پیدا ہو چکی تھی، فرانسیسی فوج اس وقت وسیع پیمانہ پر جارحانہ کارروائی کی اہل نہ تھی۔ اطالوی کیپورٹیو کے مقام پر شکست کھا چکے تھے۔ جرمنی کی آبدوز کشتیاں برطانیہ کے بے شمار جہازوں کو غرقاب کر چکی تھیں، امریکہ سے کوئی فوج اس وقت تک فرانس نہیں پہنچی تھی"

لیکن یہ 'قومی وطن' کیا چیز ہے، اس سے کیا مراد ہے، آیا یہودیوں کی مستقل حکومت یا محض 'آزادی سکونت'، اس کی تشریح میں بھی شاہی کمیشن نے مسٹر لائڈ جارج سے مدد چاہی تھی، موصوف نے فرمایا کہ نہیں، ہم فلسطین میں فوراً ہی تو کوئی یہودی ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے تھے، اور یہ بغیر کثرت آبادی کی رائے کے ہو بھی کیسے سکتا تھا، لیکن ہاں یہ تھا کہ اگر یہودی .... وہاں اکثریت حاصل کرلیں تو فلسطین ایک یہودی ریاست بن جائے گا۔ لائڈ جارج جس چیز کو آج بھی صاف صاف نہیں کہنا چاہتے وہ اُن کے سیاسی رفقانے اسی زمانہ میں علی الاعلان کہہ دی تھی، مسٹر ولسن صدر جمہوریہ امریکہ جیسے ذمہ دار شخص کی زبان سے اتحادیوں کے ارادہ اور وعدہ کا اظہار اس طرح ہوا۔

"اتحادیوں نے ہماری حکومت اور ہماری قوم کی پوری موافقت کے ساتھ یہ منظور کر لیا ہے کہ فلسطین میں یہودی حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے گا" جنرل اسمٹس (برطانوی سامراج کی وزارت جنگ کے رکن) نے جوہانسبرگ میں ایک تقریر میں فلسطین کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا "آنے والی نسلوں کے لئے ایک عظیم الشان یہودی حکومت تختۂ ارض پر وجود میں آرہی ہے"

اگران صاف باتوں میں بھی کوئی ابہام پایا جاتا ہو تو اُن الفاظ کو کیا معنی پہنائے جاسکتے ہیں جس میں خود لارڈ بالفور نے یہ احسان جتاتے ہوئے کہ اتحادیوں نے "ظالم و جابر ترکوں" کی صدیوں کی غلامی سے عربوں کو آزاد کیا ہے، اور عراق کی حکومت خود اختیاری کا راستہ صاف کر رہے ہیں۔ فرمایا تھا کہ ہم ان کی زمین کا ایک "ناخن بھر" ٹکڑہ لے لیں تو کیا غضب ہو جائے گا۔

اور شاید یہ ذکر نہیں آیا ہے کہ برطانیہ نے اُس رقبہ کو بھی مستثنیٰ قرار دیا تھا جسے وہ "فرانس کو نقصان پہنچائے بغیر کسی کو نہیں دے سکتا" اس فقرہ کے متعلق ڈاکٹر و تھراپ اسٹاڈرڈ نے لکھا ہے کہ "یہ فقرہ بلاشبہ انگریزی تاش کا "جوکر" تھا مگر اس سے مقصد حاصل ہو گیا۔ عرب چونکہ خفیہ معاہدہ سے ناواقف تھے انھوں نے یہ تصور کیا کہ یہ استثنا لبنان کے محدود ضلع سے تعلق رکھتا ہے وہ خوش خوش بغاوت کی تیاری کے لئے گھر واپس آئے اور دوسرے سال بغاوت ہو گئی"

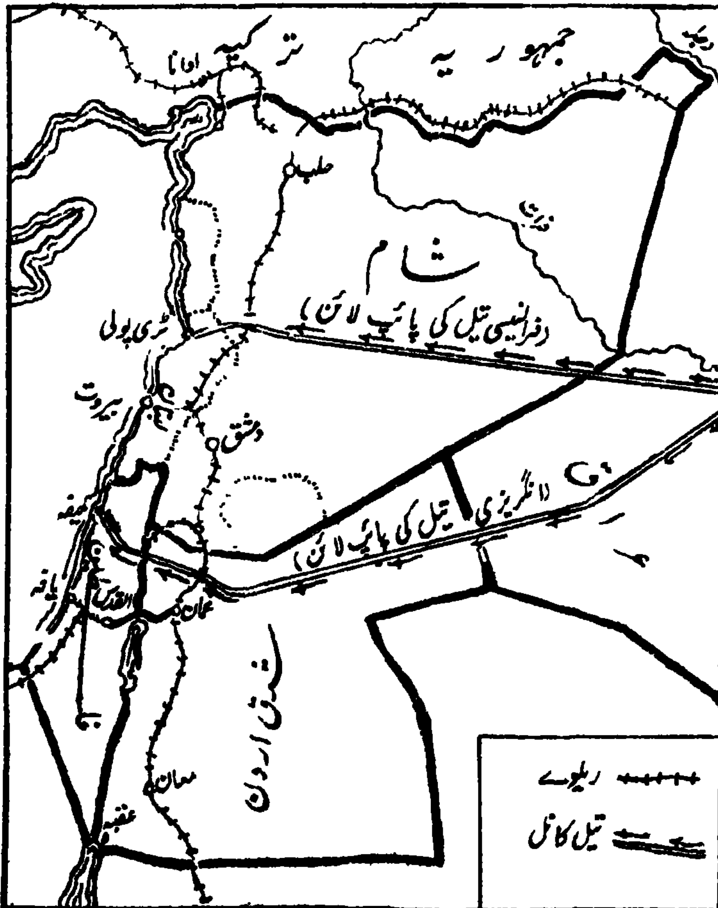
حقیقت یہ ہے کہ فلسطین کا فیصلہ آج سے بیس بائیس سال پیشتر ہی کیا جاچکا تھا محض عربوں کو دھوکہ دینے کے لئے یہ حقیقت زیر نقاب رکھی گئی۔ اور اسی لئے ہنری میکموہن کے خط کو دنیا سے چھپایا گیا اور اسی لئے عربوں کو 'شام' کی آزادی کا نام لے کر فلسطین کے جزئی خیال سے باز رکھا — حتیٰ کہ ۱۸ء میں فرانس اور برطانیہ نے صلح کے بعد عربوں کی تسکین کے لئے جو بیان شائع کیا اس میں بھی عراق اور شام وغیرہ کی تدریجی دستوری ترقی کا تصریحی وعدہ کیا اور فلسطین کو گول کر دیا۔ اودھر 'قومی وطن' کی مبہم اصطلاح سے ۲۲ء تک یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ "ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہودیوں کو عربوں پر مسلط کر دیا جائے" اور چونکہ بالفور اعلان میں یہودیوں کی مراعات اہل فلسطین کے تحفظات کے ساتھ مشروط کی تھیں، اس لئے عربوں کے لئے بے چینی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ۲۰ء میں شریفی معاہدہ کے صریحاً خلاف، جب عراق شام اور فلسطین پر انتداب کا دولہ غلط کر دیا گیا تو عرب اس عجیب و غریب 'آزادی' کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور اغیار کی بدنیتی نے انھیں خوف زدہ کر دیا۔ دفتر نوآبادیات نے ان کی حیرانی کو کم کرنے کے لئے پھر ایک 'اطمینان بخش' بیان شائع کیا جس میں عربوں کو یقین دلایا کہ "ہم نہ فلسطین کو بالکل یہودی بنانا چاہتے ہیں اور نہ خدا نخواستہ وہاں عربوں کے تمدنی اور معاشرتی اثر کو کوئی صدمہ پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں"

عربوں کے اطمینان کے لئے یہ بیان کافی نہیں تھا، انگریزوں کے خلاف عام برہمی پیدا ہوگئی ہنگامے اور فسادات شروع ہوئے جن کی تحقیقات کیلئے ۱۹۲۹ء میں مسٹر شا کی صدارت میں ایک کمیشن فلسطین پہنچا' اس کمیشن نے اگرچہ فسادات کی علت غائی یہ نہیں بتلائی کہ عرب برطانیہ پر اعتماد نہیں رکھتے لیکن یہ دیکھ کر کہ ذومعنین بیانات سے اب کام چلنا مشکل ہے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ "وہ صاف لفظوں میں اپنی پالیسی کا اعلان کرے - اور ۲۲ء کے اعلان کو از سر نو مستحکم کردے - یعنی یہ کہ انتداب میں یہودیوں کو جو مراعات حاصل ہیں وہ کسی درجہ میں بھی ان کو حکومت کے کام میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتیں" اس کے جواب میں وزیر اعظیم مسٹر میکڈانلڈ نے 'صاف لفظوں' میں پالیسی کا اظہار فرمایا "کہ ہم ہر جماعت کے ساتھ پورے عدل سے کام لیں گے اور ۲۲ء کے عہد کو پورا کریں گے" انتداب کمیشن لیگ کے اجلاس میں شا رپورٹ اور اس بیان پر بڑی لے دے ہوئی اور انتداب کمیشن نے غیر معمولی جرأت کے ساتھ یہ اعلان کیا "کہ فلسطین کی بے چینی کی اصل وجہ یہ ہے کہ برطانیہ نے اہل فلسطین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا' اور شا کمیشن کا یہ بیان سراسر غلط ہے کہ اس تصادم کو برطانیہ کی مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ فلسطین کے آخری فسادات سے متاثر ہو کر شاہی کمیشن کا تقرر عمل میں آیا - اس نے "بیس سال کے پرانے جزئی واقعات" کی تحقیق کو گڑے مردے اکھاڑنے کی برابر سمجھ کر چھوڑ دیا لیکن پھر بھی اس "افسوسناک حقیقت" کا اقرار ہے کہ:-

"لڑائی کی ضرورتوں کی وجہ سے حکومت برطانیہ شریف حسین کو صاف صاف اپنے ارادوں سے مطلع نہ کر سکی - آپ دیکھیں گے کہ سر ہنری میکموہن کے خط مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۵ء میں فلسطین کا واضح ذکر نہیں کیا گیا ہے اور نہ اس سے پہلے کوئی خاص اشارہ کیا گیا تھا: بعد کی خط و کتابت میں شریف حسین اور سر ہنری میکموہن کے درمیان صرف بیروت اور حلب کے متعلق اختلاف تھا - شریف حسین نے اس بات پر زور دیا کہ یہ علاقے خالص عرب ہیں اور جب ہنری میکموہن نے فرانسیسی مصالح کی طرف توجہ دلائی، تو شریف حسین نے جواب دیا کہ اگرچہ وہ شمال میں اپنی حیثیت سے

دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں، تاہم وہ سر دست برطانیہ اور فرانس کی باہمی مخالفت کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ اور فرانس کے مطلوبہ علاقوں (بیروت اور لبنان کے ساحلی علاقے) کے متعلق مزید گفت و شنید جنگ کے خاتمہ پر ملتوی کرنا مناسب خیال کرتا ہے۔"

یہی "افسوس ناک حقیقت" اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ برطانیہ اور شریف حسین میں فلسطین کے معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن ان تمام وعدوں کے باوجود فلسطین کا یہ حشر کیوں ہوا اس پر پچھلے سال ۱۷ر جون کو پارلیمنٹ کے ایک معزز ممبر نے روشنی ڈالی تھی" مدافعت کے لحاظ سے فلسطین کی مقامی حیثیت نہایت اہم ہے، یہ گویا کیلفم جنکشن (لندن کا سب سے بڑا ریلوے جنکشن) ہے



یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے، جو انگلستان، افریقہ اور ایشیا کے ہوائی راستوں کا مرکز ہے، بحر روم کے جدید حالات نے اس کی بحری حیثیت کو صد درجہ اہم بنا دیا ہے قبرص، فلسطین اور مصر پر اگر مضبوطی کے ساتھ قبضہ رکھا جائے تو اس سے نہ صرف نہر سوئز کو کھلا رکھنا ممکن ہو گا بلکہ تمام مشرقی بحر روم پر بھی قبضہ رہ سکے گا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ حکمبرداری کی رُو سے ہم فلسطین میں بحری مرکز قائم کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ تاہم اگر حیفہ کو ترقی دے کر بحر روم کا ایک زبردست بندرگاہ اور تجارتی مرکز بنا دیا جائے نیز اس کو تیل کی فراہمی کا ایک بڑا منبع قرار دیا جائے تو جنگ کے زمانہ میں جب ہمیں کہیں اور سے تیل نہیں مل سکے گا، اس علاقہ کے نتائج نہایت اہم ہوں گے۔"

اس تقریر سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ فلسطین کے موجودہ حل میں یہودیوں کے وعدہ کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا برطانیہ کے ذاتی مفاد کو۔ مسئلہ بیت اللحم اور دیوار گریہ کا نہیں بلکہ ان سے زیادہ مقدس شے " لارجسٹ پائپ لائن " کا ہے، ورنہ یہود کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ ان کو اگر کہیں پناہ ملی تو مسلمانوں ہی کے سایہ میں ملی ہے، یہی یہود تھے جو اسلامی اسپین میں حکومت کے مشیر و وزیر تھے، ترقی کی راہ ان پر کھلی ہوئی تھی، اسی طرح مصر میں ان کو ترقی کا پورا موقع دیا گیا اور خلافت راشدہ میں تو یہ حال تھا کہ خلیفہ وقت کے ذاتی مقدمات یہودیوں کے حق میں فیصل ہو جاتے تھے، آج بھی یہود ٹیونس، الجیریا اور عراق میں مسلمانوں کے ساتھ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فلسطین کو اگر دینی حیثیت سے دیکھا جائے تو کون نہیں جانتا کہ انجیل اور توریت کے نام لیوا ازل سے ایک دوسرے کے پیغمبروں کے دشمن ہیں، اور صرف مسلمان ہی ہے جس کے دل میں ان دونوں مقدس پیغمبروں کا یکساں احترام موجود ہے، اور جس طرح آج بھی "قمامہ" کا کلید بردار مسلمان ہے فلسطین کا واقعی محافظ بھی مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمان کا اثر وہاں گوارا کیسے ہو جب کہ " وہ (فلسطین) سلطنت برطانیہ میں رسل و رسائل اور آمد و رفت کا اہم نقطہ ہے " اور ان کے نقطۂ نظر سے یہ دیکھتے رہنا ضروری ہے کہ وہاں کسی ایسی قوم کو آباد ہونے اور اپنی قومیت کو عظیم الشان ترقی دینے کی اجازت نہ دی جائے جو بالآخر ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو" (کرنل کلفٹن براؤن ممبر پارلیمنٹ)

اسی لئے یہود جیسی غیر سیاسی قوم کو دنیا سے لا لا کر اس ساحل پر بسایا گیا ہے، اور اس خیال سے کہ کہیں یہ کچھوا بھی کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے عربوں اور یہودیوں کے درمیان میں خود بدولت اپنا ٹھکانا بنائے ہوئے ہیں۔ یہودیوں اور عربوں میں برابر چلتی رہے اور بیت المقدس کے مذہبی محافظ پنچ کی حیثیت سے دونوں کے سرپرست ہوں، فلسطین کا ساحل دنیا کی اس مذہبی خدمت کے عوض ان کے اثر میں رہے، اور دنیا کے مذہبی احساسات کی خاطر تکلیفیں جھیلنے والی سلطنت کے جہازوں کو آسانی سے تیل ملتا رہے۔ غریب یہودی بھی بس ایک بہانہ ہیں، اور ان کے سردار ڈاکٹر وائس مان نے ایک دوسرے سلسلہ میں سچ کہا تھا کہ "یہودی ہمیشہ ہی بہت اچھا بہانہ ثابت ہوئے ہیں"!

مویشیوں کی نسلی اصلاح | لارڈ لنلتھگو نے جب سے ہندوستان کی وائسرائی کا چارج لیا ہے، ملک کی زراعت کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس ذیل میں موصوف نے ہندوستانی زراعت کے اس پہلو پر خاص زور دیا ہے جو قوت محرکہ اور حیواناتی مصنوعات سے متعلق ہے یعنی مویشیوں کی اچھی نسل کا رواج۔

ہندوستان اپنے طبعی ماحول کی بنا پر از منۂ قدیم سے ایک زراعتی ملک رہا ہے۔ صنعت و حرفت میں بھی کچھ پیچھے نہ تھا، اور ایک زمانے میں اس کی مصنوعات کا دنیا کی منڈیوں پر قبضہ تھا، مگر اس کا خاص پیشہ زراعت ہی رہا ہے،

زراعت کے لئے جہاں طبعی ماحول اور زمین کی زرخیزی لازم ہے، وہاں قوتِ محرکہ بھی ایک ضروری جزو ہے۔ یہاں قدیم زمانے سے آج تک قوت محرکہ مویشیوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر بیل اور بھینسے اس کام کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر بیلوں کا حصہ نسبتاً زیادہ اور اہم ہے۔ ہل چلانا، کنویں سے پانی کھینچنا اور پیداوار کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا سب کام بیلوں سے لئے جاتے ہیں۔

ہندوستانی معیشت میں مویشیوں کی اہمیت کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو جائیگا۔
یہ اعداد ۴۵-۱۹۴۴ء کے ہیں۔

برطانوی ہند میں:-

زراعت میں کام آنے والے مویشیوں کی کل تعداد	۱۵۹۹۳۵۰۰۰
بھیڑوں اور بکریوں " "	۶۱۱۵۷۰۰۰
دیگر مویشی مثلاً گھوڑے، گدھے، خچر اور اونٹ "	۳۸۰۱۰۰۰

ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ مختلف صوبوں میں ہر ۱۰۰ ایکڑ مزروعہ زمین پر مویشیوں کی تعداد کا اوسط کیا ہے اور ہر ۱۰۰ نفوس پر اوسط تعداد کیا ہے۔

	مویشیوں کا اوسط تعداد	
	ہر سو ایکڑ مزروعہ زمین پر	ہر سو نفوس پر
اجمیر میواڑ	۱۳۴	۸۶
آسام	۱۰۰	۶۹
بنگال	۱۰۸	۵۲
بہار و اڑیسہ	۸۸	۵۷
بمبئی	۳۸	۶۰
برما	۳۴	۴۲
سی پی و برار	۵۶	۸۹
کورگ	۱۰۰	۸۴
دہلی	۷۵	۲۴
مدراس	۷۵	۵۳
سرحدی صوبہ	۵۰	۴۳
پنجاب	۶۰	۶۷

آبادی کی اکثریت کی نظر میں گائے کو جو مذہبی حیثیت حاصل ہے وہ دراصل اسی اہمیت کا نتیجہ ہے۔ برطانوی حکومت تاجروں کی حکومت ہے، اس نے ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ ملک کی حالت میں کم سے کم دخل دے کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ لیکن کسان کی حالت درست کئے بغیر تجارت کو فروغ دینا بھی دشوار تھا۔ اس لئے ہوتے ہوتے ادھر کچھ توجہ شروع کی گئی۔ ۱۹۰۰ء سے پیشتر یہاں کی اقتصادی زندگی کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ ۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن کے عہد میں زراعت کو فروغ دینے کے لئے کچھ کوشش کی گئی تھی۔ مگر یہ کوشش ابھی ابتدائی منزل میں تھی، صرف ایک مرکزی ادارہ بہار کے صوبے میں پوسا کے مقام پر جدید سائنٹفک زراعتی تجربات کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جس میں نئے نئے بیجوں اور زمین کی مختلف صلاحیتوں کا تجربہ کیا گیا تھا۔ تجربہ کامیاب دیکھ کر ۱۹۰۵ء میں زراعتی تحقیق کی از سرنو تنظیم کی گئی۔ اس میں ایک مرکزی تجربہ گاہ کے بجائے صوبہ جاتی اداروں کے قیام کی ضرورت تسلیم کی گئی اور بڑے بڑے صوبوں میں زراعتی ادارے کھولے گئے۔ ۱۹۰۵ء کے بعد کبھی کبھی جزوی تبدیلیاں اور اضافے ہوتے رہے۔ کوئی بنیادی اور اہم اضافہ نہ ہوا۔

اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں زراعت کی تحقیقات کے لئے ایک رائل کمیشن مقرر کیا گیا، اس کمیشن کے صدر لارڈ لنلتھگو صاحب تھے اس کمیشن کی رپورٹ میں مویشیوں کے متعلق نہایت سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ اور اس کی طرف خاص توجہ دینے کی سفارش کی گئی تھی۔

لارڈ لنلتھگو نے اپنے دور حکومت کا آغاز زراعت کے اسی پہلو کی اصلاح سے کیا ہے، اس تحریک کی بنیاد مندرجہ ذیل مقاصد پر رکھی گئی ہے۔

۱۔ مویشیوں کی اہلیت کارکردگی بڑھانا۔

۲۔ حیواناتی پیداوار اور مصنوعات کی تنظیم۔

ظاہر ہے گایوں اور بیلوں کی موجودہ نسل نہایت خراب ہے۔ بیل چھوٹے ہوتے ہیں، تھوڑے کام میں تھک جاتے ہیں اور کسان کو کام ادھورا چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اس لئے مجبوراً اس کو کئی جوڑیاں

رکھنی پڑتی ہیں ۔ پھران جوڑیوں کے علاوہ اس کے یہاں گائیں اوربھینسیں بھی ہوتی ہیں ۔ اس لئے اُسے چارے کے لئے مستقل انتظام کرنا پڑتا ہے ۔ اور چونکہ چارے کے لئے زمین کی کمی کے سبب وہ مستقل کھیت وقف نہیں کرسکتا، اس لئے غلّے کے کھیتوں سے جو کچھ چارہ ملتا ہے وہ سب کا سب بیل کھا لیتے ہیں گایوں اوربھینسوں کو چرنے پر قناعت کرنی پڑتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دودھ اور گھی کافی مقدار میں پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ نسل ہی معقول پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ چھوٹی نسل کے مویشی کھاتے بہت ہیں ۔ رائل کمیشن کی رپورٹ میں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل سائنٹفک نتیجے نکالے گئے ہیں :۔

> یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جس قدر چارہ ایک سو چھوٹے بیلوں کے لئے درکار ہوگا، اتنا ہی پچاس دوگنے قدوقامت کے بیلوں کے لئے بھی ہوگا ۔ مویشی جس نسبت سے نسل میں خراب اور چھوٹے قد کے ہوتے ہیں، اُسی نسبت سے اُن کی خوراک بڑھ جاتی ہے ۔

اس تحریک میں جہاں بیلوں کی نسل پر زور دیا جا رہا ہے، وہاں اچھے قسم کے چارے کے انتظام کی طرف بھی خاص توجہ دی جارہی ہے ۔ اور ذاتی چراگاہ یا چارے کے لئے کھیت بنانے کے بجائے اس امر پر زور دیا جارہا ہے کہ ہر گاؤں یا کئی گاؤں مل کر ایک مشترک چراگاہ کا انتظام کریں اور اُسے ہرا بھرا رکھنے کے لئے معقول محنت اور سرمایہ لگایا جائے ۔ اس سلسلے میں چارے کے لئے کھتیاں بنانے، چارے میں غذائیت کا جزو بڑھانے کے لئے تجربات ہورہے ہیں اور اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ یہاں بھی مویشی اور چارے کا انتظام اُنھیں اصولوں پر چلایا جائے جن پر کاربند ہوکر آسٹریلیا اور کنیڈا اپنی زمینوں سے زیادہ سے زیادہ غلہ حاصل کرتے ہیں حالانکہ وہاں کام کرنے والے مویشیوں کی اتنی کثرت نہیں ہے، جتنی ہندوستان میں ہے ۔

تحریک کا دوسرا رخ مویشیوں کے ذریعے ملک میں دودھ مکھن کے کاروبار کو فروغ دینا ہے دودھ گھی کی جتنی مقدار اچھی ذات کی گایوں اور بھینسوں سے حاصل ہوتی ہے، چھوٹی ذات کی گایوں اور

بھینسوں سے نہیں ہوتی۔ پنجاب میں اچھی ذات کی گایوں اور بھینسوں کے پالنے کا رواج ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے پہلے ہوا ہے۔ یہاں نہروں اور دریاؤں کی کثرت کے سبب چارے کا انتظام بھی قدرتاً اچھا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دودھ اور گھی کی جتنی کثرت اس صوبے میں ہے، دوسرے صوبوں میں نہیں ہے۔ چھوٹی ذات کی گائیں بچہ دینے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک سال تک دودھ دیتی ہیں وہ بھی دودھ کی مقدار کچھ تو اُنکی ذات کی خصوصیت کی وجہ سے اور کچھ چارے کا انتظام اچھا نہ ہونے کے باعث دوسرے تیسرے مہینے سے کم ہونی شروع ہو جاتی ہے، اور آخر میں چل کر ان میں ایک پاؤ سی لے کر آدھ سیر تک دودھ رہ جاتا ہے۔ دودھ کی کمی کا اثر بچھڑے پر بھی بہت بُرا پڑتا ہے۔ وہ دن بدن دُبلا ہوتا چلا جاتا ہے، اور عین شباب کے زمانے میں بھی محنت سے جی چراتا ہے۔

اچھی نسل کی گائیں پالنے کے رواج سے ایک طرف محنتی اور بڑے بڑے بیل حاصل ہوں گے، دوسری طرف دودھ مکھن کثرت سے ہوگا، اس لئے ملک کی ضروریات سے جو بچ رہے گا اُن کی برآمد سے قومی دولت میں اضافہ ہوگا۔ کنیڈا، ڈنمارک، آسٹریلیا اور امریکہ سے دودھ کی مصنوعات کی درآمد اس بات کی شاہد ہے کہ اس ایک شعبہ سے کتنا روپیہ ہندوستان سے باہر چلا جاتا ہے، حالانکہ دودھ دینے والے جانور یہاں اِن ملکوں سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ملکی ذرائع پیداوار کا بالغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ بصورت خام ہندوستان میں ہر چیز موجود ہے، صرف تنظیم اور چاہیئے زراعتی تنظیم کا موقع وائسرائے کی تحریک سے ہاتھ آیا ہے۔ جسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔

۳ __تحریک کی رفتار__ اس تحریک کو ایک سال کا زمانہ ہوا ہے۔ اور لوگ بھی (وہ خواہ سرکاری افسران ہی کیوں نہوں) اس کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں۔ گذشتہ مئی میں اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ایک آل انڈیا اجلاس شملہ میں ہوا تھا۔ اس اجلاس میں ہر صوبے کے نمائندے شریک ہوئے تھے، اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ تحریک حیوانات کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر بنانے اور اس کا اثر کسانوں تک پہنچانے کے لئے مزید تدابیر پر بحث کی جائے۔

وائسرائے نے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ قابل غور ہیں۔

آپ نے فرمایا تھا:-

"یہ امر محتاجِ تشریح نہیں کہ ہندوستان کی زراعت کا تمام انحصار مویشیوں پر ہے۔ اس لئے کہ قوتِ محرکہ کے حصول کی مویشیوں کے علاوہ ہندوستان میں اور کوئی سبیل نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کی زراعت کو فروغ دینے کے لئے مویشیوں کی نسلی اصلاح سے بڑھ کر اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔"

زراعت کے تحت میں مویشیوں کی اہمیت جتانے کے بعد وائسرائے نے اس تحریک کے اقتصادی اور تجارتی پہلو کو بھی واضح کیا:-

"ہندوستان کی سالانہ آمدنی میں مویشیوں کے ذریعے کم و بیش تیرہ ارب روپیہ آتا ہے۔ اس میں مویشیوں کی محنت، ڈیری کی مصنوعات، کھاد وغیرہ سب اجزا شامل ہیں۔ یہ محض ایک اندازہ ہے مگر اس سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بحالت موجودہ مویشیوں کا وجود کس قدر اہم اور پیداآور ہے۔ آج آپ لوگ جہاں مویشیوں کی نسلی اصلاح کی تحریک کی کامیابی کے ذرائع تجویز کرنے کے لئے آئے ہیں وہاں آپ کے سامنے بہت سے ضمنی مسائل بھی آئیں گے جو بظاہر اقتصادیات سے متعلق ہوں گے، مگر ان کی اصل مویشیوں سے ملتی ہوگی۔ مثلاً بھیڑ بکری کی پیداوار، اون کی پیداوار، چمڑے اور ہڈی کی صنعت اور گھوڑوں کی اچھی نسل پیدا کرنا۔ وغیرہ جن کا تعلق ملک کی قومی دولت سے بہت گہرا ہے۔"

تحریک کی رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس کا اثر مرکز سے نکل کر صوبوں تک پہنچنا چاہئے۔ اور اصل میدان تو صوبے ہی ہیں، اس لئے کہ عوام اور کسانوں کا تعلق جتنا قریبی صوبوں اور ضلعوں سے ہے، مرکز سے نہیں ہے۔ مرکز کا کام تو متعدد صوبوں میں باہم تبادلہ اطلاعات کا انتظام کر دینا اور گاہے بگاہے صوبائی تحریکوں کو ایک جگہ پر جمع کر دینا ہے۔ آخر میں آپ نے آئندہ کے لئے امید کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:-

"آخر میں مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے پہلے الفاظ پھر دہراؤں کہ ہم کسان کی بھلائی اس سے بڑھ کر اور نہیں کر سکتے کہ مویشیوں کی اصلاح کے لئے قدم اُٹھائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم نے صحیح راہِ عمل اختیار کی اور ہماری پالیسی صحت نیت پر ہوئی تو ہم بہت جلد کامیاب ہوں گے۔ اور آگے چل کر کسانوں کا طبقہ ہمارے ساتھ ہوگا۔"

وائسرائے کی تقریر کے بعد جناب سر جگدیش پرشاد صاحب کی صدارت میں کانفرنس میں صوبوں کے نمائندوں نے اپنے صوبے کے تجربات پیش کئے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف اسکیمیں پیش کیں۔ ان تمام اسکیموں میں قدرِ مشترک چیز یہ تھی کہ صوبوں میں مویشیوں کی تحریک کے لئے فنڈ کھولا جائے اور صوبے کے وزیرِ زراعت کی صدارت میں محکمۂ اصلاحِ مویشیان قائم کیا جائے۔ اس محکمے کا کام یہ ہو کہ مشترکہ فنڈ سے اچھے نسل کے بیل خریدے۔ اور ان کے ذریعہ اپنی نگرانی میں ہر ضلع میں اچھی نسل کے گائے بیل کی پیدائش کا انتظام کرے۔

یہ محکمہ اسی ضمن میں حتی المقدور مشترک چراگاہوں کے قیام کی کوشش بھی کرے گا۔ اور اچھے چارے کی کاشت کا رواج بھی بڑھائے گا؛ جو اچھے نسل کے مویشیوں کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔

وائسرائے کی یہ تحریک جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ہندوستانی زراعت کے لئے نہایت مبارک ہے۔ مگر اس کی کامیابی بڑی حد تک مشروط ہے، اور اگر اس کی طرف خلوص نیت سے توجہ نہ کی گئی اور کارآمد ذرائع اختیار نہ کئے گئے تو بقول مسٹر کھاپرڈے چند ایکڑ زمینوں میں تو اچھے موٹے موٹے اور جاندار بیل نظر آجائیں گے۔ مگر کاشتکاروں کی آبادی بالکل محروم رہ جائے گی۔ ہندوستان کا کسان اَن پڑھ ہوتا ہے۔ وہ کسی چیز کی اہمیت سمجھ بوجھ کر تسلیم نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ جب وہ اچھے موٹے تازے گائے بیل دیکھے گا تو اُسے تحریص ضرور ہوگی، مگر یہ جذبہ ممکن ہے اس کے اندر مستقل نہ رہے۔ اس باب میں کسانوں کی تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا تو اثر بھی اس تحریک کا پائدار ہوگا، اور اس کی کامیابی میں وقت بھی کم صرف ہوگا۔

کسان غریب بھی ہے، اچھی نسل کے جانور خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں۔ اس لئے ان کی خریداری میں اسے سہولتیں بھی بہم پہنچانی چاہئیں۔ امداد باہمی کے بنک اس باب میں کسانوں کی خاصی مدد کر سکتے ہیں۔

تحریک بہ حیثیت مجموعی مفید ہے، مگر ہندوستان کے لئے کوشش فلاح کا محض ایک رخ ہے۔ دنیا میں آج کل زراعت وصنعت جب تک دوش بدوش نہ چلیں کوئی ملک کما حقہ ترقی نہیں کر سکتا۔ حکومت برطانیہ کی پچھلی پالیسی دیکھئے تو یہ رہی ہے کہ ہندوستان کو انگلستان کی مشینوں کے لئے اشیاء خام کی فراہمی کے لئے استعمال کیا جائے۔ زراعت کو فروغ دینے میں بھی یہ حکمت مضمر ہے کہ کسان کی قوت خرید بڑھے تو برطانوی مال کی کھپت اس منڈی میں زیادہ ہو۔ اس لئے اس یک رخی تحریک فلاح کو دیکھ کر جہاں خوشی ہوتی ہے، اور امید بندھتی ہے وہاں ایک گونہ تشویش بھی ہوتی ہے کہ ؎

ہم تک کب اُن کی بزم میں آیا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
ب۔ ع

کانگریسی وزارتیں | ہندوستان کے چھ بڑے صوبوں میں کانگریس نے کئی مہینہ سوچ بچار اور بحث مباحثہ کے بعد وزارتیں قبول ہی کر لیں۔ قانون ساز مجالس کے جلسے بھی ہو چکے۔ جمہور کی طرف سے مجالس کے افتتاح کے وقت ہر جگہ جو مظاہرے ہوئے وہ ہندوستان کی تاریخ میں بالکل نئی بات تھے۔ پہلی مرتبہ ان مجالس کو جمہور نے اپنے فلاح اور بہبود کے ادارے جانا اور جو مناظر پہلے قومی جلسوں میں دیکھنے میں آتے تھے وہ قانون ساز مجالس کی عمارتوں کے باہر ــ اور اندر ــــ دکھائی دیئے۔ جلوس، ہجوم، جیکارے، بندے ماترم، غرض وہی قومی جلسوں کا سا جوش، وہی خلوص، وہی عقیدت ــــ اور کہیں کہیں وہی بے ترتیبی! یہ ہونا چاہیئے بھی تھا اور ہو بھی چکا، لیکن حکومت کا کام محض جوش اور عقیدت اور بے ترتیبی سے انجام نہیں پاتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے غور و فکر اور تدبیر کی۔ جس جوش کا مظاہرہ جمہور کی طرف سے ہوا ہے اس سے وزارتوں کی ذمہ داری بڑھتی ہے، ان توقعات کا پتہ چلتا ہے جو جمہور کو ان سے ہیں، ان کے کاموں میں جمہور کی طرف سے تعاون کا وعدہ بھی ان لیا

مضمر ہے، مگر فکر اور تدبیر کا فرض بہر حال وزارتوں کے ذمہ رہتا ہے۔ ان کی کامیابی اب اس سے نہیں جانچی جا سکتی کہ کسی وزیر کا اسٹیشن پر کس شان سے استقبال ہوا، کیسا جلوس نکلا، یا انھوں نے کیسی دل ہلانے والی تقریر کی۔ اب کامیابی کا معیار یہ ہوگا کہ ان کی تدبیر سے صوبہ کی خوشحالی میں کیا اضافہ ہوا، کتنے بھوکوں کے پیٹ بھرنے کی سبیل نکلی، کتنے بے کاروں بے روزگاروں کو کام ہاتھ آیا، کتنے بیماروں کے علاج کی اور کتنے تندرستوں کو بیماری سے بچانے کے لئے حفظ ماتقدم کی تدابیر کی گئیں، کتنے اَن پڑھ جاہلوں کے لئے لکھنے پڑھنے کا اور اپنے آس پاس کے معاملات کو سوچنے سمجھنے کے قابل بنانے کا سامان کیا گیا، غریب کے لئے انصاف حاصل کرنے میں کیا سہولتیں پیدا کی گئیں، رشوت کا بازار کس حد تک سرد پڑا، گاؤں اور شہر کے درمیان حمل ورسل کے ذرائع میں کیا ترقی ہوئی، صوبہ کی آبادی کے مختلف حصوں میں جو بے اعتمادیاں ہیں وہ کہاں تک مٹیں، قوم کی معاشی اور سیاسی ترقی کی طرف سے جو مایوسیاں یا شبہے ہیں وہ کہاں تک کم ہوئے۔ ان کی کامیابی اور ناکامی اس طرح جانچی جائے گی کہ جب یہ عنان حکومت ہاتھ سے دیں گے اس وقت ان کا صوبہ پہلے سے زیادہ خوشحال ہوگا یا بدحال، اور آزادی کی طرف اعتماد کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ ہوگا یا اس تجربہ کی وجہ سے اس میں کچھ جھجک پیدا ہو جائے گی۔

اس معیار پر پورا اترنے کے لئے ان وزارتوں کو بڑے مالی وسائل درکار ہوں گے اور قابل آدمی افلاس، بیکاری، بیماری، جہل باتوں سے نہیں مٹائے جا سکیں گے۔ آدمیوں کا حال یہ ہے کہ جتنے اعلیٰ عہدہ دار ہیں، جنھیں ان وزارتوں کے دست و بازو سمجھنا چاہئے ان پر زیادہ تر انگریز پہلے سے متمکن ہیں، ان کے جملہ حقوق قانوناً محفوظ ہیں، انھیں کوئی مشکل ہی سے چھو سکے گا۔ عہدہ داروں کا فرض تو یہ ہے کہ وزارت وقت کے احکام کی تعمیل کریں اور یہ عہدہ دار بھی تعمیل ضرور کریں گے۔ مگر تعمیل تعمیل میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جب حکومت کے مقاصد کے باب میں وزارت اور اس کے عملہ میں ایسا بنیادی اختلاف ہو جیسا کہ اندیشہ ہے کہ موجودہ وزارت اور اس کے عملہ میں ہو سکتا ہے، اور پھر وزارت کو اس عملہ کی برطرفی، یا ان کی تنخواہ میں اضافہ و تخفیف کا حق بھی نہ ہو تو وزارت کے بہت سے منصوبے

شکل ہی سے تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں یہ مشکل بھی حل ہو جائے تو وسائل کا معاملہ ہے۔ کانگریس جن چیزوں کا قوم سے وعدہ کرتی رہی ہے ان کو پورا کرے تو وسائل اور کم ہوتے ہیں۔ کسان پر لگان کم کرے تو زمیندار سے مالگذاری کم وصول ہوگی، شراب کی فروخت بند کرے تو آبکاری کی آمدنی ہاتھ سے جائے گی۔ مصارف میں تخفیف کرکے اس کمی کی تلافی ہوسکتی تھی، تو بڑے تنخواہ دار ملازموں کی تنخواہیں گھٹانے کا حق ہی نہیں ہے۔ چھوٹوں پر مشقِ تخفیف سے کیا حاصل ہوگا۔ فوج، ریلیں، ڈاک اور تار، محاصل، یہ سب مرکزی حکومت کے تحت ہیں ان میں نہ خرچ کم کرنے کا اختیار ان وزارتوں کو ہے نہ ان سے آمدنی بڑھانے کا۔ بعض ملکوں میں وسائل بڑھانے کے لئے حکومت زر رائج کی مقدار بڑھاتی ہے، سو اس کا اختیار بھی صوبجاتی حکومتوں کو نہیں، سیاست، زرگری بھی مرکزی حکومت کا حق ہے! قومی تعمیر کے کام اگر اٹھائے گئے تو غالباً صوبائی حکومتوں کو قرض لینا ہوگا، اور ان اغراض کے لئے قرض لینا مالیاتی اصول سے غلط بھی نہ ہوگا، لیکن یہاں بھی گورنر بہادر اور گورنر جنرل کی خوشنودی شرط ہے!

اس سے یہ تو واضح ہوگیا کہ جو بنیادی مسائل کسی قومی حکومت کو حل کرنے چاہئیں ان کے حل کی توقع موجودہ قومی وزارتوں سے کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ قانون دستور کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی ہیں اور وہ انھیں قدم قدم پر روکے گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر دوسرے ایسے کام وزارتیں انجام دیں جس سے جمہور کا اعتماد ان پر قایم رہے تو ان معاملات میں وزارت کی ناکامی سے دستور کو بدلوانے کا مطالبہ قوی ہوگا اور حرکت آزادی میں قوم ایک قدم اور آگے بڑھنے کو تیار ہوگی۔

مگر اس بے بسی کے باوجود جس کا ہم نے ذکر کیا یہ وزارتیں کس طرح جمہور کا اعتماد قایم رکھ سکتی ہیں؟۔ ایک تو یوں کہ آزادی کے لئے کام کرنے والوں کو محض آزادی خواہ ہونے کے جرم میں جو تکلیفیں، اور سزائیں اٹھانی پڑتی تھیں ان کو ختم کرادیں۔ آزاد خیال اشخاص پر، طالب علموں پر، اخباروں پر، جو زیادتیاں پچھلے زمانہ میں ہوتی رہی ہیں، خفیہ پولیس کی تاک جھانک سے انھیں جس طرح

تنگ کیا جاتا رہا ہے، اس کا سد باب ہو جائے۔ اس سے آزادی اور سچی خدمت قومی کی قوتیں اور ولولے ترقی کریں گے۔ اور جب دستور کی بنیادی خامیوں کی وجہ سے اس کا چلانا ممکن نہ رہیگا تو یہ قوتیں کام دیں گی۔ پھر یہ وزرا اپنی شخصی مثال سے اور اپنے حکم سے اس کا اہتمام کر سکتے ہیں کہ سرکاری عہدہ دار اپنے کو قوم کا خادم سمجھیں۔ یہ ممکن ہونا چاہئے کہ اب لوگ پولیس کے پاس شکایت لے جانے سے اس لئے نہ ڈریں کہ خود مصیبت میں پھنس جائیں گے اور عدالت میں اس وجہ سے نہ جانا چاہیں کہ قدم قدم پر رشوت دیتے دیتے اپنے مطالبہ سے زیادہ زیر بار ہو جائیں گے۔ خفیہ پولیس کا رخ آسانی کے ساتھ سیاسی جلسوں کی طرف سے موڑ کر عدالتوں کی جانب کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہاں یہ بھی اس رشوت کے "قومی ادارہ" سے تمتع نہ کرنے لگیں!

یہ سُدیشی کی تحریک کو، قومی تعلیم کے کام کو، دیہات سدھار کی کوششوں کو، جنھیں ابتک غیر سرکاری قوتیں انجام دیتی رہی ہیں اپنی تھوڑی سی توجہ سے بہت پھیلا سکتے اور بہت مضبوط کر سکتے ہیں۔ اگر وسائل کی کمی خود حکومت کو اس کا موقع نہ دے کہ وہ ان کاموں کو پوری طرح خود انجام دے تو شاید اچھا ہی ہے، بہتر یہی ہے کہ یہ کام غیر سرکاری طور پر انجام پائیں اور دفتریت کی مرجھانے والی ہوا سے دور ہی رہیں، مگر حکومت کی ہمدردی اور توجہ سے ذرا زیادہ آسانی کے ساتھ فروغ پا سکیں۔

یہ وزارتیں باوجود وسائل کی کمی کے یہ کر سکتی ہیں کہ اپنے زمانہ اقتدار میں اپنے صوبہ میں ان آزادی دشمن افراد اور جماعتوں کے زور کو توڑ دیں جو گاؤں گاؤں اور شہر شہر قوم کی گردن پر تسمہ پا کی طرح مسلط ہیں۔ یہ وزارتیں ہمدرد ماہروں کی مدد سے اپنے صوبوں کی زراعتی، صنعتی، تعلیمی، ضرورتوں کی کلی تحقیق کرا سکتی ہیں جن کے بغیر وسائل ہاتھ آجانے کے بعد بھی کوئی پائدار تبدیلی کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ یہ وزارتیں اپنے عمل سے اس بے اعتمادی کو بہت کچھ کم بلکہ ختم کرانے میں مدد دے سکتی ہیں جو ملک کے ہندو مسلمانوں میں باہم اس وقت پھیلی ہوئی ہے۔ افسوس کہ صوبجات متحدہ میں کانگریس اور مسلم لیگ میں وزارت کے معاملہ میں سمجھوتہ کی کوششیں ناکام رہیں، ورنہ حکومت کے

کاروبار میں ان دونوں جماعتوں کا تعاون اس بے اعتمادی کے رفع کرنے میں بہت کچھ مدد دیتا۔ مگر یہ نہیں کہ اس کے مواقع ختم ہو گئے۔ ہر روز ایسے مواقع پیدا ہوں گے کہ وزارت اپنے عمل سے اس بے اعتمادی کو کمزور اور بالآخر مٹانے کی کوشش کر سکے گی۔ لیکن یہی مواقع اگر صحیح طور پر استعمال نہ کئے گئے تو بے اعتمادی کو بڑھا بھی سکتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا' تو وزارتوں کے سارے مہتم بالشان سے مہتم بالشان کارنامے ایک طرف ہوں گے اور قومی مستقبل کے ساتھ یہ ایک خیانت ایک طرف۔ اور اس خیانت کا بوجھ زیادہ ہی ہوگا۔ اس لئے کہ جب موجودہ کانگریسی وزارتیں دستور کے نقص کی وجہ سے بنیادی تبدیلیوں سے قاصر ہیں تو پھر تو ان کی کامیابی کا معیار بس یہ ہے کہ وہ قوم کو اس دستور کے بدلوانے اور پوری قوت اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کے لئے تیار کرتے ہیں یا نہیں۔ اور جب تک وہ ہندو مسلمان کی یہ باہمی بے اعتمادی ـــــ چاہے وہ کتنی ہی غیر منطقی اور غیر عقلی ہی ثابت کی جا سکے ـــ رفع نہ کریں یہ تیاری پوری نہیں کہی جا سکتی۔ ان وزارتوں پر ہماری قومی زندگی کے مستقبل کی ذمہ داری ہے خدا کرے یہ اس سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوں۔

ذ۔ ح



"مسولینی صاحب کے نرالے تیور"
کسی نہ کسی سے کسی نہ کسی بات پر ضرور لڑیں گے!!

شمالی یورپ | رسالہ جامعہ کی پچھلی اشاعت میں ایک مضمون شمال کے برفیلے رقبہ میں روس کی صنعتی، بحری اور جنگی تیاریوں کے متعلق شایع ہوا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ روسی اس علاقہ میں کس انہماک سے کام کر رہے ہیں۔ روسی ہوا باز متعدد بار قطب شمالی کے اوپر سے اڑکر امریکہ پہنچ چکے ہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پائیگا کہ قطب شمالی پر کا ہوائی راستہ دنیا کے طیاروں کی شاہراہ بن جائے گا۔ اس لئے کہ ہماری دنیا کے سب اہم مرکز دنیا کے شمالی نصف میں واقع ہیں۔ اگر دنیا کی چھت پر سے اڑکر سفر کیا جائے تو ان مرکزوں کے درمیان کا فاصلہ اس سے کم ہو جاتا ہے کہ زمین کی کمر کے چاروں طرف اُڑکر اسے طے کیا جائے۔ لندن سے ٹوکیو جانے کے لئے اگر خط استوی کے پاس پاس جائیے تو زیادہ دور کا سفر ہے قطب شمالی پر سے اُڑکر پہنچ جائیے تو کم۔ یہی حال ماسکو سے سین‌فرانسسکو یا نیویارک سے شنگھائی کے سفر کا ہے، پھر اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ روسی اپنے ہوائی جہازوں کو مشرق بعید میں ایسے راستہ سے بھیج سکتے ہیں جہاں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ دشمن کے ہوابازوں کو نہ تو اس سرد علاقہ میں اڑنے کی مشق ہوگی نہ لاسلکی کے وہ قطبی مرکز ان کے ہاتھ میں ہوں گے جو روسی ہوابازوں کو منٹ منٹ کی خبر دیتے ہیں۔ روس جاپان کی جنگ ہوئی تو روسی ہوائی جہاز جاپانی محاذ پر عقب سے حملہ کر سکیں گے۔ اور اگر امریکہ روس کے ساتھ ہوا تو برابر روس کی مشرقی فوج کو قطب کے اوپر سے ہو کر سامان پہنچ سکے گا، اور جاپانی اس راستہ میں کچھ نہ کر سکیں گے۔

لیکن اس جاپانی۔ روسی جنگ سے زیادہ آج کل روس اور جرمنی میں جنگ کے امکانات پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ لندن کے اخبار پچھلے دنوں شمال میں فوجی تیاریوں کی عجیب عجیب داستانیں شایع کرتے رہے ہیں۔ کسی نے رات کو ناروے اور سویڈن کے شمال میں فوجی طیاروں کو اڑتے دیکھا ہے، کسی نے ایک جرمن آبدوز کو چھپ کر ساحل کے پاس آتے دیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنرل بلوم برگ بھی خفیہ طور پر ناروے کے ساحل کا تفصیلی معائنہ کر گئے ہیں، مرمانسک بندرگاہ میں روس بھی پوشیدہ تیاریاں کر رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شمال کے یہ ممالک عرصہ سے جنگ سے مامون ہیں۔ سویڈن اور ناروے تو نپولین کے

عہد کے بعد سے محفوظ رہے ہیں، ڈنمارک ۱۸۶۴ء میں پروشیا سے لڑا تھا اس کے بعد سے کسی سے نہیں - یہ ملک جمعیۃ اقوام اور امن عالم کے بھی بڑے حامی ہیں۔ انھوں نے اب تک بلا کسی شرط کے اور دوسروں سے بھی اس کا مطالبہ کئے بغیر اپنی فوجی قوت کو گھٹایا ہے۔ لیکن آج دنیا کے اس پرامن حصہ میں بھی ہر دم جنگ کا ذکر ہے۔ بات یہ ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے اس شمالی علاقہ میں کل چار با اختیار ریاستیں تھیں آج دس ہیں - نئی ریاستیں کچھ پرانے روسی علاقہ میں سے بنائی گئی ہیں، کچھ جرمن علاقہ میں سے - روس اور جرمن کی موجودہ رقابت سے ان ریاستوں کے لئے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔

سب سے زیادہ خطرہ میں ڈنمارک ہے - جسے جنگ کے بعد جرمنی کا کچھ علاقہ بھی دیا گیا تھا۔ اس چھوٹے سے ملک کا ساحل ساڑھے تین ہزار میل سے زیادہ کا ہے۔ اور کہیں کوئی ساحلی چٹان نہیں، سب صاف سپاٹ میدان - جرمنی کو کچھ تو اپنا علاقہ واپس لینے کا حوصلہ ہے، کچھ یہ کہ سرحد کے پاس ہی اس کے ہوائی جہاز والے بعض جنگی صنعتوں کے خاص مرکز ہیں - ڈنمارک کسی طرح اپنی حفاظت نہیں کرسکتا۔ ان کے مشہور سیاسی ہوئرپ کا قول تھا کہ یہ "اسلحہ کس کام کے؟" چنانچہ اس نے اپنی فوجوں کو برابر گھٹایا - آج کل ۸ ہزار فوج ہے، ۵۰ ہوائی جہاز ہیں، اور بیڑہ کا مجموعی وزن ۱۱ ہزار ٹن! لیکن باوجود اس بے بسی کے یہ بھی اب جنگ کے لئے کچھ نہ کچھ تیاری کررہا ہے۔

سویڈن کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں اچھا لوہا نکلتا ہے - اور اس لوہے کا بہت بڑا حصہ جرمنی کو جاتا ہے - پچھلے سال میں جتنا کچھ لوہا جرمنی میں آیا اس کا تقریباً آدھا سویڈن سے خریدا گیا ہے - اور جرمنی جنگ میں مبتلا ہو جائے تو شاید لوہا حاصل کرنے کا ایک موقع بس سویڈن سے ہی ہو۔ روسی چاہیں گے کہ یہ رسد بند ہو جائے۔

ناروے اس جھگڑے میں یوں آلودہ ہوسکتا ہے کہ یہ لوہا جاتا ہے اس کے بندرگاہ نارِوک سے جو سویڈی کانوں کے قریب ہے۔ چنانچہ سویڈن اور ناروے بھی اپنا فوجی خرچ بڑھا رہے ہیں فنستان جس نے روس سے الگ ہو کر آزادی حاصل کی ہے اب اپنے دوسرے شمالی ساتھیوں کے

ملا ہوا ہے - جنگ کے بعد بحیرہ بالٹک کے جزائر آلینڈ اسے دے گئے تھے، حالانکہ سویڈن انھیں اپنا حق سمجھتا تھا۔ سویڈن کو خوش کرنے کے لئے ۱۹۲۱ء میں یہ طے ہوا تھا کہ ان جزائر کے فوجی قلعے مسمار کر دئیے جائیں۔ لیکن اب میل کا یہ حال ہے کہ مشترکہ اغراض کے تحفظ کے لئے سویڈن والے اس پر راضی ہیں کہ ان جزائر کو فوجی مرکز بنا دیا جائے۔ اور روس والے اس پر خاصے برہم ہیں۔

غرض اس علاقہ میں بھی جنگ کا خوب چرچا ہے۔ لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ ان امن پسند ملکوں کی فوجی تیاریاں نہ روس سے حفاظت کے لئے کافی ہوں گی نہ جرمنی سے، اس لئے یہ اس فکر میں ہیں کہ برطانیہ سے روابط بڑھائیں کہ وہ جنگ کی حالت میں ان کی مدد کرے۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ اپنے باہمی اتحاد عمل کو بڑھا کر معاشی تعاون کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ جنگ کی صورت میں یہ دوسروں کے بالکل دست نگر نہ ہوں۔ (ذ - ح)

چینی جاپانی تعلقات | یہ اقتباس ایک مشہور جاپانی رسالہ "نگی شنجو" سے لیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ جاپانی، چین سے اپنے تعلقات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ دوسرے نانکنگ کی حکومت پر چینی اشتراکیوں کے اس اثر کی جو متحدہ چین' کی تحریک کے سلسلے میں پڑا ہے، (جس کا ذکر تفصیل سے ہم اپنی پچھلی اشاعت میں کر چکے ہیں) کچھ دلچسپ تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں۔

کچھ دن ہوئے میں سیر و سیاحت کی غرض سے چین کے شمالی علاقے میں گیا تھا۔ یہاں میں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ لوگوں کو کہتے سنا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ چینی جاپانی تعلقات اس وقت تک خوش گوار نہیں ہو سکتے جب تک کوئی بنیادی فیصلہ نہ ہو جائے۔ ۲۵ / جنوری ۳۷ء کو میں تین تسین (TIENTSIN) پہنچا۔ ایک دن یہاں کے ایک بڑے بازار سے گزر رہا تھا کہ یکایک میری نظر چین کے ایک نقشے پر پڑی جو ایک بہت بڑے کتب فروش کی دوکان میں شیشے کی بیرونی کھڑکی میں لٹک رہا تھا۔ اگرچہ یہ نقشہ مئی ۱۹۳۶ء کا چھپا ہوا تھا لیکن اس میں منچوریا کو چین کا ایک حصہ دکھلایا تھا اور اس کے تمام صوبوں اور شہروں کے نام وہی تھے جو "مان چوکو" کی تعمیر سے پہلے تھے۔ اسی

طرح دیواروں اور تار کے کھمبوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے دیکھے جن میں قومی نعرے درج تھے۔ سرحد کے انتشار نے چینیوں کے قومی جذبے کو جس شدت کے ساتھ اُبھارا تھا جاپانی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ گھڑی ہوئی بے بنیاد باتیں متحرک تصویروں کے ذریعہ دکھائی جاتی تھیں اور جاپان کے خلاف چینیوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی جاتی تھی۔ برخلاف اس کے جاپانی سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی خوشی سے سوئین کی جنگ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانی موثر پروپگنڈا کرنا نہیں جانتے۔

اس سفر میں "سیان" کے حادثے کے متعلق جو باتیں مجھے معلوم ہوئیں وہ ان روایات سے بالکل مختلف ہیں جو جاپان میں بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً جاپان میں کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ اس جنگ میں "ماؤ سے تنگ"، "چو طے" (MAE TSE TUNG ' CHUTE.) اور چو یولائی کمیونسٹ رہنما بھی شریک تھے۔ چین میں یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ مارشل چیانگ کائی شک کی رہائی کے سلسلہ میں نانکنگ کے مدبرین نے اس عام جذبے کی حمایت کا یقین دلایا تھا جو جاپان کے خلاف تمام چین میں پھیلا ہوا تھا۔ نیز اُنھوں نے ۶۰ (ساٹھ) لاکھ "یان" چاندی کی اور تیس لاکھ بنک کے نوٹوں کی شکل میں کمیونسٹوں کی سپاہ اور (CHANGHSUEHLIANG) اور چانگ سوے لیانگ اور یانگ ہوچنگ (YANG HU CHANG) کی فوجوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا سرخ فوج کے لئے بہت سے ہتھیار اور جنگی ساز و سامان مہیا کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔ اس میں موٹر گاڑیاں اور بسیں ہوائی جہاز بھی شامل تھے جو سیان میں حکومت نانکنگ کے قبضے میں تھے۔ ان کے علاوہ حکومت کا یہ بھی وعدہ تھا کہ وہ ہر مہینہ نصف لاکھ یان ( ) یانگ ہوچنگ کی معرفت سرخ فوج کو دیتی رہیگی۔ یہ ہیں وہ واقعات اور تفصیلات جن پر جاپان کو خاص طور سے غور کرنا چاہیئے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ سیان کے حادثے کی تحقیقات کرے۔ اسی کے ساتھ ساتھ چین میں پیش آنے والے آئندہ واقعات کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے اور پھر طے کرنا چاہیئے کہ چین کے معاملات میں اس کا کیا رویہ رہیگا۔

اسی کے برابر اہم وہ اعلان بھی ہے جو کومن تانگ نے شائع کیا ہے اور جو ایک اعتبار سے سیان کے حادثے کے جاری رہنے کا سبب بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس اعلان میں بار بار اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ کومن تانگ مملکت چین میں کسی قسم کی شورش پسند نہیں کرتی اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس وقت تک چینی اور جاپانی تعلقات کی تجدید ناممکن ہے جب تک مشرقی ہوپی کی حکومت اور خود ہوپائی اور چہار کا ملکی نظم ونسق بیرونی انتداب سے پاک نہ ہو جائیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ چین اور جاپان کے رجحانات میں کس قدر اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ ایک طرف جاپان یہ سمجھتا ہے کہ مانچوکو ایک خودمختار ریاست کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ چین سے ہر طرح علیحدہ ہے۔ دوسری طرف چین تعلقات کی تجدید اس وقت تک کرنے کے لئے تیار نہیں جب تک مانچوکو پہلے کی طرح اس کے قبضہ میں نہ آ جائے۔ اور چین کو کاروباری تعلقات میں برابر کا مرتبہ نہ حاصل ہو جائے۔

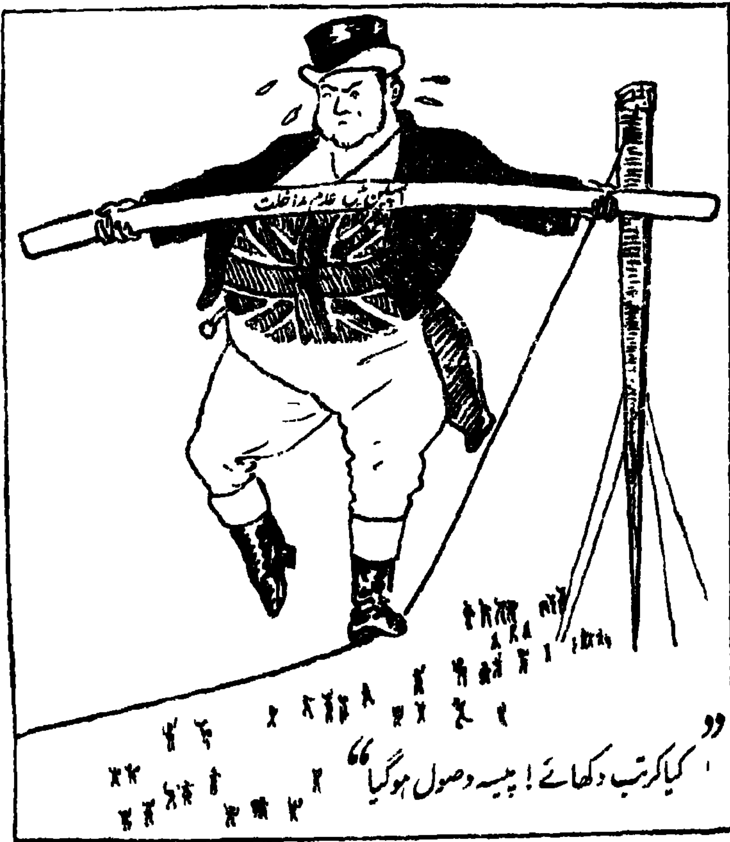
دوسری طرف روسی حکومت شمالی چین میں اپنا اقتدار بڑھاتی چلی جارہی ہے۔ چینیوں کی سرخ فوج کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اور سیان کے حادثے کے بعد سے جنگی سازوسامان میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر کام آ سکے۔ اگرچہ خود چین میں ابھی اتنی قوت نہیں پیدا ہوئی کہ وہ جاپان کا مقابلہ کر سکے، لیکن چینیوں کی سرخ فوج سے نانکنگ کا پلہ بھاری ہوتا چلا جا رہا ہے اگر لڑائی چھڑ جائے تو یقیناً چینیوں کی سنٹرل فوج سرخ فوج کے جرنیلوں کے بڑھنے کے لئے راستہ صاف کر دے گی۔ چین سے کوئی معاملہ کرتے وقت جاپان کو یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ چین میں جاپانیوں کی مخالفت کی اصل وجہ یہی سرخ فوج رہی ہے۔

غرض شمالی چین میں اپنی سیاحت سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ موجودہ جمود پر غالب آنے کے لئے جاپان کو مناسب ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ اسے چاہیئے کہ وہ فروعی باتوں کو چھوڑ کر چینی جاپانی تعلقات استوار کرنے کے لئے نانکنگ کی حکومت سے بنیادی مسائل طے کرے!

پہلا بنیادی مسئلہ مانچوکو کی ریاست کا ہے۔ جاپان کو چینیوں کے سامنے مانچوکو کے وجود کی غرض وغایت کی اچھی طرح تشریح کر دینی چاہیئے اور نانکنگ کی حکومت سے یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ وہ

مانچوکو کی نئی حکومت کو ایک خود مختار ریاست تسلیم کرلے - دوسرا ضروری مسئلہ یہ ہے کہ چین اور جاپان کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہوجانا چاہیئے جو چین سے کمیونسٹ تحریک کا خاتمہ کردے - دوسرے مسائل کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ مشرق سے کمیونزم کا بالکل خاتمہ ہوجائے - اس کے بعد اگر نانکنگ کی حکومت کے رویہ سے یہ ظاہر ہو کہ وہ مشرق بعید میں سرخ فوجوں کی قوت دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کرنا چاہتی تو پھر جاپان کو مجبوراً چین میں ایک قابل اعتماد (!) حکومت قایم کرنی پڑے گی اور اگر جاپان ایشیا میں کوئی نئی روح نہیں پیدا کرنا چاہتا اور نہ اس میں اس کی اہلیت ہے تو اُسے براعظم سے دست کش ہوجانا چاہیئے۔

(ب - ل)



سیاسی بازیگری

تعلیمی دنیا

گورنمنٹ آف انڈیا کے ماہرین تعلیم مسٹر ووڈ اور ایبٹ کی رپورٹ شائع ہوگئی ہے۔ رپورٹ کا بنیادی اصول کتابی تعلیم کی مخالفت اور فنی اور صنعتی تعلیم کی حمایت ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے رپورٹ میں نظام تعلیم کی نئی تشکیل کے لئے سفارشات کی گئی ہیں۔

حکومت تجربی طور پر دہلی اور لاہور میں دو صنعتی ادارے کھولنے کا ارادہ کررہی ہے۔ دہلی میں تو اس اسکول کے نصاب کا تعلق صنعت پارچہ بافی سے ہوگا جو دہلی کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ لاہور میں کوئی بڑی صنعت نہیں اس لئے وہاں کا مدرسہ ریلوے کے محکمہ کے لئے طلبار کی تربیت کا انتظام کرے گا۔ بالخصوص ڈاک اور تار اور محکمہ رفاہ عامہ کی تعلیم پر توجہ دی جائے گی۔ اس سلسلے میں محکمہ تعلیم کی طرف سے ان تمام محکمہ جات کا پورا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ تاکہ طلبار کو تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت حاصل کرنے میں مناسب سہولتیں بہم پہونچائی جاسکیں۔

مہاتما گاندھی نے اخبار ہریجن میں مسئلہ تعلیم پر اپنے ذاتی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:-

"ہر بچے کی تعلیم کسی مفید دستکاری سے شروع ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنی تربیت کے آغاز سے ہی اپنے ہاتھ سے چیزیں بنانا شروع کردے۔ اور اگر حکومت مدرسوں کی تیار کردہ اشیار کو خریدنے کا انتظام کردے تو ہر سکول مالی لحاظ سے اپنی مدد آپ کر سکیگا۔ طریقہ تعلیم کے متعلق گاندھی جی کا خیال ہے کہ پہلے تعلیم زبانی ہو اور بعد میں الف بے پڑھائی جائے۔ یہ تجویز بادی النظر میں تو حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے مگر اس سے محنت میں بہت بچت ہوگی۔ اور طالب علم سال بھر میں ہی بہت کچھ سیکھ سکے گا۔ مہاتما جی نے ابتدائی تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ اور نیز اس امر پر توجہ دلائی ہے کہ انگریزی زبان کی تدریس کی اہمیت کم کرنا چاہیئے۔ کالج کی تعلیم کا حیات ملی سے گہرا تعلق ہونا چاہیئے۔ اور صنعتی و حرفتی اداروں اور ٹکنیکل شعبوں کا کارخانوں سے الحاق ہونا چاہیئے۔ مثلاً ٹاٹا کا کارخانہ اک انجینیرنگ کالج اپنی طرف سے جاری کرے۔

کچھ عرصہ ہوا، ڈاکٹر ٹیگور نے ایک ایسی انجمن کے قیام پر زور دیا تھا جو ان اشخاص کے لئے تعلیمی سہولتیں بہم پہونچا سکے جنہیں کبھی درسی تعلیم کا موقعہ نہیں ملا۔ اس انجمن کے مقاصد میں سے مختلف مضامین پر مفید مطلب کتابوں کی فہرستیں مرتب کرنا، ایسی موضوعات پر کتابیں تیار کرنا جو بازار میں دستیاب ہی نہیں ہوسکتیں، اور مختلف مرکزوں میں ایسے طلبار کے امتحان لینا جنہوں نے اس سلسلے میں تعلیم پائی اور نتائج کے طور پر اسناد عطا کرنا۔ وشوابھارتی نے اس کام کو اپنے ذمے لے لیا اور بنگال کے لئے ان تجاویز کا خاکہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

تحریک تعلیم بالغان انگلستان میں ۱۷۹۸ء میں شروع ہوئی اور آج نیشنل ایڈلٹ سکول یونین کے زیر اہتمام ۱۴۰۰ سے زائد مدرسے اس اہم فرض کو انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارے کا تعلق ایک دوسری تحریک سے بھی ہے جس کا مقصد تعلیم بالغان کے اصولوں کا تمام دنیا میں پرچار کرنا ہے۔ اس کی بین الاقوامی کمیٹی کچھ عرصے سے ہندوستان میں مسئلہ تعلیم بالغان پر خاص طور پر توجہ دے رہی ہے۔ اسی سلسلے میں مسٹر ولیم ارسان کی بیوی نے پچھلے موسم سرما میں ہندوستان کا ایک تعلیمی دورہ کیا جس کے دوران میں ان کو ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی اداروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بالخصوص ناگپور میں انھوں نے نیشنل کرسچین کونسل کے مباحثوں میں شرکت کی۔ مسئلہ تعلیم بالغان کونسل کے اس اجلاس کا خاص موضوع تھا۔ نیشنل یونین کی طرف سے ہندوستان میں تعلیم بالغان کے موضوع پر ایک "ہینڈ بک" تیار کی جارہی ہے جس میں ہندوستانی اور انگریزی ماہرین تعلیم کے مقالات ہونگے۔ ان میں سر رادھا کرشنن اور پروفیسر سیدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نیز انجمن تعلیم بالغان دہلی، شہر میں تعلیم بالغان کا ایک مرکز قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔

ڈاکٹر نیل کنٹھ داس رائے نے اندھوں کی تعلیم کے لئے ہندوستان کی ضروریات کے مطابق بریل سسٹم ایجاد کیا ہے جو تمام ہندوستانی زبانوں کے لئے کام آسکے گا۔ مرکزی مشاورتی بورڈ اس ایجاد میں خاص دلچسپی لے رہا ہے اور صوبائی حکومتوں کی رائے بھی اس کے جاری کرنے کے سلسلے میں دریافت کی جارہی ہے۔

ریاست بڑودہ کی پچھلے سال کی تعلیمی رپورٹ کے مطالعہ سے ریاست میں تعلیمی ترقی کے متعلق بعض دلچسپ باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو برطانوی ہند کے ماہرین تعلیم کے لئے بھی قابل توجہ ہیں۔

ریاست میں لازمی ابتدائی تعلیم کی برکت سے پچھلے دس سال کے اندر پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں ۵۹ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اس سال ۵۳ دیہاتی کتب خانے اور ۸ عورتوں اور بچوں کے کتب خانے قائم کئے گئے۔ ٹرینڈ اساتذہ کی تعداد بڑھانے کی پالیسی پر شدت سے عمل کیا گیا۔ نیز تمام ممکن وسائل مثلاً ریفرشر کورس تعلیمی رسائل اور پرچوں تنخواہ کے اضافے، بونس وغیرہ سے اساتذہ کی لیاقت اور قابلیت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی۔

حکومت مدراس نے تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں ایک اعلان شائع کیا ہے۔ لازمی تعلیم کے متعلق حکومت کا خیال ہے کہ فی الحال جبریہ تعلیم سے زیادہ اہم مسئلہ موجودہ مدارس کی تعلیمی اصلاح ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم کا معیار گھٹا کر ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کو زیادہ ترقی دی جائے۔ مڈل اور ہائی اسکولوں کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں۔ یونیورسٹی میں داخلے پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ اس آخری مقصد کی تکمیل کے لئے حکومت قوانین ملازمت میں ضروری ترمیم کے لئے آمادہ ہے۔

برٹش گی آنا کے ہندوستانی باشندگان نے دوسری ہندوستانی کانفرنس کے موقع پر حکومت سے استدعا کی ہے کہ ان کو پبلک بورڈوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔ جبریہ تعلیم کا قانون زیادہ سختی سے نافذ کیا جائے تاکہ ہندوستانی طبقے میں خواندگان کی تعداد میں معقول اضافہ ہو سکے۔ نیز ٹریننگ کالج میں ہندوستانی طلباء کیلئے زیادہ تعداد میں نشستیں مخصوص کردی جائیں۔

ہوائی کی یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے ہندوستانی تہذیب وتمدن کا اک شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا نام "اورینٹل انسٹیٹیوٹ" ہوگا مسٹر سنکلیر ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ کے قول کے مطابق۔ ہندوستان کی تہذیب اور اس کے ادبی خزائن اہل یونان اور روما کے تمدنی شاہکاروں سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اس مقصد کیلئے یونیورسٹی

کی طرف سے ڈاکٹر کالیداس ناگ کلکتہ یونیورسٹی کو ہندوستانی تمدن کے موضوع پر چھ تقاریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ جن میں ہندوستانی ادب۔ آرٹ۔ فن سنگ تراشی مصوری وغیرہ پر بحث کی گئی۔ ڈاکٹر ناگ انسٹیٹیوٹ کی بنیادی تشکیل اور انتظام میں بھی بطور ماہر ادب و فنون ہند مشورہ دے رہے ہیں۔

پروفیسر سر پی سی۔ رے استاذ کیمیا کلکتہ یونیورسٹی پچھلے دنوں بوجہ ضعیف العمری اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے ہیں۔ پروفیسر موصوف ہندوستان میں علم کیمیا کی تدریس اور تحقیقات کے پہلے علمبردار ہیں۔ نہ صرف انھوں نے سینکڑوں طلبا کو علم کیمیا کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ بلکہ ہندوستانی صنعت دوا سازی بھی ان کی کچھ کم مرہون منت نہیں۔ بنگال فارمیسوٹیکل کمپنی کو جاری کرکے انھوں نے ولایتی اور ہندوستانی ادویہ کی صحیح کیمیائی تربیت اور خالص پیداوار کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ نجی زندگی میں پروفیسر موصوف قرن اولے کے اساتذہ کا نمونہ ہیں طبیعت میں انتہائی سادگی ہے۔ انھوں نے اپنی بیش قرار تنخواہ ہمیشہ طلبا کے وظائف اور امدادی رقوم کے لئے وقف رکھی۔ اور پچھلے دنوں ہی انھوں نے اپنے کمپنی کے سالہا سال کے جمع شدہ منافع کو یونیورسٹی میں کیمیادی تحقیقات کے لئے وقف کردیا۔ آپ نے اعلان کیا ہے کہ وہ درسی کام سے فارغ ہوکر دیہات سدھار پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں گے۔ قارئین جامعہ کے لئے یہ امر باعث دلچسپی ہوگا کہ پروفیسر موصوف نے جامعہ ملیہ کے پہلے تقسیم اسناد کے جلسہ میں ایک معرکتہ الآرا صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اور اس کے بعد بھی ہمیشہ جامعہ کے کام میں گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شاہ سلیمان چیف جسٹس الہ آباد نے دنیائے سائنس کے سامنے نظریۂ اضافیت کے مقابل ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے جو نیوٹن کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ان دو متضاد نظریوں کا حتمی فیصلہ ان علمی تجربات اور مشاہدات پر ٹھہرا جو پچھلے اپریل میں سورج کے مکمل گرہن پر جاپان میں کئے گئے تھے۔ حکومت ہند نے اس غرض کیلئے ڈاکٹر رائیڈ کو ایک علمی وفد کا قائد بنا کر بھیجا تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے مشاہدات کی بنا پر حال ہی میں رائل سوسائٹی لندن میں ایک مقالہ پڑھا ہے۔ جس میں ڈاکٹر سلیمان کی پیشین گوئی کو صحیح اور نظریۂ اضافیت سے حساب کردہ پیش گوئی کو تجربی طور پر غلط بتایا۔ ڈاکٹر سلیمان نے ستاروں کی شعاع کے متعلق جو پیشین گوئی کی ہے۔ اس پر ڈاکٹر میخائی لوف کام کر رہے ہیں اور اس کے نتائج

بھی چند ماہ میں شائع ہو جائیں گے۔

جامعہ ازہر کے مفتی اعظم شیخ المصطفیٰ مراغی نے اعلان کیا ہے کہ وہ عنقریب دنیا بھر کے مسلم علماء کو ایک نمائندہ اجتماع میں شریک ہونے کی دعوت دینگے جو امور ذیل کو بحث و نظر کے بعد قابل تعمیل بنا سکیگا۔ (۱) اسلامی دنیا میں دینی مدارس کے قیام کا مسئلہ۔ (۲) نصاب دینیہ کا تعین اور طریقہ تعلیم کی اصلاح۔ (۳) تبلیغ اسلام کے اسباب و وسائل وغیرہ۔ شیخ المصطفیٰ المراغی ان چند روشن خیال اور بلند حوصلہ علماء میں سے ہیں جو ہمارے دینی نصاب و طریق تعلیم کی اصلاح کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ شیخ موصوف نے پچھلے دنوں ہی جامعہ ازہر میں بنیادی اصلاحات جاری فرما کر بنائے اسلام پر احسان کیا ہے۔ نیز چین۔ جاپان۔ ہندوستان۔ سوڈان وغیرہ میں علماء کے وفود بھیج کر اشاعت اسلام کے سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ شیخ موصوف کی قیادت میں اجتماع مذکور اپنے نیک مقصد میں کامیاب ہوگا۔

چند مخلص قومی کام کرنے والی خواتین کی کوششوں سے روس کے بعض شہروں میں والدین کے لئے یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ یہ ادارے والدین کے لئے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور نگرانی کی راہ پر مشعل ہدایت کا کام کرینگے۔ نصاب کے بڑے اہم مضامین شادی اور کنبہ۔ بچوں کی تربیت۔ بچے اور بچیوں کے فالتو اوقات کا صحیح استعمال وغیرہ ہونگے۔ ان جماعتوں میں مرد اور عورتیں بڑی تعداد میں داخل ہو رہی ہیں۔ بالعموم یہ ادارے کلب گھروں کے قریب کھولے گئے ہیں اور زمانۂ تعلیم سات ماہ سے دس ماہ تک ہے۔

بین الاقوامی پی۔ ای۔ این کانگریس کا پندرھواں اجلاس پیرس میں منعقد ہوا جس میں آزادیٔ تحریر کے موضوع پر بہت سی ضروری تجاویز متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔ ایچ جی ولز کانگریس کے پرانے صدر نے ایک پیغام بھیجا جس میں آزادی تحریر و تقریر پر بندشوں اور سختیوں کی شدید مذمت تھی۔

ایک تجویز میں حکومت جرمنی کی ان پابندیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی جو مقررین اور مصنفین پر عائد کردی گئیں ہیں بالخصوص حکومت کے اس اقدام پر سخت نکتہ چینی کی گئی کہ حکومت نے کارل فان اوزٹیسکی کو جنہیں

نوبل پرائز ملا تھا اوسلو جانے سے روکا۔ نوبل پرائز کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انعام پانے والے اصحاب کو اوسلو میں ایک کمیٹی کے سامنے حاضر ہونا پڑتا ہے۔ اور اپنے خاص مضمون پر اک تقریر بھی کرنا ہوتی ہے۔

ایک تجویز میں اسپین کی موجودہ حالت پر اظہار افسوس کیا گیا۔ اور غرناطہ میں مشہور اسپینی شاعر گارسیا لورکا کے قتل کی سخت مذمت کی گئی۔ کیونکہ متوفی نے اسپین کی سیاسی جنگ میں کسی گروہ کی بھی طرفداری نہ کی تھی۔ ایک بہت اہم تجویز میں ان پابندیوں کی شدید مذمت کی گئی جو بعض یورپی ممالک میں اقلیتوں کے تمدن اور تہذیب پر عاید کی گئی ہیں۔

اس کانگریس میں کا۔ل کاپک (چکوسلوویکیا)۔ جیمز جائس (آئرلینڈ)۔ ڈاکٹر امیہ چیٹرجی (ہندوستان)۔ جے۔ بی پریسٹلے (انگلستان) وغیرہم نے شرکت کی۔

ورلڈ فیڈریشن آف ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کا ساتواں اجلاس ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ مضامین زیر بحث میں سے چند عنوان تعلیمی آزادی، ریڈیو کے ذریعہ السنۂ جدید کی تدریس، ریڈیو کی نفسیات، تعلیمی صنعت و حرفت، ریڈیو کے ذریعہ ورزش، گھر اور مدرسہ کا اتحاد عمل، تعلیم کے ذریعہ بین الاقوامی یک جہتی اور مفاہمت تعلیم اخلاق، دیہاتی تعلیم وغیرہ ہیں۔ مقررین میں سے خاص سربرآوردہ اصحاب سر حسن سہروردی نائب صدر میڈیکل کونسل ہند، ہیڈ پروفیسر پال منرو، ٹیچرز کالج کولمبیا، ڈاکٹر سٹیفن ڈگن ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن ہیں۔

اس سلسلے میں جاپان کے فوجی آرٹ کی نمائش کا انتظام کیا گیا ہے جس کا انصرام واسیدا (Waseda University) اور ٹوکیو امپیریل میوزیم کے ہاتھ میں ہے۔ پھولوں کی نمائش ان اساتذہ کے ہاتھ میں ہے جو پرانے سجاوٹ اور ترتیب کے اصولوں کے ماہر ہیں۔ نمائش میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ نہ صرف پھولوں کی زیبائش کے پرانے اصولوں کا مظاہرہ ہو بلکہ مہمانوں کو ان مختلف طریقوں سے بھی آگاہ کیا جائے جن سے یہی اصول نئے گھروں کی زیب و زینت کے لئے کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتے ہوں۔

ہر صبح کانفرنس میں بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے متعلق فلمیں دکھائی گئیں۔ کانفرنس کی طرف سے مہمانوں کی واقفیت اور تفریح کے لئے تاریخی اور علمی سیروں کا انتظام کیا گیا۔

پچھلے دنوں انگلستان کے چند علمی حلقوں کی طرف سے تجویز پیش کی گئی تھی کہ لندن میں ہندوستانی آرٹ کی نمائش کی جائے۔ امید ہے کہ یہ تجویز اگلے موسم سرما تک عمل میں آجائے گی۔ اس سے پہلے لندن میں چینی اور ایرانی آرٹ کی نمائشیں ہو چکی ہیں جو ہر طرح کامیاب رہیں۔ ہندوستان میں بھی فن سنگ تراشی، مصوری، اور دیگر فنون لطیفہ کے نادر شاہکار موجود ہیں۔ خاص لندن میں بھی برٹش میوزیم، البرٹ میوزیم اور انڈیا آفس میں ہندوستانی آرٹ اور صنعت کے بہترین نمونے موجود ہیں۔

اوکسفورڈ یونیورسٹی نے سر عبدالرحیم صدر اسمبلی، سر تیج بہادر سپرو اور سر اکبر حیدری کو ڈاکٹر آف سول لا کی اعزازی ڈگری دی ہے۔

پیامِ تعلیم

اپنے مدرسے سے فارغ ہو کر ظاہر ہے کہ تھوڑا وقت تم ورزش اور کھیل کود میں صرف کرتے ہوگے۔ مگر اس کے بعد کیا کرتے ہو؟ ہم تمھیں بہترین مشغلہ بتائیں! پیامِ تعلیم پڑھا کرو۔ یہ رسالہ محض تمھاری خاطر تو جاری کیا گیا ہے۔ اس میں تمھاری دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے۔ اچھے اچھے اور مزے دار قصّے، کہانیاں، مفید اور دلچسپ معلومات، لطیفے، مفید مشغلے، لیتھو اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس کے پڑھنے کے بعد تمھیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، پچھلے سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایک انجمن بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے۔ اس انجمن کے ذریعے تمھارے لئے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کہ مفید مشغلوں میں تم ایک دوسرے کی مدد کرو۔ تمھاری خاطر ہم نے اس کی قیمت بھی بہت کم رکھی ہے۔

صرف دو روپے آٹھ آنے (عہ) سالانہ

پیامِ تعلیم کا سال نامہ بھی اسی چندے میں ملتا ہے۔ اس کی قیمت خریداروں سے علیحدہ نہیں لی جاتی۔ یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہمارے سال نامہ سے بڑھ کر بچوں کے کسی پرچے نے سال نامہ شائع نہیں کیا۔ اس سال بھی یہ سال نامہ بہت اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔ صرف سال نامے کی قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیرِ ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

جلد ۲۸	اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپے (صہ)   فی پرچہ آٹھ آنے (۸؍)

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پیام تعلیم

اپنے مدرسے سے فارغ ہو کر ظاہر ہے کہ تھوڑا وقت تم ورزش اور کھیل کود میں صرف کرتے ہو گے۔ مگر اس کے بعد کیا کرتے ہو؟ ہم تمھیں بہترین مشغلہ بتائیں! پیام تعلیم پڑھا کرو۔ یہ رسالہ محض تمھاری خاطر جاری کیا گیا ہے۔ اس میں تمھاری دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے۔ اچھے اچھے اور مزے دار قصے، کہانیاں مفید اور دلچسپ معلومات لطیفے، مفید مشغلے، لیتھو اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض اسے پڑھنے کے بعد تمھیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ پچھلے سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایک انجمن بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے۔ اس انجمن کے ذریعے تمھارے لئے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے کہ مفید مشغلوں میں تم ایک دوسرے کی مدد کرو۔ تمھاری خاطر ہم نے اس کی قیمت بھی بہت کم رکھی ہے۔ صرف

دو روپے آٹھ آنے (عہ) سالانہ

پیام تعلیم کا سال نامہ بھی اسی چندے میں ملتا ہے۔ اس کی قیمت خریداروں سے علیحدہ نہیں لی جاتی یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہمارے سال نامے سے بڑھ کر بچوں کے کسی پرچے نے سال نامہ شائع نہیں کیا۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بہار میں اردو کانفرنس

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن استاد جامعہ

۲۸ اور ۲۹ اگست کو پٹنہ میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، اس کی روداد پچھلی اشاعت میں شائع نہیں کی جا سکی اس لئے کہ رسالہ چھاپے خانے بھیجا جا چکا تھا۔ لیکن کانفرنس کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کی کارگذاری اور بحثوں کو اب بھی شائع کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کانفرنس کے اکثر ڈیلیگیٹ ادبی دنیا میں بڑی حیثیت رکھتے ہیں، اور مختلف موقعوں پر جو خیالات ظاہر کئے گئے اور جو فیصلے ہوئے وہ مثال کا کام دے سکتے ہیں۔ کانفرنس انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کے سکرٹری قاضی عبدالودود صاحب، بی اے (کینٹب) کے اصرار پر منعقد کی گئی تھی۔ ان کو یہاں اختصار کے لئے سکرٹری صاحب انجمن کہا جائے گا۔ مولوی عبدالحق صاحب، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، پنڈت برج موہن دتاتریا صاحب کیفی، مولانا ظفر الملک صاحب، پروفیسر غلام السیدین صاحب، پروفیسر رشید احمد صاحب، آل احمد سرور صاحب نے اپنی موجودگی سے کانفرنس کو زینت بخشی۔ میں جناب شیخ الجامعہ صاحب کے ارشاد پر جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا کہ میرے نام بھی دعوت نامہ آگیا۔ غرض کہ میں بھی موجود تھا۔ یہ نہیں معلوم کہ کل کتنے لوگ بلائے گئے تھے۔ بہر حال معذرت کے تار نہیں سنائے گئے اور سکرٹری صاحب انجمن کے چہرے سے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔

۲۸ کی صبح کو ہم سب سکرٹری صاحب کے دولت خانے پر جمع ہوئے۔ بعض لوگوں کو ٹھیک ٹھیک معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا چاہیئے، اس لئے کہ انھیں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی، لیکن بھٹکتے بھٹکتے وہ بھی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ کوئی مہمان باقی نہیں ہے، تو مولانا سید سلیمان صاحب سے صدارت کی درخواست کی گئی، اور انھوں نے سکرٹری صاحب سے کہا کہ انجمن کو بتائیں کہ کیا کرنا ہے اور کس ترتیب سے۔ کانفرنس کا کوئی ایجنڈا تیار نہ تھا، سکرٹری صاحب نے وہ رسالہ

پڑھنا شروع کیا جو تمام ڈیلیگیٹوں کے پاس بھیجا جا چکا تھا اور ان مختلف مسائل کی توضیح کرنے لگے جن کا اس میں ذکر تھا اور توضیح بھی کی جا چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ دو اہم مسئلے ہیں جن پر کانفرنس کو رائے دینا ہے، ایک تو عدالت کی زبان، اور دوسرے تعلیم کی زبان۔ کچھ دیر اس قسم کی باتیں سننے کے بعد سب اس پر متفق ہو گئے کہ عدالت کی زبان صوبجاتی مسئلہ ہے؛ اس پر کانفرنس کا رائے دینا مصلحت کے خلاف ہوگا۔ پھر تعلیمی زبان کا مسئلہ چھڑا، سکرٹری صاحب نے وہ تجویز سنائی جو پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ میں بابو بلدیو سہائے صاحب نے پیش کی تھی، کہ ہندستانی کو، جو صوبے میں عام طور پر بولی جاتی ہے، ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیے۔ اس تجویز کے پیش ہونے کے تھوڑے دن بعد بہار کی انجمن ترقی اُردو کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں سکرٹری صاحب کی رائے جو ہندستانی کے متعلق تجویز سینٹ میں نہایت عجلت کے ساتھ پیش کر دی گئی تھی منظور ہوئی اور ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا جس کا آخری حصہ یہ ہے:۔

”سینٹ کی تجویز میں علمی مضامین کے لئے میٹرکولیشن تک انگریزی کی جگہ ہندستانی ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی ہے لیکن ہندستانی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بالکل ناکافی اور مبہم ہے۔ حامیان اُردو اسے تسلیم نہیں کرتے، اور انھیں بے حد اندیشہ ہے کہ ہندستانی کے نام سے ہندی ذریعۂ تعلیم نہ بنا دی جائے۔ اس جلسے کی خواہش ہے کہ حامیان اُردو کے ایک وفد کو اس کا موقع دیا جائے کہ اس مسئلے کے متعلق اپنے خیالات حکومت کے سامنے پیش کرے اور اس کے بعد ذریعۂ تعلیم کے مسئلے کا فیصلہ کیا جائے۔“

اسی سلسلے کا ایک اور ریزولیوشن یہ بھی تھا:۔

”چونکہ اُردو کا مسئلہ سارے ہندستان کا مسئلہ ہے اور زبان میں انقلاب انگیز تغیر اہل ادب و انشا کے غور و خوض کے بغیر نہایت خطرناک ہے، یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ حکومت بہار ہندستانی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق مرکزی انجمن ترقی اُردو سے دریافت کرے کہ وہ موجودہ زبان میں کس حد تک تغیر کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ کوئی فیصلہ جو اس انجمن کو، جو اُردو بولنے والوں کی واحد

مسلہ انجمن سے، منظور نہیں، بہار کے حامیانِ اُردو کو منظور نہ ہوگا۔۔۔"

بہار کی انجمن کو خاص فکر اس کی تھی کہ (۱) سائنس کی اصطلاحات کس زبان سے لی جائیں گی (۲) ان اصطلاحات سائنس کا کیا حشر ہوگا جو روزمرہ کی زبان میں داخل ہو چکی ہیں، (۳) الفاظ کے داخل کرنے یا خارج کرنے کا کیا معیار ہوگا، (۴) ان الفاظ اور محاورات کے متعلق کیا عمل کیا جائے گا جو اُردو میں رائج اور مستند ہیں، ہندی میں نہیں، یا ہندی میں رائج اور مستند ہیں اور اُردو میں نہیں، (۵) اُردو ہندی کے صرف و نحو میں جہاں اختلاف پایا جاتا ہے وہاں کسے ترجیح دی جائے گی، اور (۶) ہندستانی کے بنیادی قواعد کون سی جماعت وضع کرے گی۔ چنانچہ اسی جلسے میں جہاں مندرجہ بالا ریزولیوشن پاس کئے گئے اس کا بھی اعلان کیا گیا کہ "یہ جلسہ گورنمنٹ کو آگاہ کرتا ہے کہ اگر متذکرہ بالا انجمنوں کے مشورے کے بغیر اُردو زبان میں کچھ تغیرات کئے گئے تو وہ بہار کے اُردو داں طبقے کے لئے ناقابلِ قبول ہوں گے۔"

سکرٹری صاحب نے یہی ریزولیوشن سنائے اور اپنے اندیشے بیان کئے، اگرچہ انھوں نے خیالات کی ترتیب اور طرح دی تھی۔ کانفرنس کے بعض ڈیلیگیٹ بے صبر ہو گئے اور ایک نے سلسلۂ گفتگو کو توڑ کر مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ایسی بحث تو کبھی ختم نہیں ہوتی، دو بجے راجندر بابو سے ملاقات کرنا ہے، اور اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے رخصت ہو جائیں تو اپنے خیالات کو اور اگر کوئی مطالبے ہوں تو انھیں ترتیب دے دینا چاہئے۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی، لیکن چونکہ سکرٹری صاحب ابھی کھڑے تھے، اس لئے ان سے درخواست کی گئی کہ اصولی بحث کو چھوڑ کر وہ بتائیں کہ انھیں شکایت کس بات کی ہے اور وہ کیسی اصلاح چاہتے ہیں۔ سکرٹری صاحب نے فرمایا کہ ٹکسٹ بک کمیٹی نے جتنی کتابیں مشترک زبان یعنی ہندستانی میں منظور کی ہیں وہ بلا استثنا بہت ہی خراب زبان میں لکھی گئی ہیں۔ بکثرت الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جو اُردو کی کسی لغت میں نہیں ملتے۔ عام زبان کی جگہ عموماً گنواری زبان استعمال کی گئی ہے۔ نظم کے نام سے جو چیزیں ہیں ان میں قواعد عروض کا مطلق خیال نہیں کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی

فرمایا کہ ٹکسٹ بک کمیٹی میں ایسے لوگ کم ہیں جو غلط اور صحیح اُردو میں تمیز کر سکیں یا کتابوں کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کر سکیں، اور اگر لوگوں کا رونا اور کتابوں کی زبان یہی رہی تو اُردو کا خاتمہ سمجھنا چاہئے ٹکسٹ بک کمیٹی کی شکایتیں کرتے کرتے سکرٹری صاحب نے کہا کہ میں بھی اس کمیٹی میں تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہیں اور جب میں کوئی اعتراض کرتا ہوں تو وہ اسے تسلیم کرکے کہتے ہیں کہ ہاں بھائی تم ٹھیک کہتے ہو، ہم تو کچھ کر نہیں سکتے، لیکن تم جس طرح کی ترمیم پیش کرو ہم منظور کرلیں گے اور جس کتاب کو تم ناقص پاؤ اُسے ہم خارج کردیں گے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں تمام کتابوں کو دیکھتا، اور چونکہ اور کسی کو اس کام سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے استعفا دیدیا۔ یہ کیفیت سن کر کانفرنس کے کان کھڑے ہوئے اور مولانا ظفر الملک صاحب نے کہہ بھی دیا کہ قاضی صاحب آپ نے بڑی سخت غلطی کی، مگر استعفا تو کب کا منظور کیا جا چکا تھا اور کانفرنس کو بیٹھ کر سنتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر کسی نے ان کتابوں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جن کی زبان کا رونا رویا گیا تھا۔ سکرٹری صاحب کو شاید توقع نہ تھی کہ کانفرنس والے ایسی کھوج کریں گے اور ان کے یہاں کتابیں تھیں بھی نہیں۔ ایک صاحب بھیجے گئے تو وہ ساٹھ کتابوں میں سے کل چار عدد ڈھونڈھ کر لاسکے، اور باقی کے متعلق وعدہ کیا کہ تلاش کرکے لادیں گے۔ ان چار کتابوں کو سب نے الٹ پلٹ کر اور ادھر ادھر سے پڑھ کر دیکھا۔ سیدھی سادی سلجھی ہوئی زبان تھی، "لڑکو" کے ساتھ قوسین میں "بالکو" تھا تو "محبت"، "نفرت"، "عداوت" جیسے لفظ بھی بغیر ہندی کے ہم معنی الفاظ کے لکھے ہوئے تھے۔ نظمیں میر اور غالب کے کلام کی ہم پلہ نہ تھیں تو دیہاتی بچوں کے لئے خاصی اچھی اور موزوں تھیں اور ان میں عروض کے خون کے بھی ایک ہی دو ننھے ننھے بوند دکھائی پڑے۔ تب کسی نے کہا کہ قاضی صاحب، ہمیں تو ان کتابوں کی زبان میں کوئی خاص عیب نظر نہیں آتا، اب آپ کوئی مثال دیجئے تو ہم شاید اپنی رائے بدلیں۔ سکرٹری صاحب نے ایک کتاب اٹھائی اور اُسے پڑھنا شروع کیا۔ صفحہ ڈیڑھ صفحہ پڑھ گئے اور کوئی غلطی ایسی نہ ملی جو کانفرنس کے سامنے جتائی جاتی۔ پھر انھوں نے ایک نظم شروع کی، اور پہلے مصرع کو کہا کہ دیکھئے بالکل ناموزوں ہے۔ مگر اسے بھی پروفیسر غلام السیدین صاحب

نے ایک لفظ کا تلفظ صحیح کرکے پڑھا تو وہ موزوں نکلا۔ سکرٹری صاحب نے کتاب رکھ دی اور کہا کہ اصل میں ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ معیار فصاحت کیا ہے۔ اس پر ایک صاحب بڑبڑانے لگے اور سید ین صاحب نے فرمایا کہ میری رائے میں یہ کتابیں ان کتابوں سے ہرگز بدتر نہیں ہیں جو یوپی میں مشترک زبان کی ریڈریں کہلاتی ہیں۔ اور ہاں یوپی میں بڑی کوشش کرنے کے بعد یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ نظم کا حصہ مشترک نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہندی اُردو کے قواعد عروض میں بڑا اختلاف ہے۔ اس لئے ہمیں بہار کی ریڈروں کے اس حصے پر سخت تنقیدی نظر نہ ڈالنا چاہئے۔ معیار فصاحت کی بحث اپنی جگہ پر ٹھیک ہے، لیکن ایسی کتابوں میں جو زیادہ تر دیہاتی بچوں کے لئے لکھی گئی ہوں اس معیار کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں تو بول چال کی زبان کے قریب تر لانے کی فکر کرنا کہیں زیادہ ضروری ہے۔

اس موقع پر وہی حضرت جنھوں نے پہلے کہا تھا کہ راجندر بابو سے گفتگو کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے پھر بول اُٹھے کہ اس کے متعلق کچھ نہیں طے ہوا۔ اب کانفرنس متفقہ طور پر راضی تھی کہ خیالات کو ترتیب دیا جائے، اور جناب صدر نے یہ تجویز کیا کہ کانفرنس ہندستانی زبان کی ایسی تعریف کرے جو سب کو منظور ہو، اور پھر اس تعریف کے لحاظ سے دیکھا جائے کہ کیا تجویز کیا جا سکتا ہے۔ پنڈت کیفی صاحب نے ہندستانی کی تعریف کی، اور کسی قدر بحث کے بعد کانفرنس نے قریب قریب کامل اتفاق رائے سے طے کیا کہ "ہندستانی سے مراد اس ملک کی وہ زبان ہے جو اس ملک کی ہندو مسلمان قوموں کے میل ملاپ سے بنی ہے اور جس کو شمالی ہندوستان کے باشندے عام طور سے بولتے ہیں اور ہندستان کے دوسرے رہنے والے عام طور سے سمجھتے ہیں اور جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے نامانوس الفاظ سے خالی ہو اور اُردو اور دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے۔" زبان کی اس طرح تعریف کرنے کے بعد پھر باقی باتوں کا جلد جلد فیصلہ ہو گیا۔ ہم انھیں ترتیب وار دیتے ہیں:۔

(۱) ابتدائی چار جماعتوں کی کتابیں ایسی عام اور آسان ہندستانی زبان میں لکھی جائیں جو اُردو اور ہندی رسم خط کے اختلاف کے علاوہ یکساں طور سے اُردو اور ہندی بولنے والوں کی سمجھ میں آ سکیں۔

(۲) ایسی کتابوں کے انتخاب اور منظوری میں جو طریق عمل اس وقت جاری ہے وہ قابل اطمینان نہیں ہے۔ حصہ نثر میں کم اور نظم میں زیادہ اس قسم کی بے عنوانیاں ہیں جن کی اصلاح ہونا ضروری ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر اس اصول کو سامنے رکھنا لازم ہے کہ ہندی اور اُردو کے طلبار کی ذہنیت اور مذاق پر ایسا اثر نہ پڑے جو آگے چل کر ان کے ادبی مذاق کی ترقی میں حائل ہو۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ایسی کتابوں کا حصۂ نظم لازمی طور پر مشترک نہ ہو۔

(۳) ثانوی جماعتوں میں اُردو پڑھنے والوں کو ہندی اور ہندی پڑھنے والوں کو اُردو سیکھنا لازمی ہوگا، جیسا کہ صوبۂ متحدہ میں ہوتا ہے۔

(۴) ابتدائی جماعتوں میں علوم کا ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہوگی۔ علمی اصطلاحیں کوشش ہو کہ ہندستانی سے بنائی جائیں، اور جو رائج ہیں وہ برتی جائیں، اور جو موجود نہ ہوں ان کے لئے ہندی اُردو کی عام فہم اصطلاحوں کو ایک ساتھ استعمال کیا جائے۔

(۵) ثانوی جماعتوں میں ادبی ریڈریں علیحدہ ہوں۔ ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہو، بشرائط بالا۔

(۶) قواعد زبان، اصطلاحات اور لغات کے لئے انجمن ترقی اُردو اور ہندی کی کسی نمائندہ جماعت سے مساوی تعداد میں لوگ لئے جائیں جو ان باتوں کا فیصلہ کریں۔ اختلاف کی صورت میں اُردو سب کمیٹی کی رائے اُردو رسم خط کی کتابوں کے لئے اور ہندی سب کمیٹی کی رائے ہندی رسم خط کی کتابوں کے لئے فیصلہ کن سمجھی جائے۔

یہ سب طے کرنے کے بعد کانفرنس نے شرف الدین حسن صاحب رئیس باڑھ کے یہاں دعوت کھائی اور پھر سب لوگ سکرٹری صاحب کے مکان پر راجندر بابو اور بلدیو سہائے صاحب سے ملاقات کے لئے پہنچے۔ راجندر بابو یا کانفرنس والوں کو وقت بتانے میں کوئی غلطی ہوگئی تھی، ہم لوگ جب پہنچے تو راجندر بابو انتظار کر رہے تھے۔ کانفرنس کے بعض لوگوں کو ڈر تھا کہ کہیں یہ ملاقات ہندی اتھوا ہندستانی کے چھیڑے ہوئے جذبات کو برانگیختہ نہ کرے، لیکن یہ اندیشہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوا۔ سب راجندر بابو سے بڑے تپاک کے ساتھ ملے، اودھر ادھر کی باتیں ہورہی تھیں کہ

بلدیو سہائے صاحب، جو اس وقت انگریزی حکومت کے سرکاری وکیل ہیں اور جنھوں نے یونیورسٹی سینٹ میں ہندستانی کے متعلق ریزولیوشن پیش کیا تھا تشریف لائے۔ انھیں جلدی تھی اور ان کی درخواست پر راجندر بابو اور کانفرنس والے اس پر راضی ہو گئے کہ پہلے ان سے گفتگو کر لی جائے۔ ان کا انداز اس شریف آدمی کا سا تھا جس پر بیجا الزام لگائے گئے ہوں۔ انھوں نے یہ انداز کیوں اختیار کیا تھا یہ کانفرنس کو معلوم نہ ہو سکا، ہم نے تو بس یہ دیکھا کہ سکرٹری صاحب اپنی کرسی گھسیٹ کر بلدیو سہائے صاحب کے سامنے لے آئے، اور ہمیں ان کے لہجے میں کچھ تیزی محسوس ہوئی، مگر شاید یہ وہ گرمی تھی جو کسی کل کے دیر تک چلتے رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کانفرنس والے تو بس ہوں ہاں کرتے رہے، اس لئے کہ دوران گفتگو میں جو انکشافات ہوئے انھوں نے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

(۱) کانفرنس نے 'ہندستانی' کی ایسی تعریف کر لی تھی جو معیار کا کام دے سکتی تھی، اور چونکہ سکرٹری صاحب نے فرمایا تھا کہ 'ہندستانی' کی جو تعریف سینٹ میں کی گئی تھی وہ "بالکل ناکافی اور مبہم ہے" اور اس کی وجہ سے "بیحد اندیشہ ہے کہ ہندستانی کے نام سے ہندی ذریعۂ تعلیم نہ بنا دی جائے" اس لئے کانفرنس بلدیو سہائے صاحب کی تعریف کو اپنی کسوٹی پر جانچنے کے لئے تیار تھی۔ لیکن بلدیو سہائے صاحب نے بسم اللہ اس سے کی کہ میں زباں داں ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا، میں اور میرے خیال کے لوگ بس یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم نہ رہے۔ ہندی کیا ہے اور ہندستانی کیا یہ آپ لوگ جانئے، ہم نے سینٹ کے ریزولیوشن میں تو عام بول کی زبان کو تعلیمی زبان بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ان کے پاس اس کارروائی کی روئداد موجود تھی، انھوں نے ہم کو ریزولیوشن پڑھ کر سنایا۔ اس پر واقعی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سکرٹری صاحب نے بھی وہ ریزولیوشن پڑھا تھا اور اس کا ترجمہ بھی ٹھیک کیا تھا، لیکن ترجمہ کرنے کے بعد انھوں نے سمجھ لیا کہ اصل انگریزی عبارت کا مطلب عام بول چال کی زبان نہیں عوام کے بول چال کی زبان ہے، اور اسی بنا پر انھوں نے ہم سے شکایت کی تھی کہ یہاں کے لوگ عوام کی بول چال کو ہندستانی کا نام دے

رہے ہیں، حالانکہ یہاں عوام کی کوئی ایک بولی نہیں، بلکہ اکثر ضلعوں میں ہر گاؤں کی الگ بولی ہے جسے پڑوس کے دوسرے دیہاتی بھی نہیں سمجھتے۔ بلدیو سہائے صاحب نے سینٹ کا ریزولیوشن دوبارہ پڑھ کر سنایا۔ ہم سر ہلا کر چپ ہو گئے۔ کوئی کہتا تو کیا کہتا؟

(۲) اس کے بعد بلدیو سہائے صاحب نے فرمایا کہ ہمارے یہاں اُردو ہندی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں نے حفیظ صاحب کے ساتھ دورہ کر کے دیکھا کہ اکثر اسکولوں میں ایک ہی استاد اُردو ہندی بولنے والوں کو ساتھ ساتھ پڑھاتا ہے، اُردو والے اُردو کی کتاب، ہندی والے ہندی کی سامنے رکھ کر پڑھتے ہیں، اور سبق اور استاد کی باتیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ بیان کر کے سمجھئے بلدیو سہائے صاحب نے کانفرنس کے سر پہ دو ہتھڑ مارا۔ ہمارے پاس طریق تعلیم کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھی اور ہمیں کچھ بتایا بھی نہیں گیا، سکرٹری صاحب خود اس حقیقت سے واقف نہیں تھے یا انھوں نے ایسی ذرا سی بات کا ذکر کرنا بالکل فضول سمجھا ....

حفیظ صاحب، جو ایک سربرآوردہ وکیل اور موجودہ اسمبلی کے رکن ہیں آ نہیں سکے تھے یا بلائے نہیں گئے تھے، اس لئے بلدیو سہائے صاحب کے بیان کی تائید یا تردید نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہم پھر چپ ہو گئے۔

(۳) اس کے علاوہ ہمیں معلوم ہوا کہ ٹریننگ کالج میں داخلے کے جو امیدوار ہوتے ہیں ان میں ایسوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو ہندی اُردو دونوں جانتے ہوں، اور ٹریننگ اسکولوں میں دونوں زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ استادوں کے تقرر میں پہلا حق ان لوگوں کا مانا جاتا ہے جو ان دونوں زبانوں کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ یہ سب باتیں بھی سکرٹری صاحب کو معلوم نہ تھیں یا انھوں نے ہم کو بتائیں نہیں۔ بلدیو سہائے صاحب جب رخصت ہوئے تو کانفرنس والوں کو بھی بستر باندھ کر اپنے اپنے گھر چل دینا چاہیئے تھا، یا اتنے دنوں ٹھہرنے کا ارادہ کر لینا چاہیئے تھا کہ سکرٹری صاحب غور و فکر کے لئے ضروری مواد فراہم کر دیں۔ بلدیو سہائے صاحب جاتے جاتے یہ بھی فرما گئے کہ سینٹ کے فیصلے کے بعد اب آپ لوگوں کا کام ہے کہ ہماری ہدایت کریں۔ میں تو قاضی صاحب سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں کہ ہماری مدد اور ہماری کوششوں کی اصلاح کریں۔ اُردو ہندی کے معاملے میں فیصلہ کرنا درکنار ہمیں تو

اپنے آپ کو کوئی رائے رکھنے کا اہل نہیں سمجھتا۔ آپ لوگ جو کچھ فیصلہ کریں اسے میں منظور کروں گا۔ ہمارے سکریٹری صاحب اسی بات کی شکایت کر چکے تھے کہ سارا کام انھیں کے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے وہ ایک دفعہ ٹکسٹ بک کمیٹی سے استعفا دے چکے تھے۔ مگر اس وقت کچھ فخر تھا کہ وہ اس ذمہ داری کے مستحق سمجھے جا رہے ہیں۔

بلدیو سہائے صاحب تشریف لے گئے تو راجندر بابو سے گفتگو شروع ہوئی۔ وہ نہایت ہی شائستہ، منکسر مزاج اور صلح پسند آدمی ہیں، اُردو۔ یا ہندستانی۔ بہت صاف اور صحیح اور روانی کے ساتھ بولتے ہیں، لیکن شاید اسی وجہ سے کہ وہ اہل ادب و انشا میں زبردستی شامل کر لئے گئے ہیں ان کے سامنے کوئی معیار فصاحت نہیں، اور وہ اُردو بولنے والوں کو مخاطب کرتے ہیں تو ایسی اُردو اور ہندی سمیلن میں ایسی ہندی بولتے ہیں کہ اہل ادب و انشا ان کے پیچھے نہ پڑیں، اور سننے والوں کی خواہش کا لحاظ کرنے کی بدولت بعض لوگوں کو خیال ہو گیا ہے وہ زبان کے معاملے میں تعصب برتتے ہیں۔ اس ملاقات میں انھوں نے جو باتیں کیں ان پر متعصب اُردو داں کسی قسم کا اعتراض نہ کر سکتا تھا۔ آخر میں ان سے یہ طے ہو گیا کہ اُردو ہندی جاننے والوں کی مجلس ہندستانی کی لغت تیار کرنے کے لئے قائم کی جائے گی۔ غلام السیدین صاحب نے گفتگو کا انداز دیکھتے ہی راجندر بابو اور مولوی عبدالحق صاحب کی طرف سے مشترک اعلان شایع کرنے کی تجویز پیش کی، دوران گفتگو میں اعلان کا مسودہ تیار ہوا، اور اس پر دستخط بھی ہو گئے۔

کام ختم ہوتے ہی لوگ دعوتوں میں شریک ہونے کو چل دیئے۔ دوسرے دن صبح تک جو کچھ ہوا وہ کانفرنس والوں کا ذاتی معاملہ تھا۔ دعوتوں سے بہر حال کوئی ہرج نہیں ہوا۔ دوسرے دن بھی حاضری پوری تھی۔

لیکن کام کچھ نہیں تھا۔ ایک صاحب کی تحریک سے بابو بلدیو سہائے صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا وہ نوٹ کر لیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خواجہ محمد نور صاحب، جج ہائی کورٹ، تشریف لائے، اور ان سے بھی بہت کچھ جو کانفرنس والوں کو پہلے سے بتایا جانا چاہیئے تھا، معلوم ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ بلدیو سہائے

صاحب نے جو کچھ استادوں کے بارے میں بیان کیا تھا وہ صحیح ہے، لیکن عموماً جس زبان میں تعلیم دی جاتی ہے وہ بہت خراب ہوتی ہے۔ انگریزی، ہندی اور اُردو کے پرچے جانچنے کے لئے الگ الگ ممتحن ہوتے ہیں، اور امتحانوں میں کوئی ایسی بے انصافی نہیں ہوتی جس کی شکایت کی جا سکے۔ عدالتوں میں اس وقت ہندی رسم خط رائج ہے اور رائج رہے گا۔ اس سلسلے میں اُردو کے ساتھ جو زیادتی کی گئی وہ ایک تاریخی واقعہ ہے، اس کا ہندی اُردو کی موجودہ کشمکش سے کوئی واسطہ نہیں۔ اب اس کی شکایت کرنا فضول ہے۔ اس وقت کاغذات اگر ہندی رسم خط میں ہوتے ہیں تو دوسری طرف زبان اور اصطلاحیں وہی ہیں جو پہلے تھیں، جب عدالتی زبان اُردو تھی۔

گفتگو کے سلسلے میں ایک بہت دلچسپ بات معلوم ہوئی۔ سکریٹری صاحب انجمن نے پہلے روز درسی کتابوں کی زبان پر جو اعتراض کئے تھے ان میں سے کانفرنس نے ایک بھی تسلیم نہیں کیا۔ مگر جب انھوں نے فرمایا کہ ان کتابوں میں بھیڑیئے کی جگہ "ہنڈار" لکھا ہے اور بھیڑیئے کو قوسین میں رکھا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ معیار فصاحت پلٹ دیا گیا ہے تو کانفرنس لاجواب ہو گئی، اس لئے کہ مولانا سلیمان ندوی کے سوا کسی نے بھی ہنڈار کا لفظ نہیں سنا تھا۔ چنانچہ اس وقت خواجہ صاحب سے اس کا فیصلہ کرنے کی درخواست کی گئی کہ ہنڈار اور بھیڑیئے میں کس کو فضیلت حاصل ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ بہار میں شہری اور دیہاتی سب ہنڈار ہی بولتے ہیں، میں آپ لوگوں کی ہنسی سے ڈر کر چاہے بھیڑیا کہوں، لیکن گھر پر میں بھی بھیڑیئے کی جگہ ہنڈار بولتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ قاضی صاحب (یعنی سکریٹری صاحب) بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ چونکہ اُردو اور ہندستانی دونوں کو بول چال کی زبان ہونے کا دعویٰ ہے اور لکھنؤ جیسے مرکز فصاحت میں بھی گیدڑ کو سیار کہنے کی اجازت ہے۔ اس لئے سکریٹری صاحب کا یہ آخری اعتراض بھی رد کر دیا گیا اور بھیڑیئے کو ہنڈار کہنا بہار والوں کے لئے صحیح مانا گیا۔

اس جلسے کے بعد صاحب کے یہاں کھانے اور سچد آنند سنہا صاحب، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کے یہاں چائے کی دعوت تھی۔ ساڑھے چھ بجے کیفی صاحب، سیدین صاحب، مولوی

عبدالحق صاحب، مولانا سلیمان ندوی صاحب اور رشید صدیقی صاحب نے سینیٹ ہال میں ہندو مسلمانوں کے ایک بہت بڑے جلسے میں تقریریں کیں۔ یہ کانفرنس کی آخری کارروائی تھی۔

مسلمانوں کی تہذیب کا سہارا اب لے دے کر بس ان کی زبان رہ گئی ہے، اور اگر یہ سمجھ کر کہ وہ خطرے میں ہے ان کے چند نمائندے پہنچ جائیں، بڑے لوگوں سے مل لیں اور بڑے جلسوں میں تقریریں کر لیں تو ہمیں کوئی تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے دل و دماغ پر اب تک نیند کی سستی چھائی ہے، اور ہم ایک دوسرے پر اتنا کم بھروسا کرتے ہیں کہ کسی کے ڈر کر چلا اٹھنے پر بھی لوگ ہمدردی میں اس کی طرف متوجہ ہو جائیں تو خیال ہوتا ہے کہ قوم کا پرانا معمول بدل رہا ہے۔ پٹنہ کی کانفرنس میں جو بھی گیا اس لئے گیا کہ اس کے دل میں مسلمانوں کی اور ان کی زبان کی قدر تھی، اور اس نے دعوت قبول کرنا اپنا فرض سمجھا۔ کانفرنس کرنے کی جو غرض تھی وہ بھی ایک حد تک پوری ہوئی۔ لیکن ہمیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ پٹنہ کے بہت سے مسلمان جو اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو پہلے سے یہ نہیں بتایا گیا کہ کانفرنس کرنے کا ارادہ ہے، اور بہت سے ہندو دوستوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ کانفرنس ہندی کی مخالفت یا اس سے مقابلہ کرنے کے لئے بلائی گئی ہے۔ کانفرنس کی خوش قسمتی سے کانگریسی حلقوں میں ایک بات بنانے والا موجود تھا، ورنہ ایک جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ لیکن یہ نقصان ضرور ہوا کہ کانفرنس بہت سے مقامی لوگوں کے تجربے اور معلومات سے مدد حاصل نہ کر سکی، اور ان لوگوں کی اس ذ صورت بھی نہیں دیکھی جن سے اس جمہوری دور میں زبان کی سچی خدمت کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ تعمیری کام کا شوق بڑے مجموعوں میں برجستہ تقریریں کرنے سے پیدا نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے آنکھ کو آنکھ سے، دل کو دل سے ملنا ہوتا ہے۔

کانفرنس کے دوسرے جلسے میں کام ختم کرنے کے بعد پروفیسر غلام السیدین صاحب نے سکریٹری صاحب انجمن کو تنبیہ کی تھی کہ اب لغت اور محاورے اور معیار فصاحت پر بحث کرنے کا زمانہ نہیں ہے، اب اصولاً ہمیں کوشش کرنا چاہیئے کہ اپنی زبان کو عوام کی زبان کے قریب تر لائیں، اسے زیادہ

سے زیادہ آسان کرکے زیادہ سے زیادہ پھیلائیں ۔ لیکن اہل ادب وانشا تو ان ملکوں میں جہاں جمہوری نقطۂ نظر عادت بن گیا ہے اپنی صحبت الگ چاہتے ہیں، ہندستان میں اس گروہ کی خود پسندی کب گوارا کرے گی کہ وہ زبان کو پھیلانے میں مدد دے ۔ چنانچہ یہ کانفرنس چند شبہات جو ایک صاحب کے دل میں پیدا ہو گئے تھے رفع کرکے منتشر ہو گئی ۔ اس سے نہ پوچھا گیا اور نہ اس نے بتایا کہ زبان کو پھیلانے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اور کون سے لوگ ہیں جو اس فرض کو انجام دینے کا حوصلہ یا استعداد رکھتے ہیں ۔ کانگریسی وزارت کے تعلیمی منصوبوں کا بھی کوئی ذکر نہیں آیا، اس لئے یہ سوال بھی پیدا نہ ہوا کہ مسلمانوں کو خدمت کا حق وصول کرنے کی کیا تدبیریں اختیار کرنا چاہئیں ۔ غضب تو یہ ہے کہ ہماری انجمن ترقی اردو کی کارگذاری بھی اس کے سامنے پیش نہیں کی گئی، اور سوائے اس کے کہ اس کے ڈیلیگیٹوں نے ایک اخبار کے لئے سفارشی خط پر دستخط کئے، اس سے کسی قسم کی عملی امداد کا مطالبہ نہیں کیا گیا ۔ کارکنوں اور ہمدردوں کے اس رویے کو دیکھ کر آئندہ کے متعلق اندیشے پیدا ہوں تو کیا بیجا ہے ؟

مسلمان کانگریس اور مسلم لیگ

از جناب ریاض صاحب سابق ایڈیٹر ملت دلوید

مسلمان مسلم لیگ کے ذریعہ اپنی، تنظیم کریں یا کانگریس میں داخل ہو جائیں اس مسئلہ پر رسالہ جامعہ اشاعت ماہ اگست میں کسی صاحب نے بحث فرمائی ہے۔ نام کی جگہ انھوں نے اپنے کو "ایک قوم پرست مسلم" ۔ا ہے۔ مسلم اور قوم پرست! ایک عجیب سی بات ہے۔ مسلمان کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ صرف خدا یست ہو اور کوئی پرست نہ ہو۔ لیکن اب وہ وطن پرست بھی ہو سکتا ہے اور قوم پرست بھی اور پھر بھی مسلم ہ سکتا ہے۔ عجب نہیں کہ کوئی قوم پرست اس اعتراض کو دیکھ کر یہ کہے کہ" دہی کٹ ملا پن' دہی ں اعوذیوں کی سی گفتگو' اسی وجہ سے تو مسلمان تباہ ہیں اتنی باریکیوں پر غور کر کے لفظ پرست تھوڑی ۔ا گیا ہے" اور اگر ذرا ذہین ہوئے اور بحث کی طرف مائل ہو گئے تو ممکن ہے کہ یہ فرمائیں" ہم سیاسی ثیت سے قوم پرست ہیں اور مذہبی حیثیت سے خدا پرست۔ بحث چھڑنے پر معترض بھی طرح طرح ے سوالات کر سکتا ہے۔ وہ پوچھے گا کہ معاشی حیثیت سے؟ تمدنی حیثیت سے؟ زراعتی حیثیت سے؟ نعتی اور حرفتی حیثیت سے؟ تجارتی حیثیت سے؟ جنگی حیثیت سے؟ ادبی حیثیت سے؟ لمی حیثیت سے جناب کیا ہیں؟ اندیشہ ہے کہ پھر یونانیوں کی پوری فہرست اصنام بغیران تمام سوالات جواب دینا جو اس سلسلہ میں پیدا ہو سکتے ہیں مشکل ہوگا۔ پھر معترض بھی اگر طبیعت کا سقراط ہوا تو وہ پاک رنا پاک' انصاف اور نا انصافی کی بحث چھیڑ دیگا۔ مختلف حیثیتوں کے اصولوں میں تصادم ہوگا، مختلف ثیتوں کے دیوتا دست و گریبان ہوں گے' زندگی ایک ہنگامہ اور خلفشار بن جائے گی کیسی مشکل ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ اخبار نویس الفاظ کا ترجمہ کرنے میں بڑے بے احتیاط ہیں۔ پیٹری اٹ (PA TRIOT) کا ترجمہ وطن پرست اور نیشنلسٹ (NATIONALIST) کا ترجمہ قوم پرست ۔تے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی بلا غور کئے یہی الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں' پرستش کا حقیقی مفہوم کسی کے

ذہن میں نہیں ہوتا مگر یہ اعتراض میں نے ضرورتاً قائم کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے مضمون کے خاتمے پر یہ فیصلہ دیا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی اغراض کے لئے جداگانہ تنظیم نہیں کرنی چاہئے کانگریس میں شریک ہوجانا چاہیئے اور مذہبی اور تمدنی اغراض کے لئے جداگانہ تنظیم کرنی چاہئے۔

اب یہاں کیسی اہم بحث پیدا ہو جاتی ہے۔ مذہب، سیاست، اقتصادیات اور تمدن بالکل الگ الگ ہیں، ان کے درمیان حدود فاصل قائم ہیں یا یہ سب باہم مربوط ہیں؟

ترکی گورنمنٹ نے ٹرکی میں یورپین قسم کی چھجے دار ٹوپی رائج کردی ہے۔ چونکہ یہ گورنمنٹ کا حکم ہے اس لئے سیاسی ہے مگر لباس کے متعلق ہے لہٰذا عمل میں آتے ہی تمدن کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اس ٹوپی میں چھجہ ہے اس لئے سجدہ نہیں ہوسکتا عبادت میں حارج ہے۔ اب یہ وسیع معنی میں نہیں بالکل محدود معنی میں مذہبی مسئلہ ہوگیا۔ مجبوراً نماز پڑھنے کے لئے ٹرکی کے مسلمان کپڑے کی ایک دوسری ٹوپی جیب میں رکھتے ہیں ہر وقت دو ٹوپیاں۔ کپڑے کی ٹوپی بار بار دھلتی ہے اس وجہ سے ان کو ایسی کئی ٹوپیاں رکھنی پڑتی ہیں ایک ہی حکم کا یہ چوتھا اقتصادی پہلو ہے ایک بہت ہی چھوٹی اور خفیف سی بات ہے مگر ایک ساتھ سیاسی بھی ہے، اقتصادی بھی ہے، تمدنی بھی ہے اور مذہبی بھی ہے۔ پھر اسی ایک مثال سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ سیاست مذہب کے اثرات سے بالکل آزاد ہونے کے بعد بھی کس قدر مداخلت پسند واقع ہوئی ہے کہ اتنی اتنی سی بات کا انتظام کرتی ہے کہ ٹوپی کیسی پہنیں اور انھیں اس پر مجبور کرتی ہے کہ ایسی پہنیں جس سے وہ نماز نہ پڑھ سکیں۔

"سیاست اور مذہب الگ الگ ہیں" لوگوں کے ذہن میں اس خیال کی تاریخ محفوظ نہیں ہے ورنہ وہ یہ بات ایسی آسانی سے نہ کہیں۔ جس زمانے میں یورپ کی حکومتیں کلیسا سے دبی ہوئی تھیں اور کلیسا اپنے اقتدار کا غلط استعمال کر رہا تھا تو اس دور کے حکمرانوں نے کلیسا کے استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے یہ ایک اصول وضع کیا تھا۔ لیکن جب اس کوشش میں کامیابی ہوگئی تو حکومت اور سیاست غالب ہوگئی اور کلیسا مغلوب ہوگیا۔ کلیسا میں سیاست کی مداخلت شروع ہوگئی، یہ نہ ہوسکا کہ مذہب کا دائرہ عمل الگ ہوجاتا اور حکومت کا الگ۔ صاحب قوت جو کوئی بھی ہو مداخلت پسند ہوتا ہے اور بالخصوص

سیاست سب سے زیادہ۔

روس میں اس وقت اقتصادی سیاست کا دور ہے لیکن مذہب میں جتنی مداخلت وہاں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ خدا کے خلاف حکومت کی طرف سے ایک مستقل تحریک جاری ہے کسی کی مجال نہیں کہ خدا پر اعتقاد رکھے۔ یہ انھیں سوشیلسٹوں اور کمیونسٹوں کا عمل ہے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ سیاست اور مذہب الگ الگ ہیں مذہب ہر شخص کا نجی معاملہ ہے۔

ہر سیاست اور تمدن کا ایک پس منظر ہوتا ہے روس کے موجودہ تمدن اور سیاست کا پس منظر زار روس کا استبداد اور زار کی شہنشاہی کے موید کلیسا کا جبر ہے اس لئے روس کی بالشویکی حکومت بادشاہت اور مذہب کی عداوت سے کبھی پاک نہیں ہو سکتی۔

یورپ نے مظلوم اور بے یار و مددگار عیسائیت کو اپنے دامن قوت و سیاست میں پناہ دی تھی اور اپنی شرائط پر اس مذہب کو قبول کیا تھا، یعنی دور جاہلیت کے تمام رسم و رواج قایم رہیں گے۔ لہٰذا یہی پس منظر یورپ کے تمدن میں منعکس ہے۔ مذہب سیاست کا خدمت گار ہو کر رہ سکتا ہے، افراد کا نجی معاملہ ہے وہ سیاست میں مخل نہیں ہو سکتا۔ یورپ کا تمام فلسفہ سیاست اسی خیال پر مبنی ہے اور جس روز سے یورپ کی سیاست کو مشرق پر غلبہ حاصل ہوا ہے اس خیال کی خوب تبلیغ کی جارہی ہے اور ہم اس سے متاثر ہیں ورنہ یہ بات کہ مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں ایسی لچر بات ہے کہ اس پر ذرا استدلال کیجئے یہ ایک خیال پریشان ثابت ہوگی۔

اس خیال کے مویدوں کے پاس اس کے سوا، اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ یورپ کامیاب ہے اور ہم ناکام ہیں۔ مگر یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ مسلمانوں نے بھی ایک زمانہ میں بڑی بڑی حکومتیں قایم کی ہیں۔ ان کی سیاست اس وقت ساری دنیا پر غالب تھی اور اس وقت بھی وہ اس کے قائل نہ تھے کہ سیاست اور مذہب الگ الگ ہیں۔ بلکہ اس کے قائل تھے کہ مذہب زندگی کی تمام سرگرمیوں پر حاوی ہے۔ پھر ٹھیک اسی دن سے زوال شروع ہوا جس دن سے سیاست مذہب کے قابو سے باہر ہوئی۔

کفر ہو یا اسلام مذہب ہو یا انکار مکمل اور مربوط ہونا چاہئے ضرور کامیاب ہوگا۔ فرق صرف یہ رہیگا کہ

اسلام کی کامیابی دنیا کے لئے برکت اور راحت کا سبب ہوگی اور انکار کی کامیابی باعث زحمت اور پریشانی۔

یورپ کامیاب ضرور ہے مگر اس کامیابی کے نتائج کو اسے اب سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے ساری دنیا میں اختلال کی سی صورت پیدا ہے۔ کہیں دولت کے ڈھیر ہیں اور کہیں کھانے کے لئے اتنا بھی میسر نہیں جتنا جینے کے لئے ضروری ہے۔

روس کی خلاف فطرت مساوات کا تماشا بھی دیکھتے جائیے۔ ابھی پورے بیس برس بھی تو نہیں ہوئے اسٹیلن کے زمانہ میں لینن کا کمیونزم باقی نہیں رہا افراد کے حق میں ترقی کے ساتھ مراعات جاری ہیں مگر پھر بھی تمدن میں توازن قایم نہیں ہوتا۔

جب تک متضاد عناصر کمزور ہیں بس اسی وقت تک خیر ہے جب طاقت ور ہو جائیں گے تصادم لازمی ہے۔ یورپ کا سرمایہ دارانہ اقتدار ایک مہیب دھماکے کے ساتھ عنقریب پاش پاش ہونے والا ہے روس کے بے ربط اور خلاف فطرت تمدن کی یہ ساعت شاید ابھی کچھ دور ہو۔ لامرکزی (CENTRIFUGAL) میلانات دوسرے معاملوں میں ممکن اور مفید ہیں مگر مذہب اور تمدن میں ان کے لئے بالکل گنجائش نہیں ہے۔

اسلام دنیا کا آخری مذہب ہے اور قرآن آخری پیغام۔ یہ بالکل تازہ ہے اس میں سہو، نسیان اور تصرف و الحاق کو کوئی دخل نہیں ہے۔ مذہب کا صحیح تخیل وہی ہے جو قرآن پر مبنی ہو۔ قرآن میں ہر قسم کے اصول تعلیم کئے گئے ہیں، سیاسی، معاشرتی، معاشی، تمدنی، تجارتی اور وہ بھی جو عبادت اور عقائد کے متعلق ہیں۔ غرضکہ اسلام جس طرح قرآن میں تعلیم کیا گیا ہے ایک مکمل تمدن اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا کامل اور مربوط ضابطہ ہے جس کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ اگر مذہب محض عبادات تک محدود ہوتا تو قرآن زیادہ سے زیادہ ایک جزو کی کتاب ہوتی جس میں نماز روزہ اور بڑی مشکل سے حج کے متعلق کچھ احکام ہوتے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ قرآن کے تصور میں ایک عالمگیر تمدن ہے سیاست، اقتصادیات، معاشرت، معاشیات اور عبادات وغیرہ اس کے شعبے ہیں۔ قرآنی اخلاقیات (ETHICS) پر یہ سب مبنی ہیں اور یہی ان کے درمیان ربط قایم رکھتے ہیں۔

مذہب کے متعلق یورپ کا اور غالباً ساری غیر مسلم دنیا کا تخیل ناقص ہے۔ وہ صرف عبادت کو اور اللہ کے متعلق عقیدے کو مذہب کہتے ہیں۔ باقی تمام زندگی کے شعبوں کو اس دائرے سے خارج سمجھتے ہیں۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو کسی مذہب میں یہ احکام نہیں ہونے چاہئیں کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، غیبت نہ کرو، زنا نہ کرو، رشوت نہ لو، غصب نہ کرو، بخل نہ کرو، ظلم نہ کرو، قتل نہ کرو، انصاف کرو، جو مصیبت میں ہوں ان کی مدد کرو، سچی شہادت دینے سے گریز نہ کرو وغیرہ وغیرہ۔

یہ احکام ہر اس مذہب میں موجود ہیں جو کسی کتاب پر مبنی ہے اور ان میں سے کسی چیز کا تعلق عبادت اور طریقہ عبادت سے نہیں ہے بلکہ سب سیاست، معاشرت، اقتصادیات اسی دنیوی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق ہیں۔ حکمائے اخلاقیات نے بھی جو کچھ لکھا ہے وہ بھی سب یہی ہے۔ اسی کا نام ایتھکس ہے اور اسی پر سیاست اقتصادیات اور معاشرت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ اخلاقی اصول ان آسمانی کتابوں نے ان حکیموں سے اڑائے یا حکیموں نے فکر، بحث اور تشریح کر کے ان کتابوں سے یہ اخذ کر لئے۔ مجھے یقین ہے کہ بات آخری ہی ٹھیک ہے۔ قرآن چونکہ تازہ ترین پیغام ہے اور مسلمانوں کی زبان پر ہے اس لئے مسلمان سیاست کے متعلق کہے، معاشرت کے متعلق کہے یا اقتصادیات کے متعلق کہے وہ سب قرآنی تعلیمات اور اسی کے اصولوں کے حوالے سے کہتا ہے۔ یورپ والے جو کچھ کہتے ہیں وہ فلسفیوں کے حوالے سے کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اصل ماخذ ان کے ہاں بھول میں پڑ گیا ہے۔ یورپ کو اگر مذہب کے سلسلے میں کوئی چیز یاد ہے تو وہ صرف دور وسطیٰ کے ان پادریوں اور طریقوں کا جاہلانہ تعصب، تنگ نظری اور تشدد ہے جنہوں نے تعلیم اور غسل تک کو حرام قرار دیدیا تھا۔

یورپ کا اہل سیاست جب سیاست میں مذہب کی مداخلت پر تحقیر اور نفرت کا اظہار کرتا ہے تو اس کے ذہن میں وہی غلط اور مکروہ مذہبیت ہوتی ہے اور ہمارے ہاں کے لوگ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یہاں تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو بھی انہی کی کورانہ تقلید کرتے ہیں اور ان کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ تقلید کر رہے ہیں۔

کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ کارل مارکس کی کتاب اور لینن اور اسٹیلن کے اقوال پر طلباء سوچے سمجھے

ایمان لانا اور ان کے عمل کی تبلیغ کے لئے دیوانہ وار جدوجہد میں مصروف ہو جانا تو بہت قابلِ ستائش اور قابلِ ناز ہے! لیکن قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک یا اقوال کا ذکر بھی اس قدر مکروہ ہوگیا ہے کہ اس پر ہر طرف سے لعن طعن کی بوچھار اس طرح شروع ہو جاتی ہے گویا مذہب کے خلاف اشتراکی جہاد شروع ہوگیا۔ انسان کو اپنے عقائد کی تائید میں دیوانگی کرنا ضرور، مذہبی دیوانگی کا دور گیا دہری اور اشتراکی دیوانگی کا دور آگیا۔

جھانسی کے الیکشن میں مسٹر جناح کے نام سے کسی صاحب نے ایک اشتہار شائع کیا جس میں یہ عبارت تھی " انسانوں اور قوموں کی قوت اور ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ باہم متحد اور منظم ہوں اور تمام کام باہمی مشورے سے انجام دیں اور اللہ پاک نے یہی حکم مسلمانوں کو دیا ہے جس پر عمل کرنے سے غیر مسلم آج قوی اور ترقی پذیر ہیں .... ان جملہ تحریکات سے میرا مقصد محض اس قدر ہے کہ اپنے خدا و رسولؐ کے حکم کے موافق مسلمان آپس میں متحد اور منظم ہوں اور اپنے تمام معاملات اور کاموں کو باہمی مشورے سے انجام دیں اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہیں اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالیں "

جن لوگوں نے مسٹر جناح کی تقریریں سنی ہیں اور تحریریں دیکھی ہیں وہ اس عبارت کو بیک نظر دیکھ کر یہ کہدیں گے کہ یہ مسٹر جناح کا طرزِ بیان نہیں ہے ۔ پھر جس شخص نے یہ عبارت لکھی ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ اس کو انشا میں کوئی سلیقہ ہے اور نہ اس کے خیالات مرتب اور مربوط ہیں لہذا اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ یہ اشتہار مسٹر جناح کا لکھا ہوا نہیں تھا۔ لیکن اگر ہوتا بھی تو اس میں وہ کونسی ایسی بات ہے جس پر پنڈت جواہرلال نہرو اس قدر بکھرے اور مسٹر جناح سے انہوں نے اس طرح محاسبہ کیا جس طرح چوری یا قتل کے جرم سے کیا جائے کیا اس میں کانگریس کو ووٹ دینا کفر بتایا گیا تھا یا مسلم لیگ کو ووٹ دینے پر جنت کی بشارت تھی ؟ متحد اور منظم ہونے کے لئے کہا گیا اور تاکید میں خدا اور رسولؐ کے احکامات یاد دلائے گئے۔

.... میں اس مسلمان سے پوچھتا ہوں جو سیاست اور اقتصادیات میں لینن، اسٹیلن اور پنڈت جواہرلال کا پیرو بننا چاہتا ہے اور اس بات کا دعویدار ہے کہ سیاست اور اقتصادیات میں مذہب

ئی دخل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ سیاسی اور اقتصادی تنظیم غیر مذہبی طور پر ہونی چاہیئے کہ قرآن میں مسلمانوں
ے یہ کہا گیا ہے یا نہیں کہ وہ خدا کی رسی کو مضبوط پکڑیں ؟ اور کیوں کہا گیا ہے ؟ کیا صرف اس وقت
ر کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں جب نماز پڑھیں یا جب جنت میں جانے کے لئے زمین سے آسمان تک زینہ
، اور اس کے دائیں بائیں اللہ کی رسّی باندھی جائے تو اس کو اس خوف سے پکڑ پکڑ کر چڑھیں کہ نیچے نہ
جائیں ۔

یورپ کی حیرت انگیز مادی ترقی سے مسلمانوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئی ہیں اور عقل وحواس معطل ہیں
م بد ہیں وہ وقت دور نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے تنزل کا باعث اسلام ہی کو قرار دیدیں ۔ اب ان کی
ریں اپنی ہر چیز ذلیل ہے اور ذی اقتدار غیر مسلم دنیا کی طرف سے جو بات آئے وہ معزز اور محترم ہے ۔
ں دردناک حالت ہے !

انہوں نے شاید اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ یا وہ اسلام اور قرآن کو مکمل قبول کر سکتے ہیں یا وہ مجموعی
پر اس کی ہر چیز سے انکار کر سکتے ہیں ۔ ان کے لئے یہ تیسرا راستہ بالکل بند ہے کہ وہ قرآن میں سے کچھ
قبول کریں اور کچھ سے انکار کر دیں ۔ اقتصادیات کارل مارکس کی ، سیاست روسو کی ، معاشرت
میوں کی ، تمدن گاندھی جی کا ، عبادات قرآن کی اس خلط ملط کی قرآن ہرگز اجازت نہیں دے سکتا ۔
سیاسیات میں ، اقتصادیات میں ، معاشرت میں اور جملہ امور دنیا میں اسلام کا ایک خاص نقطہ نظر
سلک ہے وہ مجموعی طور پر ایک جامع تمدن ہے دنیا کی ہر مجلس میں ذی ہوش مسلمان ایک پارٹی کی حیثیت
تا ہے وہ پارٹی اس وقت برسر اقتدار نہیں ہے یہ اور بات ہے ۔ ایک زمانے میں تھی اور پھر ہو سکتی
ہے ۔

شاید اس موقع پر ترکوں ، مصریوں ، عراقیوں اور ایرانیوں کی مثال پیش کی جائے یہ سب
، وقت نیشنلسٹ اور یورپ کے پیرو بنے ہوئے ہیں ۔ یہ مثالیں بالکل ہمارے کام نہیں آ سکتیں ۔
لام عربوں یا ترکوں کی پیروی نہیں ہے ۔ ہماری ہی طرح یہ بھی حیران ہیں ، ہارے ہوئے ہیں ، اور
پ کے اقتدار سے مرعوب ہیں ، اپنے تنزل کے اسباب پر غور کئے بغیر یورپ کے طریقہ سیاست کا

تجربہ کر رہے ہیں انجام کار یہ ہوگا کہ یا وہ ہر حیثیت سے مسلمان رہیں گے یا کچھ اور ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس تھوڑے ہی عرصے میں بعض بعض جگہ بازگشت کے آثار نمودار ہو چلے ہیں اس سے زیادہ اور کوئی بات لغو ہو نہیں سکتی کہ مسلمان اس لئے ناکام ہیں کہ ان کی سیاست مذہب کے تحت میں ہے کسی اصول اور نظرئے کے صحیح اور غلط ہونے کی یہ کوئی کسوٹی نہیں ہے کہ وہ ہنگامی طور پر کامیاب یا ناکام ہے روس میں کمیونزم کامیاب ہے، جرمنی میں نازی ازم کامیاب ہے، اٹلی میں فیسزم کامیاب ہے، فرانس اور امریکہ میں جمہوریت کامیاب ہے، انگلستان اور جاپان میں شاہی کامیاب ہے اور ان میں سے ہر ایک اصولی حیثیت سے دوسرے کی ضد ہے۔

مسلمان اگر دنیا میں اپنا وجود قایم رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں بھی اپنے تمدن و مذہب کی تمام خصوصیات کے ساتھ حل کے میدان میں آنا چاہئے۔ اگر اپنے علم اور نشان کے ساتھ انھوں نے فتح حاصل کی تو وہ مسلمانوں کی اور اسلام کی فتح ہوگی۔ لیکن اگر انہی افراد نے جو اس وقت مسلمان ہیں سوشلزم نازی ازم یا کمیونزم اختیار کر لیا تو مسلمانوں کی حیثیت سے انھوں نے تو ہتھیار ڈال دئیے شکست قبول کرلی۔ وہ کمیونزم، سوشلزم یا نازی ازم کی فتح ہوگی جس پر مسلمانوں کو خوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ اگر مسلمان سود لینا شروع کر دیں تو ان کی اقتصادی بدحالی دور ہو جائے اور واقعی اس کی انھوں نے تبلیغ بھی کی ۔ یہ وہی لوگ ہیں جو جی ہار چکے ہیں اور جنھیں اپنے ہتھیاروں پر بھروسہ نہیں رہا ہے۔ اگر مسلمان سود لے کر امیر ہو جائے تو وہ یقیناً مسلمان کی حیثیت سے امیر نہیں ہوا بلکہ یہودی یا بنئے کی حیثیت سے امیر ہوا قرآن کے اقتصادی نظرئے کے ایک پہلو سے وہ منکر ہوا اور یہودیوں اور بنیوں سے اس نے شکست کھائی۔ اس معاملہ میں اس نے انکا ایمان قبول کر لیا۔

تعجب ہے مسلمانوں میں اب اتنا دم بھی باقی نہیں رہا جتنا انگلستان کی سیاسی پارٹیوں میں ہے۔ گلیڈ اسٹون کے بعد سے انگلستان کی لبرل پارٹی تنزل پذیر ہے کبھی کنزروٹیو اور کبھی لیبر پارٹی اقتدار حاصل کر رہی ہے مگر لبرل اپنے اصولوں سے کسی طرح انحراف نہیں کرتے۔ کتنی ہی اقلیت میں ہوں

مگر اپنے اصولوں اور نظریوں کی تبلیغ کئے جاتے ہیں۔ اپنی شکستوں کا باعث اپنے عمل کی کوتاہیوں کو سمجھتے ہیں حریفوں کی فتح سے مرعوب ہو کر اپنے اصولوں کو بُرا نہیں کہتے۔ اور جس شخص کا لبرل اصول پر عقیدہ نہیں رہتا وہ لبرل پارٹی سے استعفےٰ دے کر دوسری پارٹی میں چلا جاتا ہے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ مذہب سے انکار کرتے ہیں، سوشلسٹ اور کمیونسٹ بنتے ہیں، اسلام کے ہر اصول پر معترض ہیں مگر پھر بھی اپنے کو مسلمان ہی کہے جاتے ہیں اس کا یہ سبب ہے "کہ دوسرے گروہوں میں ان کی قدر ہی اس وجہ سے ہے کہ یہ مسلمان ہو کر اسلام اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں اگر یہ اسلام کو ترک کر کے کسی دوسرے گروہ میں مل جائیں تو پھر ان میں کوئی ایسی بات نہیں رہتی جس کی وجہ سے ان کو وہاں امتیاز حاصل ہو۔

"مسلمان سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے کانگریس کے ماتحت تنظیم کریں، مذہبی اور تمدنی حیثیت سے علیحدہ تنظیم کریں" یہ خیال غیر اسلامی بھی ہے اور غیر معقول بھی۔ پورے تمدن میں شعبہ سیاست کی وہ حیثیت ہے جو نظام سیاسی میں پولیس اور فوج کی۔ جس تمدن میں سیاسی تنظیم موجود نہ ہو وہ پراگندہ اور مضمحل ہو جاتا ہے۔ سیاسی اور اقتصادی اغراض کے لئے مسلمان جداگانہ تنظیم نہ کریں اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان انفرادی حیثیت بلا شرط اس کانگریس میں داخل ہو جائیں جو اس وقت تک ۹۹ فی صدی ہندو ہے، جس کی قیادت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے، جس پر ہندو مذہبیت کا غلبہ ہے، جس کا سیاسی رخ ابھی معین نہیں ہے کہ وہ یورپ کے سرمایہ دارانہ قوم پرستی کے نظریئے پر آگے بڑھے گی یا سوشلسٹ ہو جائے گی، جو مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود کو بالکل تسلیم نہیں کرتی، جو اس کی سخت مخالف ہے کہ مسلمان مسلمان کی حیثیت سے اپنی ضروریات اور شکایات پیش کریں، جو مسلمانوں کو اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کانگریس کے عہد نامے اور مینی فسٹو پر دستخط کرنے بعد مذہبی معاملات میں بھی اپنی رائے آزاد رکھیں۔ یوپی میں ابھی اس وقت ہوا جب کانگریس پارٹی اور لیگ کی پارلیمنٹری پارٹی میں اشتراک عمل کی گفتگو ہو رہی تھی۔ اس وقت مسلمان سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے بالکل کانگریس کی پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں گے، مجلس واضعان قانون میں یہ ان پر واجب ہوگا

کہ ہر معاملہ میں کانگریس پارٹی کے ساتھ رائے دیں، وزراء کی حیثیت سے صرف کانگریس کی پالیسی کا نفاذ عمل ان کا فرض ہوگا۔

دوسری طرف مسلمان اپنی تمدنی اور مذہبی تنظیم علیحدہ کریں گے اس تنظیم کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیئے کہ قرآن کے مطابق مسلمانوں کا جو مذہب اور تمدن ہے اس کی حفاظت کی جائے اور اس کی تبلیغ کی جائے۔

کانگریس میں سوشلیسٹ پارٹی کی اکثریت ہو جاتی ہے اور کثرت رائے سے یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ سوشلیسٹ حکومت قایم کی جائے اور مذہبیت کا استیصال کیا جائے، خدا کے خلاف اعلان جنگ ہو۔ ہندوستان کا سیاسی نظام جس میں مسلمان بھی شامل ہوں گے فوراً اس فیصلے کی تعمیل میں مصروف ہوجائے اور دوسری طرف اپنے معینہ فرائض کے مطابق مسلمانوں کا مذہبی اور تمدنی نظام مسلمانوں کے مذہب اور تمدن کی حفاظت میں مصروف ہو جائے گا۔ اس حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے سیاسی نظام کا ساتھ دیکر مذہب کا استیصال کریں یا اس سوشلسٹ حکومت کا ساتھ دیکر جو مذہب میں مداخلت کر رہی ہو مذہب کا استیصال کریں مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ تجویز پیش نہ کی جائے کہ جو مسلمان سیاسی نظام میں داخل ہوں وہ سیاسی نظام کا ساتھ دیں اور جو مذہبی نظام میں داخل ہوں وہ مذہبی نظام کا ساتھ دیں۔ مگر یہاں یہ دشواری پیش آئے گی کہ ہر مسلمان شہری کی حیثیت سے سیاسی نظام میں داخل ہوگا اور ہر مسلمان مسلمان کی حیثیت سے مذہبی اور تمدنی نظام کے تحفظ کا ذمہ دار ہوگا۔ اس معاملے میں ذمہ داریاں مشترک ہیں منقسم اور جداگانہ نہیں ہیں۔

ان شعبوں کے الگ الگ ہونے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ کانگریس مذہبی، تمدنی سیاسی اور اقتصادی امور کی اس طرح تشریح کردے کہ ہندوستان کے تمام مروجہ مذاہب کے پیرو اس پر متفق ہو جائیں۔ مذہبی اور تمدنی امور میں اسی مذہب کا قانون نافذ العمل ہو، ان قوانین کے نفاذ وعمل کے لئے ہر فرقے کی عدالتیں قایم کردی جائیں، حکومت ان عدالتوں کے فیصلوں کے نفاذ کی ذمہ دار ہو اور مذہبی قوانین میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ اقلیتیں اس کو خوشی سے منظور کرلیں گی مگر کیا اکثریت

اور کانگریس بھی منظور کرے گی ؟

اگر کانگریس کو یہ صورت منظور نہیں ہے تو مسلمان ہرگز کانگریس میں بلا شرط اور انفرادی حیثیت سے شریک نہیں ہوں گے۔ وہ کانگریس کی اس معاملے میں شدت سے مخالفت کریں گے۔

قوم پرست مسلمانوں کو چھوڑ کر باقی سب مسلمان کانگریس کو ہندوؤں کی فرقہ وارانہ انجمن سمجھتے ہیں۔ وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ کانگریس کامل آزادی کی طالب ہے۔ اگر کانگریس کامل آزادی کی طالب ہوتی تو احمد آباد میں مولانا حسرت موہانی کا کامل آزادی کا رزولیوشن کامیاب ہو جاتا۔ اس وقت گاندھی جی نے اس رزولیوشن کی سخت مخالفت کی۔ اس وقت گاندھی جی کو یہ عذر تھا کہ ہندوستان ابھی کامل آزادی کی جنگ کے لئے تیار نہیں ہے۔ حالانکہ اصل وجہ مخالفت یہ تھی کہ اس وقت خلافت کمیٹی کے ماتحت مسلمانوں کی تنظیم ہندوؤں سے بہتر تھی۔ گاندھی جی کو یہ خوف ہوا کہ اگر اس وقت یہ تحریک شروع ہوئی تو ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور ہندو راج کی تمنا خواب پریشان ہو کر رہ جائے گی۔

پھر ٹھیک دس برس بعد لاہور میں کانگریس نے کامل آزادی کا رزولیوشن منظور کیا اور وہ بھی اس بات پر چڑ کر، محض دھمکی دینے کے لئے کہ حکومت نے نہرو رپورٹ منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یقیناً سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان آزادی کی جنگ کے لئے سنہ ۱۹۲۱ء سے زیادہ تیار نہ تھا۔ ہاں مسلمان منتشر اور پراگندہ ہو چکے تھے۔ اب نہ فردائے سیاست پر مسلمانوں کے استیلاء کا اندیشہ تھا اور نہ اس کا خوف تھا کہ تحریک کسی وقت اتنی طاقتور ہو جائے گی جو گاندھی جی کے قابو سے باہر ہو جائے۔ اس وقت سے اب تک گاندھی جی نے اِنڈی پنڈنس (INDEPENDENCE) کی کتنی تشریحیں کی ہیں ان کو دیکھئے ان کی نیت اور ہمت کا اندازہ ہو جائے گا۔

مسلمانوں کو اس کا یقین ہے کہ کانگریس کی تحریک اور کانگریس کے ۹۹ فی صدی لیڈروں کا مقصد ہے کہ ہندوستان کا داخلی اختیار اکثریت کی حیثیت سے ہندوؤں کو مل جائے، ہندوستان پر انگریزوں کی سیادت قائم رہے اور انگریزی سنگینوں کے زور سے وہ مسلمانوں کے ساتھ وہی عمل کریں جو انھوں نے

ایک زمانے میں بودھ مذہب کے پیروؤں کے ساتھ کیا تھا۔ اگر کانگریس واقعی آزادی کی طالب ہوتی تو وہ اس وقت تک کے لئے کہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قایم ہے مسلمانوں کے مطالبات ضرور منظور کر لیتی۔ مسلمان صرف دور محکومیت ہی کے لئے تحفظات چاہتے ہیں کامل آزادی ملنے کے بعد کیا ہوگا اس کی انھیں کوئی فکر نہیں ہے۔ مگر وہ زمانہ کانگریس کے تصور میں نہیں ہے جب انگریز نہوں گے اور ہندوستان کو استقلال حاصل ہوگا۔ ان کی یہ تمنا بھی نہیں ہے۔ وہ تو صرف برطانوی سیادت اور حمایت میں عہدے اور اختیار چاہتے ہیں۔

کانگریس کی یہ فرقہ وارانہ تحریک نئی نہیں ہے۔ جس روز سے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہوا ہے انھوں نے زیادہ سے زیادہ فرقہ وارانہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے مسلمان نہیں چاہتے تھے کہ انگریزوں کی زبان میں تعلیم رائج ہو۔ یہ وہی پالیسی تھی جو مصر، شام، عراق اور دوسرے مقامات میں مسلمانوں نے اختیار کی مگر ہندوؤں نے آگے بڑھ کر لبیک کہا اور بڑے جوش سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ہندوستان کو انگریزی مال کی منڈی بنانے میں ہندوؤں ہی نے تعاون کیا۔ انگریزوں سے پہلے چونکہ مسلمان بادشاہوں کی حکومت تھی اس لئے اس وقت برطانوی حکومت کی پالیسی یہ قرار پائی کہ مسلمانوں کو اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے پامال کیا جائے لہٰذا ہندوؤں کے لئے لوٹ معاف کر دی گئی۔ ہندوؤں نے بڑھ بڑھ کر ملازمتیں حاصل کیں۔ مسلمان عہدوں اور دفاتر سے بیدخل کئے گئے۔ قرضے اور سود کے قوانین اس قسم کے بنائے گئے جو ساہوکاروں کے لئے بہت مفید تھے، مسلمانوں کی تمام جائدادیں ہندو ساہوکاروں کے قبضہ میں گئیں، ہندو ایجنٹوں کے ذریعہ ملک میں انگلستان کی مصنوعات بکنے لگیں دستکار جو کثرت سے مسلمان تھے برباد ہوگئے۔

ہندوؤں کو یہ درس اسی وقت سے دیا گیا تھا جب سے انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے کہ مسلمان باہر کی قوم ہیں ہندو ہندوستان کے قدیم باشندے ہیں، انگریز ہندوستان کو آزاد کرانے آئے ہیں، سیاست کی تعلیم دینے اور تہذیب سکھانے آئے ہیں۔ جس وقت ہندوستانی حکومت کے قابل ہو جائیں گے تو ان کو حکومت خود اختیاری دی جائے گی، ہندو اکثریت میں ہیں لہٰذا

حکومت انہی کی ہوگی ہندوؤں نے اس سبق کو خوب رٹا اور پھر انگریزوں ہی کی نگرانی میں کانگریس کے ماتحت تنظیم اور حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اب مسلمان اچھی طرح پامال ہو چکے تھے۔ ان میں سرسید پیدا ہوئے تعلیم اور نوکری کا وعظ شروع ہوا۔ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی تنظیم سے گھبرا کر اور نیز فرقہ وارانہ رقابت کو اور زیادہ قوت دینے کے لئے انگریزوں نے مسلمانوں کی بھی مدارات شروع کر دی۔ نوکریاں ان کو بھی ملنے لگیں۔ ہندوؤں نے اس کو مسلمانوں کی طرف سے اپنے حق پر جارحانہ اقدام سمجھا اور حکومت سے بھی وہ اس پر خفا ہوئے کہ ہمیشہ سے مورد الطاف ہم تھے اب یہ مسلمانوں پر کرم کیا۔ انھوں نے اس حکومت خود اختیاری کے حصول کے لئے اور زیادہ شدت سے کوشش شروع کر دی جس میں سارا اختیار اکثریت کو حاصل ہوگا اور انگریز کو یہ اختیار نہ رہیگا کہ اندرونی انتظام میں دخل دے۔ اگر مسلمان بغاوت کریں گے تو انگریزوں کی فوجیں ان کی سرکوبی کے لئے موجود ہوں گی۔

اب رہا ہندوؤں کا یہ وعظ "آزادی اور متحدہ قومیت" تو مسلمان اس سب کو ریا سمجھتے ہیں ہندو جب لفظ قوم بولتا ہے تو اس کے ذہن میں سوائے ہندو قومیت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ہر مطالبہ متحدہ قومیت کے طرف سے صرف اس لئے کرتے ہیں اور اسی وجہ سے بحیثیت بہیرہ بنگا مسلمانوں کو بھی کانگریس کے ایجیٹیشن میں شریک رکھنا چاہتے ہیں کہ انگریز ان کا مطالبہ پورا کرنے میں فرقہ وارانہ اختلاف کا عذر پیش نہ کر سکیں۔

ہندوؤں کی سیاسی پالیسی مسلسل اور مربوط ہے۔ بار بار جھکڑانے کے بعد بالآخر کانگریس نے نئے دستور میں عہدے قبول کئے چھ صوبوں میں اس وقت کانگریس کی گورنمنٹ ہے۔ کہیں ایک جگہ بھی مسلمان چیف منسٹر ہوا ؟

جب تک الیکشن کے نتائج کا اعلان نہ ہوا اس وقت تک کانگریس والوں کو مسلم لیگ کے ساتھ بڑا عشق تھا۔ یہ منصوبے تھے کہ کانگریس اور لیگ مل کر وزارت قایم کریں گی مگر جس وقت یہ دیکھا کہ کانگریس کو اتنی اکثریت حاصل ہوگئی ہے کہ اس کو کسی دوسری پارٹی سے اتحاد کرنے کی ضرورت

نہیں ہے تو یہ اعلان کردیا گیا کہ کانگریس وزارت بنانے میں کسی پارٹی سے اتحاد نہ کرے گی۔ مسلم لیگ مذہبی انجمن قرار دی گئی اور بلاتکلف یہ کہہ دیا گیا کہ مسلم لیگ اور اس کے لیڈر اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے کوئی گفت گو کی جائے مسلمانوں کو راست انفرادی حیثیت سے کانگریس کا ممبر بنایا جائے پنڈت جواہر لال اس فتح کے جوش میں یہاں تک بڑھے کہ انھوں نے اپنے ایک اخباری بیان میں یہ بھی فرمادیا کہ کانگریس میں مسلمان ممبروں کی تعداد ہمیشہ لیگ سے زیادہ رہی ہے ہزاروں اور لاکھوں مسلمان کانگریس کے ممبر ہیں۔ اگر پنڈت جواہرلال نہرو صدر کانگریس کا یہ بیان صحیح ہے تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں مسلمانوں کی نیابت اس تعداد کے اعتبار سے کیوں نہیں ہے ؟ پنڈت جواہرلال سچے ہیں تو مسلمانوں کے اس خیال کی تصدیق ہورہی ہے کہ ہندو کانگریس میں مسلمانوں کو اختیار کی جگہ دیکھنا پسند نہیں کرتے اور چونکہ کانگریس میں انتخاب مشترکہ اور مخلوط ہے وہ آسانی سے ان مسلمانوں کو ناکام کردیتے ہیں جو کانگریس میں انتخاب کے لئے آٹھتے ہیں ۔ ورنہ کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں مسلمانوں کی تعداد اس کا ثبوت ہے کہ مسلمان کانگریس میں بالکل نہیں ہیں یہ دو چار آدمی بھی جو ہیں محض نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں یا انتخاب سے نہیں آئے۔

اس وقت پنڈت جواہرلال نہرو کی یہ کوشش ہے کہ عام مسلمانوں کو کثیر تعداد میں کانگریس کا ممبر بنایا جائے ۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مطالبات سے نجات حاصل کرنے کے لئے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی (CONSTITUENTASSEMBLY) ایک نیا نسخہ ایجاد کیا ہے جس کے نمائندے ہر بالغ کے ووٹ سے منتخب ہوں گے۔ مسلمانوں میں کانگریس اثر پیدا کرنے کی کوشش کرے یہ کچھ عیب نہیں ہے مگر جس مقصد کے لئے وہ یہ کررہی ہے وہ اچھا نہیں ہے۔

مسلمان جب تحفظات کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہندوؤں کی طرف سے طعن کیا جاتا ہے کہ مسلمان اکثریت پر اعتماد نہیں کرتے ۔ مسلمان ڈرپوک ہیں ، اس قسم کے تحفظات اور فرقہ وارانہ تفریق اصول جمہوری کے خلاف ہے ، یہ تحفظات جمہوری نظام میں کھپ نہیں سکتے ۔ عجیب ! ان بزرگوں کو یہ خبر نہیں کہ

جمہوریت کی بنیاد ہی بے اعتمادی پر ہے۔ جب تک لوگوں میں اعتماد رہتا ہے شاہی سب سے بہتر حکومت ہے اور وہ قایم رہتی ہے۔ لیکن جب بے اعتمادی اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ ہر فرد اپنے مفاد کی خود نگرانی ضروری سمجھتا ہے اور نیابت پر بھی کسی کو اعتماد نہیں رہتا تو جمہوریت کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ لوگ جس قدر زیادہ بدگمان اور بے اعتماد ہوں گے اتنا ہی جمہوری نظام بہتر بنے گا جمہوریت کی تاریخ اس خیال کی تصدیق کر رہی ہے۔

جمہوری نظام میں کیا چیز کھپ سکتی ہے اور کیا نہیں کھپ سکتی یہ عجیب منطق ہے۔ یہ متفقہ رائے ہے کہ انگلستان کو دنیا میں سب سے زیادہ جمہوری آزادی حاصل ہے مگر وہاں بادشاہ موجود ہے۔ انگلستان کی جمہوریت میں بادشاہ کھپ سکتا ہے ہندوستان کی جمہوریت میں فرقہ دارانہ تحفظات نہیں کھپ سکتے۔ پھر اسی سلسلہ میں ایک اور بات ہے جو بہت ہی مضحکہ خیز ہے ایک طرف جمہوریت کا تخیل اتنا بلند کہ اقلیتوں کے فرقہ وارانہ مطالبہ سے سخت گریز اور دوسری طرف مستقل مذہبی اکثریت کا دعویٰ قایم۔ جس طرح آئین میں جداگانہ حلقہائے انتخاب ہونے کے باوجود کانگریس نے مسلمانوں کے الیکشن میں دخل دیا اسی طرح مختلف فرقوں کے وزرار کا تناسب معین ہونے کے باوجود یہ بھی کیا ہوتا کہ کسی جگہ مسلمان وزرار کی تعداد ان کے تناسب سے زیادہ بڑھادی ہوتی۔ اس سے مسلمان یہ سمجھتے کہ اب ہندوؤں میں فراخدلی پیدا ہوگئی ہے۔ نہیں گن گن کر ہندوؤں کی تعداد پوری کی گئی۔ پھر اڑیسہ میں تو کمال ہی کر دیا ایک بھی مسلمان وزیر نہیں رکھا گیا۔ یہ صرف ایسے موقعوں کے لئے ہے کہ پنڈت جواہرلال نہرو یہ فرمایا کرتے ہیں کہ "میں ان معاملات کو فرقہ دارانہ نظر سے دیکھنا پسند نہیں کرتا" بیشک یہ غیر فرقہ وارانہ نظر ہندوؤں کے لئے بہت مفید ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ جملہ اغراض کے لئے مسلم لیگ کے ماتحت اپنی تنظیم کریں، ریاستہائے متحدہ جمہوریہ مستقلہ ہند اپنا مطمح نظر قرار دیں۔ دستور میں اقلیتوں کے لئے ایسے تحفظات قایم کریں کہ اس کا امکان باقی نہ رہے کہ کسی حصہ ملک میں کوئی مستقل مذہبی اکثریت استبداد قایم کر سکے۔ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں یہ مسلمانوں ہی کے اندیشوں، خطرات اور احتیاط کی ہوگا

کہ ہندوستان میں مذہبی فرقوں کی ایسی جمہوریتہ قایم ہو جائے جس میں جمہوریتہ کی صرف صورت نہیں بلکہ حقیقت ہو۔ ہندو اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اپنا فرقہ وارانہ استبداد قایم کرنے کی کوشش کریں گے یہ مقتضائے فطرت ہے لہٰذا ان پر اعتماد کرنا بد ترین حماقت ہے۔ کیا ہندو اور مسلمان ہمیشہ لڑتے رہیں؟ اور اگر لڑتے رہیں گے تو آزادی کی جنگ کیسے لڑی جائے گی؟ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہرگز یہ منظور نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان لڑتے رہیں بلکہ مدنظر دائمی اور مضبوط اتحاد ہے۔ اور وہ اس طرح حاصل ہوگا کہ مسلمان مسلم لیگ کے ماتحت نہایت طاقتور تنظیم کریں۔ ایسی طاقتور کہ کسی ایسے فرد کو جو اپنے کو مسلمان کہتا ہو اس کے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت نہ ہو، سوائے مسلم لیگ کے اور کسی ٹکٹ پر کوئی مسلمان مجلس واضع قانون میں منتخب نہ ہو سکے ہندو اور انگریز یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ سوائے مسلم لیگ کے مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ یہ حالت پیدا کرنے کے لئے جو کچھ بھی کرنا پڑے وہ کیا جائے پھر جب کانگریس آزادی کی جنگ کے لئے اور مجالس واضعان قانون اور وزارتوں کی ترکیب میں مسلمانوں سے اتحاد اور اشتراک عمل کی خواہش کرے تو اس کو اس صورت میں منظور کیا جائے کہ ملک کے لئے جب کوئی پروگرام بنے اور پالسی معین کی جائے تو مسلم لیگ اور کانگریس کی مجالس شوریٰ کا مشترکہ اجلاس اس کام کو انجام دے اور اس کا عمل دونوں انجمنوں کی مجالس عاملہ کے سپرد ہو۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اس طرح معاہدہ ہوگا جس طرح دو قوموں کے درمیان ہوتا ہے ہندو ہندو لیڈروں کی قیادت میں اور مسلمان مسلمان لیڈروں کی قیادت میں آزادی کے لئے بحیثیت حلیف کے جنگ کریں گے مسلمان ہندو کانگریس میں مدغم ہو کر فوج کے خدمتی کی حیثیت سے پیچھے پیچھے نہیں چلیں گے۔

انگلستان بینک

از جناب محمود احمد صاحب سبزواری بی اے عثمانیہ

موجودہ زمانہ میں دنیا کے مختلف حصوں میں مال و اسباب کے انتقال اور لین دین کا کاروبار جاری ہے اور ہر ملک کے تجارتی تعلقات دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اسی بنا پر ہر ملک کا نظام زر بین الاقوامی نظام زر کا ایک جز بن گیا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد لوگوں کو اس امر کا اچھی طرح احساس ہونے لگا کہ جب کسی ملک کے نظام زر میں خرابی واقع ہو جاتی ہے تو ساری دنیا کا اس سے متاثر ہونا کم و بیش ضروری ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایک ملک صرف اپنے نظام زر کو درست کر کے کامیابی حاصل کر سکے۔

اس زمانہ میں بین الاقوامی نظام زر کا سب سے بڑا مرکز شہر لندن ہے۔ لندن کے ایک مربع میل کے اندر اندر وہ جگہ واقع ہے جو "عالمی بازار زر" کہلاتی ہے اور یہیں کی ایک سڑک "تھریڈ نیڈل" پر وہ مشہور مالی ادارہ واقع ہے جس کا بین الاقوامی نظام زر پر بڑا اثر ہے۔ اس سے میری مراد انگلستان بینک ہے۔ اس رقبے میں تمام مالی اداروں کی شاخیں، چھوٹے بڑے دفتر، ایجنسیاں یا کارندے موجود ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۶ء یہاں ۲۰۸ مختلف بینکوں کی شاخیں موجود تھیں۔ اس وجہ سے یہ کہنا کہ دنیا کا نظام زر بڑی حد تک انگلستان کے نظام زر پر منحصر ہے کچھ زیادہ غلط نہیں ہے۔ جنگ سے پہلے انگلستان اپنی مرکزیت کا تنہا اجارہ دار تھا مگر اب پیرس (فرانس) اور نیو یارک (امریکہ) بھی اس کے رقیب بن گئے ہیں۔ تاہم اقتصادی حالات اور مالی بحرانات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو تقویت انگلستان بینک کو حاصل ہے وہ دوسرے بازاروں کو میسر نہیں۔

انگلستان کا نظام زر تین بڑے اجزا پر مشتمل ہے۔ (۱) انگلستان بینک جو ایک خانگی ادارہ ہے مگر حکومت کا بینک بھی اسی کو سمجھنا چاہیئے۔ (۲) "دوسرے بینک" جن میں

انگلستان کے ۵ بڑے بنک بہت اہمیت رکھتے ہیں اور تیسرے لمبارڈ اسٹریٹ، جو اصل میں غیر ملکی
بنکوں کے مترادف ہے مگر یہ اپنے قدیم نام سے مشہور ہے۔ تیرہویں صدی میں پوپ نے لمبارڈ
قوم کے چند افراد کو ٹیکس وصول کرنے کے لئے یہاں روانہ کیا یہ لوگ اس حصہ میں آباد ہو گئے اور
نقد میں روپیہ کا لین دین شروع کر دیا۔ بعد میں لندن کے سناروں نے بھی اس حصہ میں آباد
ہو کر اپنا کاروبار شروع کیا اور اس طرح لمبارڈ اسٹریٹ جو دراصل ایک سڑک کا نام ہے بازار
زر کے مترادف سمجھا جانے لگا مگر ہمارا موضوع بحث اس وقت انگلستان بنک ہے۔ اس کے
فرائض اور کاروبار پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں
بینکاری کی ابتدا کیوں اور کب ہوئی۔

موجودہ زمانہ میں جو لفظ بینکنگ یا بینکاری استعمال ہوتا ہے اس کا آغاز انگلستان میں
سنہ ۱۶۴۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ تک لوگ اپنے زاید ذخیرے اور اندوختے "ٹاور
آف لندن" میں محفوظ رکھا کرتے تھے۔ اور یہاں پس انداز کو محفوظ کرنے کا مطلب یہ ہوتا تھا
کہ حکومت ان کی حفاظت کی ضامن ہے۔ چارلس اول کے زمانہ میں ملک میں مختلف بدامنیاں
ہوئیں اور حکومت کو روپیہ کی سخت ضرورت لاحق ہوئی۔ ابتدا میں نئے محصول عائد کئے گئے
چنانچہ ان ہی نئے محاصل میں ایک "محصول جہاز" تھا جس کے خلاف عوام نے صدائے احتجاج
بلند کی اور جان ہمپڈن کا نام اس سلسلہ میں کافی مشہور ہے۔ جب حکومت کو اس طرح ناکامی
ہوئی تو بادشاہ نے شاہ اسپین، پوپ، اور لندن کے شہریوں سے قرضہ حاصل کرنے
کی کوشش کی مگر کامیابی یہاں بھی قسمت میں نہ تھی مجبوراً چارلس نے سب طرف سے مایوس ہو کر
ٹاور آف لندن کے ذخیرہ پر جس کی تعداد ۱۳ لاکھ پونڈ تھی قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ نے حکومت
کا اعتبار لوگوں کی نظروں میں گرا دیا اور ان کا رجحان بینکاری کی طرف ہونے لگا۔

اس واقعہ کے بعد سے سوداگروں اور تاجروں نے اپنی رقمیں خود اپنے پاس رکھنا
شروع کیں مگر اب ان کے خزانچیوں اور منشیوں نے جعل، فریب اور دھوکہ سے کام لینا شروع کیا۔

کبھی یہ رقم لے کر فرار ہو جاتے تھے۔ اکثر اوقات کثیر رقمیں اپنے آقاؤں کی بغیر اطلاع سُناروں کو قرض دیتے تھے جو ان کو ۴ پنس روزانہ کے حساب سے سود ادا کرتے تھے۔ چنانچہ اب لوگوں نے اپنی رقمیں سُناروں کے حوالہ کرنا شروع کیں۔ اس طرح سُناروں نے ان فرائض کی انجام دہی اپنے ذمہ لی جو موجودہ زمانہ میں بنک کرتے ہیں۔ یہ تاجروں اور خانگی افراد کا روپیہ محفوظ رکھتے تھے، لوگوں کو روپیہ قرض دیتے تھے، ہنڈیاں خریدتے اور ان پر بٹہ کاٹتے تھے۔ جو لوگ ان کے پاس اپنا سرمایہ محفوظ رکھتے تھے ان کو یہ ایک رسید دیا کرتے تھے۔ اور معتبر سُناروں کی یہ رسیدیں موجودہ نوٹوں کی طرح دست بدست گھومتی تھیں۔ اسی زمانہ میں بیوپاریوں نے بھی روپیوں کا لین دین شروع کیا۔ مگر ان کے خلاف شکایات تھیں کہ یہ شرح سود بہت زیادہ وصول کرتے ہیں چنانچہ چارلس دوم کے زمانہ میں حکومت کو ۱۵ سے ۲۰ فیصد شرح سود پر قرضہ ملا کرتا تھا۔ یہ خصومت اس وقت اور زیادہ ہوگئی جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی حاصل کردہ شرح کا نصف بھی ان لوگوں کو نہیں دیتے جن کے سرمایہ سے یہ کاروبار کرتے ہیں۔ بہرحال اب یہ کوشش شروع ہوئی کہ کسی طرح اس کاروبار کو حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔

سنہ ۱۶۹۴ء میں ولیم سوم کی حکومت کو مزید رقم کی سخت ضرورت پیش آئی مگر قدیم تلخ تجربات کی بنا پر کسی نے اس کو رقم دینے کی حامی نہ بھری۔ اس موقع پر اسکاٹ لینڈ کے ایک باشندے ولیم پیٹرسن نے ایک بنک کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اس نے حکومت کو ۱۲ لاکھ پونڈ اس شرط پر قرض دینے کی رضامندی ظاہر کی کہ اول تو اس کو شاہی فرمان کے ذریعہ ایک بنک قائم کرنے کی اجازت دی جائے، دوسرے قرضہ کی رقم کی حد تک بنک کو نوٹ جاری کرنے کا اختیار رہو۔ چونکہ حکومت کو روپے کی شدید ضرورت تھی اس لئے اس نے ان شرائط کو تسلیم کیا اور سنہ ۱۶۹۴ء کے شاہی فرمان کے ذریعہ انگلستان بنک کا قیام عمل میں آیا۔ بنک کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہوا جو گورنر، ڈپٹی گورنر کے علاوہ ۲۴ نظماء پر مشتمل تھی۔ اور ان لوگوں پر یہ بھی پابندی لگ گئی تھی کہ گورنر ۴ ہزار، ڈپٹی گورنر ۳ ہزار، اور ہر ناظم ۲ ہزار پونڈ کے حصے خریدے

یہیں سے انگلستان کے "قومی قرضہ" کا آغاز ہوتا ہے۔

۱۶۹۴ء سے ۱۸۴۴ء تک بینک کی تاریخ مختلف مباحث سے پُر ہے ۱۶۹۷ء میں اس کو ایک شاہی فرمان کے ذریعہ مشترک کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی۔ ۱۶۹۷ء میں سب سے پہلا مالی بحران نمودار ہوا۔ اسی سال فرانس کے حملہ کی خبر نے ملک میں سراسیمگی پیدا کر دی اور بینک کے مخالفوں نے اس کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلانا شروع کر دیں چنانچہ بعض سرآوردہ کاروباری لوگوں نے بینک کے نوٹوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وہ تمام لوگ جن کا سرمایہ بینک میں محفوظ تھا اپنی رقمیں واپس لینے کے لئے بینک پہ یورش کرنے لگے۔ اور وہ وقت قریب تھا کہ بینک دیوالیہ ہو جائے۔ مگر اس نازک موقع پر بعض خاندانی امیروں، اور رئیسوں نے بینک کو قرضے دیکر اس کی ساکھ کو برقرار رکھا۔ نپولیانی جنگوں کے دوران میں بینک نے اپنے نوٹوں کے عوض سونا دینے سے انکار کر دیا مگر یہ پابندی محض عارضی تھی اور اس زمانہ میں نوٹ ہوتے بھی بہت قیمتی۔ چنانچہ سب سے چھوٹا نوٹ ۲۰ پونڈ کا ہوا کرتا تھا۔

بینک کے قیام کی تاریخ سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہو جاتا ہے کہ شاید یہ یورپ کا سب سے پہلا بینک ہو۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ یورپ میں بینکاری کی ابتدا بہت پہلے سے ہو چکی تھی چنانچہ بارہویں صدی میں اطالوی ریاستوں میں متعدد بینک قائم ہو چکے تھے۔ ۱۴۰۷ء میں جینوا کا مشہور بینک "بینک آف سینٹ جارج" اور ۱۵۸۷ء میں وینس کا "بانکو دی ریلیتو" قانونی طور پر قائم ہو چکے تھے پھر پندرہویں صدی میں مغربی یورپ کے متعدد مقامات مثلاً ایمسٹرڈم، ہمبرگ، اور راٹرڈم میں بینک کھلے، سب سے پہلے ۱۶۵۸ء میں بینک آف سویڈن نے اپنے نوٹ جاری کئے۔

بینک اصل میں ایک دوکان ہے جہاں سرمایہ کا کاروبار ہوتا ہے جس طرح دوکان دار ایک شخص سے چیزیں خریدتا ہے اور دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے اسی طرح بینک کچھ لوگوں سے سرمایہ حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو قرض دیتا ہے۔ تو اب دیکھنا یہی ہے کہ انگلستان بینک

کن ذرائع سے سرمایہ حاصل کرتا ہے اور کن مدوں پر اس کو صرف کر کے نفع کماتا ہے۔

انگلستان بینک کے حصول سرمایہ کے ذرائع کو اولاً دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اولاً ملکی ذرائع اور ثانیاً غیر ملکی ذرائع۔ ملکی ذرائع میں حسب ذیل مدات شامل ہیں:۔

۱۔ سرکاری امانتیں۔ اگرچہ انگلستان بینک اپنے دستور کے لحاظ سے ایک خانگی ادارہ ہے لیکن عملاً اور حقیقتاً وہ ایک سرکاری ادارہ ہے۔ اور تمام سرکاری فرائض کو اچھی طرح انجام دے رہا ہے۔ حکومت کے تمام مالی معاملات اسی کے سپرد ہیں، وہی حکومت کے مختلف محکموں کے حسابات رکھتا ہے، وہی قومی قرضے کا انتظام کرتا ہے، وہی دارالضرب کا نمائندہ ہے، اور وہی سرکاری رقموں کا تحویل دار ہے۔ انگلستان بینک کی یہ ایک عجیب خصوصیت ہے کہ اس پر کوئی قانونی گرفت نہیں نہ وہاں حکومت کا کوئی نمائندہ ہے۔ مگر وہ سرکاری کام بڑی عمدگی سے انجام دے رہا ہے۔ اگرچہ یہ بینک خانگی حصہ داروں کی ملکیت ہے مگر سالہا سال سے اس کو "بینکوں کے صدر" کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور کبھی بینک کے نظما اپنے ذاتی منافع کو قومی اور سرکاری مفاد پر ترجیح نہیں دیتے چنانچہ اب یہ بات تسلیم کی جاچکی ہے کہ اس بینک کا اصل کام قومی فلاح و بہبود ہے اور حصہ داروں کا نفع کمانا محض ایک ضمنی چیز ہے۔ از روئے قانون حکومت کو بینک کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے مگر ہمیشہ ہوتا وہی ہے جو حکومت چاہتی ہے۔ بلکہ بینک کے نظما مصیبتوں کے وقت حکومت کے بہترین مشیر ثابت ہوئے ہیں۔ خصوصاً جنگ عظیم میں ان کی امداد قابل تحسین ہے۔ چنانچہ حکومت اپنی تمام رقمیں یہیں رکھتی ہے جنگ کے زمانہ میں بعض اوقات ان رقموں کی تعداد دہ کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی ہے۔ اور بینک کے سرمایہ حاصل کرنے کا یہی ایک بڑا ذریعہ ہے۔

۲۔ خانگی امانتیں۔ بڑے بڑے کارخانے، مشترک سرمایہ دار کمپنیاں، خانگی اشخاص اپنے حسابات یہاں رکھتے ہیں اور ہفتہ واری تختہ میں "دیگر امانتوں" کے نام سے

جو رقم درج ہوتی ہے وہ یہی ہوتی ہے۔ چونکہ انگلستان بینک اپنی امانتوں پر کسی قسم کا سود نہیں دیتا اس وجہ سے ان خانگی امانتوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوتی جو اس بینک کے خاص مرتبہ اور قوت کا لحاظ کرتے ہوئے ہونا چاہیئے تھی

۳۔ بینکوں کے محفوظ ذخیرے۔ انگلستان میں جو مختلف بینک مالی کاروبار کرتے ہیں وہ اپنے محفوظ ذخیرے اپنے پاس رکھنے کے بجائے انگلستان بینک میں رکھوانا زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ان بینکوں پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے کہ وہ اپنے ذخیرے انگلستان بینک میں رکھیں مگر باوجود سود نہ ملنے کے وہ اپنی رقمیں یہاں محفوظ رکھواتے ہیں۔ تمام مالی ادارے ایسے مضبوط ادارہ کی اہمیت کو اچھی طرح جانتے ہیں اور آڑے وقت انگلستان بینک کے ذرا سے اشارہ سے وہ دیوالیہ ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

۴۔ غیر ملکی اداروں کی امانتیں۔ جب کوئی مالی مرحلہ پیش آتا ہے تو بیرونی بازار زر میں کام کرنے والوں، ہنڈی دلالوں اور بنکاروں کو انگلستان بینک کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ بنظر احتیاط اس بینک سے تعلقات رکھتے ہیں اور یہاں اپنا کچھ سرمایہ محفوظ رکھتے ہیں اور چونکہ ان امانتوں کا زیادہ تر حصہ لمبارڈ اسٹریٹ کے توسط سے آتا ہے اس وجہ سے ان کو ملکی ذرائع میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ ورنہ درحقیقت اس کا ذکر غیر ملکی ذرائع میں ہونا چاہیئے۔ غیر ملکی ذرائع میں حسب ذیل مدات شامل ہیں۔

۱۔ غیر حکومتوں کی امانتیں:۔ مختلف حکومتوں کو اپنے معاملات کیلئے بسا اوقات کثیر مقدار میں قرضوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے قرضے حاصل کرنے کیلئے لندن بڑا اچھا بازار ہے جہاں بڑی بڑی رقمیں آسان شرائط پر مل جاتی ہیں کیونکہ انگلستان کے اکثر لوگوں کے پاس اصل زائد بھی ہوتا ہے اور وہ اس کو دوسرے ملکوں میں لگانے کے خواہش مند بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اکثر دوسرے ملک لندن ہی کے بازار زر سے قرضہ حاصل کرتے ہیں۔ پھر انگلستان ایک بڑا صنعتی ملک بھی ہے۔ اور اس زمانہ میں قرضہ عموماً

ملک میں ریلیں بنوانے، جہاز خریدنے، یا آلات حرب خریدنے کے لئے لیا جاتا ہے اور یہ سب چیزیں یہاں ارزاں اور بہتر مل جاتی ہیں۔ اس لئے غیر حکومتوں کو سہولت اسی میں نظر آتی ہے کہ وہ وہیں قرضہ حاصل کریں اور وہیں سے سامان خریدلیں۔ کیونکہ قرضہ یہاں لیکر دوسرے ملک میں سامان خریدنے میں روپیہ کو دوسرے ملک میں منتقل کرنا پڑے گا۔ پھر بعض اوقات قرضہ کی صورت میں یہ شرط بھی لگادی جاتی ہے کہ سامان ہمارے ہی ملک سے خریدا جائے۔ چنانچہ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ہوتا ہے کہ غیر حکومتیں انگلستان بنیک کی معرفت وہاں قرض لیتی ہیں۔ اور یہ سب رقم بنیک اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔ اور اب حکومتیں جن لوگوں سے مال خریدتی ہیں انگلستان ان کو ان کے مال کی قیمت ادا کردیتا ہے۔ اور اس طرح تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے بنیک کو کثیر رقم مل جاتی ہے۔

جنگ کے بعد سے تجارت اور لین دین میں کچھ بے اعتباری سی پیدا ہوگئی ہے۔ اور شرح مبادلہ میں اوتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان اور فرانس کے درمیان تجارت ہوتی ہے اور معمولی حالات میں ایک پونڈ ۱۲۰ مارک کے برابر ہے لیکن اگر کسی وجہ سے ایک پونڈ ۱۵۰ مارک کے برابر ہو جائے تو تباہی آجائے چنانچہ اس کی بیشی کو پورا کرنے کے لئے فرانس اپنی کچھ رقم انگلستان بنیک میں رکھتا ہے اور یہی صورت دوسرے ملک اختیار کرتے ہیں اور اس طرح انگلستان بنیک کو مستقل طور پر غیر ممالک کی امانتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

۲۔ غیر ملکی افراد کی امانتیں:۔ ممالک غیر کے اکثر لوگ اپنی امانتیں یہاں رکھولتے ہیں۔ خصوصاً چھوٹے چھوٹے ممالک کے بادشاہ اور امرا تو اپنی کثیر رقمیں یہاں محفوظ رکھتے ہیں۔ کیونکہ بنیک کی ساکھ اور اعتبار بہت بڑھا ہوا ہے اور ۱۹۳۱ء سے قبل یہاں سے ہر وقت بڑی سے بڑی تعداد میں سونا حاصل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ لوگوں کو اس پر بڑا اعتماد ہے۔

اور وہ اپنی رقموں کو یہاں رکھنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ اور اس طرح بینک کو باہر سے اچھی خاصی رقمیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

۴۔ غیر ملکی تاجروں اور بینکوں کی رقمیں:۔ انگلستان بڑا صنعتی ملک ہے اور اس کے یہاں دوسرے ملکوں سے لین دین ہوتا ہے۔ اور اس لئے غیر ممالک کے کاروباری افراد یہ چاہتے ہیں کہ اپنی کچھ رقمیں یہاں محفوظ رکھیں۔ پھر موجودہ زمانہ میں پونڈ صرف انگلستان کا ہی زر نہیں رہا بلکہ دوسرے چھوٹے چھوٹے ممالک مثلاً ہالینڈ، سویڈن، ناروے وغیرہ یا ہندوستان اور دیگر انگریزی مقبوضات کا بھی بیرونی سکہ پونڈ ہی ہے۔ اس طرح پونڈ کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور دو ممالک جب اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں رقومات روانہ کرتے ہیں تو انگلستان ہی کا توسط تلاش کرتے ہیں ان سب وجوہ کی بنا پر انگلستان بینک کے پاس غیر ملکی تاجروں اور بینکوں کی کثیر رقمیں رہتی ہیں اور اس کے سرمایہ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہیں۔

بہر حال ان مختلف ذرائع سے بینک کے پاس کافی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے۔ اب بینک اپنا سرمایہ صرف دو قسم کے کاروبار میں لگاتا ہے اول حکومت کو قرضے دینا اور دوسرے خانگی افراد کو قرض دینا۔

حکومت کو آمدنی تو ایک مقررہ وقت پہ ہوتی ہے مگر خرچ فی الفور ہوتا رہتا ہے۔ اب چونکہ یہاں حکومت کے مختلف محکموں کی رقمیں رہتی ہیں۔ اس لئے ایک محکمہ کی فاضلات سے دوسرے کا کاروبار کر دیا مگر بعض اوقات حکومت کو اپنی متوقعہ آمدنی سے زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ اس وقت بینک ہی حکومت کو قرض دیتا ہے۔

بینک ایک خانگی ادارہ ہے اور اُسے اپنے مالکوں کے لئے کچھ نفع بھی کمانا ہے اس لئے وہ معمولی کاروبار مثلاً ہنڈیوں پر بٹہ کاٹنا، تمسکات پر قرضے دینا، حصص پر قرضے دینا، اور اسی طرح کے دوسرے کام کرتا ہے۔ عموماً یہ لمبارڈ اسٹریٹ کو عندالطلب قرضے دیا کرتا ہے۔

ں بازار کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ یہاں رقم پر کم سے کم مدت تک کا سود مل جاتا ہے ۔ نانچہ یہاں دنوں تک کا سود ملتا ہے ۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ سود کی شرح بہت کم ہوتی ہے مگر پونکہ کثیر رقم دی جاتی ہے اس لئے کچھ منافع مل جاتا ہے ۔ مگر بینک کے اس معمولی کاروبار کی یک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ذرائع کا لحاظ کرتے ہوئے بہت کم رقمیں ان مدّوں پصرف کرتا ہے — وہ ایک مرکزی بینک ہے اور اس کی ذمہ داریاں نہ صرف اندرون ملک لہ بیرون ملک بھی پھیلی ہوئی ہیں اور مصیبت کے وقت سب کی نظریں اسی پر پڑتی ہیں اس لئے وتا وہ ۵۰ فیصد امانتیں بشکل زر نقد محفوظ رکھتا ہے ۔ اور ۵۰ فیصد کاروبار میں لگاتا ہے ۔

آج کل یہ بینک ۱۸۴۴ء کے قانون کے تحت کام کر رہا ہے ۔ اس قانون کے دو بنیادی سول ہیں اوّل یہ کہ نوٹ جاری کرنے کا اجارہ صرف اسی بینک کو حاصل رہے گا ۔ دوسرے ٹوں کی ایک معینہ تعداد تو تمسکات کی ضمانت پر جاری کی جائے گی اور اس کے بعد تمام تعداد کے ر قدر فلز بطور ضمانت رکھنا لازمی ہوگا ۔ ان دونوں باتوں پر عمل کرنے کے لئے حسب ذیل باتوں حکم دیا گیا ۔

(۱) لندن کے اطراف میں ۶۵ میل کے اندر اندر کوئی اور بینک اپنے نوٹ جاری نہ کرے ۔

(۲) صوبوں میں کسی نئے بینک کو نوٹ جاری کرنے کی اجازت نہ ہو ۔

(۳) جن بینکوں کو یہ حق پہلے سے حاصل ہو وہ صرف اس تعداد تک محدود کر دیا جائے جو تاریخ منظوری تک جاری ہوں ۔

(۴) دوسرے بینکوں میں اگر کوئی دیوالیہ ہو جائے یا کاروبار بند کر دے یا کسی دوسرے بینک میں ضم ہو جائے تو اس کے جاری شدہ نوٹوں کے دو ثلث کی مقدار کی حد تک انگلستان بینک کو نوٹ جاری کرنے کا حق حاصل ہو جائے گا ۔

(۵) ایک کرور ۴۰ لاکھ پونڈ کی حد تک انگلستان بینک کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ تمسکات کی ضمانت پر نوٹ جاری کرے لیکن اس سے زائد نوٹوں پر ان کے ہم قدر سونا رکھنا لازمی ہے ۔

(۶) انگلستان بنیک کے نوٹ تمام ملک میں بجز اسکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ کے زر قانونی قرار دیئے گئے۔

(۷) انگلستان بنیک کے کاروبار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ شعبہ نوٹ اور شعبہ بنیکاری۔ نوٹوں کا اجارہ ۱۹۲۱ء میں مکمل ہوا اور تمام دوسرے بنیکوں کے نوٹ آہستہ آہستہ غائب ہوگئے۔ بنیک کے نوٹ جاری کرنے پر مختلف اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں لچک بالکل نہیں ہے نہ اس میں بازاری ضروریات کے مطابق کم و بیش ہونے کی صلاحیت ہے۔ کیونکہ جب ہر نوٹ کے معاوضہ میں سونا رکھنے کی شرط لازمی قرار دی گئی تو بازار کو حسب ضرورت رقم نہیں مل سکتی۔ اور اسی وجہ سے انگلستان میں چک کا رواج ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ کاروبار بڑھا اور اس کے لئے زائد زر کی ضرورت ہوئی مگر زر کی تعداد محدود تھی اس لئے لوگوں نے ایسا طریقہ نکال لیا کہ بغیر زر کے کاروبار ہو جایا کرے۔

بنیکاری کا شعبہ ہر جمعرات کو اپنے حسابات کا تخمینہ شایع کرتا ہے۔ جس میں بنیک کے دونوں شعبوں کا بدھ کی شام تک کا حساب ہوتا ہے اس کو ہفتہ واری تخمینہ کہا جاتا ہے جو حسب ذیل ہے:۔

انگلستان بنیک کا ہفتہ واری تخمینہ

(اس ہفتہ کا حساب جو یوم چہارشنبہ تباریخ ۱۱ر نومبر ۱۹۲۵ء کو ختم ہوا)

حساب صیغہ اجرائی نوٹ

ذمہ واریاں	اثاثے
جاری شدہ نوٹ ۱۸۰و۹۶۴و۰۸۵ پونڈ	حکومت کی امانتیں ۱۱و۰۱۵و۱۰۰ پونڈ
	دیگر امانتیں ۷و۴۳۴و۹۰۰ "
	سونے کے سکے و طلائی خشت ۱۶۲و۵۱۴و۰۸۵ "
جملہ ۱۸۰و۹۶۴و۰۸۵ پونڈ	جملہ ۱۸۰و۹۶۴و۰۸۵ پونڈ

حساب صیغہ بینکاری

ذمہ داریاں			اثاثے		
بینک کے حصہ داروں کا سرمایہ	۱،۴۵،۵۳،۰۰۰	پونڈ	حکومت کی تمسکات	۳۲۷،۴۰،۳۸،۴	پونڈ
دیگر حصص	۳۲،۰۴،۱۴۷	"	دیگر تمسکات	۱۹۴،۵۷،۴۴،۳	"
عوام کی امانتیں	۱،۴۳،۹۸،۱۸۹	"	نوٹ	۴،۱۸،۱۹،۷۱۰	"
دیگر امانتیں	۹،۹۴،۷۲،۱۰۵	"	چاندی اور سونے کے سکے	۸،۷۰،۵۰۴	"
ہفتہ داری اور دیگر ہنڈیاں	۲،۵۹۱				
جملہ	۱۳،۲۱،۳۰،۰۴۲	پونڈ		۱۳،۲۱،۳۰،۰۴۲	پونڈ

ان تخمینوں پر نظر ڈالنے سے ایک بات عجیب نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ صیغہ اجرائی نوٹ میں نوٹ ذمہ داریوں کی جانب ہیں اور شعبہ صیغہ بینکاری میں ان کو اثاثوں کے تحت رکھا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اول الذکر صیغہ نوٹوں کے بدلے سونا دینے پر مجبور ہے۔ دوسرا صیغہ بجائے سونے چاندی کے رکھنے کے نوٹ رکھتا ہے۔ اور اس کو جب ضرورت ہو وہ ان کو صیغہ اجرائی نوٹ میں بھجوا کر سونے میں تبدیل کرا سکتا ہے۔ اس لئے اس کو اسی میں سہولت ہے کہ وہ اپنے یہاں نوٹ رکھے۔

ہفتہ داری حسابات مرتب ہونے کے بعد مجلس نظما میں پیش ہوتے ہیں اور اس کی منظوری کے بعد ان کو شائع کر دیا جاتا ہے یہ فیصلہ مجلس نظما ہی کرتی ہے کہ اس ہفتہ میں بینک کی شرح کیا ہے مختلف سالوں میں بینک کی شرح کا جو اوسط رہا اس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکتا ہے:-

	پونڈ - شلنگ - پنیس
۱۸۴۵ تا ۱۸۵۴	۳ - ۸ - ۵

		پونڈ	شلنگ	پنس
۱۸۵۵ تا ۱۸۶۴		۴	۱۲	۹
۱۸۶۵ تا ۱۸۷۴		۳	۱۶	۱
۱۸۷۵ تا ۱۸۸۴		۳	۳	۱۱
۱۸۸۵ تا ۱۸۹۴		۳	۳	۲
۱۸۹۵ تا ۱۹۰۰		۳	۰	۴

گویا ۱۸۴۵ء سے ۱۹۰۰ء تک اوسط ۳ پونڈ ۱۲ شلنگ رہا ہے۔ موسم گرما میں موسم سرما کے مقابل شرح زیادہ رہتی ہے، موسم گرما میں فصل کے درو کے وقت، تعطیلات کے سفروں کی وجہ سے روئی اور دوسری اشیاء کی درآمد کی وجہ سے شرح بڑھ جاتی ہے۔ جنگ کے زمانہ میں شرح میں کچھ زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

شرح سود کا انحصار بنک کے ذخیرہ محفوظ پر ہے۔ اگر ذخیرہ کے سونے میں کمی ہونے لگتی ہے تو شرح سود بڑھا دی جاتی ہے۔ اس طرح نہ صرف سونا بنک سے نکلنا بند ہو جاتا ہے بلکہ دوسرے ملکوں کا سونا بھی بنک میں آنے لگتا ہے۔ اگر سونے کی مقدار حد سے آگے بڑھ جائے تو شرح سود کم کر دی جاتی ہے انگلستان بنک کی شرح کا بین الاقوامی بازاروں میں بڑی بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے اور اس کا اثر زر کی قدر اور اس کی نقل و حرکت پر پڑتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بنک کے ذخیرہ میں کمی بیشی کیوں ہوتی رہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ بنک کے ذخیرہ پر دو قسم کے مطالبات ہوتے ہیں۔ ایک اندرونی مطالبات کہلاتے ہیں اور دوسرے بیرونی۔ اندرونی مطالبات کا تعلق زیادہ تر کاروباری ضروریات سے ہوتا ہے اور یہ ضروریات وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہیں اور ان کا اس طرح بدلنا ناگزیر ہے مثلاً ہر سہ ماہی پر زر کی بڑی مقدار مطلوب ہوتی ہے تاکہ متعدد قسم کی ادائیاں مثلاً لگان، کرایہ وغیرہ کی جائیں

کیونکہ یہاں سہولت کی خاطر ان کی ادائی ہر سہ ماہی پر ہی ہوتی ہے۔ یا ہر ششماہی پر بڑی رقموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ مشترک سرمایہ وار کمپنیاں اس زمانہ میں اپنا منافع تقسیم کرتی ہیں یا اگست کے مہینہ میں لوگ تعطیلات کی وجہ سے لندن سے باہر جاتے ہیں اور ضروریات کے لئے اپنے ساتھ بہت سا روپیہ لے جاتے ہیں یا کرسمس کے موقع پر تحفے تحائف خریدنے، انعامات دینے اور دیگر اخراجات کے لئے رقموں کی ضرورت ہوتی ہے گویا ان خاص خاص موقعوں پر زر زیادہ مطلوب ہوتا ہے مگر بینک ان مطالبات سے خوف زدہ نہیں ہوتا کیونکہ ان مطالبات کی چند خصوصیات ہیں اول تو یہ مقررہ اوقات پر ہوتے ہیں۔ پھر تجربے سے ان کی مقدار کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا ہے، تیسرے بینک کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ رقمیں کس کام کے لئے لی گئیں یا کہاں گئیں اور کب تک واپس آئیں گی۔ ان وجوہ کی بنا پر ان کا انتظام آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

مگر بینک جن مطالبات سے ڈرتا ہے وہ بیرونی مطالبات ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بھی اکثر کا زمانہ مقرر ہوتا ہے اور بینک ان کے صحیح اندازہ سے واقف ہوتا ہے مثلاً روئی یا دوسری پیداواروں کے زمانہ میں مصر اور ہندوستان بہت سا سونا آجاتا ہے۔ مگر بعض بیرونی مطالبات ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کب ہوں گے، کتنی مقدار کے ہوں گے، اور نہ یہ کہ کہاں سے ہوں گے۔ اور اصل میں ان ہی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے انگلستان بینک کو ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔

بیرونی مطالبات جن کی وجہ سے انگلستان بینک کے ذخیرہ طلا پر اثر پڑتا ہے اس میں درآمد کی زیادتی، برآمد کی کمی (سونے اور غیر سونے کی درآمد و برآمد دونوں ان میں شامل ہیں) شرح مبادلہ کے تغیرات وغیرہ مختلف اسباب شامل ہیں۔ اب اس وقت سونے کو باہر جانے سے روکنا کس طرح ممکن ہے اس کی سب سے آسان ترکیب تو یہ ہے کہ بینک قرضے دینا موقوف کر دے مگر ایسا کرنے سے بازار زر میں کھلبلی پڑ جانے کا اندیشہ ہے اور لوگ اپنی امانتیں واپس لینے دوڑیں گے۔

اور وہی مصیبت پیدا ہو جائے گی جس سے بنک بچنا چاہتا تھا۔ تو ایسی صورت میں گو بنک قرضے دینا بند نہیں کرتا مگر شرح سود بڑھا کر قرض لینے والوں کی ہمتیں پست کر سکتا ہے۔ پھر اس کی شرح کی زیادتی کو دیکھ کر دوسرے تمام بنک بھی اپنی اپنی شرح سود بڑھا دیتے ہیں گو یا اب قرضہ زیادہ سود پر ملتا ہے اور امانتوں پر زیادہ سود دیا جانے لگتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرضہ کی طلب میں کمی ہو جاتی ہے اور امانتوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔

مگر ہر موقع پر شرح سود میں زیادتی ٹھیک نہیں کیونکہ بعض اوقات اس کی وجہ سے مالی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب انگلستان بنک اپنے ذخیرہ محفوظ کو گھٹتا دیکھ کر شرح بڑھا دیتا ہے تو دوسرے تمام بنک بھی اس کی اتباع میں شرح سود زیادہ کر دیتے ہیں شرح سود کی زیادتی کی وجہ سے کاروباری اشخاص کو بڑی دقتیں پیش آتی ہیں انھیں نہ صرف اونچی شرح پر قرضہ ملتا ہے بلکہ بعض اوقات قرض ملنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ پہلے سے قرضدار ہوتے ہیں ان سے قرضوں کی واپسی کا مطالبہ شدت سے کیا جاتا ہے اور چونکہ جدید قرضہ ملنا دشوار ہوتا ہے اس لئے اچھے اچھے ساکھ والوں کا دیوالا نکل جاتا ہے۔ اور ان کے ساتھ لین دین کرنے والے بھی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ اس طرح دائرہ پھیلتا ہی رہتا ہے۔ اور عوام خاص ساکھ والوں کا دیوالا نکلتے دیکھ کر اپنی رقمیں واپس لینے بنکوں کے پاس آتے ہیں اور ہر شخص رقم بشکل طلا یا انگلستان بنک کے نوٹوں کی شکل میں حاصل کرنا چاہتا ہے اب انگلستان بنک کے ذخیرے پر اس کا نمایاں اثر پڑتا ہے اور یہ ذخیرہ جلد جلد گھٹنے لگتا ہے۔ جس قدر یہ گھٹتا ہے اسی قدر لوگوں کی بدحواسی بڑھتی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عوام انگلستان بنک کے ذخیرے کو کاروباری ساکھ اور اعتبار کا آلہ تصور کرتے ہیں ایسی حالت میں انگلستان بنک کے پاس اپنے ذخیرہ کو بچانے کی صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے یعنی وہ اپنے نوٹ چھاپ چھاپ کر لوگوں کو دے کیونکہ سخت سے سخت مرحلے میں بھی عوام نوٹوں کی طرف سے بدگمان نہیں ہوتے۔ مگر ازروئے قانون بنک ایک خاص مقدار سے زائد نوٹ بغیر ہم قدر سونا رکھے جاری نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسی

حالت میں حکومت کی اجازت سے بینک کا قانون عارضی طور پر منسوخ کر دیا جاتا ہے اور بعد میں پارلیمنٹ سے اس کی منظوری لے لی جاتی ہے۔ جوں ہی بینک کا قانون معطل کیا جاتا ہے مالی بحران کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو مزید نوٹ جاری کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی صرف یہ اعلان کہ بینک کا قانون معطل کر دیا گیا اعتبار پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ انگلستان بینک کی نہ صرف انگلستان بلکہ ساری دنیا میں کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔ اور غالباً اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جان، اے ٹاڈ نے اپنی کتاب "میکانیزم آف ایکسچنج" (THE MECHANISMS OF EXCHANGE) میں حسب ذیل جملہ لکھ دیا ہے۔

"اگر کسی طرح انگلستان بینک کا دیوالا نکل جائے تو کیا ہو۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے مگر یہ کہنا کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتا کہ اس بینک کے دیوالے کے معنی ہیں حکومت برطانیہ اور برطانوی افراد کا دیوالا اور ہر ملکی بینک کا دیوالا بلکہ دیگر تمام مملکتوں کا دیوالا۔"

ساحلِ گنگا کے تاثرات

روانی پر تری اے رودِ گنگا! جان و دل قرباں
تری موجوں میں ہے عہدِ کہن کی داستاں پنہاں

نمایاں ہے ترے آئینے میں تصویر ماضی کی
ترے چینِ جبیں میں نقش ہے تقدیر ماضی کی

ترا ہر قطرہ ہندوستاں[1] کے حق میں آبِ حیواں ہے
حیات افروزِ ایماں بادۂ سرجوشِ عرفاں ہے

نہ تنہا ضو فگن تیری تجلی چشمِ زائر میں
تڑپتی ہیں تری موجیں دلِ بے تاب شاعر میں

ترے ہی دم سے باقی ہے نشاں دیرینہ عظمت کا
وطن مرجع بنا ہے آج تک اہلِ عقیدت کا

تمنا ہے ترے جلووں کی پہنائی میں کھو جاؤں
تری ان مضطرب موجوں سے ہم آغوش ہو جاؤں

کسی صورت سے اب قابو نہیں ہے شورشِ دل پر
کہوں کیونکر جو کچھ دیکھا ہے میں نے تیرے ساحل پر

کمی اب تک نہیں ہے اشکِ رنگیں کی روانی میں
جھلک کس کی نظر آتی ہے مجھ کو تیرے پانی میں

ابھی تک نقش ہے دل پر تری موجوں کی بیتابی
وہ اندازِ تلاطم وہ ادائے رقصِ سیمابی

دمِ صبح اللہ اللہ وہ شعاعِ مہر کا عالم
وہ کوسوں تک مسلسل ارتعاشِ لرزشِ پیہم

تری یہ مضطرب موجیں ہیں یا کرنوں کا گہوارہ
ترے یہ مرتعش جلوے ہیں یا فردوسِ نظارہ

جدھر دیکھو ہے اک طوفان رنگینی و رعنائی
ہے کیف اندوز تا حدِ نظر چشمِ تماشائی

محمد یحییٰ ۔ اعظم گڈھ

---

[1] مراد ہندو دنیا۔

دنیا کی تجارت میں مشرق کا مقابلہ

جناب برکت علی صاحب بی اے (جامعہ)

جاپان کی برآمد کی تجارت میں جو روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اُسے ایک اتفاقی صورت کہکر ٹالا نہیں جاسکتا یہ تو محض ایک جزو ہے، مشرق میں صنعت کی غیر معمولی رفتار ترقی کا جو دنیا کے بڑے بڑے صنعتی ممالک کے تجارتی توازن کو درہم برہم کر دینے والی ہے۔ جاپان کی اس روز افزوں صنعتی ترقی کا راز اس کی محنت کی ارزانی میں مضمر ہے۔ اور یہ وہ ذریعہ ہے جس سے دنیا کی تجارت کا رُخ نہایت آسانی سے پھیرا جاسکتا ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے جاپانی مقابلے کی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے، مشرق اور مغرب کے تجارتی تعلقات میں یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ارزانی محنت کے بل پر مشرق کی مصنوعات بین الاقوامی بازار میں داخل ہو کر خطرناک نتائج کا باعث ہوئیں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی معاشی تاریخ اسی نوع کا ایک اور واقعہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، مغرب کا صنعتی انقلاب مشرق کے اسی معاشی امتیاز کی بنا پر ہوا۔ محنت کی بچت کے لئے بے شمار تدابیر کا بروے کار لانا متعدد ایجادات کا باعث ہوا اور یہ محنت کی بچت کا احساس پیدا ہوا مشرق کی سستی محنت کی وجہ سے۔

پہلے پہلے تو یورپ اور ایشیا کی تجارت میں معیار زندگی اور اخراجات پیدائش کو بہت کم دخل تھا، اس لئے کہ مغرب میں مشرق سے جو اشیا برآمد کی جاتی تھیں ان میں محنت کا سوال ہی نہ تھا۔ مثلاً مسالے، ریشم اور چاء۔ مگر اٹھارہویں صدی میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری مغربی تجارتی کمپنیوں نے مشرق سے یہاں کی مصنوعات اپنے ممالک میں بھیجنی شروع کیں ان مصنوعات میں ہندوستان سے روئی کا سوت، سوتی کپڑے، ململ، چھینٹ اور پردے وغیرہ بھیجے جاتے تھے۔ اور چین سے ریشم بسترے، اور برتن وغیرہ۔ سترہویں صدی کے آخری سالوں میں ان مصنوعات کی برآمد اس قدر بڑھی

کہ اسے یورپ کی بڑھتی ہوئی مفلوک الحالی کا باعث ٹھہرایا جانے لگا۔ اور جیسے آج یورپ کے کپڑے ہندوستانی صنعت کو برباد کر رہے ہیں، ہندوستانی اور چینی مصنوعات نے برطانیہ کی اونی صنعت کو آغاز کار ہی میں صدمہ پہنچایا۔ یہاں کے سوتی کپڑے نہ محض سستے ہوتے تھے۔ بلکہ ڈیزائن اور رنگ کے لحاظ سے جاذب نظر بھی ہوتے تھے۔ اس زمانے کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقابلے نے برطانیہ کی یہ حالت کر دی تھی کہ انگلینڈ کے بڑے بڑے صنعتی شہر ویران نظر آتے تھے۔ کارخانے بند پڑے تھے، اور مزدور ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے اور بھیک مانگ کر پیٹ پالتے تھے۔ چنانچہ ہندوستانی کپڑے کی غیر معمولی درآمد سے تنگ آکر حکومت نے اس کی مخالفت شروع کی اور سارے ملک میں اس کے خلاف اتنی نفرت پھیلی کہ اگر کوئی عورت ہندوستانی چھینٹ پہن کر سڑک پر نکلنے کی جرأت کرتی تو اُسے تنگ کیا جاتا اور کپڑے پھاڑ ڈالے جاتے۔

فرانس میں بھی مشرقی مصنوعات کی مخالفت ہوئی۔ اور وہاں ۱۶۸۶ء میں ایک قانون کے ذریعے ہندوستانی مال کی درآمد اور فرانسیسی کارخانوں میں ان کی نقل ممنوع قرار دی گئی۔ انگلستان میں بھی ۱۷۰۰ء اور ۱۷۲۰ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستانی مال کی درآمد کو روکنے کے لئے قوانین بنائے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستانی مصنوعات کی فروخت یک لخت نہ رُک سکی۔ اور نہ برطانیہ کی ریشمی مصنوعات کے لئے مشرقی بازار میں کوئی کشش پیدا ہو سکی۔ برطانیہ میں قانونی ممانعت کے باوجود چوری چوری ہندوستان کا مال پہنچ جاتا تھا، جو وہاں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی ہوتا تھا۔

ہندوستانی اور چینی مصنوعات کے خلاف جو قوانین پاس ہوئے، اُن پر بحث مباحثے میں مشرق کے معیارِ زندگی اور اخراجات پیدائش کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ متعدد مصنفین نے اس امر پر زور دیا کہ برطانوی مال کی نکاسی مشرق کے بازار میں اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب ان کے اخراجات پیدائش میں تخفیف کی جائے۔ ایک غیر معروف مصنف نے ۱۷۰۱ء میں یہ رائے پیش کی کہ بہتر تنظیم، اصولِ تقسیم عمل اور مشینوں اور انجنوں کے ذریعے کم لاگت پر اشیاء پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اور ہندوستانی مال کی درآمد اس چیز کے لئے محرک ثابت ہو گی۔ صنعتی انقلاب سے ایک صدی پہلے محنت کی

بچت کے لئے جو تدبیریں عمل میں لائی جاتی تھیں، ان میں سے اس نے بہت سی مثالیں بھی پیش کیں۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں کپڑے کی صنعت میں متعدد ایجادات کی وجہ سے کلوں کا رواج مکمل ہو چکا تھا۔ مشرق کی صنعت پارچہ پر سے پابندیاں اٹھالی گئیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے نہایت اطمینان سے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ "اب ہندوستانی محنت کی تجارتی مقابلے میں کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ انھوں نے اس دعویٰ کی تصدیق یہ بتا کر کی کہ ہندوستان سے اب مصنوعات کم آتی ہیں۔ اور کچا مال زیادہ آتا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ "ہر دکان میں بالکل ہندوستانی طرز اور رنگ کا برطانوی ململ ایک چوتھائی بلکہ اکثر ایک تہائی سے بھی کم قیمت پر برائے فروخت موجود رہتا ہے۔" اس کا سبب انھوں نے یہ بتایا کہ "جو کام برطانوی کارخانہ متعدد مشینوں کی مدد سے ایک کاریگر کے ذریعے پورا کرتا ہے، اسی کام کے لئے ہندوستانی کارخانے میں پندرہ میں کاریگروں کی ضرورت ہوگی۔"

ہر چند انگلینڈ میں ہندوستانی مصنوعات کے سیلاب کو مشینوں اور کارخانوں کے رواج نے روک دیا تھا لیکن اس کے باوجود مشرق کے بازاروں میں برطانوی مال اب بھی مقابلے کے قابل نہ ہو سکا تھا۔ اول تو ہندوستان کے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے برطانوی کپڑے سے بہتر ہوتے تھے، اور پھر برطانوی کپڑے کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی تھیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے برطانوی کارخانے داروں کو ہندوستان میں کاروبار کرنے کے لئے آمادہ کیا تھا مگر اُسے ناکامی ہوئی۔ ۱۸۳۴-۴۲ء میں چین میں برطانوی کپڑے کی درآمد کل درآمد کا ۸ فی صدی تھی۔ مگر ۱۸۷۲-۸۱ء میں برطانوی کپڑے کی صنعت نے اس قدر ترقی کرلی تھی کہ اس کی درآمد کا اوسط کل درآمد کا ۲۸ فی صدی ہوگیا۔ اس کے علاوہ دوسری مصنوعات کی درآمد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ۱۸۷۱ء میں ہندوستان کی درآمد میں برطانیہ کی سوتی مصنوعات کا ۵۰ فی صدی حصہ تھا۔

غرض مشین نے مشرق کی سستی محنت کو شکست دیدی تھی۔ یہیں سے مشرق کی دستی مصنوعات کی تباہی کا آغاز ہوتا ہے۔

مشین کے رواج سے مصنوعات کی مقدار بڑھی اور ملک کی ضروریات سے کہیں زیادہ اشیاء بچ رہتی تھیں۔ اس بقیہ حصّے کے لئے منڈی کی ضرورت تھی۔ گذشتہ سو سالوں سے مشرق بعید کے ممالک پر مغربی کارخانوں کی مصنوعات کی کھپت کے لئے برابر اہل مغرب کا دانت جما رہا ہے۔ چنانچہ برطانوی سفیر نے جس نے ۱۸۴۲ء میں نانکن کے معاہدے پر دستخط کئے، اپنے ملک کے صناعوں کو مطلع کیا کہ "میں نے تمہاری مصنوعات کے لئے ایک ایسی منڈی تلاش کی ہے کہ لنکا شائر کی تمام مشینیں اس کے ایک صوبے کے لئے بھی مصنوعات کی فراہمی سے قاصر رہیں گی" اس وقت سے اب تک یہ ممالک اپنی امیدوں کی تکمیل کے لئے کوشش کرتے رہے، لیکن یہ امیدیں بس تھوڑے ہی دن کے لئے تھیں اس لئے کہ اس وقت کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ مشرق اپنی ضروریات کے لئے خود مصنوعات تیار کرنے لگا۔

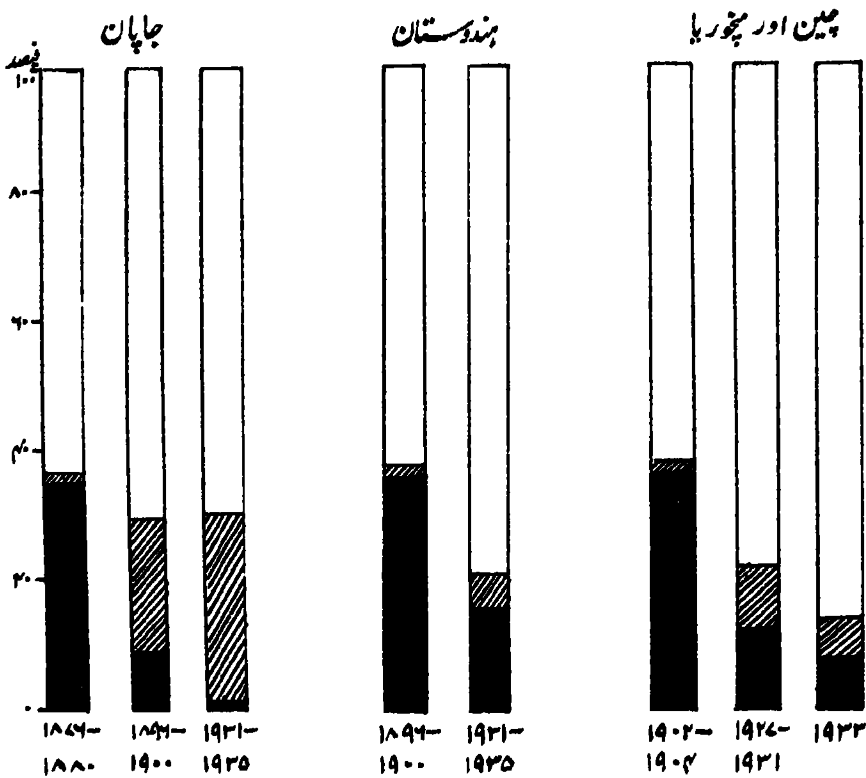
ایشیا کی ان تین بڑی قوموں میں بہ نسبت مغربی ممالک کے بیرونی خریداری کا اوسط نہایت کم رہا ہے۔ اگر ۳۰-۱۹۲۶ء کے دور کے اعداد و شمار پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں سالانہ خریداری کا اوسط ۷۷ر۱ ڈالر فی کس تھا، اور چین میں ۴۸ر۲ ڈالر فی کس، ممالک متحدہ امریکہ میں جو بہت حد تک اپنی ضروریات خود اپنی اندرونی تجارت سے پوری کر سکتا ہے، سالانہ درآمد کا اوسط ۹۷ر۳۲ ڈالر فی کس تھا۔ جاپان میں جو ایک ذرا سا جزیرہ ہے، بیرونی خریداری کا سالانہ اوسط ۱۵ ڈالر فی کس اور سلطنت متحدہ برطانیہ میں ۱۱۳ ڈالر فی کس تھا۔

غرض مشرقی درآمد کا تناسب مغربی درآمد سے بھی کم ہے۔ اگر مشرق کے تمام ممالک کی درآمد کے اوسطوں کو ایک دوسرے سے ضرب دے دیا جائے اور اس طرح جو مجموعی اوسط حاصل ہوگا، وہ بھی مغرب کی درآمد کے اوسط سے کم رہے گا۔ چین کا رقبہ کوئی ۴ ملین مربع میل ہے۔ اور آبادی ۴۰۰ ملین، مگر ۳۰-۱۹۲۶ء کے درمیان یہاں کی سالانہ درآمد کا اوسط ۷۶۳ ملین ڈالر تھا۔ اور ہندوستان میں جس کی آبادی ۳۵۰ ملین ہے، اس مدت میں سالانہ درآمد کا اوسط ۸۵۱ ملین ڈالر کی قیمت کا تھا۔ جاپان میں جس کی تجارت کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے، درآمد کا اوسط ۹۶۳ ملین ڈالر

کی قیمت کا تھا۔ ان کے مقابلے میں یورپ کے ایک چھوٹے سے ملک بلجیم کو لیجئے۔ اس کی سالانہ درآمد کا اوسط ایک ارب، تین کرور ۲ لاکھ ملین ڈالر تھا۔ ایشیا کے ان تینوں ممالک کی آبادی کا تناسب دنیا کی تمام آبادی کا ۴۰ فیصدی ہے، مگر ان کی مجموعی تجارت کا تناسب کل ۸ فیصدی۔

مشرق کی اس تجارتی پستی کے دو اسباب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ یہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی اتنا پست ہے کہ مشکل سے زندگی گذارنے بھر کے لئے آمدنی ہوتی ہے، اس لئے قوتِ خرید

جاپان، ہندوستان اور چین کی درآمد کا نقشہ (خاکہ ۱)
(مختلف زمانوں میں)



خام روئی — روئی کی مصنوعات

بہت کم ہے۔ دوسری سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اپنے محدود وسائل کے ساتھ دستکاری کا بوسیدہ اور زوال آمادہ نظام سرمایہ داری کے منظم کارخانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور سرمایہ داری کا بے پناہ سیلاب اس قدیم نظام کو بہائے لئے جاتا ہے۔ مغرب کے اس مقابلے نے مشرقی ممالک میں جو بے چینی اور انتشار پھیلایا ہے، وہ سترہویں صدی کی یورپی بے چینی سے جو مشرقی مقابلے نے پھیلا رکھی تھی، کہیں زیادہ ہے۔ اور اس انتشار کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مشرق میں بھی ایک صنعتی نظام بالکل جدید مغربی نظام کے طرز پر پرورش پا رہا ہے۔

مشرقی تجارت کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ مشرق بعید کی معیشت میں کتنی زبردست تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ انیسویں صدی میں ان ممالک میں روئی کے سوت اور سوتی مصنوعات کی درآمد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں چین اور منچوریا کی درآمد میں سوتی مصنوعات کا اوسط ۲۹ فیصدی تھا اور ہندوستان کی درآمد میں ۳۸ فیصدی۔ بیسویں صدی شروع ہوتے ہی جاپان میں سوتی صنعت کو اتنا فروغ ہو چکا تھا کہ اس کی کپڑے کی درآمد ۸ - ۹ فی صدی سے زیادہ نہ رہی۔ حالانکہ سنہ ۱۸۷۶-۸۰ء میں یہ اوسط ۳۶ فیصدی تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ان ایشیائی ممالک میں روئی کی مصنوعات کی درآمد میں نسبتاً تخفیف شروع ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۵ء کے اختتام پر ہندوستان کی درآمد میں روئی کی مصنوعات کا حصہ ۷۷ فیصدی تھا۔ اور چین اور منچوریا میں سنہ ۱۹۲۷-۳۱ء میں ۱۳ فیصدی۔ جاپان کی درآمد میں تو روئی کی مصنوعات کا اوسط بالکل صفر کے برابر تھا۔ اس لئے کہ سنہ ۱۹۳۱-۳۵ء میں کل درآمد کا ۱۔ فیصدی سے بھی کم اوسط تھا۔ مغربی ممالک کو اس سے اور بھی صدمہ ہوا ہے کہ ہندوستان اور چین میں روئی کی مصنوعات جاپان فراہم کرنے لگا ہے۔ سلطنت متحدہ برطانیہ کا حصہ ہندوستان کی روئی کی مصنوعات کی درآمد میں سنہ ۱۹۰۰-۰۲ء میں ۹۵ فیصدی تھا جو سنہ ۱۹۳۳-۳۵ء میں گھٹ کر ۷۵ فیصدی رہ گیا۔ اور جاپان کا حصہ ۱۔ فیصدی سے بھی کم سے بڑھ کر ۲۰ فیصدی ہو گیا۔ اسی مدت میں چین کی درآمد میں سلطنت

متحدہ برطانیہ کا حصّہ ۳۰ سے گھٹ کر ۱۴ فیصدی سے بھی کم رہ گیا اور جاپان کا حصّہ ۱۴ فیصدی سے بڑھ کر ۱۹ فیصدی ہوگیا۔

اس طرح مغرب کی روئی کی مصنوعات کو جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی ان کی دوسری مصنوعات کی برآمد سے ہوسکتی تھی۔ مگر ابھی بھی ناکامی رہی۔ جاپان میں مصنوعات کی درآمد کا اوسط ۱۲ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ اشیاء خام بالخصوص روئی، اون کچا لوہا اور فولاد کی درآمد کا اوسط البتہ ۶۰ فیصدی تک ہے۔ اسی طرح چین کی درآمد میں خاص اشیاء روئی، مٹی کا تیل، تمباکو، گیہوں اور آٹا ہیں۔ البتہ ہندوستان میں ابھی روئی کی مصنوعات کا اوسط خاصا ہے دوسری اشیاء میں مشین، لوہا، کچی روئی معدنی اشیاء اور تیل اور شکر شامل ہیں۔

ان تینوں ایشیائی ممالک میں درآمد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان میں اشیاء خوردنی اور اشیاء خام کی درآمد میں اضافے کا اندازہ خاکہ ۱۷ سے بخوبی ہوجائے گا۔

تجارت کی ان تبدیلیوں سے صاف طور پر عیاں ہے کہ مشرق میں مغربی تجارت کے اقتدار کو دعوتِ مقابلہ دیدی گئی ہے۔ چین، ہندوستان اور سب سے زیادہ جاپان صنعتی نظام کے فروغ سے اب اس قابل ہوگئے ہیں کہ ملک کی مصنوعہ اشیاء کی ضروریات خود پوری کرلیں۔ ایک مدت تک انھیں مغرب سے کلیں اور پرزے خریدنے پڑیں گے، لیکن جوں جوں صنعت ترقی کرتی جائے گی۔ وہ مشین بھی خود ہی تیار کرنے لگیں گے۔ اس کے بعد یہ ممالک (بہ استثنائے ہندوستان) اشیاء خوردنی خریدیں گے۔ اور ان کے بدلے میں اپنے یہاں سے مال برآمد کریں گے اور لامحالہ یہ اشیاء برآمد مصنوعہ اشیاء ہوں گی۔

اس رجحان کی تصدیق جاپان کی برآمد کی تجارت سے پہلے ہی سے ہو رہی ہے ۱۹۲۲ء میں مصنوعات کی برآمد کا اوسط ۵۳ فیصدی تھا جو اب بڑھ کر ۶۰ فیصدی ہوگیا ہے۔ اس میں روئی کی مصنوعات کا بڑا حصّہ ہے، بیرونی ممالک میں جاپان کی مصنوعات کی فروخت کا اثر برطانوی مصنوعات پر بہت برا پڑا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جاپان کی برآمد کا اوسط پہلی بار برطانیہ سے بڑھا۔ ۱۹۳۶ء میں

جاپان برطانیہ سے ۴۴ فیصدی تک بڑھ گیا۔[لہ] جاپان کی برآمد کا اضافہ اور سلطنت متحدہ برطانیہ کی تخفیف چند ممالک مثلاً برطانوی ہند، نیدرلینڈز، اور ایسٹ انڈیز میں خاص طور پر نمایاں ہے۔

برطانوی ہند کی روئی کی مصنوعات کی درآمد میں برطانیہ اور جاپان کا حصہ

	سلطنت متحدہ برطانیہ	جاپان
۱۹۲۴	۸۹/۴	۷/۲
۱۹۲۵	۸۶/۸	۸/۳
۱۹۲۹	۷۵/۱	۱۶/۵
۱۹۳۱	۶۲/۶	۲۹/۶
۱۹۳۲	۵۴/۳	۳۷/۲
۱۹۳۳	۵۶/۸	۳۶/۹
۱۹۳۵	۶۵/۹	۳۰/۷

[لہ] روئی کی مصنوعات کی برآمد کا نقشہ

	برطانیہ	جاپان
۱۹۲۵	۴۴۳۶ ملین مربع گز	۹۰۵ مربع گز
۱۹۲۹	۳۶۷۲ 〃	۱۷۹۱ 〃
۱۹۳۲	۲۱۹۷ 〃	۲۰۳۲ 〃
۱۹۳۳	۲۰۳۱ 〃	۲۰۹۰ 〃
۱۹۳۴	۱۹۹۴ 〃	۲۵۷۷ 〃
۱۹۳۵	۱۹۴۹ 〃	۲۷۲۵ 〃
۱۹۳۶	۱۹۱۷	۲۷۰۸ 〃

ایسٹ انڈیز کی درآمد کی مصنوعات کی درآمد میں برطانیہ، جاپان اور نیدرلینڈز کا حصہ۔

کل قیمت درآمد کا اوسط فی صد

	برطانیہ	جاپان	نیدرلینڈز
۱۹۲۳	۲۹/۶	۱۴/۲	۳۲/۴
۱۹۲۵	۳۲/۶	۲۰/۸	۲۵/۵
۱۹۲۹	۲۲/۹	۲۷/۵	۲۶/۹
۱۹۳۱	۱۱/۳	۴۳/۲	۲۶/۲
۱۹۳۳	۶/۵	۷۴/۴	۷/۰
۱۹۳۵	۴/۰	۷۶/۸	۱۵/۰

یورپ کو اب یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں رہا کہ مشرق صرف ایک منڈی ہے۔ مشرق بعید کی قومیں خود منڈی کی تلاش میں اپنے حدود ملک سے گذر رہی ہیں۔ اب وہ مغرب سے براہ راست تجارتی مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جس کا نتیجہ وہی ہونے والا ہے جو سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے مقابلے سے ہوگیا تھا۔

مشرق میں اس تجارتی احیاء کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں منڈی کی وسعت، اشیاء خام کی کمی، اور محنت کی فراوانی خاص وجوہ ہیں۔ منڈی کے لئے ایشیاء کا کشادہ اور وسیع خطہ خالی پڑا ہوا ہے، اشیاء خام کی یہاں کمی ہے، جنھیں یہ ممالک مصنوعات کی برآمد سے حاصل کریں گے، اور اس طرح صنعت کی ترقی کے لئے تحریک ہوگی۔

مشرق کی صنعتی ترقی میں منڈی کی وسعت، اور اشیاء خام کی کمی کے علاوہ سب سے زیادہ دخل محنت کی فراوانی کو ہے۔ مشرق میں آبادی کا بیشتر حصہ زمین کی پیداوار پر زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر تقسیم کچھ اس طرح پر واقع ہوئی ہے کہ عوام کی بیشتر تعداد کی آمدنی گذر اوقات کی حد سے زیادہ نہیں بڑھ پاتی۔ یہاں صنعتی نظام کا آغاز ایسے ماحول میں ہو رہا ہے کہ محنت کی بہت بڑی مقدار زراعتی آبادی میں موجود ہے، زراعت پر پہلے ہی سے بہت زیادہ بار ہے، اور بڑھتی ہوئی آبادی کا

بیشتر حصہ زراعت کو چھوڑکر کارخانوں کی طرف کھنچا جا رہا ہے، لوگ صدیوں سے زراعت میں لگے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ اس پیشے سے بڑھکر دولت آفریں پیشے کا امکان نہ تھا اس لئے ان کا معیار زندگی دن بدن گرتا جاتا تھا۔ اب چونکہ صنعت میں آمدنی کا امکان پیدا ہوگیا ہے اس لئے لوگ اس کی طرف کھنچ رہے ہیں، اب بھی صنعتی کارخانوں میں گو اجرت بجائے خود بہت کم ہے، لیکن زراعتی پیشے کی آمدنی سے نسبتاً زیادہ ہے۔

مشرق اور مغرب میں اجرت کی سطح کا فرق نہایت نمایاں ہے، اس فرق کی بنا پر مزدوروں کی تحریکیں کے لئے ان کے معیار زندگی کے لحاظ سے اجرت میں اضافے کی بہت گنجائش ہے۔ بہر حال بین الاقوامی مقابلے کے نقطۂ نظر سے جاپان کی اجرت کی سطح قابل توجہ ہے، جاپان میں ایک سوت کاتنے والے کی اجرت امریکہ کے ایک مزدور کی اجرت کے دسویں حصہ سے کچھ ہی زیادہ ہے، چین کا مزدور امریکہ کے مزدور کی اجرت کا بارہواں اور سترہواں حصہ پاتا ہے۔ اور ہندوستانی مزدور ساتواں حصہ۔

اس قدر کم اجرت کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مزدوروں کو لوٹا جاتا ہے۔ بلکہ یہ اجرت ان کے معیار زندگی کو جو انہیں زراعتی پیشے سے حاصل تھا کسی قدر بڑھا ہی دیتی ہے۔ ان مزدوروں کی ضروریات نہایت درجہ محدود ہوتی ہیں ان کا مطالبہ صحت بخش اور سادہ غذا، ایک مختصر سا سادہ مکان اور چند سوتی کپڑوں تک محدود ہوتا ہے۔ جو رقم ان ضروریات پر صرف ہوتی ہے اس کی نسبت سے کہیں زیادہ آرام مل جاتا ہے۔ اور اس حال میں ان کا معیار زندگی تکمیل ضروریات کے لحاظ سے مغربی مزدور کے شاندار معیار زندگی سے کم نہیں ہوتا۔ ان مشرقی مزدوروں کا یہ معیار ان کی غذا کی نوعیت سے جو بیشتر سبزی اور ساگ ہوتی ہے، مقرر ہوگیا ہے، یہ سبزیات برسات کے موسم میں جہاں پانی کافی مقدار میں برستا ہے، بہت بڑی مقدار میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس لئے سستی۔ مشرق کا رقبانہ حصہ جو بین الاقوامی تجارت میں ہوگیا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

مگر ان تمام آسانیوں کے باوجود مشرق کی صنعت کو ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ مزدوروں کی اہلیت

کارکردگی بہت پست ہوتی ہے۔ زمانہ دراز سے یہاں کے لوگ زمین پر کام کرتے آئے ہیں جسے مستقل طور پر چھوڑ دینا انھیں شاق ہوتا ہے۔ دیہات چھوڑ کر شہر میں جائیں گے ضرور، مگر ایک ہی دو سال میں پھر گھر لوٹ آئیں گے۔ اس وجہ سے کارخانوں کو نئے سرے بھرتیاں کرنی پڑتی ہیں اور تجربہ کار مزدور تیار نہیں ہو پاتے۔ ایسے مزدور مشینوں کی باریکیوں سے چونکہ ناواقف ہوتے ہیں اس لئے مشین پر کام کرنے کے لئے انھیں نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ مزدور محنتی ہوتا ہے۔ زیادہ عرصے تک کام بھی کرسکتا ہے، لیکن چونکہ زراعت میں کام کرنے کا عادی ہوتا ہے، اس لئے کارخانہ میں بھی اسی بے پروا خرامی اور آزادہ روی سے کام کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے، اور یہ طریقۂ کار مشین کے لئے قطعاً ناموزوں اور ناقص ہے۔ غرض کارکردگی کے لحاظ سے وہ امریکہ یا مغرب کے کارخانوں کے مزدور کی برابری نہیں کرسکتا۔ اس لئے یہاں مغرب کی بہ نسبت ایک متعینہ کام کرنے کے لئے زیادہ مقدار میں محنت درکار ہوتی ہے۔

لیکن یہ یقین کر لینا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ مشرق کی محنت کی یہ خامیاں دائمی ہیں۔ یہ خامیاں موروثی نہیں ہیں۔ محض صنعت کی غیر پختگی کے نتائج کے طور پر ہیں جو زراعتی ماحول اور خام تنظیم کے اثر سے وجود پذیر ہوئی ہیں۔ انھیں دور کیا جاسکتا ہے، محنت کو تربیت یافتہ بنایا جاسکتا ہے، اور آہستہ آہستہ کارکردگی میں اضافہ ہو بھی رہا ہے۔ صنعتی آبادی میں استقلال آچلا ہے۔ اور تنظیم کی پیداآوری میں اضافہ بھی ہو چلا ہے۔

مشرق کی محنت کے آئندہ امکانات کی تصدیق جاپان کی روئی کی صنعت سے ظاہر ہے۔ چونکہ لوگ یہاں بھی مشین سے آشنا ہوگئے ہیں اس لئے یہاں کی محنت میں سلیقہ اور ترتیب، تنظیم میں ترقی اور سب سے زیادہ کارکردگی میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوگیا ہے۔ گذشتہ دس سالوں میں (سنہ ۱۹۲۵-۳۴) فی مزدور چرخوں کی تعداد دگنی ہوگئی ہے۔ اور سوت کی مقدار وزن فی مزدور ۲۹ فیصدی بڑھ گئی ہے، گو اب بھی جاپان کی کارکردگی امریکہ کی محنت سے گری ہوئی ہے لیکن اضافہ کی رفتار برابر جاری ہے۔ انگلستان کی ملوں کی برابری تو جاپان کی ملوں نے کی ہے،

بلکہ بعض اوقات اس سے آگے نکل جاتی ہیں۔ روئی کی صنعت کے علاوہ جاپان نے دوسری مصنوعات میں بھی ترقی کی ہے، اور اسی قسم کی ترقی چین اور ہندوستان میں بھی ممکن ہے۔

ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے کہ جب کسی نئے صنعتی ملک میں کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے، تو وہ ملک اجرت کی شرح میں اضافہ ہو جانے کے سبب اپنی سستی محنت کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے، مگر جاپان کے حیرت انگیز اضافہ کارکردگی کا اجرت کی شرح پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ جاپان کی زراعتی آبادی میں محنت کثیر مقدار میں موجود ہے جس کی وجہ سے مزدوروں کی رسد کی کثرت سے اجرت کی شرح میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹی تخفیف ہوئی ہے۔ ۱۹۲۶ء میں شرح اجرت اگر سو فرض کی جائے تو ۱۹۳۶ء میں یہ شرح ۶ ، ۸۰ ہو گئی۔ یہ تخفیف اور زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے جب ہم اس واقعے کی طرف غور کرتے ہیں کہ اس زمانے میں جاپانی سکے "ین" کی قیمت گر گئی تھی، جس کے سبب شرح اجرت کو چڑھ جانا چاہئے تھا۔ مگر ہوا یہ کہ سکے کی اس تخفیفِ قیمت کی وجہ سے قیمتیں تو چڑھ گئیں مگر شرح اجرت میں کوئی اضافہ نہوا۔

شرح اجرت کی تخفیف اور مزدور کی اہلیت کارکردگی میں اضافے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجرتوں کی مد میں ۱۹۲۲ء کے آخر میں ۱۹۲۵ء کی رقم کا کل ۴۰ فیصدی ادا کرنا پڑا۔ اگر مزدور کی اجرت میں اس کے اضافی مطالبات مثلاً رہنے سہنے کے اخراجات، مکانات اور دوسرے اخراجات کو شامل کر کے مقابلہ کیا جائے تب بھی جاپان کی شرح اجرت ممالک متحدہ امریکہ، برطانیہ اور غالباً ہر بڑے صنعتی ملک کی شرح اجرت سے کم ہوتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مستقبل قریب میں مشرقی ممالک کی شرح اجرت میں کوئی اضافہ نہوگا۔ محنت کی تنظیم یہاں مفقود ہے۔ اور ایک زراعتی ماحول کے اثر کی وجہ سے ان کی تنظیم ایک حد تک ناممکن بھی، اس کے علاوہ زراعت سے ہٹ کر لوگ صنعت کی طرف چونکہ برابر جوق در جوق چلے آرہے ہیں اس لئے اجرت کو ایک متعینہ کم شرح پر مستقل کر دینے کے بجائے اس میں بھی آسانی اور اطمینان کے ساتھ مزید تخفیف کی جا سکتی ہے، اب اشیاء غذا کی تیاری میں نسبتاً کم محنت صرف ہوگی، اس لئے کہ نئے طریقۂ کار کا رواج ہو چلا ہے جس سے

بے شمار طریقوں سے آسانیاں فراہم کی گئی ہیں بیج کے انتخاب کی آسانی، نئی نئی فصلوں کی کاشت، کھاد کی نئی نئی اور پیداآور قسمیں، اور سب سے زیادہ زمین کی تیاری میں مشین کا استعمال۔ وہ ذرائع ہیں جن سے بہت کم محنت صرف کر کے غذا کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محنت زایدہ کی بہت بڑی مقدار دیہاتی حلقوں سے فراہم ہو جائے گی اور چونکہ دوسرے ممالک میں مشرقی ہجرت پر نہایت سخت پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں، یہ محنت دوسری طرف منتقل نہ ہو سکے گی اور نہایت کم اجرت پر دیسی کارخانوں میں کام کرنے کے لئے مجبور ہوگی۔ ان حالات میں شرح اجرت میں اضافے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

مزدوروں کی زیادتی اور شرح اجرت کی کمی مشرقی ممالک کی صنعتی ترقی اور مصنوعات کی برآمد کو بڑھانے میں خاص طور پر ممد ثابت ہوگی۔ پہلے بھی محنت کی فراوانی اور ارزانی کی بدولت مشرق کے مقابلے نے مغربی منڈیوں میں ہلچل ڈال دی تھی۔ جسے صنعتی انقلاب کی مشینوں نے کچل ڈالا۔ اب پہلی بار مشرق میں مشین اور سستی محنت کی باہمی کوشش سے پھر ایسے مواقع پیدا ہو رہے ہیں کہ مقابلے کی آسانیاں مشرق ہی کو حاصل رہیں گی۔ ان دو عناصر کی آمیزش سے جو فضا پیدا ہو چلی ہے، اسے بہت بڑی بین الاقوامی اہمیت حاصل ہو گئی ہے، اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا معیارِ زندگی کا یہ شدید تفاوت دنیا کی معیشت میں یوں ساتھ ساتھ نبھ بھی سکے گا یا نہیں ؟

اردو رسائل کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز

رسالہ "ساربان" لاہور

رسالہ ساربان اردو زبان میں ایک بلند پایہ ماہوار رسالہ ہے جس میں ذہنی اصلاح و تہذیب کے مدنظر سبق آموز نظموں اور علمی مقالات کے علاوہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پر زبردست مضامین لکھے جاتے رہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر ملکی جرائد اور مشاہیر قوم نے ساربان کو اردو رسائل کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا ہے۔ رسالہ ساربان میں عشقیہ غزلیں۔ اخلاق سوز فسانے اور ایکٹرسوں کی تصاویر قطعاً شائع نہیں ہوتیں۔ سالانہ چندہ صرف تین روپیہ۔ نمونہ کے لیے تین آنے کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

منیجر رسالہ "ساربان" لاہور

حدیثِ عشق

فریبِ حسن ! فریبِ بہار ، کیا کہنا! — طلسم بندیٔ نقش و نگار ، کیا کہنا!

تجاہلِ کرمِ مصلحت نگر ، معلوم! — تغافلِ نگہہِ ہوشیار ، کیا کہنا!

فسوں طرازیٔ حُسنِ نظر اترے صدقے — جنوں نوازیٔ رنگِ بہار ، کیا کہنا!

تراوشِ گلۂ زخمِ دل ، بحالِ تباہ — تقاطرِ مژۂ اشکبار ، کیا کہنا!

جنونِ عشق کی بے ہوشیاں خوشا قسمت — ہوا و سایۂ دامانِ یار ، کیا کہنا!

ہمہ نیاز و ہمہ اضطرابِ شوقِ تمام — فسانۂ دلِ اُمیدوار ، کیا کہنا!

میں دل کا حال کہے جاؤں، چپ سُنے جاؤ یونہیں — ہلیں نہ ہونٹ مرے، بُردبار، کیا کہنا!

کوئی بھی سامنے آئے ، مگر ہو جیسے تمھیں — کمالِ شوق و حدِ انتظار ، کیا کہنا!

بنا ہے دامنِ نشتر، "بہار نامۂ شوق"
"سرشکِ خونِ تمنا نگار" ! کیا کہنا!!

حضرت نشتر، سندیلوی

رفتارِ عالم

چین اور جاپان : منگولیا کی خود مختاری

چین اور جاپان میں آج تک اعلان جنگ نہیں ہوا ہے مگر جنگ کی آگ دہک رہی ہے شکست و فتح کی تفصیلی خبریں آپ روز اخباروں میں پڑھتے ہی ہوں گے، مگر اس سلسلہ میں دو خبریں ایسی آئی ہیں جنھیں ذرا سمجھ لینا چاہیے، اس لئے کہ شاید آگے آگے جو ہونے والا ہے اس کا پس منظر یہی خبریں ہوں گی۔ ایک خبر منگولیا کے متعلق ہے کہ منگول سردار جاپان کی مدد سے اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کی فکر میں ہیں، دوسری خبر یہ ہے کہ روس اور چین میں ایک معاہدہ ہوگیا ہے کہ ایک دوسرے سے جنگ نہ کریں گے، اس لئے کہ قومی معاملات کے تصفیہ کے لئے جنگ "مہذب" انسانیت کا شعار نہیں۔ اس معاہدہ کے بعض دفعات پوشیدہ بھی ہیں۔

آئیے پہلے منگولیا کے معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ منگولیا کا موجودہ علاقہ چنگیز خاں کی وسیع سلطنت کا بچا کھچا حصہ ہے اور جب سے چین پر منگولوں کا مختصر سا تسلط چودھویں صدی عیسوی میں ختم ہوا اس پر بس سناٹا سا چھایا رہا ہے۔ خانہ بدوشوں کی سی زندگی ہے، مگر مہذب دنیا میں خصوصاً منظم اور طاقتور حکومتوں کے پڑوس میں وشت نوردوں کے لئے صحرا بھی حاسدوں کی آنکھ کی طرح تنگ ہوجاتا ہے۔ ان کے ایک طرف روسی سلطنت تھی دوسری طرف چین کی منچو شہنشاہی۔ روسی تہذیب سے تعلق اس لئے نہ بڑھا کہ ان سے متصل سائبیریا کا ویران علاقہ تھا، اُدھر جنوب میں صحرائے گوبی تھا اندرونی منگولیا کی سرحد اگرچہ چین سے ملتی تھی مگر سرحدی علاقہ کی آب و ہوا چینی نوآبادی کے لئے کچھ بہت سازگار نہ تھی۔ مدتوں یونہی سکون کی سی حالت رہی۔ مگر کہتے ہیں کہ سکوں محال ہے قدرت کے کارخانہ میں۔ موت کے سکون تک کو بھی تو زندہ چھیڑے بغیر نہیں چھوڑتے۔ کفن چور کفن چراتے ہیں،

قبر فروش قبریں دباتے ہیں، اور ہر برہنہ نعش پر کئی کئی گدھ منڈلاتے ہیں۔ پھر منگولوں کا سکون تو کچھ موت کا سکون نہ تھا، ایک سکتہ سا تھا۔ مگر روس نے جب مشرق کی طرف قدم بڑھایا تو ان میں بھی، کہ کبھی انھوں نے روس کو فتح کیا تھا، ہلچل پیدا ہوئی۔ مال کا لین دین شروع ہوا، تعلقات بڑھے، ادھر چین نے منچوریا میں بڑے پیمانہ پر نو آبادیاں بسائیں تو منگولیا میں بھی اپنے نو آباد کار بھیجے۔ روس اور چین میں اس علاقہ کے متعلق کچھ اختلاف ہوا تو ۱۸۵۱ء میں ایک معاہدہ کے ذریعہ ل بانٹ کر کھانے کا عہد و پیمان ہو گیا۔ لیکن روس کے جو حوصلے ادھر مشرق میں تھے ان میں جاپان مزاحم ہوا اور ۱۹۰۴ء میں روس کو شکست کھانی پڑی۔ اس شکست کے بعد چین نے اپنے آدمی بڑی کثرت سے اس علاقہ میں بسائے اور خاصکر اندرونی منگولیا میں انھوں نے منگول قبائل کو چینی صوبوں میں اس ڈھب سے شامل کیا کہ ہر جگہ یہ غریب سیاسی اقلیت بن جائیں۔ چینی تاجروں نے یہاں سود پر روپیہ پھیلایا اور قرض کے جال میں غریب منگولوں کو پھانسا۔

چینی زیادتیوں سے گھبرا کر منگولوں نے روس سے تعلقات بڑھائے۔ اس نے الگ الگ سود خواروں کی جگہ منظم بنک بنا دیا، ریل چلا دی، کانیں کھدوا دیں۔ تہذیب میں ترقی شروع ہوئی اور آزادی آہستہ آہستہ ہاتھ سے جانے لگی۔

چین اور روس میں یہ کھینچ تان تھی ہی کہ ۱۹۰۵ء کی فتح کے بعد جاپان بھی منچوں میں شامل ہوا تو اس نے بھی منگولیا پر اپنا حق جتایا۔ روس نے جھٹ اس سے معاملہ چکا لیا اور دو معاہدے ہو گئے۔ ایک کھلا ایک چھپا۔ جاپان نے بیرونی منگولیا اور مغربی منچوریا میں روس کا "حق" تسلیم کر لیا۔ پہلے ۱۸۹۹ء ہی میں انگلستان بھی روس کا یہ "حق" تسلیم کر چکا تھا۔ حلوائی کی دوکان پر باداجی کی فاتحہ اسی کو کہتے ہیں۔

۱۹۱۱ء میں جب چین میں انقلاب ہوا اور جمہوریت قایم ہوئی تو روس اور جاپان نے پھر ایک معاہدہ کیا۔ پیکنگ سے جو خط طول البلد کا گذرتا ہے اسے حد مقرر کیا گیا۔ اس کے مغرب میں روس کا اور مشرق میں جاپان کا حلقہ اثر قرار پایا۔ جاپانیوں کے یہ منصوبے دیکھکر چینیوں نے بھی ہاتھ پیر ہلائے ۱۹۱۲ء میں منگولوں کی آزادی میں معتدبہ کمی کی۔ قبائلی علاقوں کو اپنے باضابطہ صوبوں میں ضم کیا،

اندرونی منگولیا میں اپنے آدمی بڑی کثرت سے بھیجے ۔ لیکن بیرونی منگولیا مقابلۃً محفوظ رہا۔ وہ تو جب روس میں انقلاب کی گڑبڑ ہوئی اور بیرونی منگولیا کو روسی کمک پہنچنے کا امکان بہت کم ہوگیا تو چین نے وہاں بھی اپنا ایک خاص جنرل بھیجا کہ اس علاقہ کو بھی باضابطہ چینی صوبہ بنالے ۔ چونکہ اس کی زد روس پر پڑتی تھی اس لئے جاپان نے بھی چین کو شہ دی ۔ مگر اس چینی جنرل نے وہاں وہ غضب ڈھایا کہ لوگ تنگ آگئے اور بعد کو ایک پاگل روسی نواب ان گرن اسٹرنبرگ نے جو روس سے بھاگ کر آیا تھا وہاں تسلط جما لیا۔ تسلط ہونے کے بعد انھوں نے بھی ظلم میں کمی نہ کی۔ بالآخر روس کی انقلابی فوج نے آکر ان کا خاتمہ کیا تو لوگ ذرا مطمئن ہوئے ۔ ایسی بلا سے نجات ملی تھی کہ لوگوں نے انقلابی فوج کو اپنا بڑا محسن مانا ۔ ادھر پرانا سیاسی نظام سب اس افراتفری میں بیٹھ ہی چکا تھا اس لئے ایک گلابی انقلابی حکومت یہاں قایم ہوگئی ۔ اس کے قایم ہوتے ہی روس نے اپنی ساری فوج ہٹالی ۔ اس سے عوام میں روس کے ساتھ بڑی عقیدت پیدا ہوئی ۔ کہ یہ ہے بے غرض ساتھی ۔ پھر ۱۹۲۴ء میں یہاں کی حکومت میں اور زیادہ جمہوری عنصر بڑھا اور اس وقت سے یہ علاقہ اپنے کو خود مختار سمجھتا ہے ۔ روس کا دوست ہے ۔ اور دوستی اتنی گہری ہے کہ اغیار اسے روس کا ایک صوبہ جانتے ہیں !

ادھر اندرونی منگولیا میں بھی چین سے آزاد ہونے کی تحریک جاپانی مدد سے برابر چل رہی تھی۔ لطف یہ کہ جب موقع ہوتا جاپان چینی قوت کو بھی اکسا دیتا کہ کہیں آزادی خواہ عناصر اپنی حیثیت نہ بھول جائیں۔ ان منگولوں پر ایک تو اپنی جنگ آزادی کی قربانیوں کا بوجھ ہے ، دوسری طرف چینی سرمایہ دار ان کا خون چوسے لیتے ہیں ۔ پھر خود ان کے سردار اور لاما ہیں ۔ اس گروہ تسمہ پا سے بھی جان ضیق میں ہے۔ جاپان اپنی غرض سے انھیں مدد دیتا ہے ۔ جب منچوکو کی نئی ریاست قایم کرائی تو ایک نیم خود مختار صوبہ منگولوں کا ـــــ سن گان ـــــ بھی بنوا دیا کہ منگولوں کی ہمدردی حاصل ہو ۔ اور یوں اندرونی منگولیا میں ہو کر بیرونی منگولیا میں قدم جمانے اور روس کے منصوبے توڑنے کا موقع ملے ۔ منچوریا کی فتح کے ساتھ ساتھ جاپان نے جہول اور چہار کا منگول صوبہ تو دبا ہی لیا ہے ۔ مغربی حصہ میں منگول قبیلوں کے امیروں اور مذہبی پیشواؤں کو رشوتیں دے کر ، وعدے کرکے ، ہتھیار اور سامان جنگ پہنچا کر ،

چین سے آزاد ہونے پر آمادہ کر رہا ہے۔ آزادی کی تحریک کچھ تو منگول سرداروں کی خود غرضیوں کی وجہ سے، کچھ قدرتی طور پر چین سے آزاد ہونے کی آرزو سے قوت پکڑ رہی ہے۔ ان کے ایک بڑے سردار شہزادہ تے نے پہلے چین سے معاملہ کرکے اپنی ایک خود مختار سیاسی جمعیۃ تسلیم کرالی تھی۔ اور چین میں سن یات سین کے خیالات پر دیانت سے عمل ہوتا اور چیانگ کائی شک ملک کے اقتدار پسند اور جابر عناصر سے ساز باز کے باعث اس منگولی جمعیۃ سے عہد شکنی نہ کرتا تو شاید جاپان کو اتنی آسانی یہاں نہ ہوتی۔ چین کی بد عہدی اور کمزوری نے شہزادہ تے کو جاپان سے جا ملایا۔

لیکن بیرونی منگولیا کا قرب ہے، روسی اثر ہے، جمہوری اور اشتراکی خیالات کی خاصی اشاعت ہو چکی ہے۔ اس لئے معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا شاید لوگ سمجھتے ہوں۔ جاپان کے اثر میں منگولوں کے خود غرض افراد ہیں اور نفس پرست مذہبی پیشوا۔ اور کیوں نہ ہو، یہ بس بھرے پودے کسی دوسرے بڑے زہریلے درخت کے سایہ ہی میں خوب پنپتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جاپان کے ساتھ ہیں تو کچھ چین کے ساتھ ہوں گے کہ خود غرضی کو اخلاقی اصولوں سے سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن منگول قبائل کی عام آبادی دیکھتی ہے کہ اس کے لئے نہ ادھر کچھ ہے نہ اُدھر۔ وہ چین سے بیشک بیزار ہے مگر سوچتی ہے کہ جاپان ہی سے ساتھ کیا مل جائے گا۔ منچوریا کے غریبوں کو کیا مل گیا۔ وہ اپنے پڑوس میں چینی بدامنی اور چینی امرار اور تاجروں کی خود غرضی دیکھتی ہے، دیکھتی ہے کہ یہ پیٹ کے کتے اپنی غرض کے سامنے اپنے وطن اور اپنی حکومت ہی کا ساتھ نہیں دیتے تو ہم غیروں مفتوحوں کو کیا دیدیں گے۔ دوسری طرف پڑوس ہی میں جاپانی فوجوں کا غرور و تمکنت دیکھتی ہے، قوت کی فرعونیت کا نظارہ کرتی ہے، چینی تاجروں اور ساہوکاروں سے بھی زیادہ بڑے پیٹ والے جاپانی سرمایہ داروں کا تسلط جمتے دیکھتی ہے۔ اسے بھلا اس سے کیا تسکین ہو سکتی ہے کہ چینی پنجہ سے نکل کر جاپانی جال میں پھنس جائے۔ کڑھائی میں تلا جانا بیشک برا ہے۔ پر اس سے نکل کر آگ میں گر پڑنا بھی تو کچھ اچھا نہیں۔ پھر یہی عام آبادی اپنے قریب بیرونی منگولیا میں جمہوری حکومت کا ناقص ہی سہی پھر بھی اچھا خاصا نمونہ دیکھتی ہے۔ جانتی ہے کہ روسی سپاہی وہاں نام کو نہیں۔ پھر کل منگولیا علاقہ

کے یکجا ہونے کا امکان دکھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ منگولی آزادی کی یہ تحریک جو اس وقت جاپانی سامراج کی ایک چال ہے کل جاپان ہی گردن میں عذاب کا طوق بن کر پڑ جائے۔ اور یہ منگولیا قبیلے اپنے ہم قوموں کے ساتھ ہوکر اور روس سے مدد پاکر جاپان کے سارے منصوبوں کو تہ و بالا کر دیں۔

اس قیاس کو اور بھی تقویت ہوتی ہے اس سے کہ خود چین میں اسی منگول علاقہ سے متصل چینی جمہوری اور اشتراکی فوجوں کا بہت اثر ہے۔ یعنی چینی قوم کے اس عنصر کا اثر جس نے اس وقت چیانگ کائی شک کو جاپان سے لڑنے پر مجبور کیا ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس نے سن یات سین کی قیادت میں چینی شہنشاہیت کا خاتمہ کیا۔ پھر جب یوان شی کائی کے ہاتھوں جمہوریت خطرہ میں پڑی تو اسے دوبارہ کومن تانگ کے قیام سے زندہ کیا اور تقریباً سارے ملک کو قومیت، جمہوریت، اشتراکیت کے اصول سہ گانہ پر متحد کیا! پھر جب اپنے ایک ساتھی کی بے وفائی کی وجہ سے منتشر ہوا تب بھی ملک کے ایک بڑے حصہ کو اپنے اثر میں رکھ سکا، سارے ملک میں اتحاد قومی تحریک اور پردیسی اقتدار کے ختم کرنے کے جذبہ کو ابھارتا رہا، اندرونی منگولیا کے قریب ہی شمال۔ مغربی چین میں لاکھوں کا لشکر یکجا کر سکا! خود چیانگ کائی شک کی فوجوں کو جاپان کے خلاف ابھار سکا، چین کے سارے طالب علموں میں دفاع قومی کا ولولہ پیدا کر سکا، اور بالآخر اپنے اس مخالف کو جس نے کئی سال سے اس عنصر کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا جاپان کے خلاف کھڑا کر دینے میں کامیاب ہوا اور یوں گویا ساری چینی قوم کو پھر اپنا ہمنوا بنا لیا۔

اس عنصر کے قوت پکڑنے سے جاپان کے سارے آگے کے منصوبوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اسی لئے چین سے اس کے جو مطالبات ہیں ان میں سب سے پہلا یہی ہے کہ اس عنصر کو یکقلم مٹا دو۔

روس اور چین کا معاہدہ اب روس اور چین میں جو معاہدہ ہوا ہے وہ اس عنصر کو اور بھی تقویت پہنچاتا ہے۔ جاپانی سامراج کے مقابلہ میں اشتراکی روس نیم اشتراکی چین کا ساتھی بنا ہے۔ منگولیا کا ایک بڑا علاقہ روس کے اثر میں ہے ہی، اندرونی منگولیا کی تحریک آزادی بھی امیروں کے ہاتھ سے نکل کر

جمہور کی تحریک بن سکتی ہے۔ ایسی تحریکیں تمام تر پروگرام کے مطابق تو ہوا نہیں کرتیں۔ کرنے والوں کی نیت کیا ہوتی ہے اور ہوتا کیا ہے۔ عجب نہیں کہ چین و جاپان کی جنگ اپنے اندر ایک اس سے زیادہ اہم معرکہ کو چھپائے ہوئے ہو۔ کیا عجب ہے کہ یہ جنگ روس اور جاپان، سرمایہ داری اور اشتراک کا ایک فیصلہ کن معرکہ بن جائے۔ اس معرکہ کا نتیجہ کون جان سکتا ہے؟ غالباً بازی اس کے ہاتھ رہے گی جس کا ساتھ دوسری طاقتیں دیدیں۔ مگر یہ کس کا ساتھ دیں؟ اگر جاپان کو قوت پہنچا کر جتاتی ہیں تو اپنے ہاتھوں اپنی چینی تجارت کا خاتمہ کرتی ہیں، اپنے فاضل سرمایہ کے وہاں لگنے کے امکانات مٹاتی ہیں اور دنیا کی سیاست خصوصاً مشرق کی سیاست میں اپنی اعتباری حیثیت کو کہاں سے کہاں نیچے پہنچا دیتی ہیں اور جاپان کو زک دلانے کے لئے روس کا ساتھ دیتی ہیں تب بھی سرمایہ دار یورپ کے ہاتھ سے چین کا ممکنات سے بھرا ہوا میدان نکل جاتا ہے۔ اور سیاست عالم میں، سرمایہ داری اور اشتراک کے تصادم میں، اشتراک کا پلہ بہت بھاری ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے دوسری قومیں دم بخود ہیں۔ اور ان کی سیاست میں اس یکسوئی اور قوت کے آثار نہیں ملتے جو ایسے نازک موقعوں پر کام آتے ہیں۔ اخلاقی ہمدردی اکثر کی چین کے ساتھ ہے۔ مگر ریاستوں کی اخلاقی ہمدردی کا حشر دنیا حال ہی میں حبش کے اندر دیکھ چکی ہے۔

(ذ۔ ح)

بحر روم اور نیون کانفرنس

کوئی دن نہیں جاتا کہ اسپین کی خانہ جنگی یورپ میں کوئی نہ کوئی نیا فتنہ کھڑا نہ کرتی ہو۔ ابھی اسپین میں عدم مداخلت کا جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ بحر روم میں آنے جانے والے جہازوں پر حملے ہونے لگے، صرف برطانیہ کے کوئی تیس جہاز ان حملوں کا نشانہ بنائے گئے، فرانس اس بحری قزاقی سے گھبرا اٹھا، اور روس کا تو ایک جہاز ترکی ساحل کے قریب ایک آب دوز کشتی کے حملہ کا شکار ہو گیا۔ ترکی حکومت نے بیان کیا کہ کچھ دنوں سے ساحل کے آس پاس ایک آب دوز کشتی دیکھی جا رہی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ جہازوں پر طیارے بمب برساتے، آب دوز کشتیاں نقب لگاتیں اور کبھی

کبھار کوئی جنگی جہاز گولہ باری کے شق کرنے سے بھی نہ چوکتا لیکن پتہ نہ چلتا کہ حملہ آور کون ہیں۔ عدم مداخلت کانفرنس کی قراردادوں کی رو سے کسی مشکوک جہاز سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ اس کی اطلاع کانفرنس کو دینا پڑتی تھی۔ فرانس اور برطانیہ اپنے جہازوں کو خطرہ میں دیکھ کر کس طرح خاموش رہ سکتے تھے، بحر روم ان دونوں سلطنتوں کے لئے شہ رگ کا حکم رکھتا ہے، بھلا یہ ممکن تھا کہ بحری قزاقی کی روک کا معاملہ فوراً ہاتھ میں نہ لیا جاتا۔ چنانچہ ایک کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ بارہ سلطنتوں کے نام دعوت نامے جاری کئے گئے، اور سوئٹزرلینڈ کے شہر نیون میں کانفرنس کا اجلاس ہوا۔

کانفرنس کا انتظام ہو رہا تھا کہ روس کے جہاز کے ساتھ اوپر والا واقعہ پیش آیا۔ روس نے اٹلی کو اس جرم کا ذمہ دار ٹھہرایا، اٹلی نے تردید کی روس نے اس تردید سے مطمئن ہونے کی بجائے اور زیادہ زور شور سے الزام لگایا بس پھر کیا تھا، اٹلی روٹھ گیا۔ جرمنی نے بھی اپنے حلیف کا ساتھ دیا۔ کانفرنس ہوئی لیکن نہ اٹلی شریک ہوا اور نہ جرمنی نے حصہ لیا۔ کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ اسپین کے ساحل کی نگرانی چھوڑ کر عین سمندر کے راستوں کی دیکھ بھال کی جائے۔ جنگی جہازوں کو اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ حملہ کا جواب حملہ سے دیں اور بحری قزاقوں سے کوئی بھی رعایت ملحوظ نہ رکھیں۔ اٹلی شریک نہ تھا، فرانس اور برطانیہ نے نگرانی کا تمام بار خود اپنے اوپر لے لیا۔ اور یہ طے کیا کہ اگر اٹلی شریک ہونا چاہے تو اس کے لئے دروازہ کھلا ہے۔

اب اٹلی سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہے، اور معاملہ یہاں تک آ کر رُک گیا ہے کہ اٹلی نگرانی کے کام میں مساوات کا طالب ہے۔ مسولینی کا کہنا یہ ہے کہ بحرِ روم اٹلی کا سمندر ہے، اور اگر اس میں ہمیں برابر کا شریک نہ مانا گیا تو ہم کسی نگرانی کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ دونوں طرف سے "الصلح خیر" کے دانشمندانہ اصول پر عمل ہو رہا ہے، امید ہے ایک دو دن تک آپس میں سمجھوتہ ہو ہی جائے گا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ بحر روم سے برطانوی تسلط کا خاتمہ ہو گیا۔ اب یا تو اٹلی کو دبا کر پھر اسے قایم کیا جائے، یا اس سے مل کر صلح و آشتی سے کام نکالا جائے۔

ان دنوں مسولینی سیاست کی بساط پر نئی نئی چالیں چل رہا ہے، کچھ عرصہ ہوا برطانیہ کے وزیر اعظم سے دوستانہ خط و کتابت شروع ہوئی، فریقین نے قدیم دوستی کا ذکر خیر کیا، موجودہ بدگمانیوں پر افسوس کا اظہار ہوا اور آئندہ کے لئے دوست بن کر رہنے کے وعدے ہوئے، اس پہ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یہ نیون کانفرنس کا جھگڑا ہو گیا۔ تعلقات پھر کشیدہ ہونے لگے لیکن اب فرانس بیچ میں پڑ گیا ہے۔ آج (۲۴ ستمبر) کی اطلاع ہے کہ فرانس اور اٹلی کے نمائندوں میں جنیوا کے مقام پر گفتگو ہوئی جس میں تصفیہ طلب باتوں پر دل کھول کر اظہار خیال کیا گیا، امید ہے نیون کانفرنس کے جھگڑے کو چکانے کے لئے عنقریب پیرس میں جو اجتماع ہوگا اس میں سب باتیں بحسن و خوبی طے ہو جائیں گی۔

اٹلی ادھر تو برطانیہ اور فرانس سے صلح صفائی کی باتیں کر رہا ہے اور ادھر مسولینی اور ہٹلر کی ملاقات کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، مسولینی سیاسی شطرنج کی بازی میں ایک مہرہ پر سب کچھ نہیں لگانا چاہتا، جرمنی سے تعلقات بڑھاتا ہے تو صرف اپنی قیمت پر فرانس اور برطانیہ سے زیادہ سے زیادہ بولی بلوانے کے لئے اور اب اگر ہٹلر سے ملنے جا رہا ہے تو فرانس اور برطانیہ سے عہد محبت استوار کرنے کے بعد تاکہ ہٹلر دوستی کا مول زیادہ پیش کر سکے، الغرض یورپ کی موجودہ سیاسیات میں نہ دوستی کے معنی دوستی ہیں اور نہ دشمنی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اب دوستی کبھی نہ ہوگی، برسات کی ہوائیں اتنی جلد اپنا رخ نہ بدلتی ہوں گی جس طرح یورپ کی موجودہ سیاسیات بدل رہی ہیں۔ (م ۔ س)

عراق

قارئین نے ستمبر کے پرچہ میں کرنل بکر صدقی کے افسوسناک قتل کی خبر پڑھی ہوگی، مرحوم عراقی افواج کے سپہ سالار تھے اور گذشتہ برس کے فوجی انقلاب کے بانی مبانی۔ عراق کے نوجوان طبقے مرحوم کے بہت گرویدہ تھے اگست ۱۹۳۳ء میں جب آشوریوں نے جو عراق کے قدیم ترین باشندوں کا ایک بچا کھچا عیسائی فرقہ تھا اور برطانیہ نے خاص طور پر اس کی پشت پناہی کی تھی

موصل کے نواح میں بغاوت کی، تو یہی شخص تھا جس نے نہایت سختی سے اس بغاوت کو دبایا، اور تلوار سے اشوری جیسے نازک مسئلہ کا ایک دو ہفتہ میں فیصلہ کر دیا، بعد میں جمعیت الاقوام اور برطانی حلقوں میں کرنل موصوف کے ظلم پر بہت کچھ کہا سنا گیا لیکن اس میں شک نہیں کہ صدقی بکر نے ہمیشہ کے لئے اشوریوں کے فتنہ سے عراق کو نجات دلا دی، کہتے ہیں کہ برطانی سامراج نے عراق کی اس اقلیت کو نہایت لاڈ پیار سے پروان چڑھایا تھا اور برطانی سیاست والوں کا خیال تھا کہ فلسطین کے یہودیوں کی طرح اشوری بھی برطانی استعمار کا آلہ کار بن سکیں گے۔

اشوری فتنہ کو دبانے کے بعد کرنل موصوف بغداد لوٹے تو ان کا شاہانہ استقبال ہوا، مرحوم فیصل گو زندہ تھے لیکن صحت کی بحالی کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے، ان کے قائم مقام شاہ غازی نے نوجوان قائد کی بڑی آؤ بھگت کی، یہ طلوع تھا بکر صدقی کے آفتاب اقبال کا،

عراق کا مسئلہ بڑی الجھنوں میں پڑا ہوا ہے۔ یہاں کے عرب قبائل اسلام کے دور اول ہی سے انقلاب آفرینی میں شہرت حاصل کر چکے ہیں کہا جاتا ہے کہ ترکوں کو عراق پر تسلط قائم رکھنے کے لئے ہر سال دس ہزار ترک عربوں کی خون آشامی کی نذر کرنے پڑتے تھے، انگریز آئے تو انھوں نے بھی اپنے آپ کو عراقیوں کے مقابلہ میں عاجز پایا، ناچار مرحوم فیصل کو عراق کے تخت پر بٹھایا گیا، اور برطانی توپیں اور طیارے اُن کے محافظ بنے لیکن فیصل سمجھ دار اور عرب فطرت کے صحیح نباض تھے، اُنھوں نے برطانی سامراج کی بجائے اہل عراق کے دلوں میں پناہ ڈھونڈی اور برسوں کی ان تھک کوششوں کے بعد پردیسی توپوں اور طیاروں سے بے نیاز ہو گئے۔

الغرض عراق میں بادشاہت کو ثبات حاصل ہو گیا چنانچہ فیصل کا انتقال ہوا تو عراقیوں نے شاہ غازی کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بلکہ باپ سے زیادہ بیٹے سے محبت کرنے لگے، اِدھر سے فراغت ہوئی تو اب آپس میں جماعتی کشمکش کا سلسلہ شروع ہوا۔

ترکوں کے عہد حکومت میں بھی ایرانی سلطنت نے عراق کو زیر اثر کرنے میں سالہا سال تک کوششیں کی تھیں، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف اور دوسری مقدس زیارت گاہوں کی وجہ سے

یہاں ایرانی اثر یوں بھی زیادہ ہے۔ عراق کی تقریباً آدھی آبادی شیعہ ہے اور ان کی ہمدردی ایران کے ساتھ ہے۔ شمالی عراق میں شیعیت کا اثر کم ہے اور یہ لوگ ترکوں کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ ان میں سے ایک جماعت ایسی بھی تھی اور اب تک ہے جو ترکوں کے ساتھ مدغم ہونے کو تیار ہے، ان کے بعد فیصل کے ساتھیوں یعنی پرانے سیاست دانوں کی ایک جماعت ہے جو اتحاد عرب کے حامی تھے، اور اسی اتحاد عرب کے نام سے انھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا، اس ٹولی کے سردار خود فیصل تھے اور نوری، ہاشمی، عسکری اس تحریک کے روح رواں تھے، یہ سب لوگ فیصل کی زیر قیادت ترکوں سے لڑ چکے ہیں، گویا عراق میں تین سیاسی گروہ ہیں، ایک ایران دوست، ایک ترک دوست، ایک اتحاد عرب کا حامی۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے ہنگاموں نے ایک اور نسل کو پیدا کیا یہ متوسط طبقوں کے نوجوان تھے، عراق کی سخت گرم اور سخت سرد آب و ہوا کا اثر باشندوں کی طبیعتوں پر پہلے ہی کیا کم تھا کہ بیسویں صدی کی انقلابی تحریکوں نے ان کے جذبات کو بالکل بے عنان کر دیا، عراق میں مزدوروں کی بہت بڑی قوت ہے، فقر و فاقہ بھی کچھ کم نہیں، روسی افکار کا انقلابی سیلاب عراق کو متاثر کئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا چنانچہ یہاں بھی نوجوانوں کی بے چین طبیعتیں بغاوت پر آمادہ ہونے لگیں، یہ بے چینی کبھی اشتراکیت کا نام پاتی، کبھی اسے اتحادِ عرب کے مخالفین کا نام دیا جاتا، کبھی اسے ترکی کی حمایت کا اثر کہا جاتا! بہر حال یہ بغاوت تھی نوجوانوں کی بوڑھے مدبروں کے خلاف، نوجوان یہ کہتے ہیں کہ اتحاد عرب محض ایک ڈھونگ ہے جس کو رچا کر یہ مدبر اپنی بے تدبیری اور بے عملی کے عیبوں کو چھپاتے ہیں، عراق کی داخلی مشکلات اتنی اہم ہیں کہ اس وقت ہیں تمام قوتیں ان پر صرف کرنی چاہئیں، مزدور تباہ حال ہیں، کسان بھوکا مرتا ہے، تعلیم یافتہ نوجوان بے کار ہیں، ضرورت ہے کہ اس وقت عراق کا ہر باشندہ صرف عراقی ہو، اتحاد عرب کے خواب میں اپنا وقت نہ گنوائے، اور ملک کی اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی حالت کو سدھارنے میں منہمک ہو۔

پرانے سیاست دانوں اور نئے رہنماؤں میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر جلدی کو شیطا

کا کام بتلاتے ہیں لیکن نوجوان ہر کام کو آناً فاناً کرنے کے قائل ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ دونوں جماعتوں میں تصادم ہوا پچھلے سال بکر صدقی (جوان نوجوان عنصر کے قائد تھے) کو موقعہ ملا تو اس نے فوج کے ذریعہ ہاشمی (جو اتحاد عرب کے حامی تھے) کی وزارت ختم کردی، مخالف گو بظاہر سہم گئے لیکن اندر ہی اندر ان کی سازشیں کام کررہی تھیں، آخرکار فوج کے ایک سپاہی کے ہاتھ سے بکر صدقی موت کے گھاٹ اترے۔ جب وزارت کا ستون گر گیا تو پھر سید سلیمان حکمت کی وزارت کیسے باقی رہتی، چنانچہ وزارت نے استعفیٰ دے دیا، اور اعتدال پسند فریق برسرِ حکومت آگیا، جو نہ بالکل نوجوانوں کا ہمنوا تھا نہ اتحادِ عرب والی جماعت کا ساتھی

مصر

شاہ فاروق کی تخت نشینی کے ہنگاموں سے ابھی فرصت نہ ملی تھی کہ وفدی جماعت کے آپس کے اختلافات نے مصریوں کی ہنگامہ پسند طبیعت کو نیا مشغلہ فراہم کردیا۔ خدا کے فضل سے مصر میں سیاسی جماعتوں کی پہلے بھی کمی نہ تھی، وفد کو چھوڑ کر اس وقت چار پارٹیاں اور ہیں، تعجب یہ ہے کہ سب جماعتوں کا مقصد اور لائحہ عمل تقریباً ایک ہی ہے، اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی سیاسی جماعت کے بیک وقت ایک کی بجائے تین تین چار چار صدر ہوتے تو آج مصر میں صرف ایک ہی پارٹی نظر آتی،

جنگ عظیم سے پہلے مصر میں حزب الوطن کا زور تھا، ۱۹۲۰ء کی تحریک میں سعد زغلول کی وفد جماعت بنی، آرام پسند اور جاہ پرست پاشاؤں کو سعد کے استبداد سے شکایت ہوئی تو احرار وجود میں آئے، احرار زمانہ کی بڑھتی ہوئی رو کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے تو مرحوم بادشاہ نے بڑے بڑے خاندانوں کو اتحاد پارٹی کے نام سے اپنے تخت کے گرد جمع کیا۔ صدقی پاشا کو انگریزوں نے شہ دی اور وزارت عظمیٰ کی مسند پر بٹھایا تو اس نے شعب کے نام سے اپنی جماعت بنالی، حزب الوطن پرانے مجاہدوں کی جماعت ہے جو اپنی جوانی جان توڑ کوششوں میں گذار کر زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے، وفد کے علاوہ باقی جماعتیں نام ہیں ایک صاحب القاب پاشا اور اس کے چند حامیوں کا،

بے شک وفد ایک فعال جماعت ہے مصریوں کی غالب اکثریت اس جماعت کے ساتھ ہے اور آج کل حکومت بھی اسی پارٹی کی ہے، وفد کی ایک جہتی اور جماعت بندی کی بنیاد "سعد پرستی" ہے، اہل مصر کو سعد سے محبت نہیں بلکہ عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وفد محض سعدی ہونے کی وجہ سے ملک میں اتنے ہر دلعزیز ہیں، پارٹی کے لیڈر نحاس پاشا میں لاکھ عیب سہی لیکن آخر وہ "خلیفہ سعد" ہے، وفدی لیڈر بھی سعد کی اس "خلافت" سے خوب فائدے اٹھاتے ہیں اور اپنے مخالفوں کا منہ بند کرنے کے لئے مرحوم لیڈر کا ذکر خیر کافی سمجھتے ہیں، وفد میں خود اختلافات موجود تھے لیکن انگریزوں کی مخالفت نے ان اختلافات کو دبائے رکھا، اب برطانی مصری معاہدہ ہوگیا اور دبے ہوئے اختلافات کو ابھرنے کا موقعہ ملا،

مصر کی تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے آپس کے اختلافات نے خطرناک صورت اختیار کرلی ہے، نقراشی پاشا جو بیگم سعد زغلول کے بھانجے ہیں اور پارٹی کے زبردست ارکان میں ان کا شمار ہوتا ہے نحاس سے بگڑ گئے، باتوں سے معاملہ ہنگاموں تک پہنچا اور دونوں فریقوں میں آپس میں خوب چلی ظاہر ہے نقراشی آسانی سے ہار نہیں مانیں گے، اور ان کی مخالفت سے وفدی جماعت بھی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے گی۔

ستمبر کے "جامعہ" میں ازھر اور وفد کی رقابت کا ذکر ہو چکا ہے، تخت نشینی کے مراسم کے سلسلہ میں یہ لکھا گیا تھا کہ بادشاہ نے عشار کی نماز ازھر کی جامع مسجد میں ادا کی، یہ اطلاع ٹھیک نہ تھی، وفد کا شروع سے یہ اصرار تھا کہ تخت نشینی کے سلسلہ میں کوئی رسم ازھر میں نہ ہونے پائے، بیان کیا جاتا ہے کہ وفد کی ازھر سے برافروختگی بڑھتی جا رہی ہے، کچھ بعید نہیں کہ وفد کے رہنما مصطفےٰ کمال کو اپنا مشعل راہ بنانے کی کوشش کریں اور ملک کے دینی طبقوں کی قوت کو توڑ دیں لیکن بادشاہ کا وجود ان جھگڑوں کو مٹانے میں بہت حد تک مفید رہے گا، بادشاہ کی ہر دلعزیزی ہمدردی اور مساوات پسندی نحاس پاشا کو غالباً مصر کا مصطفےٰ کمال بننے کا موقعہ نہ دیگی۔

افغانستان

ہم نے غالباً مئی کے پرچے میں ذکر کیا تھا کہ دولت مصر افغانستان میں سفارت خانہ قائم کرنے پر غور کر رہی ہے، اس عرصہ میں یہ مسئلہ نہ صرف طے ہو گیا بلکہ مصر کا پہلا سفیر افغانستان پہنچ بھی گیا، اس سلسلہ میں یہ تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ افغان حکومت مدتوں سے ان تعلقات کے قیام کی کوشش کر رہی تھی۔ دور امانی میں محمود طرزی وزیر خارجہ تھے لیکن مرحوم کی توجہ زیادہ تر مغربی ممالک پر تھی، انقلاب کے بعد افغانستان میں دفتر خارجہ کی سیاسی حکمت عملی کا مسئلہ زیادہ اہم ہو گیا اور حسن اتفاق سے یہ منصب علامہ فیض محمد خاں کو تفویض ہوا، جو دنیائے اسلام اور ممالک شرقیہ کی سیاست میں فہم خصوصی کے مالک ہیں، موصوف نے وزارت کا قلمدان ہاتھ میں لیتے ہی مشرقی دول کی طرف توجہ کی تھی ترکی تعلقات کو مزید تقویت دی، ایران کے روابط کو مستحکم کیا، اور حجاز میں زمانہ حج میں شاہی نمائندوں کو بھیجا اور مصر میں ایک مستقل سفارت خانہ قائم کیا، اور بجا طور پر توقع قائم کی کہ اب مصر بھی اس کے جواب میں عملی قدم اٹھائے گا، لیکن مصری وزارتیں انگلستان کی سیاست کے ساتھ داخلی پیچیدگیوں میں اس بری طرح الجھی رہیں کہ افغان دوستی کی اہمیت محسوس نہ کر سکیں اور سالہاسال کی کوششوں کے باوجود بھی افغانستان کو اثبات میں جواب نہیں ملا۔ مایوس ہو کر مصر کا سفارت خانہ توڑ دیا گیا اور ملا صاحب شور بازار کو جو مصر میں سفیر کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ واپس بلا لیا گیا۔ حتیٰ کہ مصر میں وفد پارٹی برسراقتدار آئی اور نحاس پاشا وزیر اعظم ہوئے تو افغانستان و مصر کی سیاست کا مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا ادھر افغان وزارت خارجہ نے آقائی مجددی (صاحب شور بازار) کو از سر نو گفتگو کرنے کے لئے مصر بھیجا، صدر اعظم نے ایک کمیٹی مقرر کی اور سفارتی تعلقات پر اس کی رائے مانگی۔ کمیٹی نے لکھا "مصر ایک ایسی یقینی منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ دنیا کی ترقی، صلح، امن عام اور نوع انسان کی فلاح و صلاح کے لئے دنیا کی حکومتوں سے اپنے تعلقات جدید اساس سے قائم کرے۔"

حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغربی دول سے رابطہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی اہمیت محسوس کرے کہ مشرقی اقوام اور دول مشرق سے مصر کے سفراء کے تعلق کا قیام، سفراء کا تبادلہ

قونصلوں کا تقرر بھی ضروری ہے۔ یہ تمام امور ایک ایسے وسیع مطمح نظر کے ماتحت ہونے چاہئیں جس کے ساتھ سیاسی مصلحتیں بھی وابستہ ہوں اور تمدنی، علمی اور اقتصادی مصالح بھی۔"

ہز ایکسلنسی عبدالرحمٰن عزام سفیر مصر متعینہ افغانستان جو اواخر اگست ہندوستان ہوتے ہوئے کابل گئے ہیں، مصر و ترکی کی جدید تاریخ کے ممتاز آدمیوں میں ہیں، اور زمانہ طالب علمی سے ہی قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں، اسٹوڈنٹ کانفرنس جنیوا (۱۹۱۴ء) میں موصوف لندن کے مصری طلبا کے نمایندے منتخب ہوئے تھے۔ اسی سال اگست میں جب جنگ چھڑی تو کانفرنس کے غیر معمولی اجلاس نے طے کیا کہ عبدالرحمٰن عزام کو جلد سے جلد مصر پہنچ کر حریت وطن کی کوششوں میں شریک ہو جانا چاہئے۔

عبدالرحمٰن عزام مصر آکر جہاد آزادی میں شریک ہوگئے، برطانیہ کے صاحبان اختیار نے ان کے خلاف وارنٹ جاری کر دیا۔ موصوف کو اس کا علم ہوا تو وہ طرابلس جا کر مشہور مجاہد شیخ سید احمد سنوسی کی فوج میں شامل ہوگئے، اور اس کے بعد قسطنطنیہ، برلن اور طرابلس میں رہ کر ترکی کی خاموش مگر نہایت قیمتی خدمات انجام دیتے رہے، جنگ عظیم ختم ہوگئی، طرابلس پر اطالیہ نے قبضہ کر لیا لیکن عبدالرحمٰن عزام کی خدمات جاری رہیں اور وہ سید عمر مختار کے ساتھ سات سال تک اطالیہ سے برسر پیکار رہے۔

۱۹۲۳ء میں جب سنا کہ مصر میں نئے دستور کا اجرا ہو رہا ہے وہ اپنے وطن واپس آکر سعد زغلول پاشا کی جماعت میں شامل ہوئے، اور آپ نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ملک کی بہت سی خدمات انجام دیں۔

عبدالرحمٰن عزام کو ہندوستان کی تحریک آزادی سے بڑی دلچسپی ہے اور بہت سے قومی رہنماؤں سے آپ کے دوستانہ اور عقیدت مندانہ مراسم رہے ہیں، بالخصوص مولانا محمد علی مرحوم سے۔ مشرقی قوموں کے اتحاد اور دنیا کے عام امن و دوستی کی حمایت آپ کا خاص مشغلہ ہے خدا کرے مصر و افغانستان کے یہ تعلقات ہز ایکسلنسی عزام کی دردمندی و فراست سے ہمیشہ استوار رہیں اور دونوں کے لئے مبارک ثابت ہوں۔

صوبجاتی اسمبلیوں کی زبان

موجودہ دستور میں جہاں برطانوی حقوق اور اثرات کے تحفظ کی اور تدبیریں کی گئی ہیں وہاں انگریزی زبان کی بقا کے لئے یہ قاعدہ بنایا گیا ہے کہ صوبجاتی اسمبلیوں میں صرف انھیں لوگوں کو اپنی مادری زبان بولنے کی اجازت ہوگی جو انگریزی نہ جانتے ہوں۔ چنانچہ اسی دفعہ کی تحت میں بنگال اسمبلی کے صدر نے وہاں کے وزیر اعظم فضل الحق صاحب کو بنگالی میں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ دیکھنے میں تو یہ بات کچھ بڑی نہیں معلوم ہوتی، لیکن اصل میں قومی زبان کی عزت قومی جھنڈے کے احترام سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ قومی جھنڈے کو جس اتحاد کی علامت ہم بنانا چاہتے ہیں وہ بڑی حد تک اس زبان کے مسئلے کی بدولت ایک حسرت بن کر رہ جاتا ہے، اور جب تک ہماری سرکاری زبان انگریزی ہے، اس وقت تک سمجھئے ایک اردو ہندی ہندوستانی کا تصفیہ ہی نہیں بلکہ ہندو مسلم کا ملاپ اور مختلف طبقوں کا ربط ضبط ملتوی ہوتا اور مشکل بنتا رہے گا۔

یو۔ پی میں صدر اسمبلی پرشوتم داس ٹنڈن صاحب نے حکم دیدیا ہے کہ مجلس کی ساری کارروائی اور تقریروں کی رپورٹ اردو ہندی دونوں میں چھاپی جائے۔ یہ تجویز بے شک بہت اچھی ہے۔ لیکن اس سے کام نہیں بنتا، بات جہاں ہے بنی رہے۔ انگریزی کی شرط بہت سے لوگوں کی جو شاید بہت مفید مشورے دے سکتے زبان بند رکھے گی، جو لوگ تقریریں کریں گے بھی انھیں اپنی بات پوری پوری کہنے میں دشواری ہوگی، اور ان لوگوں کی تقریریں جو اچھی انگریزی جانتے ہیں جتنا کہ چاہئے اثر نہیں کریں گی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب تک موجودہ دستور کی حرف بہ حرف پیروی ہوتی رہے گی ہماری اپنی زبان کی اصطلاحوں کو رواج پانے کا پورا موقع نہ ملے گا۔

صوبجاتی حکومتوں کے قدم ذرا اور جم جائیں اور کام کا بوجھ ذرا ہلکا ہوجائے تو انھیں چاہئے کہ اس مسئلے کو اٹھائیں اور سب مل کر یا تو دستور کی اس دفعہ کو منسوخ کرائیں یا اس کی خلاف ورزی کی کوئی

تدبیر نکالیں۔ سول سروس کی تنخواہوں سے جو خسارہ ہوتا ہے اسے پورا کرنا آسان ہے، صوبجاتی زبانوں اور ہندستانی کے اس طرح پس پشت ڈال دیئے جانے اور قومی نمائندوں کے منہ میں انگریزی کی لگام چڑھا دینے سے جو نقصان ہو رہا ہے اس سے بچنے کی بس ایک ہی تدبیر ہے ——— خلاف ورزی۔

(م-م)

تعلیمی دُنیا

(محمد عبد الغفور صاحب - ایم۔اے۔ علیگ)

۲۰ ستمبر کو قصر مطا باغچہ میں ترکی تہذیب و تاریخ کی ایک کانفرنس منعقد ہونے والی ہے جس کے متعلق وزیر تعلیم ترکیہ نے وسیع پیمانہ پر تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ اس کانفرنس کی غرض یہ ہے کہ ترکی تہذیب و تمدن نے جو اثر تاریخ عالم پر ڈالا ہے اس کا بطور ایک زندہ حقیقت کے اظہار کیا جائے۔ دو ہفتے تک ثانوی مدارس کے اساتذہ مختلف علمی مضامین پر تقریریں کریں گے۔ اس موتمر میں یورپ بھر کے علمار آثار، مورخین اور مشرقی علوم کے اساتذہ شرکت کریں گے۔ چار مستشرقین نے اطلاع دی ہے کہ وہ تاریخی واقعات سے ثابت کریں گے کہ گوٹن برگ (یورپ) کے سب سے پہلے چھاپہ خانہ سے پہلے ترکوں نے چھاپہ کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

ٹامس مسارک سابق صدر جمہوریہ چیکوسلوویکیا کی وفات سے نہ صرف یورپ کے جمہوریت پسند اور بین الاقوامی اخوت کے علمبرداروں کو ہی سخت صدمہ پہنچا بلکہ تعلیمی دنیا سے بھی ایک قابل محقق اور ادیب اٹھ گیا۔ مسارک ان معدودے چند ہستیوں میں سے تھے جو پریزیڈنٹ ولسن کی طرح معلمی کی کرسی چھوڑ کر بساط سیاست کے صدرنشین بن گئے۔ اوائل عمر میں وہ نجی طور پر معلمی کرتے رہے۔ پھر یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وی آنا یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہو گئے۔ بعدہ اپنے وطن پراگ میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے۔ جنگ عظیم کے دوران میں ملک سے جلاوطن ہو کر انھوں نے یورپ میں چک (Zchec) قوم کی آزادی کے پرچار کا بیڑا اٹھالیا اسی اثنار میں وہ کنگز کالج لندن میں لکچرر ہو گئے اور وہاں انھوں نے لندن اسکول سلاو (Slav) اسٹڈیز کی بنیاد رکھی جس کے ذریعہ سے انگلستان کے علمی حلقوں کو پہلی پہل

مشرقی یورپ کی چھوٹی اقوام کے تہذیب و تمدن ۔ معاشرت اور زبان سے روشناس کرایا گیا۔ یہ اسکول آج بھی سرگرمی سے اپنا ادبی اور علمی فرض ادا کر رہا ہے اور علمی دنیا کے لئے یہ ان کی سب سے شاندار خدمت تھی۔

جامعہ ازہر نے جامعہ نجف اشرف کے طلبار کی ایک جماعت کو دعوت دی ہے کہ وہ جامعہ ازہر میں داخل ہو کر اسلامی دنیا کی سب سے پرانی تعلیم گاہ سے استفادہ حاصل کریں ۔ جامعہ ازہر نے ایسی دعوت حال میں ہی ایرانی طلبار کو دی تھی ۔ اسلامی برادری کی بنیادوں کو استوار کرنے کے واسطے اس قسم کے تبادلہ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی ۔ جامعہ نجف نے اس دعوت کو شکریہ سے قبول کر لیا ہے اور عنقریب طلبار کا ایک گروہ مصر روانہ ہو جائے گا ۔ اس ضمن میں یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ شیعہ اصحاب کا شاید یہ سب سے پہلا گروہ ہے جو حصول تعلیم کی غرض سے جامعہ ازہر میں داخلہ لے گا۔

پروفیسر کے ۔ ٹی شاہ نے بمبئی یونیورسٹی کی سینٹ میں تجویز پیش کی ہے کہ مختلف تمدنی علاقوں کی تعلیمی اور کلچرل ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پونا ۔ کرناٹک ، سندھ میں علیحدہ یونیورسٹیاں قائم کی جائیں ۔ مگر اس تجویز کی بعض اصحاب کی طرف سے شدید مخالفت کی گئی ۔ چند تو مالی وجوہات کی بنا پر مخالف تھے ۔ بعض کا خیال تھا کہ اس قسم کی تمدنی تعلیم ہندوستانی اتحاد کے منافی ثابت ہوگی مہاراشٹر یونیورسٹی کی اسکیم کے سلسلے میں ایک وفد وزیر اعظم سے ملاقات کر چکا ہے ۔ مسٹر کھیر نے ہمدردانہ غور فرمانے کا وعدہ کیا ۔

سر مرزا اسمٰعیل دیوان میسور نے اس ہندوستانی وفد کی قیادت کی جو مشرق بعید کی دورل ہائیجین کانفرنس میں شرکت کی غرض سے باندینگ (جاوا) گیا تھا ۔ اک دعوت کے موقعہ پر تقریر

کرتے ہوئے مرزا اسمٰعیل نے جاوا اور ہندوستان کے قدیم تاریخی تعلقات کا تذکرہ کیا جن کے اثرات اب تک وہاں کی سماجی اور مذہبی زندگی میں نظر آتے ہیں بالخصوص حق اداکاری موسیقی اور رقص جیسے فنون لطیفہ میں یہ اثرات زیادہ نمایاں ہیں بالخصوص فن موسیقی کی قدیم روایات تو محض مسلمان رقاصین کی وجہ سے زندہ رہ گئیں۔

وزیر تعلیم پنجاب نے ایک مضمون کے ضمن میں تعلیمی لائحہ عمل پر مفصلہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے حکومت کا مقصد نئے مدارس یا زیادہ طلبا ر کے داخلے کی بجائے ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور ترقی ہے اس مقصد کے لئے پنجاب کے جبریہ ابتدائی تعلیم کے قانون میں مفصلہ ذیل تبدیلیاں کی جائینگی۔ (۱) ابتدائی تعلیم کی مدت چار سال سے پانچ بلکہ چھ کردی جائے گی۔ (۲) لازمی تعلیم کے لئے میعاد جو چھ سے گیارہ سال تھی اب چھ سے بارہ سال تک ہوگی (۳) حسب ضرورت لڑکیوں کے لئے بھی تعلیم لازمی قرار دی جائے گی (۴) اگر ممکن ہوا تو ابتدائی تعلیم سے اوپر کے درجوں میں تعلیم لازمی قرار دی جائے گی (۵) لازمی تعلیم کا نفاذ بجائے مقامی کمیٹیوں کے صوبائی حکومت کی طرف سے ہوا کرے گا۔ (۶) حسب ضرورت تعلیمی ٹیکس بھی عاید کیا جاسکے گا (۷) جبری تعلیم کی نگرانی اور نفاذ کے لئے خاص انتظام کیا جائے گا۔

پرائمری اساتذہ کی لیاقت ریفرشر کورس اور بہتر تربیت سے بڑھائی جائے گی۔ مدت تربیت ایک سال سے دو سال اور شرائط داخلہ میں تعلیمی اسناد کی شرط کڑی کردی جائے گی۔ معائنہ سخت ہوا کرے گا۔ ابتدائی مدارس میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم پائیں گے۔

(لاؤٹیکا) جزائر فجی میں منعقدہ ٹیچرز کانفرنس کے ساتویں سالانہ اجلاس نے جزائر کے ہندوستانی باشندوں کی تعلیم کے متعلق مفصلہ ذیل قرار دادیں منظور کیں۔

نئے مرکزوں میں ہندوستانی طلبا ر کے لئے نئے اسکول کھولے جائیں اور ان کے لئے

مناسب تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں ۔ نیوزی لینڈ یونیورسٹی کے امتحان داخلہ میں زبان ہندی کو اختیاری مضمون قرار دیا جائے ۔ جزائر فجی کے مدارس کا الحاق نیوزیلینڈ یونیورسٹی سے ہے ۔ موجودہ اسکولوں سے دو میل کے اندر رہنے والے چھ سال سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لئے تعلیم لازمی قرار دی جائے ۔ چند تجاویز اساتذہ کی بہتری کے لئے بھی منظور کی گئیں ۔

تعلیمی بورڈ انگلستان کی طرف سے حال میں ہی ایک رپورٹ ہوم ورک یعنی بچوں کو گھر کے لئے مدرسہ کا کام دینے کے مسئلہ پر شائع کی گئی ہے ۔ جس میں بارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے گھر کا کام نہ دینے کی سفارش کی گئی ہے ۔ شہری علاقوں کے مدارس کے لئے رپورٹ میں مفصلہ ذیل ہدایات دی گئی ہیں ۔

بچے ہفتے میں پانچ رات سے زیادہ آموختہ کی تیاری میں صرف نہ کریں بلکہ صرف چار رات ہو تو اور بھی بہتر ہے ۔ ہر شب چودہ سال تک کے بچوں کے لئے ایک گھنٹہ اور چودہ سے سولہ سال تک کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ تیاری کے لئے صرف نہیں ہونا چاہیئے ۔

تحقیقات کے دوران میں پتہ چلا ہے کہ بعض بچوں کو دوہرا گھر کا کام کرنا پڑ جاتا ہے ۔ ایک تو اساتذہ کی طرف سے دیا جاتا ہے دوسرا والدین کی جانب سے ۔ سب سے افسوس ناک امر یہ ہے کہ بعض کم عمر کے بچوں کے مدارس میں بھی گھر کے لئے کام دیا جاتا ہے جو سخت قابل اعتراض ہے ۔ رپورٹ میں گھر کے کام کی وجہ امتحانی تیاری اور اس کا خوف قرار دی گئی ہے ۔ بچوں میں دماغی اور ذہنی کمزوری اور بیماری کی وجہ ایک تو امتحان ہے اور دوسرا وہ بھاری کام جوان کو اس سلسلے میں گھر کے لئے دیا جاتا ہے ۔ جہاں کہیں ایسے امتحان رکھے گئے ہیں جن کے لئے رٹنے والی تیاری کی ضرورت نہیں اور جو خاص طور پر بچے کی ذہانت کا جائزہ لگاتے ہیں نہ کہ اس کی قابلیت اور معلومات کا ۔ وہاں گھر کا کام بالکل دیا نہیں جاتا ۔

گھر پر زیادہ کام دینے سے ایک خطرہ یہ ہے کہ جو بچے دن تو اسکول میں اور رات گھر پر

تیاری میں گزار دیتے ہیں وہ ایسی فضا میں نشو و نما پاتے ہیں جو گرد و نواح کی سماجی زندگی سے بالکل لاتعلق ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت ویلز میں ملتا ہے جہاں مدرسے کا کام طلبا کے وقت کا اتنا حصہ لے لیتا ہے کہ انھیں مقامی ادب و تمدن۔ کلچر اور موسیقی میں دلچسپی لینے کا کوئی موقعہ ہی نہیں ملتا۔ نیز شہریت کے لئے تعلیم و تربیت محض مدرسے کی چار دیواری کے اندر نہیں دی جاسکتی بلکہ اس کی عملی مشق مدرسے سے باہر ہی ہوسکتی ہے۔

اگر گھر کے لئے کام دینا کم کر دیا گیا تو اس کے ساتھ ساتھ طریقۂ امتحان میں بھی ضروری تبدیلیاں کردنی ہوں گی۔

جاپان کے مدارس میں کچھ عرصے سے ریڈیو سٹ مہیا کرنے پر خاص توجہ مبذول کی جارہی ہے۔ نصف سے زیادہ اسکولوں میں سٹ لگائے جاچکے ہیں اور ان کی تعداد دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ ریڈیو کے روزانہ پروگرام کو مفید اور دلچسپ بنانے میں خاص طور پر سرگرمی کا اظہار کیا جارہا ہے۔ ابتدائی مدارس، مدارس بالغان اور کنڈرگارٹن اسکولوں کے لئے علحدہ پروگرام مرتب کئے جاتے ہیں۔ ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ ریڈیو استاد کا معاون و مددگار ہونا چاہئے۔ اور پروگرام کی علاوہ اسکولی تعلیم سے متعلق ہو اور اسے مکمل کرنے والی ہو۔

ہر صبح جاپانی اسکولوں میں مدارس سے متعلق مضامین نشر کئے جاتے ہیں۔ ان کے عنوان علم اخلاق۔ قومی زبان۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ سائنس۔ موسیقی وغیرہ بہت سے انواع پر مشتمل ہوتے ہیں۔ نیز تمام طلبا کے لئے جسمانی ورزشیں باقاعدہ نشر کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی عملی ضرورت کی اور روزانہ کی کارآمد چیزوں پر تقریریں کی جاتی ہیں۔ سرکردہ اصحاب اور قائدین بچوں کے لئے تقریریں کرتے ہیں تاکہ طلبا ان کی ذات، اوصاف اور ان کے اعلیٰ تخیل سے واقفیت حاصل کرسکیں۔ ہر سال ان تقریروں کے موضوع پر لاکھوں رسالے چھپتے ہیں اور مدرسوں میں مفت تقسیم ہوتے ہیں۔ ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی کے زیر انتظام اسکول براڈ کاسٹنگ پر نفسیاتی تحقیقات

کا کام بھی ہو رہا ہے۔

انگلستان کے مدارس میں ریڈیو کے ذریعہ پیام رسانی کا کام بی۔ بی۔ سی کے زیرِ اہتمام بہت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اور ہر ہفتہ کے بچوں کے پروگرام تعلیمی جرائد اور رسالوں میں باقاعدہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں تو ریڈیو سماجی اور سیاسی زندگی میں بھی نئی چیز ہے اور اسکول تو ابھی اس کے فیض سے محروم ہی ہیں۔

دہلی اسٹیشن نے کچھ عرصہ سے بچوں کا ہفتہ وار پروگرام شروع کیا ہے مگر ابھی تک کوئی ایسا مستقل انتظام نہیں کیا جا سکا جس کے تحت میں مشاہیر تعلیم۔ قائدین ملت۔ مقبول و معروف مصنفین افسانہ نویس وغیرہ ملک کی نئی نسل کو حیاتِ ملی کا پیام جدید پہنچا سکیں۔

تعلیمی دنیا میں اپنی مدد آپ:۔

امریکن طلبا اپنی مالی مشکلات کو دور کرنے کے لئے نئے طریقے ایجاد کرنے میں شہرۂ آفاق ہیں پرانے پیشے مثلاً بھٹیوں میں کوئلہ ڈالنا۔ ہوٹلوں میں بطور خادم کام کرنا اب فرسودہ اور بے کار ہو چکے ہیں۔ اب تو کمانے کے لئے دلچسپ جدتیں کی جاتی ہیں۔ مثلاً بالٹی مور میں ایک الیف۔اے کے طالب علم نے میری لینڈ یونیورسٹی کے طلبا کو صبح بیدار کرنے کی خدمت اپنے ذمے لے لی ہے۔ یہ طالب علم شام کے سات بجے سو کر صبح دو بجے اٹھتا ہے۔ اور دو گھنٹے مطالعہ کرتا ہے اس کے بعد طلبا کے کمروں کا گشت کرتا ہے۔ کھلی ہوئی کھڑکیاں بند کر دیتا ہے اور کمرے کا درجۂ حرارت اعتدال پر رکھنے کے لئے بھاپ کی نالیاں کھول دیتا ہے۔ اصل مشکل تو سات بجے صبح کو ہوتی ہے جب اسے بعض گہری نیند سونے والے حضرات کو بیدار کرنے کے لئے اچھی خاصی کشتی لڑنا پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ طلبا کے بستر درست کرتا ہے جس کے لئے اسے فی بستر دس سنٹ (ایک ڈالر = سو سنٹ) ملتے ہیں۔ ٹیچرز کالج فلاڈلفیا کا ایک طالب علم اخبارات اور رسالوں کے لئے معمے ایجاد کرتا ہے۔ نیو جرسی کے زراعتی کالج کے پانچ طلبا انڈے بیچ کر کتابوں کا اور کھانے اور کپڑے کا

خرچ چلاتے ہیں۔ ہر ایک طالب علم کالج فارم کے مرغی خانے میں سو سے ڈیڑھ سو سفید لگ ہورن رکھتا ہے۔ اور گرد و نواح میں ہر ہفتے تقریباً چار سو سے پانچ سو انڈے بیچ لیتا ہے۔ اس طرح سے سال بھر میں ایک سو پچیس ڈالر یا اس سے کچھ زیادہ کما لیتا ہے۔ کالج کے انڈا مرغی کے محکمے کے افسر اعلیٰ نے ان طلبا کے کام کے متعلق بہت اعلیٰ رائے ظاہر کی ہے۔ اس کے خیال میں مطالعہ اور کمانے کی تجویز کو ملانے کی وجہ سے یہ طلبار انڈے بہت کفایت سے حاصل کر سکتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کو تجارتی کاروبار کا بھی عملی تجربہ ہو جاتا ہے۔

اتھاکا میں دو عرب طلبا نے اپنے گزارے کے لئے ایک دلچسپ ادبی شغل اختیار کر لیا ہے۔ وہ کالج کے ایک پروفیسر کے لئے عربی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیتے ہیں اور معاوضہ میں رہنے کا کمرہ اور کھانا مفت ملتا ہے۔

چار روسی نوجوانوں نے ایک موسیقی پارٹی بنالی ہے اور دعوتوں اور دوسری تقریبوں پہ گا بجا کر اپنا گزارا چلا لیتے ہیں۔ غرض کہ قصابی اور آہن گری سے لے کر خندقیں کھودنے تک ہر قسم کا کام طلبا کرنے کو تیار ہیں۔

بیری کالج میں عورت اور مرد طلبا ر پارچہ بافی سے، لکڑی کا سامان تیاری کرکے اور زراعت سے گزارا چلاتے ہیں، گائیوں کا دودھ دوہتے ہیں، گھوڑوں کے نعل لگاتے ہیں۔ جھاڑو اں بناتے ہیں۔ اس طریق سے تقریباً ۱۴۶ ڈالر سالانہ کما لیتے ہیں جو ان کے خرچ خوراک، رہنے سہنے، اور کتابوں کی خرید کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس مدرسے میں سولہ سال کی عمر سے لے کر پچاس سال کی عمر تک کے طالب علم موجود ہیں۔

امریکن طالب علم کو ہاتھ سے کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ ایک ہندوستانی طالب علم لکھتا ہے کہ انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں بہت سے ایسے طالب علم دیکھے جو اس سال تو کھانے کی میز پر خادم کا کام کرتے تھے اور دوسرے سال ہی کسی اور یونیورسٹی میں پروفیسر، ڈین یا چانسلر بن کر چلے گئے۔

ہندوستان میں کتابی تعلیم، سماجی پابندیوں اور عام اقتصادی گراوٹ کی وجہ سے اس قسم کے تجربات تعلیمی حلقوں میں نہیں کئے گئے ۔ البتہ بنارس یونیورسٹی نے اس سلسلے میں غریب طلبار کے لئے صنعتی اور دستی کام مہیا کر کے دوسرے اداروں کے لئے ایک مبارک مثال قائم کردی ہے۔ بنارس میں نادار اور کم مایہ طلبار، فرنیچر کی مرمت کرتے ہیں ۔ کمروں اور لکڑی کے سامان پر رنگ کرتے ہیں۔ زمین کے ہموار کرنے میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ زراعتی اور انجنیرنگ کالج میں بطور مستری یا کسان کام کرتے ہیں اور کام کے تناسب سے اجرت پاتے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں جو نفرت ہاتھ کے کام سے پھیلی ہوئی ہے اس کا سدِ باب جلد سے جلد کر دیا جائے اس کی اہمیت سپرو کمیٹی نیز ان کارخانے داروں نے بھی تسلیم کی ہے جن پر ہندوستانی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبار کو ملازم نہ رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے ۔

بمبئی کونسل میں بجٹ پر مباحثہ کے دوران میں مسٹر کھیر (KHER) نے حکومت کی تعلیمی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کیا " ہمارا مقصد ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور معیار تعلیم کو بڑھانا ہے اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے حکومت اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ ذمہ داری لینے سے بھی دریغ نہ کرے گی ۔ مفت اور لازمی تعلیم کی توسیع کے لئے حکومت رضا کارانہ خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی ۔ ریاضت جسمانی اس تعلیمی لائحہ عمل کا ضروری عنصر ہوگی۔ دستکاری اور صنعت و حرفت ہر اسکول کے نصاب میں شامل ہوں گے اور کوشش یہ کی جائیگی کہ طلبار اپنے آبائی پیشوں سے غیر متعلق نہ ہو جائیں "۔

رضاکارانہ خدمات کے سلسلے میں یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ ایک کانگریسی وزیر تعلیم نے تجویز کی ہے کہ تمام میٹرک کے امیدواروں پر لازمی قرار دیا جائے کہ سند حاصل کرنے کے بعد ایک سال تک مفت تعلیم دیں یوپی میں حکومت کے پنشن خواروں کو بھی دیہات سدھار اور تعلیمی ترقی کے سلسلہ میں رضا کارانہ خدمات پیش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے ۔

بہار میں ڈاکٹر محمود وزیر تعلیم نے علمی تحقیقات اور تجسس کو ترقی دینے کے لئے عوام اور طبقہ زمینداراں سے خاص طور پر اپیل کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے نادار اور قابل طلبار کے لئے نہ صرف حکومت کی طرف سے وظائف مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے بلکہ صوبے کے امیر طبقے۔ تعلقہ دار۔ کارخانہ دار وکلا، اور تجارت پیشہ اصحاب سے درخواست کی ہے کہ وہ اس مبارک کام میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں اور ایسے طلبا کی نقد رقم سے یا کھانے اور رہنے کی سہولتیں مہیا کرکے امداد کریں۔

پچھلے چند مہینوں میں مدراس کی حکومت کی تعلیمی پالیسی کے متعلق بہت غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مدراس گورنمنٹ نے ہندی زبان کو مدرسوں میں لازمی قرار دیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اُردو زبان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ مگر واقعہ اس کے خلاف ہے، حکومت مدراس ایک خالص ہندوستانی زبان کی ترویج کرنا چاہتی ہے۔ جو ہر دو رسم الخط میں لکھی جائیگی۔ طالب علموں کو اختیار رہیگا کہ وہ اپنے حسبِ خواہش جو رسم الخط چاہیں اختیار کریں۔
زبان کے سلسلے میں حکومتِ مدراس نے پنڈت جواہرلال جی اور جامعہ ملیہ سے مشورہ کیا ہے اور ان کے مشورہ کے مطابق وہاں عنقریب کارروائی شروع ہو جائے گی۔

مہاتما گاندھی نے ہر بچے میں ایسے مدارس کی تجویز پیش کرکے جو آپ اپنا خرچ اٹھا سکیں تعلیمی حلقوں میں خاصی ہلچل ڈال دی ہے۔ مہاتما جی کا خیال ہے کہ ہر اسکول کا طالب علم ایک سال کی صنعتی تربیت کے بعد ایک آنہ فی گھنٹہ کمانے کے قابل ہو جائے گا۔ ان کے خیال میں اگر صبح کا وقت کتابی تعلیم کے لئے وقف کر دیا جائے اور شام کا دستکاری کے لئے تو بچہ مہینہ بھر میں روزانہ چار گھنٹے کام کرکے ساڑھے چھ روپیہ کما سکے گا۔
اس تجویز سے بچہ نہ صرف محنت اور کام کی عزت کرنا سیکھے گا بلکہ دستکاری اس کے لئے ذہنی

اور دماغی ترقی کا باعث ہوگی۔ نصف یوم کے مدارس کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ دوپہر کے بعد اساتذہ، مدرسے کی عمارت اور سامان بالغوں کی تعلیم کے لئے بالکل مفت اور بغیر مزید اخراجات کے استعمال ہو سکتے ہیں۔

اس تجویز پر بعض تعلیمی حلقوں کی طرف سے شدید نکتہ چینی کی گئی ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ متمدن ممالک میں ایسی ہمہ گیر تعلیمی پالیسی کہیں بھی نہیں پائی جاتی بچوں پر اس نازک عمر میں کام کا اتنا بوجھ ان کو ہمیشہ کے لئے معطل اذہان کے تو ار کو مستقل نقصان پہنچا دے گا۔ لیکن بعض ماہرین سمجھتے ہیں کہ ہاتھ کے کام ہی سے بچہ کی صحیح ذہنی تربیت ممکن ہے۔

ہندوستان میں لازمی اور مفت تعلیم کا مسئلہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تقریباً ہر صوبہ نے لازمی تعلیم ایکٹ رائج کر کے ابتدائی لازمی تعلیم کی ترویج کی کوشش ہے۔ اگرچہ بالعموم یہ تعلیم مفت نہیں دی گئی۔ بہرحال عام طور پر ہر جگہ اور خاص طور پر دیہاتی حلقوں میں اس اسکیم کو بہت ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ صرف تعلیم سے غیر دلچسپی۔ والدین کی جہالت یا جبریہ قوانین کی عدم موجودگی نہیں بلکہ اس کا بڑا سبب اقتصادی مشکلات ہیں جو غریب کسان اور چھوٹے پیشہ ور کو سانس نہیں لینے دیتیں۔ اگر کسان کا لڑکا اس کو زراعتی کاموں میں۔ جانوروں کی نگہ بانی میں مدد دے دیتا ہے اور غریب پیشہ ور کا لڑکا روزمرہ کی زندگی میں باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کو خواہ مخواہ مدرسے میں بھیج کر کتابی تعلیم دلائیں جس کا نتیجہ لازمی طور پر آبائی پیشے سے نفرت اور بیکاری ہو۔

جرمنی کے ایک مشہور ماہر تعلیم اور ریاست پرشیا کے وزیر تعلیم نے جنھوں نے ایشیائی ممالک کی اقتصادی اور تعلیمی حالت کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا لکھا ہے کہ ایشیائی اقوام کی اقتصادی حالت اس قدر گری ہوئی ہے کہ اس میں تعلیم کی کوئی جگہ ہی نہیں! بعینہ یہی حالت ہندوستانی کسان کی ہے جب تک کسان کی اقتصادی حالت درست نہ ہوگی وہ کسی حالت میں بھی اپنے آپ کو اپنے بچوں کی

محنت اور امداد سے محروم نہ کرے گا، وہ محنت جو اس کو زندگی کی کم سے کم ضروریات مہیا کرنے کی ضامن ہے ۔ اور ایسی حالت میں کبھی بھی اپنے آپ بچوں کو مدرسہ بھیجنے پر رضامند نہ ہو گا۔

مہاتماجی کی تجویز اس اہم مسئلہ کا ایک حل پیش کرتی ہے۔ متمدن ممالک میں کالج کی تعلیم کے سلسلے میں تو بالعموم طلبا تعلیم کا خرچ خود برداشت کر لیتے ہیں ۔ امریکہ میں تو یہ تعلیمی زندگی کا عام تجربہ ہے۔ جرمنی میں جنگ عظیم کے بعد طلباء کی انجمنوں نے ہزاروں طلبا کی انھیں مناسب کام مہیا کر کے تکمیل تعلیم کے سلسلے میں امداد کی ۔ امریکہ کے بعض نیگرو زراعتی مدارس ۔ ڈنمارک کے فوک اسکول ایک حد تک اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ کیا ہندوستان جو اس وقت اک تجربی دور سے گزر رہا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کرے گا ۔

بسم اللہ

جامعہ

زیرِ ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۲۸	نومبر سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ ر — فی پرچہ ہر

پرنٹر پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع برقی پریس۔ دہلی۔

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شائع کی ہیں۔ جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبہ سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ از راہِ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں :۔

(۱) مطبوعاتِ جامعہ۔ جامعہ کی شائع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست

(۲) ناشرینِ اُردو۔ جامعہ کے علاوہ اردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ

(۳) مصنفینِ اُردو۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اردو کتابوں کی فہرست

(۴) بچوں کی کتابیں۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست

(۵) عورتوں کی کتابیں۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں۔

(۶) مختصر فہرست کتب۔ کتب اُردو کی تقریباً ایکہزار مشہور کتابوں کی فہرست

(۷) ادبی کتابیں۔ تاریخ و تنقید ادب، مقالات و انشا، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۸) مذہبی کتابیں۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

(۹) تاریخی کتابیں۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعیات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے۔ عنقریب شائع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ دہلی

گونگوں کی دُنیا

اور

مولانا ہمزاد

(خود مولانائے موصوف کے قلم حقیقت رقم سے)

گونگوں کی دنیا

مورخہ پہلی ماہ نجات

سنہ ستر ہزار عشقی

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزا

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرساہا

میرے ہمزاد

تم حیرت سے کہو گے مولانا ہمزاد جیسے سلامتی ساحل پر جان دینے والے اور اس شعر کو سرنامہ بنائیں۔ صبر سے کام لو۔ پہلے میرے حالات سن لو پھر جو جی چاہے کہنا۔

تم میرا حال اسی وقت اچھی طرح سمجھ سکو گے جب میں تمھیں اپنے واقعات کچھ پہلے سے بتاؤں گا۔ (حال میں جذبات اور خیالات کا حال بھی شامل ہے۔ اس جگہ یہ کہہ دینا اچھا ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح جملہ معترضہ ہوں گے جنھیں چھوڑ نہ جانا) وہ دن تمھیں یاد ہیں جب تم مجھے مولانا ہمزاد کہہ کے چھیڑا کرتے تھے اور میں بھی جواباً تمھیں ہمزاد کہا کرتا تھا یہاں تک کہ ہم لوگوں کا یہی نام پڑ گیا۔ بہت دن کی بات ہے۔ جب ہم تم دونوں اتنے بڑے نہ تھے۔ جب تمھاری لاپروائی یا عرف عام میں سنک کا عالم حد سے بڑھا ہوا تھا۔ جب تمھاری یہ حالت تھی کہ ؎

نہ کھانے کی سدھ بدھ نہ پینے کا ہوش ؎ نہ جانے بھراول میں کا ہے کا جوش

جب تم اس ہیئت کذائی سے بقول شفیق بزرگوں کے گستاخی کیا کرتے تھے۔ جب تم (یہ اور پہلے کی بات ہے مگر گذشتہ باتوں کی رو میں یہ بھی یاد آگئی اس لئے لکھے دیتا ہوں) جب تم بجائے پڑھنے جانے کے بستہ بغل میں دبائے میرے ساتھ کھیلنے بھاگ آتے تھے اور اکثر بغیر بستے کے گھر واپس جاتے تھے۔ جب تم بستہ نہ ہونے کی وجہ اپنے خشمگیں اتالیق سی "بہ بدیہہ افزودن بہ بہانہ سازکردن" سے کام لے کر بتایا کرتے تھے اور جب تم ..... جب تم ......

مختصر یہ کہ جب تم ایسے نہ تھے جیسے اب ہو۔ اب تو ولایت سے واپسی کے بعد بہت سنبھل گئے ہو معلوم نہیں کیوں۔ شاید وہ باتیں یاد نہ ہوں اور ان کا یاد دلانا بھی اب تمھیں ناگوار ہو۔ اچھا اسی سلسلے میں ایک بات پوچھ لوں جو زبانی نہ پوچھ سکا تھا۔ بتاؤ تم اتنا بدل کیوں گئے۔ تم نے اپنی وہ والہانہ روش کیوں چھوڑ دی شاید اپنی نئی پوزیشن کے خیال سے۔ مگر کم سے کم مجھے تم سے ایسی ظاہرداری کی امید نہ تھی۔ میں سچ کہتا ہوں تمھاری وقعت اگرچہ دنیا کی نظروں میں تمھاری اس پوزیشن کی وجہ سے بہت بڑھ گئی مگر میری نظروں سے تم اپنی نئی روش کی وجہ سے بہت گر گئے تھے۔ تھے اس لئے کہ اب وہ بات نہیں رہی۔ اب ذاتی تجربے نے مجھے اس بات کا قائل کردیا ہے کہ ہر شخص کو بعض وقت "زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز" پر عمل کرنا ہی پڑتا ہے۔ خیر تو میرا یہ تجربہ جس کے بیان کرنے کے لئے میں دراصل یہ خط لکھ رہا ہوں اتنا دلچسپ ہے کہ عوام تو اسے پڑھ کے بغیر "واہ واہ ؟ - نہیں ؟ سچ ؟" کہے اور افیون خانے کے مخصوص انداز میں تنقید و تبصرہ کئے رہ ہی نہیں سکتے اور تم اسے پڑھ کے اس قدر متاثر ہوگے کہ اس کا اندازہ سوائے میرے کوئی اور نہیں کرسکتا۔ اس وقت صفی کا وہ شعر یاد آگیا ؎

سرِ نشتر مرا فسانہ ہے ؎ متحرک رگِ زمانہ ہے

نوٹ :- اس مضمون کا خیال مجھے ایچ ۔ جی ۔ ولس کا فسانہ " اندھوں کی وادی " پڑھ کے پیدا ہوا۔

زمانے کی رگ چاہے متحرک ہو یا نہ ہو مگر تمہارے دل کی ایک اک رگ ضرور پھڑکنے لگے گی۔ معلوم نہیں تمہیں یاد ہو کہ نہیں عرصہ ہوا تم نے اپنی بکری کے بچے کو جب وہ گردن ٹیڑھی کئے چکنے چکنے مخمل جیسے کان ہلاتا کلیلیں کرتا دودھ پینے جا رہا تھا اس کی ماں کے آگے سے اٹھا لیا تھا۔ تم اسے جتنا لپٹاتا اور پیار کرنا چاہو وہ اتنا ہی ٹانگیں مارے اور "میں - میں" چلائے۔ ماں بھی بیچاری بندھی "میں - میں" کرتی رہی مگر تم نے ایک نہ سنی۔ اسے گود میں دبوچے خوش خوش باہر چلے گئے۔ کچھ دور تو ماں کی آواز کان میں آتی رہی۔ پھر مٹ گئی۔ بچہ بھی بیچارہ چپ ہو گیا۔ مگر اب اس کے دل کی کیفیت جو آواز اور حرکات سے ظاہر نہ ہوتی تھی اس کی ابھری ابھری گول گول آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اسے دیکھ کے بقول غالب رگ سنگ سے لہو ٹپکنے لگتا، مگر تم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب بڑے دل والے بنتے ہو۔ خیر تو جب تمہارا باہر کی سیر سے جی بھرا تو گھر کی طرف چلے گھر کے قریب ابھی نہ پہنچے تھے کہ بکری کی دردناک "میں - میں" کی صدا پھر آنے لگی۔ اسے سُن کے بچہ جس طرح پھر بیتاب ہو کے "میں - میں" کرنے ٹانگ زور زور سے چلانے اور تمہاری گود سے تڑپ کے نکل جانے کی مجنونانہ کوشش کرنے لگا وہ تمہارے دل کی اس حالت کا جو اس خط کے پڑھنے کے بعد اس کی ہو گی سچی تصویر ہے صرف فرق جو ایک بکری کے بچے اور انسان کے دل میں ہونا چاہئے وہی سمجھو اور وہ بھی تمہارا دل۔ دیکھو کہاں کی بات کہاں نکل آئی۔ جو بعد میں کہنے کی بات تھی اس کا ذکر ابھی چھیڑ دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اصل بات وہی ہے اس لئے خواہ مخواہ زبان پر چلی آتی ہے۔ جی چاہتا ہے ابھی کہہ دوں مگر نہیں اگر ابھی کہہ دیا تو بقول یاروں کے "سارا مزا کرکرا ہو جائے گا" اور تم میری موجودہ حالت کا بھی صحیح اندازہ نہ کر سکو گے اس لئے پھر شروع سے کہتا ہوں۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں وہ دس بارہ برس پہلے کا زمانہ یاد ہے کہ نہیں۔ اگر یاد ہو گا تو اس زمانہ میں جو دلچسپ جھگڑے ہم لوگوں میں ہوا کرتے تھے وہ سب بھی یاد ہوں گے۔

بظاہر ہم میں تم میں کوئی بات مشترک نہ معلوم ہوتی تھی۔ تم پورے شیطان تھے اور انیجاب پورے رجحان بننے میں کوشاں۔ تمہارے جسم میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حافظ کی روح حلول کی ہوئی

اور میرے جسم میں محتسب کی۔ مگر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ ہم لوگوں میں اتنی گہری دوستی تھی معلوم نہیں یوں ہی رو میں لکھ گیا ورنہ اس کی وجہ اب مجھے صاف معلوم ہوتی ہے۔ خط پڑھنے کے بعد تمھیں بھی معلوم ہو جائے گی۔

ہماری لڑائیوں میں وہ دن یاد رہیگا۔ مجھے تو کبھی نہ بھولے گا شاید تمھیں بھی یاد ہو۔ شروع برسات کا زمانہ تھا۔ موسم کی پہلی گھٹا تھی اور خوب گھر کے آئی تھی، بالکل گھنگور، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "کالا مینگھا" لڑکے لڑکیوں کی "گڑی چھوٹی بیل پیا سا کالے مینگھا پانی دے" کی متواتر چیخ پکار سے غصے میں آ کے بپھر گیا تھا۔ آسمان پر وہ گرج چمک تھی کہ سوتے دل بھی جاگ اٹھیں۔ پھر صبح کا سہانا وقت ہر شے میں زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ دل میں ایک عجب طرح کی خنکی اور سرور محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں تم سے کب گھر میں کل سے بیٹھا جاتا۔ تم آئے اور مجھے دریا کی سیر کے لئے پکڑ لے گئے۔ ہم لوگ یوں ہی گھومتے گھامتے بظاہر بغیر قصد ایک جگہ پہنچ گئے۔ میں تو سمجھتا ہوں تم مجھے وہاں قصداً لے گئے تھے مگر خیر۔ غالباً تم سے پہلے ہی میری نکتہ رس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ چند ؎

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ؎ جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

والی رادھائیں کنہیا جی کی نگاہوں سے بے خبر عجب ترنگ میں نہا رہی ہیں۔ کوئی کسی پر پانی پھینک رہی ہے کوئی کسی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ رہی ہے۔ کوئی شرم کے مارے سمٹی جا رہی ہے۔ کوئی کسی کے پیچھے جھپٹ رہی ہے کوئی قہقہہ لگا رہی ہے۔ کوئی کنارے پر کھڑی جلدی جلدی کپڑا اتار رہی ہے اور زور سے کہہ رہی "اے سنا۔ ہم آجائیں تو"۔ میں نے فوراً اپنا منہ ادھر سے پھیر لیا۔ تم نے جو دیکھا تو بار بار "مولانا دیکھئے اس طرف ایک چیز" کہہ کہہ کے میری جان عذاب میں ڈال دی۔ میں باتوں میں ٹالتا رہا کہ تمھیں یہ پتہ نہ چلے کہ میں نے ادھر دیکھ لیا ہے۔ جب تمھارا اصرار حد سے بڑھا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ اب زیادہ انکار راز افشا کر دیگا تو میں نے لاپروائی سے مڑ کے "کہاں، کیا" کہتے ہوئے اس جانب آسمان کی طرف دیکھا۔ بہت میں نے کوشش کی کہ دامن نگاہ کا کوئی گوشہ اس معصیت انگیز

منظر پہ بار دیگر پڑ کے ملوث نہ ہو مگر پھر بھی ایسا معلوم ہوا ایک لٹکتا ہوا کونا اس پر سے رگڑ کھاتا ہوا نکل ہی گیا۔ تم نے کہا " مولانا۔ میں آپ کو اس وقت آسمان پر فرشتے تھوڑی دکھانا چاہتا ہوں بلکہ زمین پر حوریں"۔ میری نگاہ نیچے کی طرف بے اختیار گر پڑی۔ میں نے خوف و غصے کی حالت میں کہا " کیا بکتے ہو" اور پھر فوراً لاحول کہہ کے ادھر سے منہ پھیر لیا ساتھ ہی ساتھ میں نے تمہارا ہاتھ زور سے پکڑا اور تمھیں وہاں سے کھینچ کے لے جانے لگا۔

تم " مولانا خیریت تو ہے۔ آخر یہ سب کیوں؟"

میں " پہلے یہاں سے چلو تب بتاؤں"۔ اس وقت میرے منہ سے ہر وقت توبہ۔ توبہ نکل رہی تھی اور میری گرفت میں اتنی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ تم اس سے نکل نہ سکے۔ جب کچھ دور جا چکا تو میں نے کہا " تم بڑے وہ ہو۔ زبردستی گنہگار بناتے ہو"

تم " گنہگار؟ کیسے؟"

میں " گناہ آنکھوں سے بھی تو ہوتا ہے"

تم " مگر میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا کہ آپ اتنی جلدی گناہ کر بیٹھیں گے"

میں نے کھسیا کے کہا " استغفراللہ۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ خدانخواستہ مجھ سے گناہ سرزد ہی ہو گیا۔ اللہ اس سے ہمیشہ بچائے۔ ارے وہی " چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند" والی بات سمجھو"

تم۔ " مولانا سعدی کا یہ قول تو آپ کو یاد رہا اور وہ نہ رہا کہ ؎

کہ گفت بر رخ زیبا نظر خطا باشد ٭ خطا بود کہ نہ بینند روئے زیبا را "

میں۔ " مجھے سب یاد ہے۔ فضول باتیں نہ کرو۔ چلو"

تم " اور حافظ کا یہ شعر بھی کہ ؎

چہ کار اندر بہشت آں مدعی را ٭ کہ میل امروز با حورے ندارد "

یہ سن کے مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے جوش میں آ کے کہا " نئی تعلیم نے تم لوگوں کو بالکل

جہل مرکب کر دیا ہے۔ نہ کچھ سمجھو نہ بوجھو مگر سمجھتے ہو کہ سب کچھ جانتے ہو۔ خواجہ کے اس شعر کا کچھ مطلب سمجھے بھی کہ جھٹ سے پڑھ دیا۔

تم۔ "مطلب صاف ......"

میں۔ "اسی سے تو میں کہتا ہوں کہ خاک نہیں سمجھے۔ صوفیوں اور وہ بھی خواجہ حافظ علیہ الرحمتہ جیسے بزرگ کا کلام سمجھنے کے لئے مدتوں حضرات صوفیہ کی خدمت میں زانوے ادب تہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ کچھ کالج اسکول میں ان لوگوں سے پڑھا جو خود کچھ نہیں جانتے اور سمجھے کہ ہم بڑے عالم فاضل ہو گئے۔ اندھا اندھے کو کیا راستہ دکھائے گا"

تم۔ "بجا ارشاد آپ ہی اس کا مطلب فرمایئے"

میں۔ "ابھی میں خود اپنے میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا کہ خواجہ کے مطلب کو کما حقہ سمجھ سکوں۔ مگر خیر جتنا سمجھ سکتا ہوں بتاتا ہوں۔ اس شعر کا مطلب صرف ایک لفظ "حور" کے معنی سمجھنے پر منحصر ہے۔ حور کا مطلب؟"

تم۔ "فرمایئے"

میں۔ "حور ظاہر ہے کہ دنیا میں نہیں ہوتی اس لئے اس کا استعمال خواجہ کے مخصوص انداز میں مجازی ہے"

تم۔ "بجا"

میں۔ "تو پھر یہاں حور سے مطلب خواجہ کا کیا ہو سکتا ہے۔ حور کا مطلب ...."

قبل اس کے کہ میں جملہ ختم کر دوں تم بول اٹھے" اوہو۔ اب میں سمجھا۔ حور کے معنی پیر۔ کیوں مولانا"

میں۔ (خوش ہو کے) "بیشک۔ آخر جمال ہمنشیں ...."

ابھی ٹھیک سے جمال ہمنشیں نہ کہہ سکا تھا کہ اتنے زور سے بجلی کا کڑکا ہوا کہ بے اختیار منہ سے "یسبح" نکل کے رہ گیا۔ کھٹ سے جسم سکڑ گیا۔ جھٹ سے سر جھک گیا اور آناً فاناً میں

غار کے پیچھے دبک سا گیا۔ جب یہ مصیبت ختم ہوئی تو میں نے کہا" بھائی چلو گھر۔ اب یہاں زیادہ رہنا ٹھیک نہیں"۔

م۔ " اگر آپ ہی پر بجلی گرنی ہے تو وہاں نہیں گر سکتی۔ کاہے کو گھر والوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہیں یہ بجلی محض آپ ہی کے لئے چمکی تھی۔ آپ نے مولانا کشف الدجا بجمالہ کا یہ شعر سنا ہے"

ب۔ (حواس مجتمع کرتے ہوئے) "مولانا کون"

م۔ " ارے اپنے مولانا کشف الدجا بجمالہ قدس سرہ کا نام نامی نہیں سنا"۔ پہلے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے واقعی نہیں سنا مگر بہت جلد کچھ دھندھلا دھندھلا سا خیال آنے لگا اور میں نے کہا" سنا کیوں نہیں شعر پڑھو تو پتہ چلے۔ سینکڑوں شعر سنا کرتا ہوں"۔

م۔ " اچھا تو سنئے۔ فرماتے ہیں[۵۱]

فلک پر بھی ہے قبضہ شیخ جی ان حسن والوں کا
وہ دیکھو لے رہا ہے برق میں انگڑائیاں کوئی

یں۔ (فوراً جوش میں آکے) "کیا شعر فرمایا ہے۔ رعنائی خیال کے قربان جائے۔ جی خوش ہوگیا۔ کیا تم اسے بھی بیہودہ مجازی معنوں میں لے جاتے ہو۔ یہ شعر خالص حقانیت کا ہے اور حضرت سیدنا قدس سرہ کے فیضان روحانی کا ثمرہ ہے"۔

تم نے ذرا مسکرا کے کہا" مولانا تو آپ میری ولایت کے قائل ہوگئے"

یں (غصے میں) "تم نے کیوں حضرت مولانا کے نام سے اپنا شعر پڑھا"

تم " اگر ایسا نہ کرتا تو آپ اتنی تعریف کرتے"۔

میں " بڑے گستاخ ہو۔ معافی مانگو"

تم " کس سے اپنے آپ سے"

---

۵۱ اُردو کے وہ اشعار جن کے مصنف کا نام مندرج نہیں میرے ہیں۔

میری جھینپ اور کھسیاہٹ کا تم اندازہ کر سکتے ہو۔ اسی حالت میں میں نے کہا" تم نے کیوں دھوکا دیا۔ کیوں کفر بکا۔ کیوں اپنے کو مولانا کشف اللہ جا بجالہ کہا۔ تم لوگ نہ معنی سمجھو نہ مطلب جو کچھ منہ میں آتا ہے بکنے لگتے ہو" یہ کہتے ہوئے میں تمھارے پیچھے دوڑا۔ تم بھی زیادہ نہ بھاگے۔ خیر جب پکڑا تو تم نے کہا کہ" مولانا صرف آپ کو چھیڑنا چاہتا تھا۔ بس"۔ دل تو احساس شکست سے چور تھا اس وقت لڑتا کیسے۔ سوائے اس کے کچھ اور نہ کہہ سکا کہ مجھے ایسی چھیڑ نہیں پسند۔ اس کے بعد ہم لوگ پھر دوست دوست ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باتیں کرتے گھر کی طرف چلے۔ باتوں باتوں میں تم نے کہا (آخر پرانی عادت کہاں جاتی)" مولانا آپ کیوں زبردستی اپنی جان کو عذاب میں ڈالتے ہیں۔ ثواب کے لئے عذاب میں پڑنا کون عقلمندی ہے۔ کیا آپ کو وہاں سے چلے آنے میں تکلیف نہیں ہوئی"۔ یہ سن کے میں پھر کھسیایا اور بولا" تکلیف کیا عین راحت ہوئی، جانتے ہیں یہ عذاب عارضی ہے اس لئے اسے خوشی سے برداشت کرتے ہیں۔ اس کے بدلے جب وہ رحیم کریم جنت النعیم عطا فرمائے گا تو ساری کسر پوری ہو جائے گی۔ میں نے کسر کہا۔ توبہ۔ کسر کیا۔ جتنی اب تکلیف ہوئی ہے اس سے ہزار گنا زیادہ آرام نصیب ہوگا اور وہ عیش عیش جاودانی ہوگا۔ یہاں کی طرح فانی نہیں" یہ کہتے کہتے میں جوش میں آگیا اور جنت کے عیش و آرام کی ایسی زبردست تصویر کھینچی کہ مجھے خود لطف آگیا۔ سچ کہتا ہوں میرا دل بول رہا تھا کہ میں نے اتنی پرجوش اور" لذیذ" تقریر کبھی نہ کی تھی۔ ایک ایک لفظ جو زبان پر آتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ دل کی انتہائی گہرائیوں سے نکل رہا ہے۔ خیر تو جب میں دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھی شراب طہور کی نہر کا ذکر کر چکا جو میرے پرانے انداز گفتگو میں بجز دخیال آنے کے منہ سے ملحق ہو جائے گی تو تم نے حسب عادت بیہودہ سوالات شروع کر دئے کہ" مولانا کیسے۔ نہر کی نہر مع اپنے چو ناگارا کے منہ میں لگ جائیگی یا اس میں سے ایک موج اٹھ کے منہ میں گھس جائے گی یا کوئی حور جام بلورین میں بھر کے دو ہتھیلی پر رکھ کے خواصوں کی طرح مودبانہ پیش کرے گی یا محبوب شوخ و شنگ کی طرح گلے میں ہاتھ ڈال کے اور قسمیں دے دے کے پلائے گی"۔ تمھارے شروع کے دو سوال سن کے تو میرا غصہ ناک تک آگیا تھا اگر

تمہارے آخری سوال نے میرے جسم میں سرور کی ایک برقی لہر دوڑا دی اور میں نے اسی پر کیف جوش میں کہا " ہاں اور کیا، بیشک، مومنوں کے لئے وہاں حوریں تو ہوں گی اور وہ بھی کیسی یہاں کی چڑیلوں سے ہزار لاکھ کروڑ مہا سنکھ گنا بڑھکے تم نے میرے لطف و جوش کے دھکتے ہوئے انگاروں پر یہ کہہ کے پانی چھڑکا کہ " ارے مولانا سوچئے تو کیا فرمارہے ہیں آپ۔ دوزخ کا ذکر کر رہے ہیں کہ جنت کا۔ اگر حور اتنی کریہہ المنظر ہستی کا نام ہے جس کے آگے ہماری چڑیلیں بھی حور معلوم ہوں تو کم سے کم خاکسار تو ایسی جنت سے باز آیا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ہی اس کے لئے اتنے حیران پریشان کیوں ہیں کہ اس دنیا کو جو جنت بن سکتی ہے زبردستی دوزخ بنائے ڈالتے ہیں۔ میں نے کہا لاحول ولا قوۃ میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔ میرا مطلب یہاں کی چڑیلوں سے وہ چڑیلیں تھا جنھیں تم لوگ حور سے بڑھکے سمجھتے ہو لیکن جن کی ہستی ان حوروں کے مقابلے میں جو انشاء اللہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمارے تصرف میں آئیں گی چڑیلوں سے بڑھکے نہیں ۔"

تم۔ " اچھا تو کہہ چلئے "۔ میں نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کیا اور ' لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم ' کے مصداق خوب خوب رطب اللسانی کی۔ دنیا کا زبردست سے زبردست مصور بھی اپنی محبوبہ کی برہنہ تصویر کیا اس کیف و سرور جوش و مستی کے ساتھ کھینچے گا جس سے میں نے حوروں کے ایک اک عضو کی مصوری کی۔ پہلے تو تم بیچ بیچ میں بولتے جاتے تھے کہ " مولانا سڑک کا تو خیال کیجئے۔ لوگ کس طرح دیکھ رہے ہیں۔ کیا کہتے ہوں گے " مگر میری تقریر کے سیلابی دھارے کے آگے یہ تنکے کیا ٹھہرتے۔ آخر کار تم بھی دم بخود ہو کے سننے لگے۔ جب میں اپنی جادو بیانی ختم کر چکا (اس وقت کی تقریر مجھے سچ مچ جادو معلوم ہوتی اور میں خود مسحور ہوا جاتا تھا بمصداق سے

ہم مست ہوئے جاتے ہیں خود اسکے اثر سے ٭ یہ شعر نہیں نعرہ مستانہ ہے گویا)

اور سمجھا کہ تم اگر پورے نہیں تو کم سے کم آدھے مسلمان تو ہو ہی گئے ہوگے۔ اس وقت میں نے

تمھاری طرف بڑے فاتحانہ انداز میں ہمہ تن سوال خاموش بن کے دیکھا۔ تم نے ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہنسی کو بہت ضبط کر رہے ہو کہا ؎

شیخ صاحب کی ذہانت دیکھو ؎ حور کو سمجھے ہیں عورت ہوگی

بس نہ پوچھو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے قریب قریب جامے سے باہر ہوکے کہا ”عورت نہ ہوگی تو کیا تمھارا سر ہوگا۔ خدائے عزاسمہ نے بہ نفس نفیس اپنے کلام پاک میں اس کا کھلے لفظوں میں وعدہ فرمایا ہے۔ بیہودہ، بدتمیز کہتا ہے“ شیخ صاحب کی ذہانت دیکھو۔ انگور کھٹے ہیں۔ ارے ظالم خدا کے غضب سے ڈر۔ تجھے کیا ہوگیا ہے۔ کیا سمجھتا ہے کہ تو ہمیشہ اسی طرح بنا رہے گا۔ تیرے ہاتھ پیر میں اسی طرح زور رہیگا۔ تیرے دل و دماغ ہمیشہ یوں ہی تر و تازہ بنے رہیں گے۔ اگر اندھا نہیں ہوگیا ہے تو اپنے اردگرد ایک نظر ڈال۔ یوں فرعون بے سامان نہ بنا رہ۔ دور کیوں جاتا ہے رمضان ہی کو دیکھ۔ بڈھی چمڑا ہے اور چمڑا بھی کیسا جیسے برسوں کا سکھایا ہوا۔ کانوں میں جب تک چیخ کے نہ بولو سن نہیں سکتا۔ آنکھیں دیکھنے میں اچھی مگر اپنے پوتے کو بھی نہیں پہچانتا۔ اپنے بل بوتے بچھونے سے اٹھ نہیں سکتا اگر قضائے حاجت کی ضرورت ہوئی اور کوئی ترس کھانے والا موجود ہوا تو اس نے بڑی مشکل سے اٹھایا ورنہ پڑے ہی پڑے سب کچھ اور اسی میں لت پت پڑے رہنا۔ اس دن نہیں دیکھا کہ جب وہ اپنی ادھموئی آواز میں دھیرے دھیرے ”پانی۔ پانی“ کہہ رہا تھا اور اس کی بہو جھلا کے یہ کہتی ہوئی آئی ”بڈھا مَرَو نہیں جات۔ جان اجاب ماں ہے۔ کہاں تلک کوئی کرے“ اور بیدردی کے ساتھ اسے اٹھا کے پانی پلانے لگی۔ پلاتے کیا گی اس کے ہاتھ میں یہ کہہ کے کٹورہ پکڑا دیا کہ ”لیو ڈھسکو۔ پانی، پانی، پانی، پانی۔ مرے جات ہیں پانی بنا“ تو اس کی گردن کس طرح بے اختیار ہل رہی تھی۔ ہاتھ کس طرح کانپ رہا تھا۔ آدھا پانی اس کے اوپر چھلک چھلک کے گرا تب کہیں ایک دو قطرے اس کے دیر سے بڑھے ہوئے منتظر ہونٹوں میں پہنچے اور اتنے ہی میں اس قدر تھک گیا کہ آہستہ سے بس کہہ کے پڑ گیا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اسی طرح پیدا ہوا تھا

کیا کبھی اس کی عمر تمہاری طرح نہ تھی ۔ کیا اس کے یہی کانپتے ہوئے ہاتھ جن سے اب پانی کا کٹورا نہیں سنبھلتا کبھی شراب طہور سے بھرے ہوئے قدرت کے زرنگار پیالوں سے نہ کھیلتے رہے ہوں گے ۔ کیا کبھی وہ بھی بانکا چھیلا بنا نہ پھرتا رہا ہوگا ۔ تم نے تو خود اس کے منہ سے اس کی جوانی کے قصے سنے ہیں ۔ کس طرح قوس قزح کے رنگ کا صافہ پیچ در پیچ ایک طرف ذرا سا جھکا کے باندھے ۔ خوب تیل پلی پتیل جڑی چمکتی سر سے اونچی لاٹھی لئے چنا ہوا تن زیب کا کرتا زیب تن کئے اور اس کے اوپر کسی پھولدار ریشمی کپڑے کی صدری پہنے تہمد باندھے سلیم شاہی جوتا ڈاٹے ایک طرف گال میں دو خوشبودار دیا دری پان کی گلوریاں دبائے (مجھے اس کا یہ کہنا کبھی نہ بھولے گا کہ " بھیا اللہ قسم کبھی دو چھوڑ ایک گلوری منہ میں نہ رکھتے تھے ") سینہ تانے کس آن بان سے چوک کی سیر کو نکلتا تھا کہ عورت تو عورت مرد بھی دیکھتے رہ جاتے تھے ۔ ہر طرف اس کی خاطر تواضع ہوتی تھی ۔ اگر کہیں کچھ دن ناغہ کر کے جاتا تھا تو وہاں سب شکایتاً یہی کہتے " ارے آج کدھر سے چاند نکلا ۔ رمضان بھیا تو بالکل عید کا چاند ہو گئے " ۔ یا ایک اس کا وہ زمانہ تھا یا ایک یہ ہے کہ اس کے اپنے اس کے مرنے کی دعا کرتے ہیں ۔ کیا رمضان نے کوئی قصور کیا ہے کہ اس کا یہ حال ہو گیا اور کیا تم کہیں سے رنگا کے آئے ہو کہ یوں ہی سدا بہار بنے رہو گے ۔ اگر تم نے اس کی اتنی عمر پائی تو تمہارا بھی یہی حال ہوگا اور اگر کم عمری میں مرے تو دیکھنا کہ موت کس طرح تمہارے سارے قصر خیالی کو دفعتاً مسمار کر دے گی ۔ اتنا بھی وقت نہ ملے گا کہ اپنے ارمانوں کے پورا نہ ہو سکنے کا افسوس ہی کر لو ۔ بڑے بڑے فرعونوں کا یہی حال ہوا ہے ۔ تم تو تم ۔ آنکھیں کھولو تو دیکھو کہ جمادات نباتات حیوانات ساری کائنات درس عبرت ہے ۔ عبرت پکڑو عبرت ۔ ورنہ پھر سوائے پچھتانے کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا " ۔ تقریر تو میں نے بہت لمبی چوڑی کی تھی مگر اس کا خلاصہ یہی ہے ۔ جوش میں آگیا تھا ۔ اردو فارسی شاعری سے جو نا دے نی صدی اسی مضمون کی ہے میں نے جگہ جگہ کام لے کے اپنی تقریر کے اثر کو بہت بڑھا دیا تھا ۔ تم بھی متاثر نظر آرہے تھے ۔ جس قدر تم پر زیادہ اثر ہوتا نظر آتا تھا اسی قدر میں اور زور روں سے تقریر کرتا تھا ۔

آخر جب حلق سوکھنے لگا تو میں نے اسی درس عبرت پر تقریر ختم کی اور تمھاری طرف منتظر جواب بنکے دیکھا۔ تم نے کہا ؎

کیا خاک اسے جینا پر لطف دکھائی دے ٭ ہر نقش جسے عبرت انگیز نظر آیا

میں پھڑک گٹھا تیری اور تیرے پُر لطف جینے کی ایسی تیسی ۔ میں کیا جانتا تھا کہ اللہ جل شانہ عم نوالہ نے ابوجہل کی طرح تیرے قلب پر مہر ثبت کر دی ہے "صمٌ بکمٌ عمیاً فہم لا یرجعون ۔ یہ آیت قرآنی پڑھا اور لاحول ولا قوۃ کہتا میں تمھیں راستے ہی میں چھوڑ کے اپنے گھر واپس آیا۔

مدت تک نہ میں تم سے بولا اور نہ تمھیں بولنے کا موقع دیا۔ شاید تم بھی "سبک سر بنکے کیوں پوچھیں" پر عمل کرتے رہے ۔ یاد نہیں آتا کہ پھر کیسے سلسلہ شروع ہوا۔ شاید ہم لوگوں نے ؎

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ٭ تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

پر عمل کیا ہو اور اپنے اپنے دل میں یہ سوچ کے کہ "پانڈے جی پچھتائیں گے پھر چنے کی کھائیں گے" آپ ہی آپ مل گئے ہوں یا ہاں خوب یاد آیا ۔ واہ میں یہ دلچسپ واقعہ بھولا ہی جا رہا تھا۔ سنو میں ہی نے پیش قدمی کی تھی ۔ صرف چنے کی دال مجبوراً کھانے ہی کے لئے نہیں ۔ جی تو تم سے ملنے کے لئے پھر بہت چاہنے لگا تھا لا کہ ہو بقول نظیر" اک عمر کی جو ہے پڑی عادت نہیں چھٹتی" مگر اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی ۔ میں تم سے اتنے عرصے تک زیادہ تر اس وجہ سے نہیں بولا تھا (غصے کی وجہ بھی تھی) کہ میں تم سے بات کرنا گناہ سمجھتا تھا ۔ مومن نے یہ شعر تو طنزاً کہا تھا کہ ؎

میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو ٭ کہیں دامان تر نہ ہو جائے

لیکن میرے نزدیک تم سے بات چیت کرنا واقعی بمنزلہ گناہ کے تھا۔ کچھ عرصے کے بعد آپ ہی آپ مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ نہیں ۔ میں غلطی پر ہوں ۔ تم گمراہ ہو تو میرا فرض یہ ہے کہ تم کو راہ راست پر لاؤں نہ کہ تم کو اور گمراہ ہونے دوں ۔ یہ خیال آتا تھا کہ اپنے آپ کو اس سہل انکاری پر کہ ایک بہانہ ڈھونڈ کے اس بڑے فرض کی ادائگی سے قاصر رہا (اس وقت مجھے اپنا گذشتہ طرز عمل صاف بہانہ نظر آتا تھا) خوب لعنت ملامت کی اور اسی وقت تمھارے ہاں گیا ۔ تم تھے نہیں ۔ نوکروں سے کہہ آیا کہ جب آؤ تو

کہدیں کہ میں آیا تھا۔ تم تھوڑی دیر کے بعد" چہرہ خوشی کے مارے گلستان بنا ہوا" میرے ہاں پہنچے اور خوشی سے لبریز آواز میں بولے "کہئے مولانا کیسے یاد فرمایا"۔ مجھے تمھارے چہرے اور آواز کے لہجے سے یہ معلوم کر کے تو بڑی خوشی ہوئی کہ تم مجھ سے تجدید دوستی کے خیال سے بہت خوش ہو مگر تمھارا اتنا رجحان دیکھ کے میں نے منہ بنا کے خشک لہجے میں کہا "کچھ نہیں ایک کام تھا"۔ اس پر تم بیساختہ بول اُٹھے "کام کی بات بعد میں ہوگی۔ پہلے آپ مجھ سے خوش ہو جائے تب۔ بہت غصہ کر چکے۔ لائیے کانی انگلی"۔ یہ کہہ کے تم نے اپنی کانی انگلی کو ٹیڑھا کر کے بڑھایا مگر میں اپنی انگلی سیدھی ہی کئے رہا۔ کانی انگلی ملا کے لڑکیوں یا چھوٹے بچوں کی طرح عہد وفا باندھنا مجھے اپنے سن علم و فضل اور تقدس کے شایان شان نہ معلوم ہوا۔ خصوصاً اس بات کا خیال آیا کہ میں ایک اہم اور بہت مقدس کام کو اس تجدید دوستی کے ساتھ شروع کرنے والا ہوں۔ لہٰذا اس کی ابتدا ایسے مسخرے پن سے نہ ہونی چاہئے۔ میں نے بہت متین لہجے میں کہا کہ" خیر تمھاری یہی خوشی ہے تو دوستی ہو جائے گی۔ مگر یہ انگلی ونگلی کیا لڑکیوں کا کھیل۔ لیکن تم نے ایک نہ مانی اور بغیر میری کانی انگلی کو زبردستی ٹیڑھا کئے اور اس کو اپنی انگلی سے کس کے کھینچے نہ رہے اور سچ پوچھو تو باوجود میری ظاہری مخالفت کے مجھے دل ہی دل میں اس کا لطف بھی آیا۔ اس طرح ہماری دوبارہ دوستی کا سلسلہ شروع ہوا۔

میں نے یہ دوبارہ دوستی تمھیں راہ راست پر لانے کے لئے شروع ہی کی تھی؛ اس لئے میں نے اب کی دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے بحث و مباحثے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ بحثیں بڑی دلچسپ تھیں اس لئے مجھے اب تک قریب قریب لفظ بلفظ یاد ہیں۔ مگر میں اس وقت انھیں یہاں لکھ کے تمھارے صبر کی ضرورت سے زیادہ آزمائش کرنا اور اس طرح ان کے اثر کو کھونا نہیں چاہتا۔ فرصت ملی تو انھیں کبھی علیحدہ لکھوں گا۔ اس وقت تم میرے ان دلچسپ تجربات کو سننے کے لئے بیچین ہو رہے ہو گے جن کا ذکر میں نے اس خط کے شروع میں کیا ہے اور شاید تم بے صبری کی وجہ سے میرے اس لکھنے کو بھی فضول سمجھتے ہو مگر مجھے یقین ہے کہ جب تم پورا خط پڑھ چکو گے اس وقت تمھاری رائے بدل جائے گی۔ خیر جس طرح بھی ہو صبر کے ساتھ یا بے صبری سے صرف ایک واقعہ کا ذکر اور سن لو۔

امید ہے کہ باوجود بے صبری کے بھی وہ چنداں غیر دلچسپ نہ معلوم ہو۔

ہم لوگ ایک دن جمیل کے ہاں دعوت کھانے جا رہے تھے اور میری طبیعت بمصداق ؎

زندہ دل شیخ جی کب تھے اتنے ؛ آج شائد کہیں دعوت ہوگی

خوب جولانی پر تھی۔ مذہبی بحث تو میں ہیر پھیر کر چھیڑ ہی دیا کرتا تھا۔ اس دن بھی چھیڑ دی اور بڑے جوش کے ساتھ تم نے بہت بچنے کی کوشش کی مگر میری گرفت سے کہاں نکل سکتے تھے۔ تم نے "فالتو عقل" [۱] نہ ہونے کا عذر پیش کیا مگر یہاں کون سنتا ہے۔ آخر تم نے کھسیا کے کہا "مولانا کوئی دلچسپی کی بات کیجئے۔ یہ کیا۔ ہر وقت مذہب، خدا، سنتے سنتے ناک میں دم آگیا۔" یہ سُن کے مجھ سے کہاں رہا جاتا۔ فوراً برس پڑا۔ میں نے کہا "غضب خدا کا تو کیا بک رہا ہے۔ آسمان سے بجلی نہیں گر پڑتی کہ تجھے بھسم کر دے۔ زمین پھٹ نہیں جاتی کہ تجھے نگل جائے۔ خدا کے ذکر سے تجھے دلچسپی نہیں! اس سے نعوذ باللہ تیرا ناک میں دم آتا ہے۔ تو نے کیا خدا کو سمجھ رکھا ہے ملعون؟"

تم۔ "مولانا اکبر کا یہ شعر یاد ہے ؎

میں کب کہتا ہوں واعظ تجھ سے میں نے راز دیں سمجھا
فقط اتنا ہی سمجھا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا"

میں۔ "تو اپنی کٹ حجتی سے باز نہ آئیگا"

تم۔ "واہ مولانا الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" میں یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ مجھے کوئی چور کہے۔ خوب بگڑا قریب قریب مار بیٹھا تھا کہ تم نے کہا زبردستی آپ اتنا بگڑ رہے ہیں آپ کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ورنہ مجھ میں اور آپ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہیں یہ آپ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں میرا ایک بہت پہلے کا کہا ہوا شعر ہے سُن لیجئے" میں نے بڑی خوشی اور اُمید بھرے لہجہ میں کہا تمھیں چھیڑنے میں مزا ملتا ہے عجیب آدمی ہو ابھی تو میں مار بیٹھا ہوتا۔"

---

[۱] مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں۔ فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں (اکبر)

تم۔ "شیخ جی میں اور مجھ میں صرف اتنا فرق ہے

وہ خدا کے واسطے ہیں اور خدا میرے لئے"

یہ سن کے جو کچھ طبیعت کی حالت ہوئی بتا نہیں سکتا "خدا کے واسطے" پر خاص کر غصے سے کانپ اٹھا، وہ جوش جو ذرا دب گیا تھا پھر زور شور سے اُبھر آیا اور میں نے آگ بگولا ہو کے کہا "اس وقت جو جی چاہے کہہ لے قیامت میں قدر عافیت معلوم ہوگی دیکھنا بچا کیا حشر ہوگا۔ دوزخ کے کندے بنو گے، یہ زبان جو اس وقت بہت چل رہی ہے اسی میں ملائکہ لوہے کی لال انگارہ سلاخیں بھوکیں گے نہایت ڈراؤنے ڈراؤنے اژدھے بالکل زندہ آتش فشاں پہاڑ، جن کے منہ کے غاروں سے شعلے لپک رہے ہوں گے کبھی کھڑا نگل جائیں گے کبھی بھاڑ چاڑ کے بوٹی کر دیں گے، ہاتھی سے بڑے بڑے بچھو ڈنک ماریں گے ہر ڈنک ایسا ہوگا کہ ستر ہزار برس تک اس کا درد کرب نہ جائیگا۔ خون پیپ کھانے کو ملیگا اس وقت سوائے توبہ استغفار کے کچھ بن نہ پڑے گی اب بھی سویرا ہے۔ راہ راست پر آجاؤ اور یہ مسخراپن چھوڑ دو۔ ایسی باتیں مذاق میں بھی کرنا بہت بڑا گناہ ہے"۔ میں تو سمجھا تھا کہ دنیا کے سنکھوں انسانوں کی طرح تم بھی عذاب دوزخ کی اس تصویر سے کانپ اُٹھو گے مگر تم ایسے روئیں دل اور روئیں تن نکلے کہ دبی ہوئی مسکراہٹ سے بولے ؎

بے بسی، اس پہ جہنم، کیا خوب ؎ کسی ظالم کی ظرافت ہوگی

"ظالم" اور "ظرافت" سن کے تو میں تمھارے اوپر حملہ آور ہوا چاہتا تھا کہ اس شعر کے معنی کی طرف خیال گیا اور میں نے دیکھا کہ وہی ہمارے پرانے جبر و قدر کے مسئلے کو اس پیرائے میں ادا کیا گیا ہے۔ میں کچھ خوش ہوا کچھ کھسیایا اور مسئلہ جبر و قدر پر ایک زبردست تقریر کی جو آئندہ کبھی بشرط فرصت الگ سے لکھوں گا۔ بہرحال اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صاحب ایمان کو اس سے دور دور رہنا چاہیئے اس کے حل کی کوشش نہ کرنی چاہیئے بلکہ جب اس کا خیال آئے تو تین دفعہ لاحول پڑھ دینی چاہئے کیونکہ درحقیقت یہ وسواس شیطانی ہے۔ میرے اس کہنے پر تم نے نہایت سنجیدگی سے کہا "مولانا آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ مجھے شیطان اس طرح بہت ستایا کرتا ہے۔ میں آپ کے ارشاد کے

مطابق اسے دور رکھنے کی ان شاء اللہ ضرور کوشش کروں گا مگر یہ فرمائیے کہ اس کے لئے با قرأت لاحول پڑھنی زیادہ مجرب ہوگی یا بے قرأت"۔ یہ سن کے جو میری کیفیت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ شاید تم کرسکو بس یہی جی چاہتا تھا کہ اگر بس چلتا تو میں تمھیں فوراً سنگسار کرا دیتا۔ سچ کہتا ہوں اس وقت مجھے اس بات کا مطلق خیال نہ آتا تھا کہ تم میرے سب سے بڑے دوست ہو یا میں نے تمھیں سنگسار کرا دیا تو ایک ایسے انسان سے جو میر صاحب کے اس شعر کا مصداق ہے کہ ؎

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

دنیا ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے گی یا کسی کو بھی سنگسار کرانا بڑا سنگدلی ہے کیونکہ مذہب کی دھکتی ہوئی آگ کے شعلے ان خیالات کے خس و خاشاک کو بھسم کر دیتے ہیں)۔ خیر میرا غصہ مجبوراً میری کانپتی ہوئی آواز، لال انگارہ آنکھوں اور تمتمائے ہوئے چہرے سے ظاہر ہوا۔ میں نے کہا سنگسار نہ سہی تو کم سے کم اپنے دونوں ہاتھوں سے تمھارا گلا گھونٹ کے تمھاری آنکھوں کے ڈھیلے تو چٹکا ہی سکتا ہوں۔ میں تمھاری طرف جھپٹا ہی تھا کہ جمیل سامنے آگیا۔ چونک کے دیکھا تو اس کا گھر سامنے ہے۔ فوراً جس طرح بنا غصہ ضبط کیا۔ بڑی دیر تک میں چپ رہا۔ بات چیت کا بھی ٹھیک سے جواب نہ دے سکتا تھا جمیل جب وجہ پوچھے تو مجبوراً کہہ دوں یوں ہی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں ہے۔ دسترخوان پر بھی تم سے دور بیٹھا۔ کھانا پر اداعوتی تھا، اور کوئی دن ہوتا تو اس کی دل کھول کے داد دیتا مگر آج نوالے حلق میں پھنستے تھے اور قریب قریب ہر ایک کو پانی کے ساتھ اتارنا پڑتا تھا۔ اس بات نے میرے غصہ کو اور بڑھا دیا۔ کھانے کے بعد میں نے جلد رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ تم تاڑ گئے کہ خیریت نہیں اور میرے ساتھ نہ آئے۔

اس کے بعد تمھارے ولایت جانے تک میں نے تم سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ جب تمھارے وہاں جانے کا زمانہ قریب آیا تو البتہ پرانی دوستی اور میرے خیالات نے مجھے مجبور کیا کہ میں پھر تمھارے پاس جاؤں اور تمھیں ولایت میں قدم سنبھال کے رکھنے کی ہدایت کروں۔ اب مجھے اس بات پر ہنسی آتی ہے

مگر اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک تکلیف دہ فرض کو پورا کر رہا ہوں ۔ مجھے یہ دیکھ کے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے میری نصیحت کو بجائے حسب معمول ہنسی میں اڑا دینے کے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

تمھارے ولایت جانے کے بعد میں نے اپنے آپ کو زیادہ تر فلسفہ اور مذہب کی کتابیں پڑھنے اور نام کے مسلمانوں کو پورا مسلمان بنانے اور نامسلموں کو مشرف بہ اسلام کرنے میں مصروف رکھا اس میں مجھے بڑی کامیابی ہوئی ۔ میری ہمت بڑھی اور میں نے مذہب کے استحکام اور فلسفہ کی دھجیاں اُڑنے کے لئے کئی زبردست کتابیں تصنیف کیں یہاں تک کہ میرے تابعین نے جن کی تعداد روز افزوں تھی میرے نام کے پہلے 'حضرت' اور آگے 'غزالی ثانی' لکھنا شروع کر دیا اور میں نے بھی اس لقب کو بخوشی اختیار کر لیا۔

میرے خیالات کی یہ حالت تھی کہ تم ولایت سے واپس آئے ۔ میں لے تم سے بہت کھود کھود کے وہاں کی سب باتیں پوچھیں (یہ حال کی بات ہے اس لئے تمھیں سب یاد ہوگی) جب تم نے سب واقعات بتائے اور اپنی آکسفورڈ والی نظم سنائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے ۔ میرے دل میں غیظ و غضب کا طوفان تھپیڑے مارنے لگا ۔ میرے کانوں میں ایک آواز غیب سے آنے لگی (جو پہلے تو بہت صاف نہ تھی مگر روز بروز صاف ہوتی گئی) کہ میں یورپ جاؤں اور ناپاک سرزمین کو فسق و فجور کی غلاظت سے پاک کروں ۔ میں نے اس کا اظہار سوائے حلقہ بگوشان خاص کے اور کسی پر نہ کیا ۔ سفر کے تفصیلی حالات بیان کرنے کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے یہاں صرف انھیں باتوں کا ذکر کرتا ہوں جن کا تعلق آئندہ کے واقعات سے ہے۔

جہاز میں کیا سوار ہوا کہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گیا ۔ ہر طرف عورت مرد اس طرح خوش خوش گھومتے پھرتے نظر آئے جیسے انھیں روز قیامت کا خیال ہی نہیں اور نہ نجات کا غم ۔ جدھر دیکھئے ایک ایک جوڑا بیٹھا ہے الگ کونے میں ۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ لوگ میاں بیوی ہوں گے مگر جب میں نے دیکھا کہ ابھی ایک عورت ایک مرد کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے اور ابھی دوسرے کے ساتھ اور دونوں کے ساتھ اس طرح کہ ہمارے ملک میں بیویاں بھی اپنے شوہروں کے ساتھ اس طرح

نہیں بیٹھتیں تو میرا رُواں رُواں کھڑا ہوگیا کچھ تو جہاز کے ہر وقت گن گن گن گن کرنے کی وجہ سے اور کچھ ان روح لرزا دینے والے مناظر کے ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہنے سے مجھے زندگی دوبھر معلوم ہونے لگی اور میں زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں بند پڑا رہتا، اپنے بچھونے پر پڑا پڑا غور کیا کرتا کہ کس طرح ان گمراہوں کی ہدایت کروں، پہلے تو یہ مسئلہ طے کرنا تھا کہ اس گمراہی کا سبب کون ہے، میں جلد اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ اصل بِس کی گانٹھ عورت ہے، اسی نے آدم کو جنت سے نکالا اور یہی اولادِ آدم کو جنت سے محروم رکھنا چاہتی ہے اگر یہ مردوں کی حوصلہ افزائی نہ کرے تو ان کی کبھی ہمت نہ پڑے، میں نے اپنی حالت پر غور کیا اور تھوڑی دیر کے لئے طوعاً و کرہاً یہ خیال کیا کہ اگر بالفرض میرے دل میں وسواس شیطانی پیدا ہو اور میں اس جہاز پر کسی لڑکی سے عشق کرنا چاہوں (ایک بڑی شوخ و شنگ لڑکی تھی اسی کا خیال آیا) اور وہ میری ہمت نہ بڑھائے تو میں کیا کروں گا بقول غالب پیش دستی یا خدا پرستی، میں کچھ فیصلہ نہ کرسکا، آخر یہ خیال پیدا ہوا کہ آزما کے دیکھ لوں آزمائش میں کیا حرج ہے۔ اس ارادے سے باہر نکلا اور اسے ڈھونڈنے لگا وہ نظر تو آئی مگر بدستور ایک لمبے کے ساتھ دونوں بیٹھے سرگوشیاں کررہے تھے، مجھے یہ منظر پہلے سے بھی زیادہ بُرا لگا اور میں بے چینی سے اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کیسے یہ مردود کھسکے اور میں پہونچوں، خدا خدا کرکے مراد بر آئی اور وہ جہنم واصل ہوا میں اپنے دل میں اس طرف بڑھنے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ ایک دوسرا بدمعاش پہنچ گیا اور نہایت بے تکلفی سے اس کے پاس کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا، کوئی برف میں ٹھنڈی کی ہوئی لالہ رنگ چیز جو ضرور شراب ہی ہوگی منگائی اور دونوں نے اپنے گلاس ایک دوسرے سے بجاکے پینا شروع کیا، وہ پگھلی ہوئی آگ ابھی ان کے حلق سے نہ اُتری ہوگی کہ ادھر جان جل کے کباب ہوگئی، اتنا غصہ شائد مجھے کبھی نہ آیا ہوگا میں چُپ بیٹھا دیکھا کیا، کبھی کبھی وہ بدمعاش میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتا کہ جی چاہتا کہ آنکھ نکال لوں کبھی کبھی وہ بھی ایک نگاہ غلط انداز ڈال ہی دیتی اور پھر فوراً اس طرح ہٹالیتی کہ کچھ نہ پوچھو اس سے کچھ اُمید بندھتی اور دل میں ایک ہلکی سی خوشی کی لہر دوڑ جاتی میں اسی طرح بڑی دیر تک بیٹھا رہا وہ ملعون اُٹھنے کا

نام ہی نہ لیتا تھا خیر کسی طرح اُٹھا، اس کے اُٹھنے سے کرسی پر سے اتنا بوجھ نہ اٹھا ہوگا جتنا کہ میرے سینے سے اٹھا۔ میں" اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی" کہہ کے اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ میرا دل سچ مچ، مثل نقش مدعائے غیر" بیٹھ گیا یعنی کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بھی اٹھی اور دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ میں تھوڑی دیر تک غصہ اور کھسیاہٹ کی دنیا میں کھویا ہوا رہا۔ پھر چپکے سے اُٹھ کے اپنے کمرے میں چلا گیا پلنگ پر لیٹ کے جو واقعات ابھی ہوئے تھے ان پر ایک اک کرکے غور کرتا رہا اور اسی حالت میں سوگیا خواب میں بھی وہی سب باتیں نظر آئیں اب زیادہ تو یاد نہیں صرف اتنا یاد ہے کہ کسی طرح ہم لوگ اکیلے ہوگئے۔ میں نے اس سے کچھ "عشق کرنا" چاہا جس پر وہ بگڑی۔ میں نے اسے شوخی و شرارت پر محمول کیا۔ پھر حسن طلب کا خیال پیدا ہوا اور میں نے بصد شوق اپنا منہ اس کی طرف بڑھانا شروع کیا اور اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف ہٹانا، یہاں تک کہ ہمارے ہونٹوں کے درمیان دو ناکوں کا فاصلہ رہ گیا۔ اتنے میں اس نے دفور ناز میں اس زور سے ایک طمانچہ میرے داہنے رخسار پر مارا کہ میں چونک پڑا اور آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہوں کہ میرا تمام چہرا گرم ہے ناک سے سانس بھی گرم گرم نکل رہی ہے۔ وہ مقام جہاں طمانچہ لگا تھا خاص طور سے گرم تھا یہ سب واقعات اس قدر آنکھ کے دیکھے معلوم ہو رہے تھے کہ مجھے دھوکا ہونے لگا کہ شاید سچ مچ ایسا ہی ہوا ہو اور وہ مار کے باہر چلی گئی ہو، اس کا کمرے میں آنا خیال میں نہ آیا، خیر اسی شک و شبہے کی حالت میں اُٹھ کے میں نے منہ دھویا، چہرے کی گرمی کم ہوئی اور میں ٹھنڈی ہوا کھانے کے لئے ڈک پر گیا۔ وہاں یہ دیکھ کے میرے پاؤں میں کچھ کمزوری سی محسوس ہونے لگی کہ وہ ڈک کے ایک کونے میں جنگلے پر ٹیک لگائے سمندر میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کا منظر دیکھ رہی ہے اور اکیلی ہے میں بھی اس سے کچھ دور اسی طرح کھڑا ہوگیا اگرچہ میں بظاہر لطف منظر اٹھا رہا تھا مگر دل میں کوئی " تقریب بہر ملاقات" سوچ رہا تھا کہ پہلے کیا کہوں اور کس طرح وہ اس کا کیا جواب دے اور میں کیا جواب دوں۔ آدھے گھنٹے تک کی گفتگو سوچ جاتا پھر شروع کا حصہ بھول جاتا اور کوئی دوسرا سلسلہ گفتگو سوچتا۔ خیر یا تو کچھ سوچ کے یا اضطراری

حالت میں (اس وقت میں ٹھیک بتا نہیں سکتا کہ کیا بات تھی) میں نے بڑی لَے کے ساتھ سیٹی بجانی شروع کی، میں عمر بھر گانے بجانے کو گناہ سمجھتا تھا اس لئے اسے خود کیسے جان سکتا تھا مگر اس وقت کی سیٹی سے مجھے ایک لذت محسوس ہوتی تھی اور میں سمجھ رہا تھا کہ بہت پر اثر طریقہ سے بجا رہا ہوں، میں نے تھوڑی ہی دیر بجایا تھا کہ اس نے میری طرف ایک ایسی نگاہ ڈالی جس کے میں معنی نہ سمجھ سکا اور فوراً وہاں سے چلی گئی۔ پھر دو منٹ بعد ایک بغل جاپ ساتھ لئے نمودار ہوئی، اس وقت مجھے بغل جاپ کی موجودگی اتنی بُری نہ معلوم ہوئی بلکہ دل کو کچھ اس خیال سے خوشی ہوئی کہ وہ قصداً مجھے جلانے کے لئے اسے اپنے ساتھ لے آئی ہے، اگر اسے میرا خیال نہیں تو یہ چھیڑ چھاڑ کیوں۔ یہ خیال آنا تھا کہ میری سیٹی نے الفاظ کی صورت اختیار کی اور یہ شعر زبان پر تھا ؎

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو ٭ کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرز ادا سے ہم (حالی)

میں اس وقت تک اس لطف کی دنیا میں رہا جب تک وہ چکر لگاتی رہی، ادھر وہ اپنے کمرے میں گئی، ادھر میں اپنے کمرے میں۔

اسی طرح دو تین دن کٹے مگر مجھے اس سے بات کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ ایک رات کو پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ میری داڑھی نہایت زوروں سے کھینچ رہی ہے اور یہ کہے جا رہی ہے کہ

اور کیا پھبتی کہوں بن آئے ہو لنگور سے

داڑھی منڈواؤ میں باز آئی خدا کے نور سے (جان صاحب)

آنکھ کھلی تو دیکھا داڑھی ہاتھ میں تھی، فوراً اٹھ کے اپنا چہرا آئینہ میں دیکھا اور بڑی دیر تک دیکھتا رہا غور کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے، یہ شعر کہ

ہے ابھی چہرے پہ خود نورِ شباب ٭ بعد میں داڑھی بڑھالی جائے گی

اس وقت یاد آیا اور کچھ دیر کھٹکتا رہا کیونکہ اس میں کسی قدر منطقی استدلال تھا اور منطق مجھے ہمیشہ سے مرغوب۔ میں نے خیال کیا کہ آخر بات ہے تو لگتی ہوئی۔ نورِ شباب بھی تو خدا ہی کا نور ہے اور

ایک طرح نورِ شباب زیادہ بجا طور پہ خدا کا نور ہے یہ آدمی نہیں پیدا کر سکتا داڑھی تو اپنے بس کی چیز ہے رکھی نہ رکھی۔ لہذا جب یہ اصلی نور نہ رہ جائے اور چہرے کو اللہ کے نور کی ضرورت ہو اس وقت داڑھی بڑھالی جائے۔ فی الحال بضرورت کام کرنے سے فائدہ۔ یہ سب خیالات آئے، مگر شرع شریف کے حکم کا خیال سب پہ بالا تھا، آخر کوئی تو مصلحت ہوگی جس کی بنا پر داڑھی رکھنے کا حکم ہوا ہے، الغرض قریب تھا کہ میں داڑھی رکھنے کے موافق فیصلہ کروں کہ اتنے میں ایک اور سلسلۂ خیال پیدا ہوا، مجھے یاد آیا۔ کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں، ظاہر تھا کہ اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ گمراہوں کو صحیح راستہ دکھلانے کے لئے، اس لئے مجھے ہر وہ چیز کرنی چاہیئے جو اس پاک مقصد کے حصول میں مدد کرے، داڑھی کا ایک ایک بال اگر گمراہوں کی آنکھوں میں شہتیر کی طرح نہیں تو کم سے کم بہت بڑے بڑے اور موٹے موٹے خس کے تنکوں کی طرح تو ضرور تھا، خواب کی بھی تعبیر یہ تھی کہ جب تک میں داڑھی دور نہ کروں گا اس محبوب شوخ وشنگ سے قربت حاصل نہ ہوگی خواب کا خیال آنا تھا کہ مجھے یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ آخر میں نے یہ خواب کیوں دیکھا مجھے اس نتیجہ پر پہنچنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ یہ خدا کی طرف سے ہدایت تھی، جب میں خدا کے نام کا ڈنکا بجانے اور یورپ کے کلیساؤں میں نعرۂ اذان بلند کرنے کے لئے بحرِ ظلمات عبور کر رہا ہوں تو وہ قندیل نور مجھے راستہ نہ دکھائیگی تو اور کون دکھائے گا بوجہ سلسلہ وحی کے بند ہو جانے کے خدا اپنے مجاہدوں کو رویائے صادقہ کے ذریعہ سے پیغام پہنچاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا خواب رویائے صادقہ میں سے تھا، یہ خیال آنا تھا کہ میں نے بغیر کچھ اور غور کئے اپنے ناپاک استرے سے ان پاک بالوں کو جو اب تک مجھے جان سے زیادہ عزیز تھے صاف کر ڈالا مونچھ مونڈنے میں کچھ پس وپیش کیا کیونکہ اس پہ تاؤ دینے کی میری عادت تھی، اکثر جب کچھ نہ کرتا یا کسی امر پہ غور وفکر کرتا تو برابر تاؤ دیا کرتا، اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ اس ناپاک کے جو اکثر اس کے ساتھ رہتا ہے مونچھ ہے یا نہیں، جیسے ہی میری آنکھوں کے سامنے اس کی مادہ رو صورت آئی میں نے استرا اٹھا بقیۃ السیف کو بھی صاف کر دیا، آئینہ میں پھر ہر طرح گھما پھرا کے اپنی صورت دیکھی، جیسا محسوس ہوا نہ بتاؤں گا، اس خیال نے

جملہ احساسات کو دور کر دیا کہ یہ صورت اسے پسند آ جائے تو سب سوارت ہے، اب تبدیلِ لباس کی بھی فکر ہوئی کیونکہ یہ بھی لازمی نظر آیا، اول تو میرے پاس کوئی انگریزی کپڑا نہیں (ہمیشہ سے نفرت تھی ہوتا کیسے) اور اگر کہیں سے مل بھی جائے تو پہننا معلوم۔ خیر اسی ادھیڑبن میں تھا کہ میرے کمرے کا بیرا کسی کام سے آیا، میرے دماغ میں فوراً ایک خیال کی لہر سی دوڑ گئی اور مجھے یہ آناً فاناً محسوس ہوا کہ وہ خدا کا بھیجا ہے۔ میں نے اس سے اپنی مشکل ظاہر کی اور انعام دینے کا وعدہ کیا۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا کہ کوئی نیا سوٹ تو وہاں ملنے سے رہا۔ وہ اپنا ایک پرانا سوٹ البتہ دے سکیگا بشرطیکہ اسے معقول قیمت دی جائے۔ میں فوراً راضی ہوگیا اور اس نے اپنا ایک واقعی پرانا سوٹ (واقعی میں نے اس لئے کہا کہ مجھے ہلکی ہلکی یہ امید تھی کہ شاید پرانا اس نے انکساراً کہا ہو) مجھے لا کے پہنایا، ٹائی وغیرہ سب باندھی۔ مجھے پتلون کچھ اُٹنگا اور ران میں کستا سا معلوم ہوا مگر اس نے مجھے سمجھا دیا کہ یہ میری ڈھیلی مہری کے پاجامہ پہننے کی عادت کی وجہ سے ہے، ابھرے پیٹ پر واسکٹ بھی بہت کسی معلوم ہوئی اور کوٹ کے بٹن تو لگے ہی نہیں، اس نے کہا کہ بٹن نہ لگانا نیا فیشن ہے، خیر میں اسی طرح سج کے اوپر گیا اور اس شوخ کو ادھر ادھر ڈھونڈھنے لگا، ایک جگہ اپنے عاشق یا معشوق کے ساتھ (جو بھی وہ مردود رہا ہو) بیٹھی نظر آئی۔ میں بھی کچھ دور ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا کہ اب دیکھیں اس کی نگاہیں کیا کہتی ہیں اس نے گوشۂ چشم سے مجھے دیکھا، تھی تو وہ نگاہ غلط انداز ہی مگر میرے اوپر پڑتے ہی جم سی گئی، پھر تو اس نے میری طرف بار بار دیکھنا شروع کیا اور اس بلا کی تبسم آمیز شوخی کے ساتھ کہ کچھ نہ پوچھو، میرے دل سے چہرے تک اور چہرے سے دل تک پہلے گدگدی اور پھر گرم گرم خون کی لہر دوڑنے لگی، کچھ عجب کیفیت تھی ایسی کہ اس کا تجربہ کبھی پہلے نہ ہوا تھا، بے اختیار منہ سے نکل گیا ؎

اک سرسری نظر ہو تو سمجھا لوں دل کو بھی ؛ لیکن میں کیا کروں نگہ بار بار کو

کچھ دیر تک میں اور اس پر لطف دنیائے شعر میں رہتا مگر یکایک مجھے جیسے کوئی اُنچنتے میں ڈھکیل دے۔ اس سب کے اصل مقصد کا خیال آیا اور میں اپنے اوپر غصہ اور لعنت ملامت کرتا اٹھ کے اپنے کمرے میں

چلا گیا، وہاں میں نے اپنے آپ کو خوب بُرا بھلا کہا اس وقت میں اپنی نظروں میں صاف Paphnutius معلوم ہو رہا تھا ایسا جی چاہا کہ داڑھی نوچ لوں، فوراً ہاتھ گال کی طرف اٹھے اور غصہ ان پر اتارا، لیٹے لیٹے از سر نو پھر Paphnutius سے اپنا مقابلہ کرنا شروع کیا اور جلد نتیجے پر پہنچ گیا کہ مجھ میں اور اس میں وہی فرق ہے جو عزازیل اور جبریل میں یعنی بظاہر دونوں فرشتے مگر ایک کا باطن کفر ضلالت کی سیاہی سے شب دیجور اور دوسرے کا بارش انوار رحمت سے نور آعلیٰ نور، اس سے کچھ دل کی وحشت کم ہوئی، پھر بڑی دیر تک سوچ سوچ کے یہ طے کیا کہ اپنے ارادے کو استقامت دینے کے لئے خدا کو حاضر ناظر گردان کے یہ عہد کروں کہ اس آزمائش کے عشق کو آزمائش کی حد سے بڑھنے نہ دوں گا۔ چاہے وہ مجھ سے سچ مچ عشق ہی کیوں نہ کرنے لگے۔ اس آخری بات نے میرے خیال کو اس جانب منتقل کیا کہ میں نے جس وقت امتحان کی ٹھانی تھی اس وقت صرف نتیجہ کا ایک ہی پہلو سامنے آیا تھا یعنی اگر اس نے میری محبت مسترد کر دی۔ لیکن اس نے اگر میری محبت قبول کی، اس سوال کا خیال ہی نہ کیا تھا، میں نے اپنی اس بیوقوفی پر اپنے آپ کو اور بُرا بھلا کہا اور نئے سرے سے صورت معاملات پر غور کیا بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اُس نے میری محبت رد کر دی تو میرا امتحان کا مقصد پورا ہوگا اور اگر اس نے قبول کی (جس کا اب مجھے امکان زیادہ معلوم ہوتا تھا) تو اس صورت میں کہ وہ مشرف بہ اسلام ہو اور شرع شریف کے مطابق میری منکوحہ بیوی بننے کی خواہش ظاہر کرے۔ مجھے اسے زوجگی میں قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئیے یہ سب باتیں سوچ کے دل میں اطمینانی صورت پیدا ہوگئی، اب میں زیادہ مستعدی سے اس سے ملنے کا موقع ڈھونڈھنے لگا، جیسے جیسے وہ مجھے دیکھ کے مسکراتی میرے شوق کی آگ اور بھڑکتی، آخر کار میں نے ایک دفعہ اسے اکیلا بیٹھا پا ہی لیا، میں نے اپنے پاؤں مضبوط کئے جو پھر کمزور ہونے شروع ہوگئے تھے اور یہ طے کرکے کہ جس طرح وہ مردود اس کے پاس کرسی کھینچ کے بے تکلف بیٹھ گیا تھا میں بھی بیٹھوں گا اس کی طرف بڑھا (اپنے درمیان یخ بستہ کو توڑنے کا مجھے اب بہترین طریقہ یہی نظر آتا تھا) کرسی کے پاس پہنچا اور اسے اتنے زور سے کھینچا کہ گھٹنے میں چوٹ بھی لگ گئی، مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس پر اسی زور سے بیٹھ گیا، بیٹھا ہی تھا کہ وہ اونچی آواز میں Coming

کہہ کے کچھ ہنستی ہوئی باہر چلی گئی' میں نے کہا کمبخت کو اسی وقت بلانا بھی تھا اور افسوس کرتا ہوا اپنے زخمی گھٹنے کو سہلاتا وہیں کچھ دیر بیٹھا رہا اسی دن رات کو میں نے ڈیک کے ایک اندھیرے کونے میں اسے ایک ملعون کے ساتھ بیٹھے دیکھا دونوں گھسر پھسر رازونیاز کی باتیں کر رہے تھے میں ایک دفعہ ان کے پاس سے گذر گیا' پھر دوسرے چکر میں دوبارہ گذرا وہ لوگ بدستور بیٹھے تھے اب کی چکر میں میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ سوچتے سوچتے مجھے یہ خیال آیا کہ اس اندھیرے میں وہ ممکن ہے کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں' اس خیال سے میں کانپ اُٹھا' سوچا کیا طریقہ اس کے روکنے کا ہے کوئی بات سمجھ میں نہ آئی' آخر کار یہ طے کیا کہ کچھ نہیں تو میں ان کے قریب ہی جا کے کھڑا ہو رہوں میری قربت کی وجہ سے وہ کچھ نہ کر سکیں گے' چنانچہ میں ان کے قریب ایک کونے میں جنگلے پر ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھوڑی دیر کھڑا رہا' وہ لوگ بالکل چپ معلوم ہوئے میں نے ان کی طرف اس چپ کا سبب دریافت کرنے کے لئے غور سے دیکھنا شروع کیا' میں ابھی ٹھیک سے دیکھ نہ سکا تھا کہ وہ لعین اٹھا اور بہت تیزی سے میرے پاس آکے کچھ انگریزی میں بکنے لگا میں انگریزی ہندوستانی لہجے میں سننے سمجھنے کا عادی' یہ خالص ولایتی لہجہ جسے غصہ نے اور بھی بھیانک بنا دیا تھا میری سمجھ سے باہر تھا۔ بہر حال میں اتنا ضرور سمجھ سکا کہ وہ کوئی بہت بُری گالی دے رہا ہے۔ میرا خون غصے کے مارے یوں ہی کھول رہا تھا اس پر یہ گالی۔ پھر یہ بھی بجلی کی طرح خیال آیا کہ عورتیں بہادری اور جسمانی قوت کے اظہار کو پسند کرتی ہیں اور میرا ایسے موقعہ پر اس کی گالی پی جانا اپنے عشق کی خودکشی کے لئے زہر پینا ہے۔ بس بغیر کچھ جواب دیئے میں نے ایک گھونسا اس کے منہ پر مارا' مارنا تھا کہ میرے سر میں بجلی سی چمک گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی لوہے کے پنجے نے پکڑ کے مجھے لوکا دیا اور میں ہوا میں ہوں'

اس کے بعد کے واقعات یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر یاد نہیں آتے۔ بس یہاں سے یاد آتے ہیں کہ کچھ میرے جسم کو گرمی سی محسوس ہوئی' گالوں کو خاص کر۔ معاً مجھے اس کے طمانچے کا خیال آیا اور میں نے فوراً آنکھ کھول دی' دیکھا کہ میں زمین پر پڑا ہوں اور آفتاب نہایت شدت سے چمک رہا ہے' میری آنکھ چکا چوند کی وجہ سے بند ہو گئی اور میں گذشتہ واقعات کو یاد کرنے لگا' تاکہ یہ سمجھ سکوں کہ میں

کہاں ہوں۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئی میں سورج کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا دیکھا سامنے سمندر ہے اور بڑی بڑی موجیں " پائے در زنجیر وکف برلب" دیوانہ وار چلی آرہی ہیں۔ میں نے کہا یا اللہ میں کہاں ہوں، کہیں میرا بھی Robinson Crusoe یا Gulliver کا سا حال تو نہیں ہوا، خیر میں نے وہاں زیادہ دیر تک بیٹھ کے اس پر غور کرنا مناسب نہ خیال کیا اور فوراً وہاں سے اٹھ کے اونچی زمین پر آیا، ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا، سمندر کی موجوں کی آواز نے میری نگاہ پھر اپنی طرف کھینچی، میں نے مڑ کے دیکھا، دور سمندر میں میری گذشتہ زندگی مجسم کھڑی نظر آئی۔ جملہ واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ غالباً اس نابکار نے مجھے سمندر میں ڈھکیل دیا تھا اور خدا کے رحم و کرم نے میری جان کو اپنے حفظ داماں میں رکھ کے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ یہ خیال آنا تھا کہ میں فوراً دو رکعت شکرانے کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو گیا اور نہایت خشوع وخضوع سے پڑھنے لگا۔ جب میں نے اپنی سجدوں سے تڑپتی ہوئی جبین نیاز زمین پر رکھی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا سر سر عرش بریں ہے، میرا ذوق عبودیت اس حد تک پہنچ گیا جہاں فروغ تجلی بال جبریل کو بھی بھسم کردے، اس حالت میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جو میری عقل پر پردہ پڑا تھا اس میں بھی آگ لگ گئی اور وہ چشم زدن میں راکھ ہو گیا ادھر وہ پردہ غائب ہوا ادھر میرے اوپر یہ راز کھلا کہ کہیں یہ مقام جنت نہ ہو مجھے یہ یقین ہو چلا کہ جس وقت مجھے اس ناشدنی نے ڈھکیلا ہوگا اس وقت میری روح ضرور پرواز کر گئی ہوگی اور صدقے شان کریمی کے جس نے بغیر مواخذۂ حشر مجھے جنت عطا فرمائی۔ یہ خیال آنا تھا کہ میں قواعد نماز کو بھول کے ہمہ تن شکر ونیاز بنا اسی عالم سجود میں پڑا رہا۔ کبھی کبھی جوش میں آکے البتہ اپنی پیشانی اور ناک رگڑنے لگتا۔ میں اسی حالت میں تھا کہ کسی نے میرے بازوؤں کو چھوا، میں نے سر اٹھا کے جو دیکھا تو ایک حور کھڑی ہے، روح تڑپ گئی اور میرا سر نیاز بے اختیار پھر سجدے میں گر پڑا مگر دیدار حور سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشنے کی تمنائے بے تاب نے اسے جلد ہی اٹھا دیا اور میں نے ایسی آواز سے جو مجھے اپنی آواز ہی نہ معلوم ہوتی تھی اس سے مخاطب ہو کے "میری جان، میری روح" کہا، کہنا تھا کہ وہ ہمہ تن خوف وحیرت بن گئی اور وہاں سے چشم زدن میں

غائب ہوگئی - میں حافظ کے اس مصرع کی کہ

" بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی ست"

زندہ تصویر بنا درکی در پڑا رہا۔ سوچتا رہا کہ معاملہ کیا ہے، دنیا میں ہم لوگوں کو کچھ غلط پڑھایا گیا تھا کیا کہ حوریں جنت میں مومنوں کی کنیزوں کی طرح ہوں گی۔ یہاں تو قصہ ہی کچھ اور ہے۔ بجائے میرے پاس محبت سے آکے بیٹھنے کے وہ اس جہاز والی چڑیل کی طرح رفو چکر ہوگئی، اسی ادھیڑبن میں تھا کہ بہت سے لوگ مرد عورت میری طرف آتے نظر آئے کچھ دیر تک میں ان لوگوں کو حیرت سے دیکھتا رہا، نہ ایک حرف انھوں نے کہا نہ میں نے۔ آخر میں نے سوچا کہ کب تک زبان خاموشی سے گفتگو کروں۔ کوئی بات بھی ہے، چنانچہ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ لوگ کون ہیں اور کیوں مجھے اس طرح دیکھتے ہیں، ادھر میری زبان کا پتہ کھڑکا ادھر ان لوگوں کے ہوش حواس کا گھوڑا بھڑکا، تم میرے اس جملہ کو پڑھ کے ہنسو گے تو مگر جو ہوا اور جس طرح ہوا اسے میں اس سے بہتر طریقہ سے بیان نہیں کرسکتا مجھے اب کی دفعہ تعجب کے ساتھ ہنسی بھی معلوم ہوئی، میں نے کہا یہ لوگ آدمی ہیں کہ گھن چکر۔ پھر خود بخود دل نے جواب دے کے شرمندہ کیا کہ نہ آدمی نہ گھن چکر حوران سیم بر اور غلمان زریں کمر، میں نے کھڑے ہوکے تحکم کے ساتھ کہا " چلو ادھر آؤ" یہ کہنا تھا کہ وہ اور پیچھے ہٹے اور آپس میں کچھ اشاروں اشاروں میں کہہ کے غائب ہوگئے، میں نے کہا یہ سب گونگے ہیں کیا۔ جنت کا تذکرہ کرنیوالے واعظوں کو ایک عدد صلواۃ سنائی کہ ایسی موٹی بات نہ لکھی دل نے کہا دنیا میں یار لوگ ایسے ہی عقلی گدے لڑایا کرتے ہیں اور الل ٹپ اڑاتے ہیں۔ اس وقت مجھے ایک دفعہ پھر دنیا میں واپس جانے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ میں لوگوں کو جنت کے صحیح حالات بتا سکوں اور سارے کٹھ ملاؤں کی زبان لال کرسکوں (اس وقت مجھے وہ سب لوگ جنھیں میں علمائے کرام میں سمجھتا تھا کٹھ ملا نظر آتے تھے) میں اپنا غصہ اچھی طرح نہ اتار چکا تھا کہ پھر بہت سے لوگ آتے نظر آئے مختلف چیزیں ہاتھوں میں لئے ہوئے، ان میں ایک چیز از قسم جال کے بھی تھی میں معاملات کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ وہ لوگ میرے چاروں طرف کچھ دور کھڑے ہوگئے اور پھر یکایک اس تیزی سے جھپٹے

جیسے بلی چوہے پر اور میں فوراً جال کے اندر۔ میں بہت چھٹپٹایا مگر اکبر کے اس شعر کا مصداق بن کے رہ گیا کہ ؎

"تڑپو گے جتنا جال کے اندر .. جال گھسے گا کھال کے اندر"

میں نے بڑی ڈانٹ ڈپٹ مچائی مگر بے سود۔ یکا یک یہ خیال آیا کہ شاید یہ لوگ مجھے کافر سمجھتے ہیں لیا۔ فوراً میں نے بسم اللہ۔ اعوذ باللہ۔ لا الہ اللہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ۔ اللہم صل۔ اللہم بارک۔ وغیرہ باواز بلند ورد کرنا شروع کیا مگر سب اکارت گیا۔ آخر راضی بہ رضا ہو کے چپ ہو گیا۔ خیر جب انھوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ میں جال سے نہیں نکل سکتا تو ایک اڑتے ہوئے موٹر پہ مجھے لاد کے ایک نہایت عظیم الشان باغ میں لے گئے جہاں طرح طرح کے جانور دیکھ کے جی خوش ہو گیا میرے دل میں حور کی طرح کبھی کبھی یہ خیال بھی آجاتا تھا کہ کہیں یہ اعراف تو نہیں ہے ان کے اشارے کی بات چیت سے مجھے کچھ کچھ ان کے گونگے ہونے کا یقین آچلا۔ اور چونکہ اشارے کی زبان ایسی زبان ہے جسے ہر شخص چاہے کسی ملک اور قوم کا کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ اپنی سمجھ کے مطابق سمجھ سکتا ہے اس لئے میں بھی کچھ کچھ ان کے معنی مطلب سمجھنے لگا' مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ لوگ یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ مجھے کہاں رکھیں اور اس مسئلہ نے کافی اختلاف رائے پیدا کر دیا ہے' آخر میں نے یہ دیکھا کہ کچھ جانور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جا رہے ہیں اور نہایت تیزی سے کچھ مشینیں کام کر رہی ہیں تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے ایسی جگہ لے گئے جس کے ایک طرف چمپنزی بندر اور دوسری طرف کاکاتوا کی بود باش تھی' جو مقام مجھے رہنے کے لئے ملا تھا وہ کافی کشادہ تھا مگر بالکل جزیرہ اس کے چاروں طرف ایک ایک سو ہاتھ چوڑی اور گہری خندقیں تھیں جزیرے میں چند درخت تھے پھول پھل کے اور ایک مصنوعی پہاڑی میں کھوہ'

میں نے اب از سر نو اپنی حالت پر غور کرنا شروع کیا مجھے خیال ہوا شاید کسی گناہ کی سزا میں خداوند تعالیٰ نے میرے لئے یہ سزا تجویز فرمائی ہو اور اپنے رحم و کرم سے مجھے دوزخ کا کندہ نہ بنایا ہو' سزا کی میعاد ختم ہونے کے بعد پھر انشاءاللہ جنت کا پورا آرام نصیب ہوگا' اس خیال کی خوشی کو

کمدر کرنے کے لئے کچھ یہ بھی خیال آیا کہ اگر یہ مقام بالفرض جنت ہے تو پھر یہ لوگ آپس میں اس قدر مشورہ کیوں کر رہے تھے جہاں خدا کا حکم ہوتا وہاں انھیں مجھے بے چوں و چرا پہنچا دینا چاہیئے تھا مگر لسان الغیب کے اس مصرع نے کہ "رموز مصلحت خویش" یاد آکے اس الجھن سے نجات بخشی۔

کھانے کے لئے صبح شام مجھے ایک ایسی قسم کی جھولی کے ذریعہ سے جس سے حضرت ابراہیمؑ آگ میں پھینکے گئے تھے۔ ہر قسم کی چیز اینٹ پتھر سے لے کے کچا گوشت تک ملتا۔ اس وقت خاص طور سے تماشائیوں کا مجمع ہوتا اور وہ لوگ بڑے شوق سے یہ دیکھتے نظر آتے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کس طرح۔ میں پھل وغیرہ کھا لیتا۔ ایک دن میں نے سوچا جیسا دیس ویسا بھیس۔ یہ سب اشاروں میں بات کرتے ہیں میں بھی کیوں نہ کروں۔ چنانچہ جب تماشائی اکٹھا ہوئے تو میں نے اشاروں کی زبان میں اس شان سے تقریر کرنی شروع کی کہ اگر تم دیکھتے تو ہنستے ہنستے لوٹ جاتے۔ اس سے وہ لوگ بے انتہا خوش نظر آئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری ذہانت کی داد دے رہے ہیں اب روز بروز تماشائیوں کا مجمع بڑھنے لگا اور میں نے اپنی خاموش گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا جس کی وجہ سے ان کی مہربانیاں روز افزوں ہوتی جاتی تھیں۔

ایک دن مغرب کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک زبردست گوریلا میرے جزیرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں گھبرایا کہ یا اللہ یہ کیا۔ عمر بھر میں پہلے پہل گوریلے سے سابقہ پڑا۔ میں چپکے سے جا کے کھوہ میں گھس گیا اور اس کے منہ پر جس قدر پتھر مل سکے رکھ کے راستہ بند کیا۔ پھر بھی ڈر کے مارے دیر تک نیند نہ آئی۔ جہاں کھٹ سے ہوا اور میں جھٹ سے اُٹھ بیٹھا۔ کسی طرح خدا خدا کرکے صبح ہوئی۔ میں نے اپنی کھوہ کے دروازے سے جھانک کے دیکھا تو گوریلا صحن میں بیٹھا ہوا ہے مگر خیریت یہ ہے کہ پیٹھ میری طرف ہے۔ میں چپکے سے کھوہ کے اندر لوٹ گیا اور بڑی دیر تک وہیں اٹھی بیٹھی مچائے رہا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو پھر جا کے جھانکا۔ گوریلا بدستور بیٹھا تھا مگر اس دفعہ اس کا منہ میری طرف تھا۔ میں نے تیزی سے اپنا سر کھینچ لیا۔ اتنے میں دھم سے آواز ہوئی' یہ کھانے کے پہنچنے کی اطلاع تھی۔ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں اس لئے پھر جھانکا۔ کھانے کی ٹوکری کھوہ کے منہ کے پاس ہی پڑی تھی اور

گوریلا بہت تیزی سے میرے کھانے کی سب چیزیں کھائے جا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ منہ میری ہی طرف کئے بیٹھا تھا مگر کھانے میں منہمک ۔ قریب ہونے کی وجہ سے میں اسے اچھی طرح سے دیکھ سکا۔ میں نے کہا دیکھوں نر ہے کہ مادہ ۔ دیکھا تو مادہ ۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی نگاہ اٹھی۔ اس نے جیسے ہی مجھے دیکھا ایسے خوفناک طریقے سے دانت نکالے بھبکی دکھائی کہ میں فوراً پیچھے کی طرف گر سا پڑا۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ کہیں آ نہ جائے مگر وہ نہ آئی غالباً کھانے میں مصروف رہنے کی وجہ سے ۔ شام کے کھانے کے وقت بھی میں چپ پڑا رہا ۔ دھم سے آواز ہوئی ۔ خالی پیٹ نے بہت ستایا مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا ۔ رات بھر مارے بھوک کے نیند نہ آئی ۔ ڈر الگ۔ میں نے سوچا کہ تسبیح وتہلیل ہی میں اپنے کو لگائے رکھوں مگر اس دہشت کے مارے روح تہلیل ہوئی جاتی تھی کہ کہیں وہ سجدے کی حالت میں آگئی تو کیا کروں گا ۔ لہٰذا دل ہی دل میں نہایت خلوص کے ساتھ میں نے خدا سے گڑگڑا کے دعا مانگی کہ وہ اپنے حبیب پاک کے طفیل میں مجھے اس عذاب الیم سے نجات بخشے۔ اس وقت مجھے اپنی یہ دعا اپنی جملہ نمازوں سے زیادہ پر اثر و پر کیف معلوم ہوتی تھی ۔ خیر جوں توں صبح ہوئی ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے صرف آنکھ نکال کے جھانکا تو وہ دیوی نظر نہ آئی ۔ اب میں نے اپنے سر کا ذرا سا اور حصہ نکال کے دیکھا مگر وہ اب بھی دکھائی نہ دی ۔ جی چاہا کہ نکل کے دیکھوں مگر فوراً ہی خیال آیا کہ کہیں وہ اسی ٹیلے پر بیٹھی نہ ہو ۔ یہ خیال آنا تھا کہ میرا سر خود بخود بقول شخصے داخل دفتر ہو گیا ۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ کہیں خدا نے میری دعا قبول نہ کر لی ہو اور اس پلید کو جہنم واصل فرما دیا ہو ۔ اپنی دعا کے اثر پر تو مجھے یقین تھا مگر یہ بات اتنی دل خوش کن تھی کہ اس کا یقین نہ آتا تھا ۔ خیر میں نے یہ طے کیا کہ اصلیت کے جاننے کا موقع کھانے کے وقت آئے گا ۔ اگر وہ اس وقت بھی غائب رہی تو دعا کے قبول ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہیگی ۔ نہایت بے چینی کے ساتھ کان اس دھم کی آواز سننے پر لگے رہے ۔ آخر کار آواز آئی ۔ بے صبری اور خوف کی وجہ سے سر عجب کشمکش میں تھا ۔ ایک آگے کو ڈھکیلے تو دوسرا پیچھے کو گھسیٹے ۔ اگر چاہتے ہو کہ میری اس حالت کی تصویر تمھاری آنکھوں میں پھر جائے تو غالب مرحوم کے مشہور شعر میں ذرا تحریف کر کے یوں پڑھو کہ ؎

رو کے ہے مجھے خوف جو کھینچے ہی مجھے بھوک ؎ کھانا میرے آگے ہے گوریلا مرے پیچھے

پر کسی طرح میں نے جھانکا ہی۔ دیکھا تو ٹوکری کھانے کی بھری پڑی ہے اور وہ دیوتی مذارد۔ بے اختیار ں دیوار کو جسے میں نے اپنی حفاظت کے لئے تیار کیا تھا پھاند گیا اور اس ٹوکری پر ٹوٹ پڑا جب شکم سیر ہو کے کھا چکا تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس وقت مجھے اپنی رات کی صلواۃ بے وضو[۵۱] یاد آئی اور اپنی ہزاروں نماز باوضو" پر اس کی نفضیلت کا پورا پورا احساس ہوا۔

اس دن مغرب کے بعد پھر کوئی چیز اسی گوریلا قسم کی مگر مقابلتہً چھوٹے قد کی میری حدود اراضی یں نظر آئی۔ پھر وہی مصیبت۔ دل لرز گیا۔ میں بدستور اپنی ماند میں چپکے سے چلا گیا اور رات بھر اس عذاب سے بچنے کی بھی دعا مانگتا رہا۔ صبح کو میں نے جھانک کے دیکھا تو وہ جنتی موجود ہے۔ چمپینزی کی مادہ معلوم ہوئی۔ خیر کچھ ہمت کر کے میں نکلا۔ میرا نکلنا تھا کہ وہ میری طرف اس طرح جھپٹی کہ میرے پائے ثبات بے اختیار اکھڑ گئے اور پھر میں اپنی ماند میں لڑھکتا پڑھکتا جا کے گر پڑا۔ میں نے کہا آج کا بھی کھانا بنیا حرام ہوا۔ کیا مصیبت ہے۔ مجھ سے کون سی ایسی خطا سرزد ہوئی جس کی یہ سزا مل رہی ہے۔ خیر میں نے بدستور سارا دن اور ساری رات الحاح وزاری میں گذاری۔ ایسا معلوم ہوا کہ خدا نے میری دعا پھر سُن لی کیونکہ وہ دوسرے دن کھانے کے وقت نظر نہ آئی میں پھر شکر ایزدی بجالایا اور اطمینان سے سانس لینے لگا لیکن پھر بھی دل دھڑکتا ہی رہا کہ شام کا وقت خیریت سے گذر جائے تو جانیں۔ خیر شام ہوئی۔ ابھی اچھی طرح اندھیرا نہ ہوا تھا کہ پندرہ بیس بندروں کا غول جس میں گوریلا، لنگور، اوٹنگ چمپینزی اور طرح طرح کے بندر تھے عجب عجب خوفناک آوازوں کے ساتھ لمبے لمبے تیز چمکتے ہوئے دانت نکالتا ایک دوسرے کو کاٹتا کودتا پھاندتا داخل ہوا۔ اس منظر کو دیکھ کے جان حزیں کی جو حالت ہوئی ہوگی اس کا تم خوب اندازہ کر سکتے ہو۔ میں نے کیا کیا اور کس طرح کیا مجھے مطلق یاد نہیں۔ بس میں نے اپنے آپ کو ماند کے ایک کونے میں سر دھنسائے ہوئے پڑا پایا۔ اس عالت میں کب سے پڑا تھا اور کب تک

۵۱؎ جو نیت ہو تری خاص تو پھر زاہد برابر ہیں ؎ نماز باوضو تیری صلواۃ بے وضو میری (مصنف)

پڑا رہا بتا نہیں سکتا ۔ ایک ایسی مدت کے بعد جو برسوں معلوم ہوتی تھی ماند کے منہ پر کچھ کھٹ پٹ کی آواز معلوم ہوئی ۔ جان نکل گئی ، میں نے اور سختی سے اپنا سر کونے میں دھنسایا ۔ کچھ دیر بعد چند پیروں کے اندر داخل ہونے کی آواز معلوم ہوئی ، اب میں بالکل تن بہ تقدیر ہو گیا ۔ بس یہی آرزو رہ گئی کہ جو کچھ ہونا ہے جلد ہو جائے ۔ مجھے ہر وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب جسم میں خونخوار دانت گھسے اب میرے بدن کے تکّے اڑے ۔ اتنے میں میری پیٹھ میں کوئی چیز لگی ۔ دل بیٹھ گیا ۔ مگر پھر نہ دانت گھسے نہ کچھ ہوا ۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی کنکری جسم پر پڑ کے اچھل گئی ۔ کچھ دیر بعد یکایک ساری ماند روشن ہو گئی ۔ جان میں جان آئی ۔ پلٹ کے دیکھا تو چند خوبصورت انسان کھڑے ہیں ۔ ایک ہاتھ میں ٹارچ کے قسم کی کوئی چیز ہے اور وہ لوگ اپنے سامنے ایک جال پھیلائے ہوئے ہیں میں نے کہا اب پھر مجھے پکڑ کے کہیں لے جائیں گے گیا ۔ خیر جال میں بندھنا اس زندگی سے جو میری تھی ہزار درجہ بہتر تھا ۔ اس لئے میں زیادہ ڈرا نہیں اور ان سے اشارے سے پوچھا کہ وہ لوگ کیا چاہتے ہیں ۔ انھوں نے بتایا کہ بلا اب سر سے ٹل گئی اور میں باہر نکل سکتا ہوں ۔ یہ سننا تھا کہ میں ہمہ تن شکر بن گیا اور وہ لوگ فوراً چلے گئے ۔ میں باہر نکلا ۔ بہت سے پھل تھے ۔ خوب جی بھر کے کھایا ۔ آج تماشائیوں کا بڑا مجمع تھا مگر کھانے کے بعد ایسی سستی معلوم ہوئی کہ ویسی کبھی افطار کے بعد بھی نہ معلوم ہوئی تھی ۔ بس پڑ رہنے کو جی چاہا اور پڑتے ہی ایسا سویا کہ سارے دن کی خبر لے ڈالی ۔ شام کو آنکھ کھلی ۔ منہ ہاتھ دھو کے ناشتے کے طور پر کچھ کھایا ۔ ابھی میں کھانے سے فارغ نہ ہوا تھا کہ سینکڑوں تماشائی میرے جزیرے کے سامنے آ گئے ۔ میں نے کہا خدا نے میرا دل خوش کیا اب میں انکا بھی کروں ۔ ان کے قریب گیا اور اشارے کی زبان میں بات چیت شروع کر دی ۔ انھوں نے پہلے تو میرے اتنے دن غائب رہنے پر تعجب ظاہر کیا ۔ میں نے وجہ بتائی تو ان کا سارا چہرہ خاموش قہقہہ بن گیا ۔ انھوں نے ایک پری چہرہ کو جو پاس کھڑی تھی پیش کر کے بتایا کہ مجھے بھی ویسا ہی کرنا چاہیے تھا ۔ میں بغیر جواب دئے فوراً اپنی ماند میں جا کے پڑ رہا اور اقبال کے انداز میں خالق سے خوب خوب شکوے کئے ۔ شکوہ ہی کی حالت میں یہ شبہ پھر مجھے ستانے لگا کہ کہیں میرا یہ خیال کہ یہ مقام جنت ہے غلط تو نہیں ۔ تھوڑی دیر کے لئے اس شبہ نے یقین کی صورت اختیار کی اور میں بہت کھسیایا ۔ میں نے کہا مفت ہی

اللہ میاں کا اس قدر شکر ادا کیا۔ مگر پھر حضرت شیخ کا یہ فرمانا یاد آیا کہ" در ہر نفسے دو شکرے واجب۔"
ظاہر تھا کہ اس کے مقابلہ میں میری شکر گذاری کچھ نہ تھی۔ طبیعت کھسیائی ہوئی تھی اس لئے میں نے شیخ کی
شان میں بھی دو تین کلمات خیر کہہ دئے از قسم کبھی خود بھی اس پر عمل کیا تھا کہ دھڑ سے نصیحت ہی کر دی اور
اور اگر عمل کیا تھا تو دنیا میں کوئی اور کام کیسے کر سکے مگر پھر فوراً قہر خداوندی کا خیال آیا اس نے میرے غصہ کو
عجز و نیاز سے بدل دیا اور میں بڑی دیر تک نماز پڑھتا رہا۔

دوسرے دن ایک حور وش میری طرف آتی نظر آئی۔ پہلے تو میں اسے کچھ شبہ کی نظر سے
دیکھتا رہا مگر میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی خوفناک چیز نہ دیکھی جس کی وجہ سے اطمینان ہوا۔ وہ مجھ سے کچھ
فاصلہ پر رک گئی۔ اب میری کچھ ہمت کھلی اور میں نے اشارے سے اس کو اپنے پاس بلایا۔ ایسا معلوم
ہوا کہ میرے اس اشارے سے وہ بہت خوش ہوئی اور فوراً چلی آئی۔ جی چاہتا تھا کہ فوراً اس کے
ہاتھ میں ہاتھ ڈالدوں مگر ہاتھ اُٹھ اُٹھ کے رہ جاتا تھا۔ وہ مجھ سے ذرا دور ہٹ کے بے تکلف بیٹھ گئی اور
اشاروں میں بات چیت شروع کی۔ مجھے علاوہ اور باتوں کی خوشی کے یہ خوشی بھی تھی کہ اب سب باتیں
معلوم ہو جائینگی۔ پہلی بات جو میرا پوچھنے کو جی چاہا وہ قدرتی طور سے وہی تھی جو مجھے سب سے زیادہ ستا
رہی تھی یعنی یہ کہ وہ مقام واقعی جنت ہے یا کوئی اور جگہ ہے۔ پوچھنے کا خیال آنے کو تو آ گیا مگر جب میں نے
پوچھنا چاہا تو بات سمجھ میں نہ آئی کہ کس طرح پوچھوں۔ سوچ ساچ کے میں نے اس مشکل کا حل آخر نکال
ہی لیا۔ بڑا ہی خوش ہوا اور میں نے اپنی ذہانت کی داد اپنے آپ کو دل ہی دل میں خوب دی میں نے کہا
پہلے خدا سے شروع کروں گا وہ ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو اس کا جاننا لازمی ہے۔ فوراً سمجھا سکوں گا۔
پھر اچھے بُرے کام بتاؤں گا۔ پھر موت کا نقشہ کھینچ دوں گا۔ اس کے بعد یہ خیال آسانی سے ادا
ہو جائے گا کہ وہ چیز جو خدا اچھے کاموں کے صلے میں مرنے کے بعد دیتا ہے۔

میں نے آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی۔ اس نے دیکھ کے اس طرح سر ہلایا کہ معلوم ہوا اچھی طرح
سمجھتی ہے اس کے بعد میں نے زمین پر ایک تخت کا نقشہ کھینچا اور اشارے سے تخت کو آسمان پر بتایا
اور پھر خود پلتھی مار کے بیٹھ کے یہ ظاہر کیا کہ وہ اس پر بیٹھتا ہے۔ وہ بہت مسکرائی اور مجھ سے یہ اشارہ

کر کے کہ میں ابھی آتی ہوں چلی گئی ۔ جلد ہی کاغذ پنسل لے کے پہنچ گئی اور کاغذ پر نقشہ کھینچ کھینچ کے اور اشاروں کی مدد سے یہ بتایا کہ میرا خیال غلط ہے آسمان پر کوئی چوکور چیز نہیں صرف ستارے گردش کر رہے ہیں۔ بس ۔ میں نے بہت گردن اردن ہلا کے اور کاغذ پنسل کی مدد سے اپنے خیال کو ظاہر کرنے کی کوشش کی مگر اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا ۔ میں نے کہا اچھا یوں نہ سہی یوں سہی ۔ خیال آیا کہ خدا دل میں بھی تو رہتا ہے ۔ میں نے فوراً دل کی طرف اشارہ کیا ۔ اس نے پھر گردن ہلا کے بتایا کہ وہ اچھی طرح جانتی ہے اور فوراً دل کا کام بتایا ۔ میں نے زور سے گردن ہلا کے کہا نہیں وہ تو میں جانتا ہوں میرا مطلب اور ہے ۔ اس نے پوچھا کیا ۔ میں بڑی مشکل میں پڑا کہ اب کیسے بتاؤں ۔ ایک ترکیب نکالی ۔ دل کی تصویر کھینچ کے اندر تخت کی تصویر بنائی ۔ اب فکر ہوئی کہ اللہ میاں کو کس طرح بتائیں کہ اس تخت پر بیٹھے ہیں ۔ خود بیٹھ کے بتانے والی ترکیب بیکار ثابت ہو چکی تھی ۔ بڑی سخت دقت ۔ نور کے خیال کو کس طرح ظاہر کریں ۔ خیر سورج کی طرف اشارہ کیا ، اس نے کہا ہاں ہاں سمجھتے ہیں ۔ پھر کرنوں کو بتایا اور اس کے بعد ان کرنوں کو تخت پر بٹھایا ۔ خیال تو آیا کہ میں سورج کو خدا قرار دئے دے رہا ہوں مگر مجبوری تھی ۔ وہ ظالم اسے بھی نہ سمجھی ۔ اشارے کر کے اس نے بتایا کہ سورج کی کرنوں کا اثر ہر چیز میں ہے دل ہی کی کیا خصوصیت ہے ۔ ایسی طبیعت کھسیاری تھی کہ کچھ نہ پوچھو ۔ خدا خالق کائنات نا ممکن ہے کہ ہر مخلوق اسے نہ جانے سارے پنکھ پکھیرو اس کی پرستش کرتے ہیں ۔ بقول نظیر ؎

سانجھ سویرے چڑیاں مل مل چوں چوں کرتی ہیں ؎ چوں چوں چونچوں چونچوں کیا بیچوں بیچوں کرتی ہیں

یہ سب بھی کرتے ہوں گے مگر کیا قیامت ہے کہ ایسی بدیہی چیز کو سمجھا نہیں سکتا ۔ اکبر کا یہ مصرع جس نے اکثر بہت تسلی دی تھی کہ " جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا " اس گاڑھے وقت میں بھی یاد آیا مگر بیکار ۔ پہلے اپنے آپ کو سمجھانے کا سوال رہتا تھا اب دوسرے کو سمجھانا ہے ایسے کو جو ہماری زبان نہیں سمجھتا اور اسے سمجھانا ضروری ۔ میں نے کہا خیر مجبوری میں سب جائز ہے ۔ بت پرستی ہی کے خیال سے کچھ مدد لوں ۔ چنانچہ ایک بڑے پتھر پر میں نے پانی ڈالنا شروع کیا ۔ درختوں سے

کچھ پھول توڑ کے اس پر چڑھائے۔ اس کو دیکھا تو اس کا چہرہ حیرت بنا ہوا ہے۔ میں نے کہا ابھی نہیں سمجھی۔ تب میں نے دل میں خدا سے کہا کہ یا اللہ تو علیم و خبیر ہے تو اسے گناہ نہ سمجھنا۔ میں صرف تیرا خیال ظاہر کرنے کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔ یہ کہہ کے پہلے میں اس پتھر کے آگے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر اسے سجدہ کیا۔ سر اُٹھا کے جو دیکھا تو اس کے چہرہ پر نہ محض حیرت ہے بلکہ ہنسی بھی۔ میں نے کہا یہ بھی ترکیب نہ چلی۔ تھوڑی دیر سر کھجاتا رہا اس بات کا احساس کہ میں خدا کے خیال کو نہیں ظاہر کر سکتا اتنا تکلیف دہ تھا کہ میں ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ خیال آیا کہ کچھ تصرف سے کام لینا چاہئے مگر پھر وہی دقت۔ کس چیز کو بتاؤں کہ جو ہر چیز میں ہے۔ اتنے میں خیال آیا کہ سورج کی روشنی کے متعلق وہ خود کہہ چکی ہے کہ اس کا اثر ہر چیز میں ہے چنانچہ میں نے بتایا کہ وہ چیز جو سورج کی روشنی کی طرح ہر چیز میں ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا بڑی بات ہے۔ اپنی بالآخر کامیابی پر خوشی ہوئی۔ دل میں یہ بات کبھی کبھی کھٹکتی تھی کہ کہیں مسخری نے یہ نہ سمجھ لیا ہو کہ میری مراد سورج کی روشنی ہی سے ہے مگر میں اسے فوراً بھول جانے کی کوشش کرتا۔

اب میں نے اچھے بُرے کاموں کے اظہار کی کوشش شروع کی۔ سب سے اچھا کام ظاہر تھا کہ نماز ہے۔ میں جھٹ سے نیت باندھ کھڑا ہو گیا۔ رکوع سجود کے بعد سلام پھیر کے لگے ہاتھوں دعا بھی مانگ لی کہ یا اللہ میری مشکل آسان کر۔ اس سے فارغ ہو کے میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہی حیرت اور مسکراہٹ۔ اب مجھے اس بات کے سمجھانے کی دقت بھی محسوس ہوئی۔ میں نے کہا اور کون ایسا اچھا کام ہے جسے میں اشاروں سے ظاہر کروں۔ بہت کام خیال میں آئے مگر ایسے کہ جن کی اصلی صفت یعنی اچھائی کو میں ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ پھر میں نے کہا اچھے کام نہیں تو کم سے کم بُرے کام تو ضرور سمجھا سکوں گا پھر اس کے بعد اچھے کام بتانا آسان ہوگا یعنی جو اس کے برعکس ہیں۔ اب بُرے کاموں کی فہرست سامنے آئی۔ زنا کو اس فہرست میں اولیت حاصل تھی۔ مگر اس فعل قبیح کی تشریح کروں تو کیسے۔ ایک ترکیب سوچی یعنی پہلے شادی سمجھاؤں جو آسان بات ہے۔ پھر یہ بتاؤں کہ اُن مردوں اور عورتوں کے درمیان میاں بیوی کے تعلقات جو میاں بیوی نہیں ہیں۔ چنانچہ

میں نے اسے عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ میں نے اس سے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ وہ مسکراتی ہوئی آکے بیٹھ گئی۔ پھر میں نے آنکھ بند کر کے اسے بتایا کہ وہ بھی بند کرے۔ اس نے ہنس کے یہ بھی کیا۔ میں نے کہا اب اپنے اور اس کے سر پہ چادر کس طرح ڈالوں۔ وہاں چادر ہی نہیں۔ میں تھوڑی دیر اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اس نے آنکھ کھول دی اور مسکرا کے گویا یہ پوچھنے لگی "آگئے"۔ میں نے کہا یوں کام نہ چلے گا۔ جا کے بہت سے پھول توڑ لایا مگر سہرا کیسے گوندھوں وہاں تاگا کہاں۔ اس سے اشارہ کر کے بتایا۔ وہ فوراً سر ہلا کے مسکراتی ہوئی چلی گئی اور جلد بہت سا تاگا لے آئی۔ میں نے جھٹ جھٹ دو سہرے تیار کئے۔ ایک اس کے باندھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اس نے میرے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر میں نے خود اپنے سہرا باندھا اور اس سے بتایا کہ وہ بھی اسی طرح باندھے۔ اس نے خوش ہو کے جھٹ سے باندھ لیا ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ کچھ نہ پوچھو روح تک لذت یاب ہوگئی۔ مگر جب میں نے نگاہ استفسار اس کے چہرے پر ڈالی تو صاف معلوم ہوا کہ کچھ نہیں سمجھی۔ میں نے ایک اور ترکیب سوچی۔ کاغذ پر ایک مرد کی تصویر بنائی ایک عورت کی اور دونوں کی گردن میں طوق ڈال کے ایک زنجیر سے ملا دیا۔ وہ یہ دیکھ کے کچھ ہنسی کچھ چیں بجبیں ہوئی اور فوراً پنسل سے زنجیر کاٹ دی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ شادی کے خیال کو اب میں کس طرح ظاہر کروں۔ پھر وہی بے بسی کا احساس۔ اتنے میں خیال آیا کہ اگر اس بات کو ظاہر نہیں کر سکتا تو کم سے کم چوری کے خیال کو تو ضرور کر سکتا ہوں جو دوسرا بہت بڑا کام ہے۔ اس کے لئے ملکیت کے خیال کو ظاہر کرنا ضروری تھا جو آسان بات معلوم ہوئی۔ میں نے پھل وغیرہ کو دکھا کے جواب بھی کچھ باقی تھے کہا کہ اگر وہ انھیں لے لے تو کیا ہوگا۔ اس نے اشارے سے کہا کہ اگر اسے ضرورت ہے اور مجھے نہیں تو کیا حرج ہے۔ میں نے بتایا کہ اچھا اگر میں اس کی کتاب واپس نہ کروں تو۔ اس نے پھر وہی جواب دیا۔ میں نے کہا عجب الٹی کھوپڑی کے لوگ ہیں۔

میں بڑے مخمصے میں پڑا تھا اور کوئی بات سمجھ میں نہ آرہی تھی۔ بس بار بار سر کھجلا رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کے مسکرائی اور کتاب کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ پہلے میں اس کی زبان سیکھ لوں پھر ہم لوگ آسانی

سے ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں گے۔ اس وقت جو کچھ میرا جی چاہے پوچھ لوں گا۔ میں خوشی سے راضی ہوگیا بات معقول تھی۔ مگر اس نے کہا پہلے ایک اور ضروری کام کرنا ہے۔ میں اس کام کی نوعیت نہ سمجھا اور فوراً گردن اس جوشیلے انداز سے ہلائی جس سے ظاہر ہوتا تھا "ہاں ہاں بسروچشم"۔ وہ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد چند لوگوں کو اپنے ساتھ لے آئی۔ انھوں نے مجھ سے منہ کھولنے کو کہا۔ کیا کرتا مجبوراً کھولا۔ ایک مرد دونے فوراً کمانی کی قسم کی کوئی چیز لگا دی جس سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے بعد انگلی ڈال کے اس نے اچھی طرح میرے منہ کے ہر حصہ کو ٹٹولا۔ آخرکار زبان کو پکڑا اور اس کی خوب دیکھ بھال کی حلق کا بھی یہی حال ہوا۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ میری زبان ضرورت سے زیادہ بڑی ہے اور حلق میں بھی کچھ خرابی ہے جو اپریشن اور دوا کے استعمال سے دور ہوجائے گی۔ میں بہت گھبرایا۔ ڈرا کہ منہ میں کمانی لگی ہوئی ہے کہیں ظالم اپریشن شروع نہ کردیں۔ اس وقت کی بلا سر سے ٹالنے کے لئے میں نے بڑی لجاجت اور خوشامد کے انداز میں ظاہر کیا کہ میں بعد میں اپریشن کرالوں گا فی الحال منہ سے کمانی نکال دیجائے۔ انھوں نے فوراً نکال دی اور بعد میں آنے کا اشارہ کرکے چلے گئے۔ جان بچی لاکھوں پائے کا مضمون تھا مگر دل بڑی دیر تک دھڑکتا رہا۔ میں تھوڑی دیر تک چپ بیٹھا رہا اور پھر چپ چاپ اٹھ کے اپنی ماند میں چلا گیا۔

دوسرے دن اگرچہ دل پر خوف کا اثر غالب تھا مگر پھر بھی اس پری چہرہ کو دیکھنے اور اس کی خاموش سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کو بے اختیار جی چاہ رہا تھا۔ زبان دل بس یہ کہہ رہی تھی کہ ؎

ساتھ میں اس کے ڈاکٹر ہاتھ میں جن کے نیشتر ؎ آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

تھوڑی دیر بعد وہ آئی اور اکیلی آئی۔ جی خوش ہوگیا۔ اس نے پوچھا کب اپریشن کراؤ گے۔ کیا جواب دیتا۔ ٹالنے کی کوشش کی مگر جیسے وہ ہاتھ دھو کے پیچھے ہی پڑ گئی۔ میں نے کہا اشاروں سے سب کچھ نہیں کہہ سکتا، تھوڑی بہت اپنی زبان سکھادو تب بتاؤں۔ خیر وہ راضی ہوگئی۔ چونکہ زبان بہت سیدھے سادے اصول پر تھی اس لئے میں تیزی سے سیکھنے لگا۔ ایک جی تو اپنی ذہانت دکھانے کو چاہتا تھا دوسرا اس سے روکتا تھا یہ خیال دلا کے کہ جتنی جلدی زبان سیکھو گے اتنے ہی جلد اپنی زبان

کٹوانے کا ٹیڑھا سوال پیدا ہو گا ۔ بڑی مشکل تھی ۔ اس کے سامنے گونگا بننے پر بھی دل آمادہ نہ ہوتا تھا اور نہ آبان ہی کٹوانی منظور تھی ۔ خیر الامور اوسطہا کا کلیہ یہاں بھی کام آیا اور میں نے کبھی گونگا اور کبھی زبان بن بنکے مہینے ڈیڑھ مہینے پار کر دئے ۔ اس عرصہ میں اس کا حسن اور دلربایانہ انداز (جس کی دلکشی میں اشاروں کی گفتگو نے چار چاند لگا دئے تھے) اکثر مجھے بیخود کر دیتا اور ہوس پیش دستی غالب آتی مگر اس کا ایک اشارہ میرے ہاتھ پاؤں جکڑ دینے کے لئے کافی ہوتا ۔ وہ عموماً ایسے موقعوں پر میری زبان کی طرف اشارہ کرتی کہ اسے جلد کٹوا دو ۔ کچھ دنوں کے بعد تو ظالم برابر زبان کٹوانے کا سوال پیش کرنے لگی ۔ آخر کار میں نے ایک دن اس کو اسی کی زبان میں سمجھایا کہ زبان ایک نعمت ہے ۔ بجائے اس کے کہ مجھ سے کٹوانے کو کہا جائے ان لوگوں کو اپنی زبان ہلانے کی کوشش شروع کر دینی چاہئے ۔ کچھ دنوں کے بعد وہ بھی بولنے لگیں گے اور اس کی اہمیت سمجھیں گے ۔ اس نے جواب دیا کہ منہ سے آوازیں نکالنا جانوروں کا کام ہے انسان کا نہیں ۔ مجھ میں جو کچھ عیب ہے وہ یہی ۔ اگر میں ان لوگوں کی دنیا میں انسانوں کے حقوق حاصل کرنا چاہتا ہوں تو مجھے گونگا ہو کے رہنا پڑے گا ورنہ جیسے اب تک جانوروں کی طرح رہتا چلا آیا ہوں رہوں گا ۔ میں نے پھر اسے سمجھانے کی جان توڑ کر کوشش کی مگر بے سود ۔ مجبوراً چپ ہو رہا ۔ سوتے جاگتے ہر وقت سوچا کرتا ۔ ان لوگوں کی جہالت اور نادانی پر رہ رہ کے غصہ آتا کہ اپنے عیب کو خوبی سمجھتے ہیں اور مجھ میں جو لے دے کے ایک خوبی ہے اس کو عیب ۔ خیر اگر اس کو خوبی نہیں سمجھتے نہ سمجھیں مگر ظالم رواداری سے تو کام لیں ۔ یہاں تو یہ ہے کہ اگر چاہتے ہو ہم تمھیں انسان سمجھیں تو بالکل ہماری طرح ہو جاؤ ۔ ہمارے عیب کو خوبی سمجھو اپنی خوبی کو عیب ورنہ تم جانور ہم انسان اور چونکہ کثرت انہی لوگوں کی ہے اس لئے جس کی لاٹھی اس کی بھینس ۔ عمر بھر میں جتنا فلسفہ پڑھا تھا اور بہت پڑھا تھا سب یاد آگیا ۔ ان سے بہت کچھ تسلی دینے کی کوشش کی مگر اس تلخ حقیقت کے آگے کہ زبان کٹوانی پڑے گی سب تسلیوں کے چھینٹے زخم پر نمک کا کام کرتے تھے ۔ آخر کار جو کام فلسفہ سے نہ ہوا وہ محبت نے کیا ۔ رہ رہ کے اس شوخ کا اشارہ دل میں چٹکیاں لیتا کہ پہلے زبان کٹواؤ تب ۔ دنیا کے تمام مشہور

عاشقوں کے واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ ان کی قربانیوں کے آگے میرا ایک ذرا سا پارۂ گوشت کو کٹوا کے پھینک دینا کوئی بڑی بات نہ معلوم ہوئی۔ چنانچہ دوسرے دن جب وہ حسب معمول آئی تو اس پر عشق کا احسان جتا کے میں نے زبان کٹوانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ یہ دیکھ کے وہ جس طرح خوش ہوئی میں کبھی نہ بھولوں گا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ اس نے میرے دونوں رخساروں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور چشم زدن میں غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کچھ لوگوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس کے بعد کیا ہوا اور کیسے ہوا میں نہیں بیان کر سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اینجانب اس وقت زبان بریدہ ہیں۔

اس حادثہ کے پیش آنے کے بعد میں بہت جلد یہاں کی سوسائٹی کا رکن ہوگیا۔ اب میں یہاں کی زبان اور طرز معاشرت سے پوری طرح واقف ہوں۔ میں تفصیل سے اس کا نقشہ کھینچتا اور سچ یہ ہے کہ میں نے اسی لئے لکھنا شروع ہی کیا تھا مگر یہ خط شیطان کی آنت ہو چکا ہے۔ پڑھتے پڑھتے گھبرا گئے ہوگے۔ اس وقت زیادہ لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ایک بات اور بھی ہے، مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں اس خط کو شائع نہ کر بیٹھو۔ میں تمھیں ایسا کرنے سے منع نہیں کرتا کیونکہ جانتا ہوں بیکار ہے مگر ذرا پہلے سوچ سمجھ لینا۔ اول تو شاید ہی ہماری موجودہ صحافت میں کوئی ایسا "ظلوم وجھول" رسالہ ہو جو اس بار امانت کو قبول کرنے کی جسارت کرے تو تم کہو گے کس کا سر پھرا ہے کہ ایک تو بار بھی اٹھائے دوسرے گالی بھی کھائے، مگر میں کیا کروں

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ؎ آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم)

جامعہ کو آزما کے دیکھو۔ اسی سے کچھ 'قالو بلا' کہنے کی امید کی جا سکتی ہے (اگر غور سے دیکھو تو میری اس سچی کہانی میں کوئی ایسی بات نہیں جو اسے اچھوت بنا دے۔ جیسا تم نے دیکھا ہوگا اس میں معنی کی کم سے کم تین تہیں ہیں۔ پہلی تہ تو ضرور یاران جنگجو کو برافروختہ کر دینے کے لئے کافی کیا کافی سے زیادہ ہے۔ دوسری جو ذرا سے غور کے بعد ظاہر ہو جاتی ہے اس پر کوئی سمجھ دار آدمی ناخوش نہیں ہو سکتا بلکہ شاید خوش ہی ہو۔ رہی تیسری وہاں تک صرف انھیں لوگوں کی نگاہیں پہنچیں گی جو محرم راز ہیں

اور ہم صفیر انھیں سے دادِ سخن پانے کی اُمید ہے۔ بر ہی کیسی)۔ خیر تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی رسالہ واقعی سر پھرا ثابت ہوا تو کیا تمھارے خیال میں جتنا میں لکھ چکا ہوں وہ کافی بار نہیں۔ میری رائے میں تو اسی وقت کافی سے زیادہ ہے۔ اتنا پہلے اچھی طرح سنبھل جائے پھر اور دیکھا جائیگا۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست ؎ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

رہی تمھاری دلچسپی۔ اس کے لئے یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ دنیا تمھاری اس خیالی دنیا سے بہت ملتی جلتی ہے جس کا ذکر تم کبھی کبھی مجھے چھیڑنے یا اپنے دل کا بخار نکالنے کے لئے یا جس لئے بھی ہو کیا کرتے تھے (یہ زبردستی کا اتہام ہے۔ میری خیالی دنیا تو شاعر کی دنیا ہے جہاں "ہمیں جائے من و جائے تو باشد" کا مضمون مضمون ہو۔ شاید مولانا کا مطلب اُس آنے والی دنیا سے ہے جس کا ذکر میں ان سے کبھی کبھی کیا کرتا تھا)۔ تم مجھے لکھنا کہ یہ خط شائع ہوا کہ نہیں۔ اگر ہوا تو اس کا کیا اثر ہوا۔ اسی کے مطابق میں پھر تمھیں لکھوں گا۔ ہاں اگر تم یہ یقین دلاؤ کہ تم میرے خطوں کو شائع نہ کرو گے تو البتہ تمھارے معلومات اور دلچسپی کے لئے یہاں کی ایک ایک بات کی تفصیل فوراً لکھ بھیجوں۔ مگر انھیں پڑھ کے تم اپنے بکری کے بچے کی طرح یہاں آنے کے لئے بیقرار ہو جاؤ گے۔ اس بیقراری کا علاج میرے پاس نہیں۔ اس لئے ذرا سوچ سمجھ کے لکھنا۔

جو کچھ مجھے کہنا تھا میں نے رو میں جس طرح سا کہہ دیا۔ اب اگر تم اس کے متعلق بھی اکبر کے الفاظ یہ کہو کہ ؎

ڈالدے جان معانی میں وہ اُردو یہ ہے ؎ کروٹیں لینے لگے طبع وہ پہلو یہ ہے

تو سوائے اس کے کہ تمھاری سخن فہمی اور ذوق سلیم کی داد دوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ اچھا مرجان اب خدا حافظ

تمھارا .....

ہمزاد

ہاں ایک بات اور کہہ سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب تم خود اس طرح کہو تو پھر میں بھی کہوں نہ تمھاری

ہاں میں ہاں ملا کے ایک تو تمھیں خوش کروں دوسرے خود بھی خوش ہو لوں ۔ یہ تمھارا ہی مقولہ ہے نا ؎

دل میں محمود ہی زباں سے ایاز ؎ اس قدر انکسار کون کرے

جب یہ ہے تو ؎

اولئے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا ؎ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

فضل احمد کریم فضلی

ترکی میں تعلیم

ترکی میں مسئلہ تعلیم کی تاریخ تین عہدوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

(۱) تعلیم دینی کا دور۔ آغاز سے تنظیمات تک یعنی ۱۸۳۹ء تک

(۲) درمیانی دور۔ تنظیمات سے جمہوریت کے اعلان تک ۱۸۳۹ء سے ۱۹۲۳ء

(۳) اصلاحات کا دور۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۷ء

پہلے دور کی مدت پانچ صدی۔ دوسرے کی تقریباً ایک صدی یا کچھ کم اور تیسرے کی جس میں حیرت انگیز تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے پندرہ سال۔

جب پہلے پہل ترکوں نے خانہ بدوشی کو ترک کیا اور مفتوحہ علاقوں میں آ بسے تو انہیں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے فوجی نظام اور دیوانی محکمہ جات کے افسروں کے لئے تعلیم و تربیت کی سہولتیں مہیا کریں۔ اس غرض کے لئے ترکوں نے نیسیا اور بروصہ میں قاضی اور مفتی تیار کرنے کے لئے مدارس جاری کئے۔ سلیمان اعظم کے عہد حکومت کے اختتام تک یہ مدرسے تعداد میں برابر بڑھتے اور ترقی کرتے گئے۔ اور ان ہی اداروں سے سلطنت عثمانیہ کے بڑے بڑے نامور حکام تربیت پاکر نکلے۔

تنظیمات اس تحریک کا نام ہے جس کے زیر اثر ترکی سلطنت نے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی کوشش کی۔ اس تحریک نے جدید اسکول کی بنیاد ڈالی مگر پرانے مدرسے جوں کے توں رہے۔ اس عہد میں پرانی دینی قسم کی تعلیم اور زمانۂ جدید کی تعلیم دونوں برابر جاری ہیں۔ پرانے مدارس کی تنظیم اور انصرام تو شیخ الاسلام کے ہاتھ میں رہا اور نئے اسکولوں اور اداروں کے لئے ایک نیا محکمہ معارف قائم کیا گیا وزارت معارف کے اسکولوں میں نصاب تعلیم محض عربی زبان پر ہی موقوف نہ تھا۔ بلکہ حکومت کی طرف سے انجینیرنگ اسکول اور گلاطہ سرائے کا لیسے کھولے گئے۔ لیسے میں ذریعہ تعلیم فرانسیسی اور اساتذہ بھی فرانسیسی تھے اس ادارے سے پرانی اور نئی طرز حکومت کے سیاسیئن فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔

صوبجات کے والی اور حکام کی تربیت سول سروس اسکول ملکیہ (۱۸۷۶) میں کی جاتی تھی۔ قانون کے لئے ایک علیحدہ ادارہ حقوق مکتبی (۱۸۷۹) تھا مگر تعلیمی ترقی کے لحاظ سے سب سے شاندار اور اہم دور اصلاحات کا ہے۔ جس میں نظام تعلیم کے بنیادی اصول چار قرار پائے گئے۔ (۱) تعلیم کو مذہبی اثرات سے آزاد کرنا (۲) اتحاد ملی (۳) لڑکوں اور زنانہ تعلیم کے طریقوں کی مغائرت دور کرنا (۴) طلبا کی ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کا انتظام۔

پچھلے دس سال میں ترکوں کی تمدنی اور سیاسی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور مغربی تمدن کے اختیار کرنے کی تحریک کے جدید تعلیمی تحریک سے گہرے تعلقات ہیں۔ اس تحریک کا سب سے اہم اقدام لاطینی رسم الخط کا اختیار کرنا تھا۔ دوسرے ترکی تاریخ کی تدریس کی اصلاح اور ترکی زبان کی اصلاح۔

ترکی سیکڑوں سال سے عربی اور فارسی الفاظ اور تراکیب ترکی لغت میں شامل ہوتی رہی ہیں درحقیقت زیادہ مشکل تو تراکیب اضافی۔ وصفی اور اسما الجمع وغیرہ کی تھی ان اجنبی تراکیب کی وجہ سے زبان بہت مشکل اور بے ڈھنگی ہوگئی۔ اور طرز بیان غیر واضح اور پیچ دار ہو کر رہ گیا۔ درحقیقت یہ زبان محض ادبی اور کتابی بن گئی جس کا حلقۂ اثر تعلیم یافتہ طبقہ تھا۔ اس کی وجہ سے تحریری زبان اور عام فہم زبان میں ایک وسیع خلیج پیدا ہوگئی۔

شمسی۔ نمیق کمال اور اکرم اور دوسرے جدید مصنفین کے اثر سے ترکی زبان بہت سے اجنبی اثرات سے پاک ہوگئی۔ لیکن جدت پسند طبیعتوں کے لئے اس تحریک کی رفتار بہت سست تھی اس لئے بعض مصلحین نے یہ کوشش کی کہ جن عربی اور فارسی الفاظ کے بجائے ترکی الفاظ مل سکتے ہیں وہ ترکی لغت سے خارج کر دئے جائیں۔ پس ترکی ماہرین السنہ نے صوبوں، دیہاتوں اور ان غیر ممالک میں جہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے نئے ترکی الفاظ کی جستجو میں علمی تحقیقات شروع کر دی تاکہ یہ الفاظ اجنبی خارج شدہ الفاظ کی جگہ لے سکیں۔ آغاز جمہوریت اور آزادی کے جوش و خروش میں تو یہ تحریک خوب زور پکڑ گئی مگر اب کچھ ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ تاہم لغت کا اصلاحی کام چل رہا ہے۔ اور ابھی تک اس کے نتائج پر کوئی حتمی

فیصلہ نہیں دیا جاسکتا۔

ابتدائی مدارس سلاطین ترکیہ کے زمانہ میں اب سے بیس سال پہلے تک ابتدائی تعلیم کا انتظام وزارت معارف کے ہاتھ میں تھا۔ بعض مدارس غیر ملکیوں کے تھے۔ دوسرے غیر مسلم اقوام کے مذہبی ابتدائی مدارس شیخ الاسلام اور محکمۂ اوقاف کے ماتحت تھے۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کے قانون کے تحت یہ مختلف النوع ادارے یک قلم موقوف کر دئے گئے اور ابتدائی تعلیم کا مکمل نظام وزارت معارف کو تفویض کیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کی مدت گاؤں میں تین سال اور قصبوں میں پانچ سال ہے۔ پہلی تین جماعتوں میں ایک جامع مضمون پڑھایا جاتا ہے جس کا نام علم حیات (حیات بلگیسی) ہے۔ اس میں معلومات انسانی کے ابتدائی امور شامل ہیں۔ بچوں کو ان کے ماحول کی اشیاء کا مطالعہ کرایا جاتا ہے اور ایسے مشاہدات پر غور و فکر کرنا سکھایا جاتا ہے جو ان کی قوت متخیلہ کو بیدار کر دیں۔ نیز انہیں تقریر، تحریر، نقاشی اور ورزش کی مشق کرائی جاتی ہے تاکہ ان میں قوت بیان اور طاقت اظہار پیدا ہو۔ ان اداروں کی تعلیم مشہور و معروف حقیقی واقعات پر مبنی ہوتی ہے۔ اور بالعموم سبقوں کے عنوان روزانہ اخباروں کی سرخیوں سے لئے جاتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں ترکوں کی توجہ مسئلہ سنجک پر مرکوز تھی۔ اس موقعہ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بچوں کو بتایا گیا کہ ملک شام کس زمانے میں ترکوں کے قبضہ میں تھا۔ یا اس سے متعلق دوسرے مسائل مثلاً بحیرۂ روم کی سیاسی اہمیت کیا ہے؟ زبان اسانی ملی کو زندہ رکھنے کا ذریعہ کیوں ہے؟ انتداب Mandate۔ مجلس اقوام اور سیاسی عہد نامے کیا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ہر سال ۱۴ جنوری سے ۱۸ جنوری تک مسو دیشی یا کفایتی، ہفتہ منایا جاتا ہے۔ اگر موسم خوشگوار ہوا تو اس ہفتے کے دوران میں ملکی صنعت و حرفت کی ترقی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بچے کارخانوں، بنکوں اور ریلوے اسٹیشنوں کی سیر کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں ان کو علم اقتصادیات کی بھی کچھ واقفیت ہو جاتی ہے مثلاً ملکی پیداوار، درآمد، برآمد، بنک کا سود، قرضۂ ملی و غیرہ بحث سے ضروری مسائل سے روشناسی ہو جاتی ہے۔

گرامر اسکول گرامر اسکول ابتدائی مدارس اور لیسے کی درمیانی کڑی ہے۔ گرامر اسکول کی مدت تعلیم چھ سال ہے جس کو دو برابر حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے آخری تین سال درجۂ لیسے کے لئے مخصوص ہیں۔

لیسے لیسے نے دور اصلاحات میں ولایات کے عدادیہ مدارس کی جگہ لے لی ہے۔ اس کا

نصاب وسیع اور جدید کر دیا ہے۔ معیار تعلیم بھی پہلے سے بلند ہے۔ یونیورسٹی میں بہتر طلبا بھیجنے کی غرض سے میٹرک امتحان کو سکول لیونگ سرٹیفکٹ سے علیحدہ قرار دیا گیا ہے ۱۹۳۶ء میں طلبا کی تعداد ۱۱۷۴۶ تھی جو ۱۹۲۳ء کی تعداد سے دس گنی ہے۔ بعض ولایات (صوبوں) میں بہت سے نئے مدارس قائم کئے گئے ہیں اور ان میں دار الاقامہ۔ ورزش خانے۔ معمل اور کتب خانے تعمیر کئے گئے ہیں۔

اگرچہ اب نصاب میں سائنس کے مختلف مضامین کا اضافہ ہو گیا ہے تاہم عربی اور فارسی کی لازمی تعلیم خارج کرنے کی وجہ سے کام کافی ہلکا ہو گیا ہے۔ عربی اور فارسی نکال دینے سے کچھ ایسا تعلیمی نقصان واقع نہیں ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان زبانوں کے پڑھانے کے طریق پرانے اور فرسودہ تھے۔ اور زیادہ زور طالب علم کی قوت حافظہ پر دیا جاتا تھا۔ اس کی قوت ادراک اور ذہنی ارتقا کے لئے اس طریقۂ تعلیم میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ان غلط طریقوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان اصحاب کے ہاتھ میں جو پرانے عدابیہ مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں فارسی یا عربی زبان کی کوئی کتاب دے دی جائے تو اس کا ایک نقطہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔

یونیورسٹیاں آج کل ترکی میں صرف استنبول کی یونیورسٹی ہے جس میں پانچ شعبے ہیں۔ قانون۔ ادب۔ اقتصادیات۔ سائنس۔ طب۔

یونیورسٹی کے اساتذہ میں ایسے اصحاب ہیں جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے یورپ بھر میں مشہور ہیں ان میں سے بیشتر اہل جرمن ہیں جن کو نازی حکومت نے ملک بدر کر دیا ہے۔ لکچر بالعموم جرمن یا فرانسیسی زبان میں ہوتے ہیں اور نوجوان ترک پروفیسر جو غیر ملکی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہیں ان کا ترجمہ ترکی زبان میں کر دیتے ہیں۔ ان اساتذہ کے ساتھ یہ معاہدہ ہے کہ وہ چار سال کے بعد ترکی زبان میں لکچر دیا کریں گے۔ ان میں سے بعض نے تو اس مدت معینہ سے پہلے ہی اس شرط کو پورا کر دیا ہے۔ چند سالوں میں انگورا میں بھی اک یونیورسٹی قائم کی جائے گی۔ فی الحال وہاں قانون۔ السنۂ جدیدہ۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ اور طب حیوانات کے شعبے موجود ہیں۔ علوم سیاسی کا مدرسہ جو دیوانی محکموں کے لئے امیدوار تیار کرتا ہے حال میں ہی انگورا منتقل کر دیا گیا ہے۔ اور عنقریب ہی شعبہ طب کا افتتاح بھی ہو جائے گا۔ انگورا اور استنبول میں مدارس میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے ایک چوتھائی ہے صرف استنبول کے شعبہ ادب میں لڑکیاں تعداد میں کچھ زیادہ ہیں یعنی لڑکے

۲۰۷ اور لڑکیاں ۲۸۷ ۔ لڑکیوں کا مقصد یونیورسٹی کی تعلیم سے محض ذہنی تربیت ہی نہیں بلکہ وہ اس تعلیم کے ذریعہ اقتصادی آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ترکی میں لڑکیوں کے لئے کوئی ملازمت یا پیشہ ممنوع نہیں۔ منشی گری میں تو عورتوں کی بھرمار ہے ہی مگر آج کل تو عورتیں منصف۔ وکیل۔ طبیب۔ سلوتری اور سرکاری ملازم بھی ہونے لگی ہیں۔

آج ہم انگورا اور ترکی کے ہر بڑے شہر میں علی الصبح جب سیکڑوں عورتوں کو بنکوں اور دفاتر وزارت میں روزانہ کام پر جاتے دیکھتے ہیں تو خواہ مخواہ دل میں خیال آتا ہے کہ بیس برس پیشتر انہیں کی بہنیں حرم سرائے کی چار دیواری میں مقید رہا کرتی تھیں۔ ترکیہ جدید کی ترقی پر حیرت ہی نہیں ہوتی معجزہ کا گمان ہوتا ہے

مدارس کی تعداد زیادہ ہو جانے سے طلبا کے رہنے سہنے کا مسئلہ بھی زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے۔ انگورا کو ہی لیجئے اس کی آبادی چالیس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ تیس ہزار ہو گئی ہے۔ اور انگورا یونیورسٹی کی تجویز کے ساتھ ساتھ رہنے سہنے کے انتظامات کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔

وزارت تعلیم جب کبھی کوئی نیا مدرسہ کھولتی ہے تو ساتھ ہی دارالاقامے کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ترکیہ جدیدہ میں یونیورسٹیوں نے ایک بہت ہی اہم کام اپنے ذمہ لے لیا ہے اور وہ علمی تحقیقات ہے۔ اب ترک اپنی تاریخ کو غیر ملکی مصنفین کی عینک لگا کر نہ پڑھیں گے۔ ترکی نوجوان کو تاریخی اور آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جدید طریقوں پر تربیت دی جا رہی ہے تاکہ محکمۂ آثار قدیمہ اجنبی محققین کا مرہونِ منت نہ رہے۔

فنی تعلیم ترکی حکومت جو تجاویز صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے عمل میں لا رہی ہے ان سے ہر صناع اور پیشہ ور کے سامنے ترقی کی نئی راہیں کھل گئی ہیں۔ اسلئے وہ فنی اور صنعتی ادارے جو علمی اور جدید تعلیم دیتے ہیں مقبول عام ہو گئے ہیں۔ تین ماہ ہوئے جب انگورا میں گھریلو صنعت و دستکاری کی نمائش کی گئی تھی جس کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ ترکی صناع کی مہارت اور نفاست کس طرح دوبارہ نئی زندگی حاصل کر رہی ہے۔ فوجی اور جہاز رانی کے مدارس کے علاوہ اور بہت سے فنی ادارے کھولے گئے ہیں۔ جو اپنی تبیل کے یورپی مدارس سے لگا کھا سکتے ہیں مثلاً نارمل ہائی اسکول۔ انجینروں کا ہائی اسکول۔ فنون لطیفہ کا مدرسہ۔ زراعتی مدرسہ۔ اور ٹریننگ کالج۔ فنی تعلیم و تربیت کے کام میں عورتوں نے بڑا حصہ لیا ہے۔ انگورا میں عصمت انونو کا مدرسہ

ترکیہ جدید کی آزاد عورت کے لئے کھولا گیا ہے۔

اجنبی اثرات ترکی کے نظام تعلیم کی تشکیل میں ترکی سیاسیئن نے کسی یورپی ملک کی نقالی نہیں کی۔ بادی النظر میں تو یہ نظام تعلیم گنگا جمنی سا معلوم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں امریکی۔ فرانسیسی اور جرمنی اثرات نظر آتے ہیں۔ ابتدائی مدارس کے نصاب میں کنڈر گارٹن کے خدوخال نمایاں ہیں۔ فنی تربیت میں امریکی فنی اداروں کے اصول صاف دکھائی دیتے ہیں اور لیسے مدارس کی ساخت فرانسیسی لیسے سے ملتی جلتی ہے درحقیقت ترکی سیاسیئن کو جہاں کہیں بھی کوئی اچھی بات نظر آئی تو انھوں نے دوسرے کی پیروی کرنے میں تامل نہ کیا۔ تاہم غیر ملکی اصولوں کو اختیار کرتے ہوئے انھوں نے یہ حقیقت پیش نظر رکھی کہ ترک بچے کا ذہنی ارتقاء اس کی جبلت اور پیدائشی خصلت مختلف ہیں اور اسی لئے انھوں نے غیر ملکی نصاب اور طریق میں مناسب ترمیم اور تبدیلی کر دی۔ آج کل اگر کوئی حکومت کسی شعبے کی اصلاح کا کام اپنے ہاتھ میں لیتی ہے تو وہ سب سے پہلے ان تحقیقاتی اور اصلاحی اقدامات کی مکمل معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اس سلسلے میں غیر ممالک میں عمل میں لائے گئے۔ ترکیہ جدید نے بھی۔ یہی کیا۔ نیز حکومت کے دفاتر ان نوجوان ترکوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے غیر ممالک میں تعلیم پائی۔ انہیں میں سے بعض ترقی کر کے محکموں کے افسرِ اعلےٰ بھی ہو گئے ہیں۔ قصرِ تعلیم کو بلند کرنے میں ان سب لوگوں کا حصہ ہے اور اسی لئے ترکی نظام تعلیم میں گنگا جمنی رنگ نمایاں ہے۔

تعلیمی مسائل اور مشکلات اگرچہ لیسے مدارس کا معیار تعلیم پرانے اعدادیہ مدارس سے بہت اونچا ہے تاہم ترکیہ جدید اس سے مطمئن نہیں بلکہ وہ ان کو بہترین یورپی اداروں کا مدمقابل بنانا چاہتی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے واسطے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی جا رہی ہے۔ لیسے کے فارغ التحصیل طلباً کے معیار لیاقت کو بلند کرنے سے ہی یونیورسٹی تعلیم کا معیار بلند ہو سکتا ہے اور وزارت کے محکموں میں آجکل یونیورسٹی کے اسناد یافتگاں ہی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ السنۂ جدیدہ کی تعلیم کا مسئلہ ملک کے لئے بے حد اہم اور ضروری ہے۔ ادبِ ملی کی تکمیل کا مسئلہ بھی فوری توجہ کا محتاج ہے۔ بہت سے مغربی شاہکار اب تک ترکی زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکے۔ اس بارِ عظیم کی ذمہ داری آئندہ نسلوں پر ہے۔

ترکی سیاسیئین کی دور اندیش پالیسی کی وجہ سے استنبول یونیورسٹی کا معیار تعلیم بہت بلند ہوگیا ہے۔ نصاب تعلیم وسعت اور معیار میں یونیورسٹیوں سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ اگر کوتاہی ہے تو اساتذہ کی طرف سے نہیں بلکہ طلباء کی طرف سے ہے۔ اسی غرض سے حکومت لیسے کا معیار بڑھانے کی انتہائی کوشش کر رہی ہے۔ انگورا یونیورسٹی کی تجویز کے بعد حکومت تیسری یونیورسٹی کے قیام پر غور کرے گی۔

ادب کی تدریس ترکی زبان کی اصلاح نے ایک اور مشکل پیدا کر دی ہے۔ موجودہ اسکولوں میں فارسی اور عربی کی صرف و نحو نہیں پڑھائی جاتی، اسلئے پچھلے دس سال کے عرصے میں بہت سے فارسی الفاظ بیکار اور غیر مستعمل ہو گئے ہیں۔ نہ تو سرکاری تحریریں استعمال ہوتے ہیں اور نہ اخباروں میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ترکی طلبا اب ترکی متقدمین کا کلام پڑھ نہیں سکتے اور نیفی۔ نبی۔ فضلی اور ندیم جیسے شعراان کے لئے معمہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ادب قدیم کو مدارس کے نصاب سے خارج کرنے کا تو خیال بھی کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ ادب تو قوموں کی حیاتِ ماضی کا آئینہ اور حیات ملی کا اہم جزو ہوتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس پرانے کلام میں سے غیر مستعمل اور غیر مانوس الفاظ نکال دئے جائیں۔ اس میں یہ دقت ہے کہ اصل اور جدید ایڈیشن میں کوئی مطابقت نہ رہے گی۔ ترکی کے تعلیمی حلقوں میں اس مسئلہ پر بہت غور کیا جا رہا ہے

دیہاتی مدارس ترکی میں گاؤں دور دور واقع ہوئے ہیں اور آبادی کم ہے۔ فاصلے کی وجہ سے گاؤں کو تعلیمی ضروریات کے لئے ملحق نہیں کیا جاسکتا۔

بعض حالات میں جغرافی مشکلات تو دور ہو سکتی ہیں مگر اس سے عام مسئلہ تعلیم حل نہیں ہو پاتا۔ درحقیقت چالیس ہزار مدارس کی تعمیر اور اساتذہ کی فراہمی کے لئے بہت رقم کی ضرورت ہے۔ اعلان جمہوریت سے سال بسال تعلیم عاملہ کی مد پر خرچ کا اضافہ ہی ہوتا رہا ہے لیکن ضروریات اس قدر وسیع ہیں کہ ایک معمولی میزانیہ کی مدات سے اس کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔ اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں جب حکومت کی صنعتی اسکیم تکمیل پا چکے گی تو اک پنج سالہ تعلیمی لائحہ عمل کی بنیاد ڈالی جائے گی ترکی میں تعلیمی پالیسی کی تعمیر جمہوریت اور شہریت کے اصولوں پر استوار کی گئی ہے۔ ابتدائی مدارس کے نچلے درجوں

سے لے کر یونیورسٹی کے اعلیٰ درجے تک کہیں بھی سماجی امتیازات کا نام و نشان نہیں ہے۔ بالعموم تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ دارالاقامہ کے طلبا سے بھی رہنے سہنے کے لئے کچھ نہیں لیا جاتا۔ جہاں کہیں فیس لگائی گئی ہے محض برائے نام ہے۔ اور مقامی اقتصادی حالات کا جائزہ لے کر اس نسبت سے لگائی جاتی ہے۔

مدرسے نہ صرف طلبا کو کشمکش حیات کے لئے تیار کرتے ہیں بلکہ ایسے شہری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جنکو فرائض ملی کا پورا پورا احساس ہے بچوں کو موجودہ حکومت سے محبت کرنے کا سبق سکھایا جاتا ہے جس نے ترکی کو آزادی۔ تحفظ نفس اور خودداری کی تعلیم دی۔ حبِ وطن کے اس جذبے کو ہر طریق سے بیدار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ترک بچے اور بچیاں نہ صرف یہ جانتے ہیں کہ کیا کچھ کیا جا چکا ہے۔ بلکہ انھیں اس امر کا بھی شدید احساس ہے کہ کیا کچھ کرنا باقی ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اس اہم کام کی ذمہ داری ان کے شانوں پر ہے ان میں بجائے ایک مصنوعی جذبۂ افتخار اور طمانیت پیدا کرنے کے ایک پیہم قوت عمل بیدار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انہیں یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ ترکی ایک بہشت ہے بلکہ یہ کہ اس کو بہشت بنانا ان کے ہاتھ میں ہے۔ تعلیمی ترقی کا راستہ وادی پرخار میں سے گزرتا ہے لیکن پچھلے پندرہ سال کی کوششوں کے نتائج بے حد حوصلہ افزا ہیں۔ تجربی اور نامکمل کوششوں کا دور جلد ہی ختم ہو جائے گا ترکوں نے ضبط و تنظیم کی خداداد قابلیت کا عجیب شاندار مظاہرہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ آئندہ نسل اپنے پیشرو مصلحین کے تجربے اور ان تھک کوششوں کا پھل اٹھائے گی اور ان کے لئے ترقی کی شاہ راہ پرفضا اور آسان ہو گی۔ (ایشیاٹک ریویو)

تقسیم و انتشار آراضی

جناب حبیب الرحمٰن صاحب، پروفیسر معاشیات، جامعہ عثمانیہ نے گذشتہ مارچ میں لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے "ہندوستانی زراعت کے بعض معاشی مسائل" پر تین تقریریں نشر کی تھیں۔ اس سلسلے کی پہلی تقریر کھاد کے عنوان پر مئی ۳۰ء کے "جامعہ" میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ اسی سلسلے کی دوسری تقریر ہے۔

ہندوستان کی زرعی زمین سے تعلق رکھنے والے مسائل میں تقسیم و انتشار آراضی کا مسئلہ بہت اہم اور فوری توجہ کا محتاج ہے، کیوں کہ اول تو یہ خرابی تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے، دوسرے ترقی و اصلاح کی تمام تدبیروں میں مانع اور (اس طرح) ہندوستانی کاشت کاروں کی خوش حالی میں بری طرح حائل ہو رہی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اولاً اس مسئلے کی نوعیت اچھی طرح سمجھ لی جائے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اصل خرابی کیا ہے۔ اور اس کی بدولت ہماری زراعت کی ترقی میں کس قسم کی رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ دولت پیدا کرنے کے لئے مختلف عوامل درکار ہوتے ہیں لیکن یہ بات بھی کچھ کم بدیہی نہیں ہے کہ کاروبار کی نوعیت اور پیمانہ پیدائش کا لحاظ کرتے ہوئے ان عوامل کی جو مختلف مقداریں درکار ہوتی ہیں، ان میں ایک طرح کا تناسب برقرار رکھنا کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ زراعت ہو یا صنعت و حرفت، تجارت ہو یا آمد و رفت، ہر شعبہ پیدائش میں اس بدیہی اور سیدھے سادے اصول کی پابندی ناگزیر ہے ورنہ کاروبار کے نفع بخش طریقے پر چلنا ناممکن ہے۔ مثلاً اگر کسی کاروبار میں مشینیں تو ہوں ضرورت سے زائد لیکن ان کو استعمال کرنے کیلئے کافی مزدور نوکر نہ ہوں، یا مشین اور مزدور دونوں موجود ہوں لیکن خام پیداوار کافی مقدار میں تیار نہ رکھی جائے، یا یہ تمام چیزیں تو مناسب مقدار میں موجود ہوں لیکن کام کرنے کے لئے جگہ بہت تنگ ہو، تو

ظاہر ہے کہ تمام صورتیں انتظام کی خرابی کا نتیجہ سمجھی جائیں گی، اور اگر کاروبار میں نقصان آئے، یا کم نفع حاصل ہونے لگے تو اس کا باعث اس خرابی انتظام کو قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی کسان زمین لے سے ضرورت سے زائد لیکن کام کرنے کے لئے اس کے پاس کافی آدمی موجود نہ ہوں، یا یہ دونوں عامل موجود ہوں۔ لیکن ان کی مناسبت سے زرعی آلات و اوزار یا بونے کے لئے کافی تخم دستیاب نہ ہوں یا اس کے برعکس کام کرنے والے تو کثیر تعداد میں موجود ہوں لیکن اسی مناسبت سے نہ زمین ہو اور نہ آلات و اوزار، تو ظاہر ہے کہ یہ حالات بھی کسی طرح زرعی کاروبار کے لئے نفع بخش نہیں ثابت ہوسکتے۔ ایسی ہی مثالیں پیدائش کے دولت کے دوسرے شعبوں سے بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی جدو جہد کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس بنیادی اصول کے عمل سے مستثنیٰ ہو۔ لیکن ہندوستانی زراعت کے موجودہ حالات میں اس اصول کی صریح خلاف ورزی ہورہی ہے ہمارے ملک کی ۷۰ فی صدی آبادی زراعت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہے۔ لیکن اتنی کثیر تعداد کو کاشت کے لئے جس قدر زمین ملنی چاہئے، وہ اسے میسر نہیں ہے اور نہ اس کے پاس اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ جدید آلات و اوزار، عمدہ تخم، مناسب کھاد، طاقت ور مویشی اور ترقی زراعت کی دوسری ترکیبیں اختیار کرسکے۔ بہ الفاظ دیگر ہماری زراعت میں ایک عامل پیدائش یعنی محنت تو کثیر مقدار میں موجود ہے لیکن دوسرے عوامل یعنی زمین و اصل اسی مناسبت سے موجود نہیں ہیں۔

جب ایک محدود رقبۂ زمین ایک کثیر مقدار میں تقسیم ہوتا جائے گا تو ظاہر ہے کہ ہر ہر شخص کے حصے میں جو رقبہ آئے گا وہ چھوٹا ہوتا جائے گا۔ چنانچہ ہندوستان کی زرعی زمین کسانوں کی روز افزوں تعداد میں تقسیم ہوتے ہوتے اب اس نوبت پر پہنچ گئی ہے، اور کاشتکاروں کو فرداً فرداً جو رقبہ ملا ہوا ہے وہ اب اس قدر چھوٹا ہوگیا ہے کہ کسان اور اس کا خاندان اس پر اپنا پورا وقت مفید طریقے پر صرف نہیں کرسکتے۔ تقسیم آراضی سے دراصل یہی صورتِ حال مراد ہے اور ایسے ہی چھوٹے چھوٹے غیر نفع بخش کھیتوں کو اصطلاح میں غیر معاشی کھیت کہتے ہیں۔

تقسیم آراضی کے علاوہ اور اس سے بھی زیادہ مضرت رساں ایک اور خرابی یہ ہے کہ کسان

کو جو کچھ تھوڑی بہت زمین حاصل ہے۔ وہ سب ایک مقام پر موجود نہیں ہوتی بلکہ اس کے کئی چھوٹے بڑے ٹکڑے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور دور دور واقع ہوتے ہیں۔ اسی خرابی کو اصطلاح میں انتشار آراضی کہتے ہیں۔

ہندوستان میں تقسیم و انتشار آراضی کی خرابی اب کس حد تک پہنچ گئی ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے چند اعداد و شمار پر نظر ڈالنا مناسب ہے۔ اس بارے میں سب سے زیادہ مکمل تحقیق پنجاب میں کی گئی ہے جس سے حسب ذیل اعداد[۵] تیار کئے گئے ہیں

ایک ایکڑ یا اس سے بھی کم رقبے پر کاشت کرنے والے کسانوں کی تعداد	۲۲٫۵
ایک سے ۲½ ایکڑ تک کاشت کرنے والے کسانوں کی تعداد	۱۵٫۴
۲½ سے ۵ ایکڑ " " " "	۱۷٫۹
۵ سے ۱۰ ایکڑ " " " "	۲۰٫۵

دوسرے صوبوں کے متعلق ایسے جامع اعداد و شمار حاصل نہیں ہیں لیکن زرعی کمیشن کی یہ رائے ہے کہ بمبئی اور برما کو چھوڑ کر دوسرے تمام صوبوں میں کافی کاشتکار اوسط رقبے کی مقدار پنجاب سے بھی کم ہے۔ بمبئی کی حالت غالباً پنجاب ہی کی سی ہے اور برما کا اوسط غالباً پنجاب سے زیادہ نکلے گا۔ ۱۹۲۱ء کی (CENSUS) رپورٹ میں مختلف صوبوں کے اندرونی کاشتکار زیر کاشت ایکڑوں کی مقدار حسب ذیل ہے۔

بمبئی	۱۲٫۲
پنجاب	۹٫۲
صوبہ متوسط برار	۸٫۵
برما	۵٫۶

---

[۵]۔ ماخوذ از رپورٹ زرعی کمیشن بابت ۱۹۲۸ء۔

مدراس	۴٫۹
بنگال	۳٫۱
بہار اڑیسہ	۳٫۱
آسام	۳٫۰
صوبجات متحدہ	۲٫۵

زرعی کمیشن کا خیال ہے کہ گو یہ اعداد کامل طور پر صحیح نہیں ہیں تاہم ان سے سرسری طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کھیتوں کا رقبہ گھٹتے گھٹتے کس حد تک پہنچ گیا ہے۔

انتشار کے متعلق کمیشن نے بعض دیہی تحقیقات کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً پمپلا سوداگر میں ڈاکٹر مَن کی تحقیق کے مطابق ۶۲ فی صدی کسانوں کے کھیت وسعت میں ایک ایکڑ سے کم ہیں۔ جاتے گاؤں میں ایسے کسانوں کی تعداد ۲۱ فی صدی ہے۔ بیرام پور میں مسٹر بھالا کی تحقیق کے مطابق ۴۳ ½ فی صد کسان ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس پچیس جدا جدا قطعات ہیں۔ پنجاب میں بہ کثرت ایسے اشخاص ملتے ہیں جن کی زمینیں بیس بیس، تیس تیس مختلف جگہوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مسٹر کالورٹ کو تو ایک کسان ایسا بھی ملا جس کی زمین کے دو سو سے زیادہ جدا جدا منتشر ٹکڑے تھے۔ بعض مقامات میں تو اس خرابی کی بدولت کھیتوں کی حالت بالکل مضحکہ خیز ہوگئی ہے۔ مثلاً رتناگیری میں بعض قطعوں کی وسعت ایکڑ کے ایک سو ساٹھویں حصے یعنی ۳۰ ¼ گز تک پہنچ گئی ہے۔ پنجاب میں بعض کھیت ایسے پائے گئے ہیں جو ایک ایک میل لانبے لیکن صرف چند گز چوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد رقبے ایسے موجود ہیں جو منتشر ہوتے ہوتے اب اس حد کو پہنچ گئے ہیں کہ ان پر کاشت کرنا سرے سے ناممکن ہو گیا ہے۔

تقسیم و انتشار اراضی سے ہندوستان کی زراعت کو جو گوناگوں نقصانات پہنچ رہے ہیں، ان کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً عوامل پیدائش کا نقصان بہت بدیہی ہے۔ کاشتکار اور اس کے مویشیوں کا بہت سا وقت اور بہت سی محنت مختلف کھیتوں کے درمیان آنے جانے میں

ضائع جاتی ہے اور زمین بہت چھوٹی ہونے سے کاشتکار نہ اپنے آپ کو اور نہ اپنے مویشیوں کو پورے وقت مصروف رکھ سکتا ہے۔ حالانکہ کام کم لینے سے کچھ مویشیوں کی خوراک میں کمی واقع ہوتی۔ جس قدر کھیت منتشر ہوتے ہیں اسی قدر زیادہ زمین حد بندی کی نذر کرنا پڑتی ہے اور اس طور پر جو زمین فصل اگانے کے کام آتی وہ یوں ہی بے کار ضائع ہوتی ہے۔ فرداً فرداً تو یہ نقصان کچھ قابلِ لحاظ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو جو قابلِ کاشت زمین ضائع ہو رہی ہے، اس کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی منتشر کھیتوں کے مصارف نسبتاً بہت زیادہ ہوتے ہیں کیوں کہ ایک طرف عوامل پیدائش ضائع ہوتے ہیں اور دوسری طرف کھیتوں کی نگرانی اور پیداوار کے نقل و حمل کے مصارف بڑھ جاتے ہیں۔ اور ان مادی نقصانات کے علاوہ پڑوسیوں سے آئے دن جو جھگڑے ہوتے ہیں اور اپنے ہم پیشہ ساتھیوں سے مقدمہ بازی کی جو ترغیب ہوتی ہے وہ علیحدہ ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ اہم اور بہ لحاظ اپنے اثرات کے بنیادی اور مستقل نقصان یہ پہنچا ہے کہ کاشتکاروں کو اپنے کاروبار میں زیادہ روپیہ لگا کر اسے بہتر بنانے اور ترقی دینے کی کوئی ترغیب نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی خاص معینہ رقبۂ زمین اس کے قبضے میں نہ ہو کیونکر کوئی کاشتکار روپیہ خرچ کر کے خسارہ اٹھانے پر آمادہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کھیتوں کے اطراف ایسی باڑ لگائی جاتی ہے جو فصل کو آوارہ جانوروں اور چوروں کے حملوں سے محفوظ رکھ سکے، نہ کھیتوں پر کنوئیں کھود دے جاتے ہیں کہ جن سے بارش کی بہت زیادہ احتیاج باقی نہ رہے، نہ کھاد خریدنے کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور نہ نئے آلات و اوزار استعمال کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں صرف اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جبکہ رقبۂ کاشت کافی وسیع ہو۔ ذرا ذرا سے قطعات پر ایسی اصلاحات اول تو عمل میں نہیں لائی جا سکتیں اور اگر انھیں عمل میں لایا بھی جائے تو ان سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہی حال ذرائع آب پاشی کا ہے۔ ذرا ذرا سے ٹکڑے کے لئے کون کنواں کھودنے کی طرف راغب ہوگا اور بے شمار چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی نہروں سے کیوں کر آب پاشی کی جائے گی۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ بہت سے کسان مل مل کر کنوئیں کھودیں اور استعمال کریں یا سرکاری نہروں سے اکٹھا پانی حاصل کر کے آپس میں تقسیم کر لیں۔ لیکن موجودہ حالات میں اس کی کامیابی

کی کوئی توقع نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ موجودہ حالات میں ہماری زراعت کو دونوں طرح سے نقصان پہنچ رہا ہے کیونکہ ایک طرف تو اس میں چھوٹے کھیتوں کی تمام خرابیاں موجود ہیں جس کی وجہ سے نہ مشینیں استعمال کی جاسکتی ہیں اور نہ محنت بچانے کے دوسرے طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں اور دوسری طرف وہ چھوٹے کھیتوں کے خاص فوائد سے محروم ہے۔ کیونکہ انتشار کی وجہ سے کاشتکار ہر ہر قطعہ پر پوری توجہ صرف نہیں کرسکتا۔

ہندوستان میں تقسیم و انتشار آراضی کی موجودہ حالت کے کئی اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ اس بارے میں بعض لوگوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین وراثت پر بہت زور دیا جاتا ہے اور انہیں قوانین کو وہ تقسیم و انتشار کا خاص سبب قرار دیتے ہیں۔ اگر موروثی جائداد ہر ہر نسل کے بعد ورثا میں برابر تقسیم ہوتی چلی جائے اور ساتھ ہی ساتھ آبادی میں اضافہ ہوتا رہے تو ظاہر ہے کہ جائداد کے نہ صرف چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوجائیں گے بلکہ جہاں زمین یکساں زرخیزی والی نہ ہوگی، وہاں یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے منتشر بھی ہوتے جائیں گے تاکہ ہر وارث کو ہر قسم کی زمین میں حصہ مل سکے اس میں شک نہیں کہ اس خرابی کے پیدا کرنے میں ملک کے قوانین وراثت کا ضرور حصہ ہے۔ لیکن انہیں کو تقسیم و انتشار کا بنیادی سبب قرار دینا درست نہیں ہے۔ اول تو ہندوستان کی کثیر آبادی میں اشتراک خاندان کا طریقہ رائج ہے جس کے مطابق موروثی جائداد منقسم نہیں ہوتی بلکہ مشترک رہتی ہے۔ مسلمانوں کے قوانین کا رجحان یقیناً تقسیم در تقسیم کی طرف ہے۔ لیکن زراعت کے پیشے میں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ اس کے علاوہ قوانینِ وراثت خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، مدتوں سے ہمارے ملک میں رائج ہیں لیکن تقسیم و انتشار آراضی کی موجودہ خرابی نسبتاً حال کی بات ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض قوانینِ وراثت موجودہ صورت حال کے پیدا کرنے کے لے کافی نہ تھے بلکہ کچھ اسباب اور ایسے پیدا ہوگئے تھے جو بجا طور پر اس کے ذمہ دار قرار دئے جاسکتے ہیں۔ ان نئے اسباب میں آبادی کا اضافہ، ملکی صنعتوں کی تباہی اور اشتراک خاندان کے طریقے کا زوال، یہ امور خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ جب تک ملک میں مزید قابلِ کاشت زمین

آسانی سے حاصل ہو جاتی تھی، اضافۂ آبادی کا کوئی خاص اثر محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ موروثی زمین کے ٹکڑے کرنے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ چند ورثا اسی گاؤں میں کوئی نئی زمین زیر کاشت لے آئیں۔ لیکن گذشتہ سوڈیڑھ سو سال سے کچھ تو اضافہ آبادی کی بدولت اور اس سے کہیں زیادہ ملکی صنعتوں کے زوال کے باعث کاشت کے لئے نئی نئی آراضی کا دستیاب ہونا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ریلوں اور دوسرے ذرائع آمد و رفت کی ترقی اور ساتھ ہی حکومت کی آزاد تجارت والی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں کثرت سے دوسرے ملکوں کی مصنوعات آ آ کر فروخت ہونے لگیں اور مشین کے استعمال کی بدولت یہ چیزیں یہاں اس قدر سستی بکنے لگیں کہ ہندوستان کے دستکار ہاتھ سے تیار کیا ہوا مال اس قدر سستے داموں فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ اور چونکہ حکومت اس بارے میں دخل دینے کے لئے قطعاً تیار نہ تھی اس لئے نتیجہ بالکل بدیہی تھا۔ ہندوستانی دستکار اور صناع روزافزوں تعداد میں اپنے اپنے پیشوں سے دست کش ہونے لگے اور آبائی زمینوں پر کاشت کر کے گذر اوقات کرنے لگے اس طرح نہ صرف قدرتی اضافۂ آبادی بلکہ تبدیلِ پیشہ کے ذریعے سے بھی ہندوستان میں زراعت پیشہ طبقے کی تعداد خوب بڑھنے لگی اور زمین پر اس کا روز افزوں بار پڑنے لگا۔ اب اگر کاشتکاروں کی یہ روزافزوں تعداد اپنے قدیم اور روائتی اشتراک خاندان کے طریقے سے استفادہ کر کے آبائی جائداد کو مشترک رکھتی اور اس پر مشترکہ طور پر کاشت کرتی تو ممکن تھا کہ ملک کی زراعت اس قدر تباہ حال نہ ہوتی۔ لیکن بدقسمتی سے عین اسی زمانے میں مغربی ملکوں سے جو تعلقات بڑھنے لگے تو اُن کے خیالات اور رسم ورواج کا یہاں بھی پرتو پڑنے لگا، اشتراکیت کم زور اور انفرادیت قوی ہونے لگی اور اشتراک خاندان کے طریقے میں تزلزل پیدا ہونے لگا۔ خاص کر انگریزی نظام معدلت کی اشاعت اور انگریز یا انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی ججوں کے فیصلوں سے انفرادیت کے رجحان کو زبردست تقویت پہنچی اور ہندوستان کے مشترک خاندان کثرت سے منقسم ہونے لگے اس کے علاوہ امن و امان کا قیام، رسائل، نقل و حمل کی ترقی، زرعی پیداواروں کی روز افزوں طلب ان سب کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ زرعی زمینوں کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا لیکن یہ اضافہ کاشتکاروں کے لئے ایک خدا داد نعمت ثابت ہونے

کی بجائے اُن کے حق میں اور وبالِ جان بن گیا۔ صدیوں کی جہالت اور قدامت پسندی اور نامعقول رسم و رواج اور توہمات کی جکڑبندی کے زیرِ اثر یہاں کے بھولے بھالے کاشتکار اپنی زمینوں کو مارواڑیوں کے ہاتھ رہن رکھ رکھ کر قرضے وصول کرنے لگے اور مارواڑیوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر یہ زرعی زمینیں اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہونے لگیں۔

ہندوستان میں تقسیم و انتشار آراضی کا موجودہ حالت اور اس کے مختلف اسباب اور گوناگوں نقصانات کا ہم مختصر طور پر ذکر کر چکے اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ اس خرابی کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ اس بارے میں ایک تو ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ خرابی واقع ہو چکی ہے، اُسے رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے یہ اہتمام کیا جائے کہ دوبارہ وہ خرابی پیدا نہ ہونے پائے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف تجویزیں پیش کی جاتی ہیں جن کی خوبیوں اور نقائص کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ البتہ دوسرے ملکوں کے تجربے سے جو بات نمایاں طور پر واضح ہے، وہ یہ ہے کہ محض کاشتکاروں کی رضامندی اور ذاتی کوششوں پر بھروسہ کرنے سے اس خرابی کی اصلاح ناممکن ہے۔ بلکہ اس کے لئے سرکاری مداخلت اور ایک حد تک جبر سے کام لینے کی ضرورت ہے، فرانس، سوئٹزرلینڈ، بلجیم، جرمنی، ڈنمارک، جاپان، ان میں سے ہر ایک کو تقسیم و انتشار آراضی کی خرابی سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن بغیر قانون سازی اور جبری مداخلت کے کہیں بھی اس کی اصلاح نہ ہو سکی۔

لیکن ہندوستان کی حکومت اس قسم کی تدبیریں اختیار کرنے سے ہمیشہ محترز رہی اور اب بھی بہت کچھ پس و پیش کرتی ہے اور اس کا یہ تامل بڑی حد تک حق بجانب ہے۔ اول تو حکومت کا اجنبی ہونا اس کی طرف سے رعایا کے دلوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور شکوک پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دوسرے یہاں کے کاشتکاروں کی اپنی زمینوں سے کچھ ایسا قدرتی لگاؤ ہے کہ وہ کسی طرح ان سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتے خواہ اس طرزِ عمل سے انھیں کتنا ہی نقصان پہنچ رہا ہو۔ تیسرے یہ کہ یہاں اور ملکوں کی طرح دوسرے ذرائع معاش موجود نہیں ہیں۔ ملک کی قدیم دستکاریاں تو تباہ ہو چکیں لیکن ان کی جگہ نئی صنعتیں ابھی تک اتنی ترقی نہیں کر سکی ہیں کہ ان میں کثیر دیہاتی آبادی کی کھپت

ہوسکے۔ ظاہر ہے کہ باشندوں کی ایک بڑی تعداد کو بغیر کسی ذریعہ معاش کے یوں ہی چھوڑ دینا سراسر خلاف مصلحت بلکہ سخت خطرناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرعی کمیشن نے جہاں حکومت کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ اس بارے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھی رہے، وہیں اس نے یہ بھی تاکید کی ہے کہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم اٹھائے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہاں سردست اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ سخت قوانین نافذ کرکے اور رعایا پر جبر و تشدد کرکے تقسیم و انتشار آراضی کی اصلاح کی جاسکے۔ لہٰذا جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ محض رعایا کی رضامندی سے کیا جاسکتا ہے اور یہ رضامندی محض پروپیگنڈا کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں جو تدبیر سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہے وہ پنجاب کا تجربہ ہے جس کی نمایاں خصوصیت یہی پروپیگنڈا اور عام رضامندی ہے۔ اس کے علاوہ صوبہ متوسط کا تجربہ بھی بہت کامیاب ثابت ہو رہا ہے اور وہ اس وجہ سے امید افزا ہے کہ اس میں کسی قدر سرکاری مداخلت اور جبر کا عنصر بھی شامل ہے۔ ان دونوں تجربات کی کسی قدر تفصیلی کیفیت آیندہ کسی موقعہ پر نشر کی جائے گی۔

غزل

یہ کیا بات ہے جاننا چاہتا ہوں
کسی کو میں کیوں پوجنا چاہتا ہوں

کہیں کوئی گم کردہ دل ہے جہاں میں
دلِ بے بہا بیچنا چاہتا ہوں

الٰہی کہیں تو نے پیدا کیا ہے
کوئی ہمنوا ڈھونڈھنا چاہتا ہوں

یہ رنگِ گلستاں، یہ عمر گریزاں
کہوں کیا الٰہی، کہ کیا چاہتا ہوں

ابھی تو یہی جی میں ہے، آگے جو ہو
کہ ان کو فقط دیکھنا چاہتا ہوں

جو شایانِ شاں ہو ترے وہ عطا کر
مرا کیا میں کیا جانے کیا چاہتا ہوں

اٹھا کر دکھاؤ گے کیوں دل کو ناحق
میں اس بزم سے خود اٹھا چاہتا ہوں

جسے کام ہر اک سے کس کام کا وہ
میں اپنا الگ اک خدا چاہتا ہوں

وہ گھبرا کے یوں منع کرتے ہیں فضلی
کہ جیسے میں سچ مچ کہا چاہتا ہوں

ہندوستان کے مزدور

از جناب ضمیر صدیقی صاحب بی۔ اے (علیگ)

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور آبادی کے تناسب سے مزدوروں کی تعداد بہت کم ہے۔ صرف چند بڑے شہروں بمبئی۔ کانپور۔ مدراس اور دیگر تجارتی مرکزوں میں مزدوروں کی کثرت نظر آتی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں مزدور ہمیشہ سے رہتے ہیں لیکن منظم جماعت کی حیثیت سے ان کی تعداد ۱۹۱۱ء سے بڑھنا شروع ہوئی اور ۱۹۲۱ء تک کارخانوں کے بڑھنے سے مزدوروں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ کل آبادی میں ۹۵، ۹ فیصدی مزدور ہیں اور باقی آبادی کا انحصار کاشتکاری، تجارت اور ملازمتوں پر ہے۔ حسب ذیل نقشہ سے معلوم ہو گا۔ کہ ہندوستان میں کل مزدور کن کن پیشوں میں منقسم ہیں اور اُن کی تعداد کیا ہے۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے لئے گئے ہیں۔

کپڑے کے کارخانوں میں	۴۱،۰۲،۱۳۲
لباس اور فیشن کی اشیاء بنانے والے	۲۳،۸۰،۸۲۴
لکڑی کے کارخانوں میں	۱۶،۳۱،۷۲۳
خورد و نوش کی اشیاء بنانے والے	۱۴،۷۶،۹۹۵
عمارات بنانے والے	۶،۱۸،۵۲۷
دھات کی اشیاء بنانے والے	۷،۱۳،۰۷۰
کیمیکل وغیرہ	۶،۰۳،۵۰۴
چمڑا اور کھالیں بنانے والے	۳،۱۲ ۰۷۴
معدنیات اور کان والے مزدور	۳،۴۶،۰۰۰

متفرق ۱۴،۹۸،۰۵۴

اس کے علاوہ مزدوروں کی بڑی تعداد چھوٹے اور غیر رجسٹری شدہ کارخانوں میں کام کرتی ہے جو مندرجہ بالا اعداد و شمار سے الگ ہیں انکی تعداد بھی ۴۰ لاکھ سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ کل مزدور ۲ کروڑ سے کچھ ہی کم ہوں گے جو مزدور کارخانوں کے علاوہ دوسری قسم کی مزدوری کرتے ہیں ان کی صحیح تعداد معلوم نہ ہوسکی۔ لیکن وہ بھی ایک بڑی تعداد میں ہے۔

زیادہ تر مزدور گاؤں سے آتے ہیں جو وہاں کے زمیندار اور ساہوکار سے خائف ہوکر بھاگ آتے ہیں۔ اِن مزدوروں کو ملازمت دلانے، تنخواہ کی ادائیگی، اور دیگر انتظامات کے لئے کارخانے والے شہروں میں ایک طبقہ مستقل طور پر ہوتا ہے جو دلاّل کہلاتے ہیں۔ ۱۹۲۳ء سے قبل مزدوری کی کمی کی وجہ سے اِن دلاّلوں نے مزدور بہم پہونچاکر کارخانے والوں کی بڑی امداد کی اور بڑے لالچ دے کر دیہات والوں کو کارخانوں میں لایا گیا لیکن اب صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ مانگ کم ہے اور رسد زیادہ اس لئے بعض اوقات تو مزدوروں کو ملازمت حاصل کرنے کے لئے رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔

ہندوستان میں مزدوری کا معاوضہ عام طور پر ماہانہ ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے مزدور ایک طرح سے کارخانے والوں کا غلام ہوجاتا ہے کیونکہ مزدور ایک ماہ کا خرچ ادھار اور قرض لے کر چلاتا ہے اور جب تنخواہ ملتی ہے تو اس وقت ادائیگی ہوتی ہے۔ بعض مہینے میں خرچ کا اندازہ نہ ہونے سے مزدور مقروض بھی ہوجاتا ہے جس کی ادائیگی اگلے ماہ کی تنخواہ پر واجبی ہوتی ہے اس قسم کے واقعات دو تہائی سے بھی زائد ہیں۔ مزدور بہت معمولی روپیہ قرض لیتا ہے لیکن اُس پر سود اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس کی ادائیگی مزدوروں کی طاقت سے باہر ہوتی ہے۔ احمد آباد کے کارخانے والے قریب کے گاؤں کے لڑکوں کو ٹھیکہ پر مزدور رکھتے ہیں۔ اُس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگ لڑکوں کے ماں باپ کو ۲۰ یا پچیس روپے سالانہ کے حساب سے دیتے ہیں اور وہ گاؤں کے لوگ ناداری کی وجہ سے اپنے بچوں کو مزدور بناکر بھیجتے ہیں حالانکہ اِن لڑکوں کے کھانے اور رہنے کا انتظام کارخانے والے خود کرتے ہیں لیکن یہ انتظام اِتنا خراب ہوتا ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ اِن کے

کھانے اور رہنے پر کم سے کم خرچ کیا جائے؎۱ یہ غلامی کا طریقہ اتنا مضبوط ہوگیا ہے۔ کہ ٹریڈ یونین جیسے اداروں کو بڑی دقت پڑ رہی ہے کہ وہ اِن مزدوروں کی بہتری اور ترقی کے لئے کوئی تحریک کریں۔

کارخانوں کے لئے قانون اور مزدوروں کے معاوضے

۱۸۸۱ء تک کارخانوں کے لئے ہندوستان میں کوئی قانون نہ تھا۔ اس قانون کے مطابق ۷ سال سے کم عمر کے بچے مزدوری نہیں کرسکتے تھے۔ ۷ سال سے ۱۲ سال تک کے لڑکوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ۹ گھنٹے روزانہ کام کریں۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں یہ پاس ہوا کہ ۱۲ سال سے کم عمر کا لڑکا مزدوری نہیں کرسکتا۔ اِس سے زیادہ عمر کے لڑکے صرف ۶ گھنٹے روزانہ کام کرسکتے ہیں۔ بڑی عمر کے مزدوروں کے لئے قرار پایا کہ وہ ۱۱ گھنٹے روزانہ کام کریں۔ لیکن باوجود اِس قانون سازی کے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کارخانے میں اس پر عمل نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۲ء میں احمد آباد کے کارخانوں میں ۲۲۶ لڑکے کام کرتے تھے۔ آج کل بھی ان کارخانوں میں لڑکے ملازم رکھے جاتے ہیں۔ اور آپ کو تعجب ہوگا کہ اُن سے مقررہ وقت سے دوگنا کام لیا جاتا ہے۔ جن کارخانوں میں مشین سے کام نہیں لیا جاتا مثلاً بیڑی کا کارخانہ، قالین بننے کا کارخانہ اُن میں عورتیں اور بچے ہی کام کرتے ہیں۔ کارخانے والے اس کا قطعی لحاظ نہیں رکھتے کہ عمر کے لئے کیا قانون ہے اور اُن سے کتنے گھنٹے کام لینا چاہئے اس کے علاوہ جس فضا میں وہ کام کرتے ہیں وہ نہایت گندی اور مضرِ صحت ہوتی ہے۔ دھاتیلے رپورٹ میں عورتوں اور ۸ برس کے بچوں کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا ہے۔ اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:-

"اِن کارخانوں میں عورتوں اور بچوں سے ڈنڈوں، بیدوں، اور دوسری قسم کی مار پیٹ سے کام لیا جاتا ہے۔ جب اِن مزدوروں پر مار پڑتی ہے تو کارخانوں میں ایک ہنگامہ ہوجاتا ہے۔ تمام کارخانوں میں گرد اور دھول اس قدر اڑتی ہے کہ کھڑا ہونا محال ہوتا ہے۔ مزدور ماؤں کے بچے ان کے قریب ہی ریت اور دھول پر لیٹے ہوئے نظر آتے ہیں جن پر میلے کچیلے کپڑے پڑے ہوتے ہیں اور یہ بچے اپنی سانس کے ساتھ دھول اور جراثیم پیٹ میں پہونچاتے رہتے ہیں۔"

؎۱ The cotton Industry of In[illegible] 1930 by ARNO PEARSE

اِس رپورٹ میں بیڑی کے کارخانوں کے متعلق لکھا ہے :-

"بیڑی کے کارخانوں میں پانچ پانچ برس کے بچے کام کرتے نظر آئیں گے جن کے لئے پورے دن کے کام کے بعد کچھ منٹ کا وقفہ بھی نہیں ملتا کجا ہفتہ میں آرام کا ایک دن یہ بچے صرف دو آنہ یومیہ کے لئے ۱۰ اور ۱۲ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں"

اِس کے علاوہ بڑے بڑے کارخانوں میں بھی بہت بے توجہی سے کام لیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں بنگال کے جوٹ کے کارخانوں میں ۳ لاکھ ۱۹ ہزار مزدوروں میں سے ۸۰ ہزار عورتیں اور ۲۹ ہزار بچے کام کرتے تھے۔ کام کا وقت ½۵ بجے صبح سے لیکر ۷ بجے شام تک ہے اور لطف یہ کہ درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ عورتیں ایک ہاتھ سے بچے سنبھالتی ہیں اور دوسرے سے کام کرتی ہیں۔ حاملہ عورتیں محض اِس خوف سے کہیں ملازمت نہ چھوٹ جائے اپنے بچے کارخانوں میں ہی جن دیتی ہیں۔ ۱۹۲۴ء کے سرکاری بیان سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۳۲ حاملہ عورتوں میں سے ۱۰۲ عورتوں نے اپنے بچے کارخانوں میں جنے [1]

بمبئی کے روئی کے کارخانوں میں عورتیں اپنے بچے ساتھ نہیں لاسکتیں اور چونکہ ان میں زیادہ تعداد ایسی ہے جو اپنے بچوں کے لئے کوئی انتظام نہیں کرسکتیں جو اُن کے بچوں کی دیکھ بھال کرسکے اس لئے یہ عورتیں اپنے بچوں کو افیون کھلا کر آتی ہیں تاکہ وہ سو جائیں اور شام تک خاموش رہیں۔ ۱۹۲۲ء کی سرکاری تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ۹۸ فی صدی بچوں کو افیون کھلائی جاتی ہے [2]۔ مزدور کی حالت جیسی ہندوستان میں ابتر ہے اتنی شاید ہی کسی ملک میں ہو۔ یہاں نہ تو اس کی صحت ہی کے لئے کوئی خاص انتظام ہے اور نہ اُس کے معاوضے کے لئے کچھ پرواہ کی جاتی ہے۔

۱۹۲۸ء میں بمبئی میں جو اسٹرائک ہوئی تھی اُس سے کپڑے کے کارخانوں کی حالت بہت کچھ ظاہر ہوئی ہے اِس سلسلے میں جو فوسٹ کمیٹی قائم کی گئی تھی اور اُس نے مزدوروں کے معاوضے کے متعلق جو معلومات بہم پہونچائی ہیں وہ قابل غور ہیں۔ کمیٹی نے ہندوستانی مزدور اور ممالک متحدہ امریکہ و انگلستان کے مزدوروں کے معاوضے کا مقابلہ کیا ہے۔ رپورٹ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی ہے

ملاحظہ ہو۔

ہندوستان میں ایک ماہ کی مزدوری (۲۶ دن ۱۰ گھنٹہ) ۔ ۔ ۔ تقریباً ۱۴ روپے
ممالک متحدہ امریکہ " " (۲۴ دن ۸ گھنٹہ) ۔ ۔ ۔ تقریباً ۲۱۰ روپے
انگلستان " " (۲۴ دن ۸ گھنٹہ) ۔ ۔ ۔ تقریباً ۹۰ روپے

باوجود اس قدر کم مزدوری ہونے کے بھی کمیٹی نے یہی طے کیا کہ ہندوستانی مزدور کے معاوضے میں کمی ہونا چاہئے۔ چنانچہ ۳۰ روپے ماہوار ملنے والوں کی تنخواہ میں کمی کر دی گئی اس رپورٹ نے یہ بھی معلوم کیا تھا کہ ایک مزدور کے گھر کے کھانے میں آمدنی کا ۵۷ فی صدی روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو مزدور کارخانوں میں کام کرتے ہیں اُن کے معاوضے بھی کم کر دئے گئے تھے یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو گورنمنٹ نے ریلوے کے مزدوروں کی تنخواہ میں ۱۰ فیصدی تخفف کر دی اور بعد میں محکمہ ڈاک کے ملازمت نیز دوسرے سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں ۱۰ فیصدی کمی کی گئی۔

کانوں کے مزدور کی حالت

۱۹۲۳ء کے مائنس ایکٹ کے قبل گورنمنٹ نے اِن مزدوروں کی طرف کوئی توجہ نہ کی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں جو مردم شماری ہوئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۲ برس سے کم عمر کے بچے جو کانوں میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ کل ۸۰۵۴۸ کی تعداد میں تھے۔ اس قانون نے ۱۳ برس سے کم عمر کے لڑکوں کے لئے قطعی ممانعت کر دی کہ وہ کان میں کام نہ کریں اور بڑی عمر کے آدمیوں کے لئے ہفتہ میں ۵۴ گھنٹہ کام کرنے کا وقت مقرر کیا گیا اور کان کے باہر ۶۰ گھنٹہ فی ہفتہ کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں ایک اور قانون پاس کیا گیا جس سے عورتوں کو کارخانوں میں کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس وقت جو کوئلے کی کانیں بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ اور سی۔ پی میں ہیں ان میں ۱۴ فی صدی عورتیں مزدور ہیں۔ ان کارخانوں میں تو ہوا کا تو گذر ہی کہاں بلکہ مزدور جیسے جیسے کان کھودتا ہوا زمین کے اندر جاتا ہے ویسے ہی درجۂ حرارت بڑھتا جاتا ہے اور نمی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ رانی گنج (بنگال) کے

1) Shrader and Furtwangler.
2) Bombay Labour Gazette, Sept. 1932.

نوٹ صفحہ ۹۵۵ علے علے

کوئلے کی کان میں چونکہ مرد اور عورتیں ننگے پیر کام کرتے ہیں انکے پیر اکثر زخمی ہوجاتے ہیں اور وہ کئی کئی دن تک کام نہیں کرسکتے۔ دھاتُلے کمیٹی نے بھی شکایت کی ہے کہ عورتوں سے وہ بھاری کام لیا جاتا ہے جو انکی طاقت سے باہر ہوتا ہے۔ کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ گورنمنٹ کو ان مزدوروں کی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہئے

کارخانوں میں جو حادثات پیش آتے رہتے ہیں وہ بھی کم نہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ۲۲۷ موتیں ہوئی تھیں جس میں ۱۰۹ مرد اور ۲۷ عورتیں تھی۔ ۱۹۲۲ء میں جو ورکمین کمیشن ایکٹ پاس ہوا ہے اس سے پہلے ایک مزدور کی موت پر اس کے وارثان کو کچھ نہ ملتا تھا لیکن اس قانون سے بالغ کی موت ہونے پر تقریباً ۲½ ہزار روپے اور نابالغ کی موت پر جس کی عمر ۱۵ سال سے کم ہو تقریباً ۲۵۰ روپے ملتے ہیں۔ ہندوستان کا مزدور اس کی اہمیت اس لئے نہیں سمجھتا کہ ابھی حقیقت میں اس نے اپنے حقوق نہیں پہچانے۔ وہ یہ ہی نہیں جانتا کہ اس کی محنت پر دنیا کے کاروبار چلتے ہیں اگر آج وہ کام بند کردے تو سارے سنسار میں تہلکہ مچ جائے۔ ۱۹۲۹ء تک مزدوروں کی موت کا اعداد و شمار ایک ہزار پر ۱۳ اکا ہے۔

مزدوروں کے مکانات

ہندوستان میں کانوں اور کارخانوں کے مزدوروں کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے یہ ضرور ہے کہ کان کے مزدور کو کان کے مالک کی طرف سے مکانات دئے جاتے ہیں لیکن اُن کے لئے ایک چھوٹی سی کوٹھری ہوتی ہے جس میں ایک بے کواڑ کا دروازہ ہوتا ہے اُس میں نہ کوئی کھڑکی ہوتی ہے اور نہ کوئی روشندان چھت ایسی خستہ ہوتی ہے کہ موسم برسات میں اُن میں سے پانی آتا ہے کارخانوں کی حالت بھی یہی ہے۔ دھاتُلے رپورٹ کا حسب ذیل بیان ملاحظہ ہو۔

"۲۲-۱۹۲۱ء کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بمبئی میں ۹۷ فی صدی مکانات صرف ایک کوٹھری کے ہیں جن میں ۲ سے لیکر ۹ آدمی تک رہتے ہیں۔ کراچی میں مزدوروں کی ½ آبادی انھیں کوٹھریوں میں رہتی ہے۔ یہی حالت احمد آباد، کانپور، ہاوڑہ، کلکتہ وغیرہ میں ہے۔"

صرف چند مثالیں ایسی ہیں جہاں زمین اور مکانات کارخانے والے مہیا کرتے ہیں ورنہ عام طور پر مزدوروں

کو زمینداروں کے رحم وکرم پر چلنا پڑتا ہے۔ زمین مہنگی ہونے کی وجہ سے مکانات اس قدر چھوٹے اور تنگ بنائے جاتے ہیں کہ ان میں سانس لینا دشوار ہوتا ہے۔ گلیاں اور کوچے اتنے گندے اور کم چوڑے ہوتے ہیں جن میں بارہ مہینہ گندگی میلا' اور کیچڑ رہتی ہے۔ جو مزدور اپنی بیویوں کو سخت پردے میں رکھتے ہیں۔ وہ گھروں کے دروازوں کے سامنے ٹین اور ٹاٹ کے ٹکڑے ٹانگ دیتے ہیں جو غربت کی عین نشانی ہے ہندوستانی مزدور ایسی ہی فضا میں پیدا ہوتے، چلتے، زندہ رہتے، اور مرتے ہیں اور انھیں احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ دنیا کے لئے کیا کر رہے ہیں اور اس کا بدلہ دنیا انھیں کیا دے رہی ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں جب غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ ہو رہا تھا اس وقت احمد آباد میں کپڑے کے کارخانے بہت اچھی مالی حالت میں تھے لیکن اس وقت بھی مزدوروں کے رہنے سہنے کا انتظام اتنا خراب تھا کہ لوگ پہلے سے بھی زیادہ بری حالت میں ہو گئے۔ مزدوروں کی تعداد بڑھ گئی لیکن کارخانوں کے مالکوں نے ان کے لئے مکانات کا انتظام نہ کیا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ٹیکسٹائل یونین نے ایک رپورٹ چھاپی جس سے معلوم ہوا کہ احمد آباد میں ۱۶ر۰۰۰ کوٹھریاں ایسی تھیں جن میں انسان رہ نہیں سکتا۔ ان میں نہ ہوا کا گذر تھا نہ روشنی کا

مزدوروں کی بے روزگاری

کارخانوں کو شروع میں مزدوروں کی بڑی مانگ تھی اور مزدور ڈھونڈے نہیں ملتے تھے لیکن جب سنسار کی مالی حالت میں تبدیلی ہوئی اس وقت سنہ ۱۹۲۴ء سے بے روزگاری شروع ہوئی۔ دھاٹلے رپورٹ جو اس زمانہ میں شائع ہوئی تھی اس سے معلوم ہوا کہ بمبئی کے کارخانوں میں سنہ ۲۴ء میں مزدوروں کی تعداد ۱ر۴۴ر۵۴۷ تھی لیکن سنہ ۲۹ء میں صرف ۱ر۸۰ر۳۶۹ رہ گئی۔ اس طرح ٹاٹا کمپنی میں ۳۲ر۵۲۱ سے ۲۸ر۶۶۰ رہ گئی۔ اس زمانے میں کلکتہ میں بے روزگاری کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں تقریباً ۴۰ ہزار مزدور ریلوے سے نکالے گئے اور جوٹ کے کارخانوں میں تقریباً ۴۰۲ ہزار مزدوروں میں سے ۸۰ ہزار بیکار ہو گئے۔ اس طرح کل بیکار مزدوروں کی تعداد ۴ کروڑ کے قریب پہونچ گئی ہے بیکار مزدور یا تو اپنے گاؤں کو واپس چلے گئے یا پھر فقیر ہو گئے اور بڑے بڑے شہروں میں امیروں کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنے لگے۔

مزدوروں کی صحت اور تندرستی

مزدور کی بے روزگاری، قلیل تنخواہ، گندے اور خراب مکانات اور گندی فضا میں رہنے سے اس کی تندرستی پر اثر پڑتا ہے جو ہر سال کی اموات کی اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ ہندوستانی مزدور ایک مٹھی بھر چاول پر زندہ رہ سکتا ہے سراسر غلط ہے۔ غذا میں کمی اور قوت نہ ہونے ہی سے ہندوستان میں عمر کا اوسط ۲۳ سال اور انگلستان میں ۵۵ سال کا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں اموات کا اوسط ۲۶٫۸ فی ہزار اور انگلستان میں ۱۱٫۷ فی ہزار تھا۔

۱۹۱۸ء میں بخار اور انفلوئنزا میں ایک کروڑ اور ۱۰ لاکھ آدمی مرے تھے اور کل آبادی پر ۶۲٫۲۶ فی ہزار کا اوسط تھا اس سال آگرہ میں ۱۲۸٫۹۵ فی ہزار، کانپور میں ۹۹٫۹۱ فی ہزار اور پونا میں ۸۴٫۵ فی ہزار کا اوسط تھا۔ یہ حال صرف شہروں ہی کا نہ تھا بلکہ دیہاتوں کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ ڈاکٹر سی۔ سی۔ بنٹلی نے اپنی رپورٹ ۱۹۲۷ء میں لکھا ہے۔

"صرف بنگال میں ہر سال دس لاکھ آدمی مر رہے ہیں۔ ۱۰ سال سے کم عمر کے بچے ۱۰ فیصدی کی تعداد میں مرجاتے ہیں۔ یہ محض خراب خوراک سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جو آدمیوں میں پھیلی رہتی ہیں۔ گذشتہ سال ۱۲۰ ہزار ہیضہ سے، ۳۵ ہزار ملیریا سے، ۳۵۰٫۱ ہزار دق سے مرے ہیں۔ اوسط یہ ہے کہ ہر سال ۵۵ ہزار حال کے پیدا شدہ بچے مرجاتے ہیں۔"

یہ برابر دیکھنے میں آرہا ہے کہ ہر سال ہیضہ، پلیگ، اور چیچک کے مریض بڑھتے جا رہے ہیں اور ہزاروں ہندوستانی ذرا سی بے پرواہی سے مرجاتے ہیں۔ ڈاکٹر سر جون میگو نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ سارے ملک میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ انسان مختلف بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ دق کے بیمار ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دق کی بیماری ہر سال ہمارے ملک میں بڑھ رہی ہے۔ رات کا اندھاپن جو خوراک ٹھیک نہ ملنے سے ہوجاتا ہے اس میں ۶ لاکھ آدمی

مبتلا ہیں۔ رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ۳۹ فی صدی آدمیوں کو خوراک ٹھیک ملتی ہے۔ ۴۱ فی صدی لوگ خراب خوراک سے اپنا گذارا کرتے ہیں اور باقی ۲۰ فی صدی کو تو بدترین کھانا ملتا ہے۔ اس سلسلے میں بنگال کی حالت بہت افسوسناک ہے وہاں موتیں بہت ہوتی ہیں اور اوسط ہزار پر ۵۰ آدمیوں کا ہے۔ مزدوروں کی حالت اور بھی بدتر ہے۔ ایک کوٹھری میں رہنے والے خاندان کی موتوں کا اوسط ہزار پر ۵۷۷ اور دو کوٹھری میں رہنے والوں کا اوسط ہزار پر ۲۵۴ ہے ہسپتال میں مرنے والوں کی تعداد ہزار میں ۱۰۷ کی ہے۔ ملے

اب ہندوستان کے سرمایہ داروں کی آنکھیں کھل گئی ہیں کیونکہ مزدور کی خراب تندرستی سے اُس کے کام میں ہرج ہوتا ہے۔ ہر کارخانے والے نے اپنے ہسپتال کھلوا دئے ہیں اور دوائیوں کا بھی انتظام کیا ہے۔ ہندوستان میں کل ۱۷۷۴ ہسپتال ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں کانگریس آف میڈیکل ریسرچ ورکرس نے خاص توجہ سے کام کیا ہے اور مزدوروں کو بیماریوں سے بچانے کے لئے مختلف تدابیر سوچی جارہی ہیں کیونکہ اب یہ اچھی طرح سے معلوم ہوچکا ہے اگر مزدور کی تندرستی اچھی ہوگی تو اُس سے اچھے سے اچھا کام لیا جاسکتا ہے۔

مزدوروں کی تعلیم

ولایتی سرمایہ دار ملک اس نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ جس طرح مزدور کے لئے صحت اور تندرستی ضروری ہے بالکل اُسی طرح اُس کے لئے تھوڑی بہت تعلیم بھی ضروری ہے لہٰذا انھوں نے اپنے یہاں جبریہ تعلیم کا سلسلہ جاری کرایا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس مسئلہ پر کئی سال سے غور ہو رہا ہے اور ملک کی مجلسِ قانون ساز نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے ۱۹۳۰ء تک ملک میں ۱۳۲ میونسپل بورڈوں نے اور ۱۴۲۷ دیہاتوں میں جبریہ تعلیم کا نفاذ ہوگیا تھا۔

سائمن رپورٹ (حصہ دوم) میں بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جس قدر بھی ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اُس میں سے فوج پر کل آبادی میں ۲ روپے ۴ آنہ فی آدمی، تعلیم پر ۴½ آنہ فی آدمی خرچ

کیا جاتا ہے۔ ریاست بڑودہ میں تعلیم پر برٹش انڈیا میں فی آدمی کی تعلیم سے تین گنا یعنی پ۱۲ آنہ فی آدمی خرچ ہوتا ہے انگریزی ہندوستان کی ۲۴ کڑور آبادی پر گورنمنٹ صرف ایک کڑور پونڈ تعلیم کے لئے خرچ کرتی ہے اور انگلستان کی ۴ کڑور کی آبادی پر گورنمنٹ پانچ کڑور پونڈ سے بھی زائد صرف کرتی ہے،

تعلیم اور صحتِ عامّہ جو نہایت ضروری چیزیں ہیں اُن پر اتنا کم روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ دیگر امداد وشمار سے معلوم ہوا ہے کہ انگریزی ہندوستان سے تو ریاستی ہندوستان ہی تعلیم کے اوپر بہت خرچ کرتا ہے۔ سارے ہندوستان میں لکھنا پڑھنا جاننے والے مرد تقریباً ۱۴ فی صدی اور عورتیں ۲ فی صدی ہیں۔ میسور جیسی چھوٹی ریاست میں مرد ۱۴ فی صدی اور عورتیں ۲ فی صدی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں تعلیم کے لئے مزدور اور کسان بھی بیدار ہو رہا ہے اور جیسے ہی ہندوستان کے مزدور میں بیداری پیدا ہوئی اس وقت آپ دیکھیں گے کہ ہندوستانی مزدور کسی ملک کے مزدور سے کم نہ رہے گا۔

تہذیب جدید کا انجام

(مولوی محمود علی خاں صاحب جابی سے - بھوپال)

سناؤں تمہیں داستانِ الم — وہ تہذیبِ حاضر کا ظلم و ستم
مسلّم ہیں تہذیب کی نعمتیں — مبارک ہیں سائنس کی دولتیں
عروجِ تجارت بطرزِ عجیب — قرونِ گذشتہ کو کب تھا نصیب
رسل اور رسائل کی آسانیاں — ہوئیں جن سے آساں جہانبانیاں
بساطِ زمیں پر وہ ریلوں کا جال — لئے پھرتی ہیں جو تجارت کا مال
وہ ڈاک اور مسافر کو لیکر رواں — شب و روز شام و سحر ہیں دواں
وہ بے تار پیغام کا سلسلہ — دیا جس نے عالم کو یکسر ہلا
سنا کرتے ہیں تھا کبھی جام جم — تصاویرِ برقی ہیں کیا اس سے کم
رواں جس گھڑی ہو دخانی جہاز — جھکائے سمندر جبینِ نیاز
وہ سینہ میں دوزخ جلاتا ہوا — گرجتا ہوا تیز جاتا ہوا
فلک سیر طیارہ گانِ عظیم — سفر جن میں کرتے ہیں اہلِ نعیم
مسافت مہینوں کی گھنٹوں میں طے — عجیب اس سے ممکن ہے کیا اور شے
وہ دنیائے صنعت کی اعلیٰ مثال — وہ سائنس کا انتہائی کمال
سفینے مسلح بہ آلاتِ جنگ — وہ انسان کے تیار کردہ نہنگ
وہ عفریت پیکر مشینوں کا زور — بپا کرتی ہیں جو قیامت کا شور
ترقی وہ تشریح کی بے مثال — گزرتا نہ تھا جس کا دل میں خیال
وہ آلات مہلک وہ توپ و تفنگ — کہ عقلِ بشر جن سے رہ جائے دنگ

مشین اور سائنس کا یہ کمال
ہے اخلاق و انسانیت کا زوال

خدا اور مذہب سے بیزار ہیں
فقط سیم و زر کے پرستار ہیں

سیاست سے کشور کشائی کریں
غریبوں پہ زور آزمائی کریں

وسائل ذلیل و سیاست ذلیل
بظاہر بنیں امن کے وہ کفیل

مہذب درندوں سے عالم تباہ
کریں ذبح بھرنے نہ دیں پھر بھی آہ

کریں منعقد مجلس اقوام کی
نمود و نمائش فقط نام کی

حبش لقمۂ آز اٹلی بنے
یہ معصوم خرمن وہ بجلی بنے

وہ اسپین کا کشت و خوں الاماں
وہ مزدور و سرمایہ کی داستاں

تقاضائے تہذیب حرص شدید
تمدن کا معیار ھل من مزید

اُدھر جوعِ ارضی سے جاپان تنگ
بپا جس نے کی ہے قیامت کی جنگ

یہ سب کچھ ہے اس یوم بد کی خبر
کہ تہذیب ہو جبکہ زیر و زبر

بپا ہو قیامت کی جنگِ عظیم
فراموش ہو جائے جنگ عظیم

سمندر میں افواج کی دار و گیر
بیک لحظہ غرقاب جم غفیر

وہ بحری جہازوں کی حربِ عظیم
بنائیں جو پانی کو نارِ جحیم

وہ مسموم گیسوں سے مردوں کا ڈھیر
کہ زاغ و زغن جن سے ہو جائیں سیر

غریبوں کی موت اور یتیموں کی آہ
غضب کی قیامت خدا کی پناہ

امیروں کے مسکن غریبوں کے گھر
مکان و مکیں خاک ہوں سربسر

یہ صدیوں کا تیار کردہ نظام
فنا ہو نہ لے کوئی بھی اس کا نام

وہی بربریت کا دورِ عمل
وہی سعی انساں کا روزِ ازل

یہ دولت تمدن کی کھو جائے گی
یہ تہذیب ماضی میں سو جائے گی

رفتارِ عالم

پیمان سعد آباد

معاہدہ سعد آباد (ترکی، افغانستان، ایران اور عراق کا معاہدہ) کا متن عام اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، جن پُر خلوص اُمیدوں اور جذبِ صادق کے ساتھ اس معاہدہ کی تکمیل عمل میں آئی ہے۔ وہ بہت خوش آیند ہے، اس موقعہ پر کاخ سعد آباد میں متعاہد حکومتوں کے نمائندوں نے اس پیمان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا تھا، ہم چاہتے ہیں کہ ان تقریروں کا اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کریں

ان تقریروں میں "اسلام" کا لفظ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ لیکن اس پر اگر کسی کو رنج ہو تو شاید اس کی اپنی کوتاہ بینی ہے۔ تقریروں کے ایک ایک لفظ سے اسلام کی سچی تعلیم کی ترجمانی ہوتی ہے۔ نام کو بغیر معنی کے استعمال کرنے والوں نے نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ اب معنی کو بلا نام کے بیان کرنا پڑتا ہے۔

آقائے سمیعی وزیر خارجہ ایران | آقائے سمیعی نے مختصری تمہید میں معاہدہ پر انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

"اس معاہدہ کی اہمیت ایک کھلی ہوئی چیز ہے، بالخصوص اس لئے کہ ان چاروں ملتوں کے اس مضبوط اتحاد سے مغربی ایشیا میں صلح قائم رکھنے میں غیر معمولی مدد ملے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایشیا عام طور پر امن و امان سے ہم آغوش رہیگا"

رئیس الوزراء دولت ایران | رئیس الوزراء ایران نے تمہید میں ایران و عراق کے تنازعہ کے دوستانہ فیصلہ پر ڈاکٹر توفیق رشدی آراس اور ڈاکٹر ناجی الاصیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ

"آج جس مسرت بخش کام کو ہم نے انجام دیا ہے اس کی نظیر ہمارے ملکوں کی

تاریخ میں موجود نہیں ہے، میرے پاس الفاظ نہیں جن سے میں اپنی مسرت
کا اظہار کر سکوں۔ بلاشک وشبہ آج کے معاہدہ نے ہمارے دوستانہ تعلقات
میں ایسا استحکام پیدا کر دیا ہے کہ جس سے چاروں ملک باہم دگر مربوط ہو گئے ہیں ۔
ہمارا یہ پیمان جس کو آپ نے بہ نظر لطف وکرم پیمان سعد آباد سے موسوم کیا ہے
سیاسی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس اتحاد کے
بغیر ہم دنیا کے لئے کس حد تک توجہ کے قابل تھے! ہمارا یہ پیمان مشرق کی صلح
کا بہترین ضامن ہے"

آقائے سردار فیض محمد خاں وزیر خارجہ دولت افغانستان! "میں نازاں ہوں کہ اعلیٰحضرت ہمایوں نے ایک ایسے اہم کام کی انجام دہی کے لئے ہم سب کو یہاں جمع فرمایا۔ اور ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ ہم مشرق کے بسنے والوں کا مرنا اور جینا مشترک ہے، ...."

جیسا آقائے رئیس الوزراء نے فرمایا ہے" اس معاہدہ سے کسی حکومت کی مخالفت مقصود نہیں ہے بلکہ اتحاد واتفاق کی ایک جائز آرزو ہے جسے ہم نے آج عملی جامہ پہنا دیا ہے، اور ہماری یہ آرزو اس لئے ہے کہ ہم دنیا میں صلح وامن کو قائم رکھنے میں مدد دیں، اور بنی نوع انسان کی خدمت کر سکیں"

ڈاکٹر ناجی الاصیل وزیر امور خارجہ عراق! "آج کا واقعہ ایک یادگار واقعہ ہے، اسی لئے ہم بکمال افتخار شرکت کے لئے آئے ہیں۔ سعد آباد کی سرزمین میں آج محبت ومودت کا جو بیج بویا گیا ہے اس کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ میں ہر چہار وزراء کو معاہدہ کی باقاعدہ تکمیل پر مبارکباد دیتا ہوں۔ طہران وانگورہ، اور کابل وبغداد نے جو قدیم متمدن قوموں کے پایہ تخت ہیں اپنے اس اتحاد سے یہ ثبوت دیا ہے کہ صلح وآشتی کے قیام میں تعاون کرنا ان کے نزدیک ترقی وسعادتِ قومی کی اساس ہے، ان قدیم ملتوں نے عالم انسانی کی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور اس مبارک معاہدہ کے ذریعہ تہذیب انسانی کے بعد کر اپنی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لئے قدم اٹھا رہے ہیں، مشرق اب خواب غفلت سے بیدار ہو گیا ہے اور بہت سے نمایاں کارناموں سے اپنی عظمت وصلاحیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ مشرق کا

یہ دور جدید جس کا افتتاح کا رخ سعد آباد کے اس تاریخی پیمان سے ہو رہا ہے ہم میں برادرانہ محبت، دائمی دوستی اور حسن تفہیم کی بنا ڈالے گا“

توفیق رشدی آراس، وزیر خارجہ ترکیہ | ”سعد آباد کے قصر شاہی کا یہ پیمان مشرق جدید کی صبح امید کا پیغام ہے، اس معاہدہ نے تاریخ مشرق میں جس صفحہ کا اضافہ کیا ہے اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی، ....

روحانی نقطۂ نظر سے پیمان مذکور جائز اہمیت کا مالک ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ وہ الفت و محبت کا فنا نہ ہونے والا سرچشمہ ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ تمام عالم میں یہ چشمہ فیض جاری ہو جائے۔

....

یہ معاہدہ تکمیل انسانیت کی راہ میں ایک قدم ہے۔ اس معاہدہ نے دنیا میں ایک مشترک وطن اور برادری کی نیو رکھی ہے“

”اب پرانی کشاکش اور دیرینہ کینہ جوئی کی بجائے جس نے ہمارے وطن کو ویران کر رکھا تھا محبت و الفت کا دور ہو گا۔ اور جو ملت ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گی ہم خوشی کے ساتھ اُسے اپنے آغوش میں جگہ دیں گے۔ ہمارا یہ پیمان اس لئے نہیں ہے کہ ہم صرف اپنی نگہداشت کریں ہم تو چاہتے ہیں کہ وسیع کرتے کرتے تمام قوموں کو اس میں شامل کر لیں۔

میں بھی اُن ملتوں کا ایک فرد ہوں جن کی تاریخ فتوحات و افتخارات سے مزین ہے لیکن اسی قدر شکستوں اور مصیبتوں کے اثرات سے اس کا چہرہ زخمی بھی ہے اور اسی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں کسی قوم پر بھی رشک کی ضرورت نہیں، لیکن ایک چیز ہے جس سے ہم سب قرنوں سے محروم ہیں محبت اور دوستی ہے۔ اس لئے اس مقام سے جو دنیا کے قدیم ترین تمدن کا مرکز ہے میں بآواز بلند کہتا ہوں ہم اس جگہ کو ساری دنیا کی الفت و یگانگت کا مرکز بنانا چاہتے ہیں اور اجازت ہو تو اتنا اور عرض کر دوں کہ اس عشق و تعلق کی سرحد کرۂ ارضی کی انتہا کے سوا کچھ نہ ہوگی۔

میں صمیم قلب کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو آرام اور سکون

کے ساتھ پرورش کر سکیں ، ہمارے کسان پورے امن و اطمینان کے ساتھ اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال کریں

در مختصر یہ کہ خوش قسمت او رسعید قوموں کے ساتھ ہر قوم مامون ومحفوظ رہے۔

صلح ہمارے نزدیک وسیلہ نہیں بلکہ مقصود ہے۔ اگر ہم قوی بننا چاہتے ہیں تو اس لئے کہ دنیا ضعف سے نفرت کرتی ہے۔ ہم جنگ سے بیزار ہیں تو اس لئے نہیں کہ ہمیں اس سے دہشت ہوتی ہے بلکہ س لئے کہ ہمارے یقین میں آج تک یہ دوا نہ کسی دُکھ کا علاج کر سکی ہے اور نہ کسی مشکل کو حل کر سکی ، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم جنگ کا جواب خاموشی سے دیں لیکن ہاں یہ ضرور چاہتے ہیں کہ پہل کسی حالت میں ہماری طرف سے نہ ہو

.... ہمیں فوج اب بھی عزیز ہے اس لئے نہیں کہ وہ ہمارے امن کی ضامن ہے بلکہ اس لئے کہ وہ نظم ونسق ، ترک نفس اور وطن پرستی کا مکتب ہے۔

اگر سامان حرب کی نسبت قطعی طور پر طے ہوجائے اور نوع انسانی آلات جنگ کی تدریجی کمی کی قائل ہو جائے تو اسی روز ہم اپنے توپخانہ کو کسانوں کے سپرد کردیں گے تاکہ وہ ان سے اپنے مطلب کے اوزار تیار کریں۔

ہم چاہتے ہیں کہ خطرہ نہ ہمارے درمیان باقی رہے اور نہ دوسری اقوام عالم کے درمیان رہے' یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر جامۂ بشریت کے ذریعہ ہم دوسری قوموں کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بین المللی آسائش وآرام کے مسائل محض سیاسی طور پر حل نہیں ہو سکتے ، اقتصادی مسائل جو کسی طرح بھی سیاست سے کم اہم نہیں ہیں ہماری توجہ کے خاص محتاج ہیں ....

بین المللی کثرت مبادلات کے سلسلہ میں اعتماد اور باہمی امداد بہت قیمتی عوامل ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان عوامل کو سیاست ومعیشت میں علیحدہ علیحدہ تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر سیاسی اختلافات کی بنا دراصل معاشی مسائل پر مبنی ہے ، یہ صحیح ہے کہ آج سب ملکوں میں سیاست ومعیشت کے درمیان وہ ربط وتعلق نہیں ہے جو ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ذمہ دار لوگ اس حقیقت سے اب بخوبی واقف ہو گئے ہیں ، اور آپس کے سیاسی مسائل میں مناسب نظم وترتیب پیدا کرنے کی

سعی کر رہے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کوششیں کامل اتحاد و اتفاق کے ساتھ کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ ہمارے خیال میں ان کوششوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہونا چاہئے اس لئے کہ ملی منافع خواہ سیاسی ہوں یا اقتصادی جب تک منافع عمومی کے ساتھ ترکیب نہ پائیں اطمینان بخش نہیں ہوسکتے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ خود و گیران سیاست اس پر یہ اعتراض کریں گے کہ اس سے ملی منافع اور خود داری کو صدمہ پہنچے گا۔ لیکن ہمارا یقین ہے۔ اگر خود پرستی میں حقیقت شناسی کی لاگ رہے تو پھر دیگراں پرستی اور خود پرستی میں فرق باقی نہیں رہتا۔ اور یہ جذبہ محض تربیت نفس اور قومی تعلیم اور بالخصوص نوجوانان ملت کی تربیت سے پرورش پا سکتا ہے۔ بچوں کی تعلیم میں ہر موقع پر ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ عیش و مسرت کی گھڑیاں ایام معیبت نہ بن جائیں۔ سیاسی اور معاشی مسائل کو متوازی حیثیت دے کر جذبہ مفاہمت کے ساتھ حل کرنا چاہئے۔ اور دنیا کی تمام قوموں کے لئے سیاسی امن و امان اور معاشی آسائش و آرام کی مساوات کی حمایت کرنی چاہئے۔

مصری روئی

مصر کی معاشی خوش حالی کا دارومدار روئی پر ہے اور مصری روئی کی قیمت کا کم اور زیادہ ہونا امریکن روئی کی مقدار پر موقوف ہے۔ اس سال امریکن روئی کی پیداوار کا خیال ہے کہ گذشتہ سال کی نسبت ۱/۵ حصہ زیادہ ہوگی۔ خود مصر میں بھی اس سال مقدار پیداوار زیادہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت روئی کی قیمت میں ۳۰ فیصدی کے قریب کمی آگئی ہے۔ اور روئی کی قیمت گھٹ جانے کا لازمی اثر یہ ہے کہ باقی تمام ضروریات بقدر ۳۰ فیصدی کے قیمتی ہوگئی ہیں۔ ذیل کے اعداد و شمار سے امریکن اور مصری روئی کی مقدار پیداوار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

گذشتہ سال امریکن روئی			ایک کروڑ پچیس لاکھ گانٹھیں	
اس سال	”	” (اندازہ)	ایک کروڑ ساٹھ	”
گذشتہ سال مصری روئی			ساڑھے بائیس لاکھ	”
اس	”	” (اندازہ)	پچیس لاکھ	”

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس

ماہ رواں میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مسٹر جناح کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ لیگ کا اجلاس یہ دوسری مرتبہ لکھنؤ میں ہوا اور مسٹر جناح بھی دوسری مرتبہ لیگ کے صدر ہوئے۔ اس سے پہلے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں اجلاس ہوا تھا اور اتفاق سے مسٹر جناح ہی اس کے صدر تھے۔ لیگ کا یہ بالکل پہلا اجلاس تھا جس میں مسٹر جناح شریک ہوئے تھے۔ ۱۹۱۶ء سے پہلے وہ کانگریس کے نہ صرف معمولی ممبر تھے بلکہ اس کی مجلس منتظمہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن تھے اور لیگ کی شرکت سے ہمیشہ اس لئے انکار کرتے تھے کہ وہ اسے ایک فرقہ وارانہ جماعت سمجھتے تھے۔ جب ۱۹۱۶ء میں لیگ کا اجلاس بھی کانگریس کے ساتھ ہی لکھنؤ میں ہونا طے پایا۔ اور آنے والے دستور کے لئے لیگ اور کانگریس سمجھوتے کے امکانات معلوم ہوئے تو مسٹر جناح نے اس شرط پر لیگ کی شرکت اور صدارت منظور کی کہ لیگ بھی وہی نصب العین منظور کرے جو کانگریس کا ہے۔ چنانچہ مسٹر جناح کی تحریک پر مسلم لیگ نے ۱۹۱۶ء میں "درجہ نوآبادیات" کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس نے "درجہ نوآبادیات" کو بدل کر "سوراج" کو اپنا نصب العین قرار دیا تو مسٹر جناح ؎

اگر یک سرمُوئے برتر پرم　　فروغ تجلّی بسوزد پرم

کہتے ہوئے کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ اس وقت سے موصوف کانگریس سے برابر دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس دوری کے باوجود زمانے کی رفتار کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس نصب العین کی وجہ سے مسٹر جناح نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی تھی آج ۳۶ء میں لکھنؤ میں خود آپ کی تحریک پر لیگ نے اسی کو تسلیم کر لیا۔

لیگ کے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۶ء کے اجلاسوں میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ دونوں اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ دونوں کے صدر مسٹر جناح ہوئے۔ دونوں میں لیگ کا نصب العین

تبدیل ہوا اور لیگ کی ساری تاریخ میں یہی دو اجلاس ایسے نظر آتے ہیں جن میں حیات کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ۱۹۱۶ء کے اجلاس میں تعمیری حیات جلوہ گر تھی اور لیگ نے کانگریس کے ساتھ وہ تاریخی معاہدہ کیا تھا جو تقریباً حرف بحرف مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم میں شامل کرلیا گیا تھا۔ بخلاف اس کے موجودہ اجلاس میں تخریبی عناصر کارفرما نظر آتے تھے۔ یعنی لیگ نے خود کوئی ٹھوس کام کرنے یا مسلمانوں کے لئے کوئی صحیح شاہراہ عمل تجویز کرنے کے بجائے سارا زور کانگریس کی مخالفت میں لگا دیا اور شاید اتنا زور لگا دیا جتنا شمع سحری اپنی آخری بھڑک میں صرف کردیتی ہے۔

بہرحال بادی النظر میں لیگ کا رویہ کتنا ہی مخالفانہ کیوں نہ رہا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ لیگ نے دو تجویزیں نہایت نتیجہ خیز منظور کیں۔ پہلی تجویز نصب العین کی تبدیلی سے متعلق ہے جس کی رو سے لیگ نے بھی قریب قریب کانگریس کا نصب العین تسلیم کرلیا اور دوسری تجویز کے ذریعے سے لیگ نے وفاق کی سخت مخالفت کی۔ یہ دونوں رزولیوشن لیگ کے ترقی پسند رویئے پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ خواہ یہ رویہ اس نے عمداً اختیار کیا ہو۔ یا مجبوراً اختیار کرنا پڑا ہو۔

لیگ کے موجودہ اجلاس میں تعمیری مقاصد کے ماتحت نہیں بلکہ محض کانگریس کی مخالفت میں مسلمانوں کے مختلف الخیال طبقے ایک جگہ جمع ہوگئے تھے۔ لیکن اُن کا اتحاد بھی اتنا ہی عارضی اور نمائشی تھا جتنا لیگ کا عام جوش و خروش۔ چنانچہ اگر مذکورہ بالا تجاویز کے منظور کرنے اور ترقی پسند رویہ اختیار کرنے کے بعد لیگ نے حسب دستور تمام کارروائی بلند آہنگ دعووں تک محدود نہ کردی بلکہ عمل کو بھی دخل دیا تو خواہ اس نے کانگریس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کی ہو وہ لازمی طور پر کانگریس سے قریب تر آجائے گی اور مسلمانوں کا سرکار پرست طبقہ خود بخود اس کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ لیکن اگر اُسے عمل کی توفیق نہ ہوئی تو آج نہیں کل اس کی موجودہ حیثیت کا فنا ہوجانا یقینی ہے یعنی بے عملی کی صورت میں وہ حکومت کی حامی اور سرکار پرست جماعت بن جائے گی۔ اور عمل کی صورت میں وہ کانگریس کے دوش بدوش آکھڑی ہوگی۔ اس کے علاوہ لیگ کے لئے کوئی

تیسرا راستہ نہیں ہے۔

علاوہ ازیں دو عناصر اور بھی ہیں جن کی وجہ سے لیگ کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ لیگ کا پروگرام تمام تر سیاسی ہے۔ اس کی ساری جدوجہد کونسلوں اور اسمبلیوں کی نشستیں حاصل کرنے اور سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے تک محدود ہیں۔ اس کے آگے نہ اب تک لیگ نے کچھ کیا ہے اور نہ موجودہ اجلاس میں آئندہ کے لئے کچھ طے کیا۔ یعنی لیگ میں اقتصادی پروگرام کا کوئی وجود نہیں ہے۔ مسلمانوں میں کارخانہ دار اور مزدور کا سوال زیادہ اہم اور نمایاں نہیں ہے۔ لیکن کسان اور زمیندار کا سوال اتنا ہی نازک ہے جتنا ہندوؤں میں ہے۔ اس کے باوجود لیگ نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی اور نہ موجودہ صورت میں وہ کچھ کر سکتی ہے۔ کیوں کہ لیگ پر زمیندار طبقہ پورے زور شور کے ساتھ چھایا ہوا ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ اپنے حقوق سے شمہ برابر بھی دست بردار ہو۔ اس کے علاوہ خود مسٹر جناح نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ خیال ظاہر فرمایا کہ بھوک، افلاس، تشدّد اور کسانوں کے حقوق کا شور مچانا کھلم کھلا اشتراکیت کا بیج بونا ہے۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ لیگ سے کسی اقتصادی پروگرام کے پیش کرنے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ اور جب تک یہ نہیں ہوتا لیگ کا وجود ہمیشہ خطرے میں رہے گا۔

دوسری چیز لیگ کا جمہور سے تعلق ہے۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس وقت لیگ بالائی اوسط طبقے کی جماعت ہے۔ زیریں اوسط طبقے اور جمہور سے اُسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مانا کہ موجودہ اجلاس میں اس کی کوشش کی گئی ہے اور لیگ نے اپنی فیس کُنیت کم کردی ہے اور مختلف صوبوں اور ضلعوں میں شاخیں قائم کرنے پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ لیکن بظاہر اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ جب ان شاخوں کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہ ہوگا اور ان کے سامنے کوئی عملی اور تعمیری پروگرام نہ ہوگا تو وہ کب تک باقی رہ سکتی ہیں وہ تو صرف برسات کی گھاس کی طرح ہوں گی جو پانی کے چند چھینٹے پڑنے

سے جم آتی ہے۔ اور پھر تیز دھوپ پڑنے سے مرجھا جاتی ہے۔ حیات دراصل عمل میں ہے۔ اور عمل کے بغیر جمہور سے واسطہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب تک لیگ جمہور سے واسطہ پیدا نہ کرے گی۔ اور اُن کے فائدے کے لئے کوشش نہ کرے گی۔ اس کی حیات کے امکانات معلوم۔ (م، ع، خ)

مدراس اسمبلی

جب سے کانگریس نے حکومت سنبھالی ہے۔ کانگریسی صوبوں میں بڑی چہل پہل ہے۔ اُن کی سرگرمیوں کے چرچے دوسرے صوبوں پر بھی اثر انداز ہیں۔ پہلی بار ہندوستان کے عوام نے محسوس کیا ہے کہ حکومت میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ ایسے موقعہ پر کسی ادارے میں عوام کے شامل ہو جانے سے جو ہماہمی، خلوص اور جوش پیدا ہو جاتا ہے وہ ایک بڑی حد تک دکھائی دے رہا ہے۔ خصوصاً اسمبلیوں میں اُن کا مظاہرہ بہت زیادہ دلچسپ اور پرجوش طریقے پر نظر آیا۔ یہ جوش نہ صرف عوام میں ہے بلکہ خواص تک اس میں سرشار نظر آتے ہیں۔ خصوصاً مدراس میں تو بڑی مستعدی اور چستی کے ساتھ ارکان حکومت و ممبران اسمبلی مصروف کار ہیں۔ ایک دن تمام ارکان نے یہ طے کیا کہ آج بجٹ کی کارروائی ختم کر کے چھوڑیں گے۔ چنانچہ اس روز نصف شب تک اجلاس ہوتا رہا۔ یہ ہندوستانی اسمبلیوں میں پہلی مثال ہے۔

بجٹ | عارضی وزارت کے زمانے میں گورنر نے چھ مہینے کے لئے بجٹ منظور کر دیا تھا کانگریسی وزارت کو بقیہ چھ ماہ کا بجٹ بنانا تھا۔ وہ بھی بہت جلد اس عجلت میں۔ اس نے جو بجٹ تیار کیا ہے، ستائش کے قابل ہے۔

اس وزارت کے لئے بجٹ بنانے میں بڑی دقتیں تھیں۔ صحت تعلیم اور اصلاحی کاموں پر خاص توجہ کی ضرورت تھی۔ پھر ترک مسکرات کا خسارہ۔ لگان کی کمی کا گھاٹا پورا کرنا اور عارضی وزارتوں کی فرو گذاشت کا خمیازہ بھی انھیں ہی بھگتنا تھا۔ اخراجات میں کمی کی

جو سب سے آسان اور بہتر صورت بڑی تنخواہوں میں تخفیف کی تھی وہ پہلے ہی سے شجر ممنوعہ ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ بجٹ میں کسی آمدنی کے اضافے کا امکان نہ تھا اگر عوام پر کوئی ٹیکس لگایا جاتا تو اُن کی کم آمدنی پر ایک مزید بار پڑتا جو کسی طرح مناسب نہ تھا البتہ متمول صاحبان پر انکم ٹیکس بڑھایا جا سکتا تھا۔ اس سے ان کی ذات پر چنداں اثر نہ پڑتا اور بجٹ بھی ایک حد تک متوازن ہو جاتا۔ لیکن قانون کی رو سے صوبجاتی حکومتیں اس معاملے میں بھی بے بس ہیں وہ انکم ٹیکس نہیں بڑھا سکتیں۔ اس لئے جوں توں کاٹ کر کے بجٹ بنا لیا گیا۔ بجٹ میں عوام کی بہبود اور قومی تعمیری کاموں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً لگان کی معافی کے لئے ۷۵ لاکھ ہیں۔ صحت، آب رسانی، زراعت وغیرہ کے لئے ۴۲ لاکھ سے زیادہ۔ چرخے کی صنعت کے فروغ کے لئے دو لاکھ۔ صفائی، قرض امداد باہمی اور دیگر تعمیری کاموں کے لئے بھی کافی گنجائش رکھی گئی ہے۔ باوجود اس کے ۶۰ ہزار پس انداز ہوتے ہیں۔

نشیلی اشیا کا ترک | نشیلی چیزوں کے ترک کرنے پر کانگریس کا بڑا زور ہے۔ مسکرات کی قباحت اور مضرات کے سب قائل ہیں اور اس کے ترک کے لئے بھی آمادہ۔ مگر اس راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ آب کاری کے محکمے کی آمدنی تعلیم پر صرف ہوتی ہے۔ اس کے بند کرنے کے معنی قوم کی بنیادی ضرورت، تعلیم کو روک دینے کے ہیں۔ اس لئے یہ مسئلہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن گاندھی جی تعلیم کے لئے ناپاک آمدنی کے سخت خلاف ہیں۔ کانگریس بھی "آب زمزم از دہانِ طشت" کی قائل نہیں۔ خود وزیر اعظم مدراس اس معاملے میں بہت کٹّے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں کہا ہے کہ میں وزارت کو ترک کر سکتا ہوں مگر ترک مسکرات کے خیال سے باز نہیں آسکتا۔ چنانچہ اسمبلی نے طے کر دیا ہے کہ تدریجاً اس بلا کو ملک سے ٹالا جائے تاکہ رفتہ رفتہ خسارہ پورا ہوتا جائے۔ اور کام بھی پختگی کے ساتھ انجام پائے۔ چنانچہ خیال ہے کہ تین سال میں یہ اسکیم کامیاب ہو جائے گی پورے صوبے میں ترک مسکرات سے آب کاری کے شعبے کو ......۵ روپے کا نقصان ہے، ابتداءً مدراس میں ایک ضلع طریقہ کا

کے طے کرنے اور کام کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ضلع سیلم ہے۔ سردست اس ضلع کی آب کاری کی ۰۰۰۰۰ ۱۱ روپے کی آمدنی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ تخمینۂ آمدنی صرف سال رواں کا ہے۔ ورنہ یوں یہاں سے آب کاری کی سالانہ آمدنی ۰۰۰۰۰ ۳۰ روپے ہے۔ اس ضلع کا ۷۰۵۸ مربع میل اور آبادی ۲۲۴۳۳۹۷۲ ہے۔

سیلم ضلع خاص طور پر اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ یہ وزیر اعظم مدراس کی جائے پیدائش ہے اور ان کا اثر و رسوخ اس ضلع میں بہت زیادہ ہے۔ اس کام کی نگرانی کے لئے ایک خاص افسر مقرر کیا گیا ہے۔ حکومت کا خیال ہے کہ مزید عملے کی ضرورت نہ ہوگی کیوں کہ اب تک جو ساقی تھے وہی محتسب بن جائیں گے۔ آب کاری کے شعبے کے لئے یہ بھی بڑی دلچسپ خدمت ہوگی۔

اس تجویز کا نفاذ ۳۰ راکتوبر سے ہو چکا ہے۔ حکومت کے کارندے، قومی لیڈر وزرار سب جلسے جلوس، وعظ و تلقین میں مصروف ہیں۔ جام و سبو لوٹ رہے ہیں۔ مے خانوں کی جگہ چار خانے بن رہے ہیں۔ پرانے پرانے مے گسار اپنے ہاتھوں پیمانہ و ساغر توڑ رہے ہیں۔ یہ سب وہاں ہو رہا ہے "جہاں ہندو راج" ہے۔ لیکن ہمارے "اسلامی صوبے" اب تک خاموش ہیں۔

کے توانم دید زاہد جام صہبا بشکند		می پرد رنگم حبابے گر بہ دریا بشکند

(م، ح)

ممالک متوسط کی اسمبلی

بجٹ | سی پی کی وزارت کے لئے بجٹ بنانا بہت ہی مشکل کام تھا، اس لئے کہ یہاں کی آمدنی زیادہ تر روئی پر موقوف ہے۔ لیکن اس سال کثرتِ باراں کی وجہ سے فصلوں کو نقصان پہنچا۔ اس نقصان سے بچنے کے بعد جو پیداوار ہوئی اس کے لئے بازار میں مقابلہ سخت ہے وجہ یہ ہے کہ اس سال امریکہ میں روئی کثرت سے پیدا ہو گئی۔ اس خاص مشکل کے علاوہ اس صوبے کے لئے ان تمام دقتوں کا سامنا بھی تھا جو اذ

کانگریسی صوبوں کو پیش آئیں۔

۳۸-۱۹۳۷ء کے بجٹ کے مطابق یہاں کی آمدنی ...۴۴ ۴،۷۴،۴ روپیہ اور خرچ ...۳۵ ۴،۷۴،۴ ہے۔ اس طرح ...۲۱ کی بچت ہوگی۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کانگریسی وزارت سے پہلے ۳۷-۱۹۳۶ء کے بجٹ میں ... ۶،۷۸ روپیہ کے خسارہ کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ لیکن وہ بڑھ کر ...۸۵۴۱ روپیہ تک پہنچ گیا۔ حالانکہ اس بجٹ میں وہ بہت سی قومی تعمیری مدات خرچ شامل نہیں تھیں۔ جو اس میں رکھی گئی ہیں۔

سی۔پی میں جنگلی مواضعات کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جن میں زیادہ تر گونڈھ اور بھیل قدیم قومیں آباد ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کی طرف اب تک کسی حکومت نے توجہ نہیں کی۔ لیکن کانگریسی وزارت نے اس کا خیال رکھا ہے۔ چنانچہ ہر حلقے میں ایک مدرسہ کھولنے کی اسکیم ہے۔ بجٹ میں ... ۸ روپیہ قانون مزارعات پر عمل درآمد اور قدیم باشندوں کی اخلاقی ترقی کے لئے جنگلی مواضعات کی تعلیمی ترقی کی خاطر ..۴۴، روپیہ سالانہ اور ۰۰ ۲، ۷ روپیہ یکمشت، ضلع ہتیوں کے لئے ...۱۲ منظور کئے گئے ہیں۔

بہت رواروی میں یہ بجٹ بنایا گیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بجٹ تک وزارتوں کو سوچنے کا موقع مل جائے گا۔ اور کام کا اچھا خاصا تجربہ ہو جائے گا۔ آمد و خرچ کی ہر مد اُن کے پیش نظر رہے گی۔ اس لئے وہ بہت بہتر بجٹ بنا سکیں گی۔ موجودہ صورت میں بھی یہ بجٹ بہت غنیمت ہے۔

ترک مسکرات | ترک مسکرات کی اسکیم ضلع ساگر اور نرسنگھ پور سب ڈویژن میں چلایا جانا طے ہوا ہے۔ نیز آکوٹ (برار) اور چند چیدہ صنعتی علاقوں میں بندش کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس تحریک سے صوبے کو ۳۳ لاکھ کا خسارہ ہوگا۔ اس گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے کئی سال پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ کچھ نئے ٹیکس لگائے جائیں گے جن کا غریبوں پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اور اسی اثنا میں یہ رقم دیہات سدھار کے کاموں پر صرف ہوگی۔

چونکہ اس سال شراب کے ٹھیکے دسمبر تک اور تاڑی کے اگست تک جاری رہیں گے اس لئے کل خسارہ ... ۳۵ روپیہ کا ہوگا۔

اعزازی پولیس کے افسر | یہ طے کیا گیا ہے کہ اعزازی پولیس افسر کا تقرر کیا جائے۔ تاکہ تنخواہ دار ملازموں میں

تخفیف ہو۔ اور پولیس کی اسپرٹ میں بھی نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔ سردست ایسے افسران مقامات اور فرائض پر مامور کئے جائیں گے جہاں جانوروں کی بے رحمی کے انسداد کی ضرورت سمجھی جائے گی۔ اس طرح ان افسروں کو بہت کچھ تجربہ حاصل ہو جائے گا۔ اور پولیس کے اونچے عملے میں تخفیف کا موقع ملے گا۔ نیز اس صورت میں عوام کو پولیس سے وحشت نہ رہے گی اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔



ایشیائی آداب

(کرنٹ ہسٹری)

روزنامہ

مونس اٹاوہ

مُسلمانوں کے حقوق کا سچّا محافظ۔ حق و صداقت کا علمبردار۔ حقیقی
کا شیدائی۔ حکومت کی پالیسی پر آزادانہ نکتہ چینی کرنے والا۔ آزادی
مسلم لیگ کا حمایتی۔ ہندوستان و ممالک غیر کی تازہ ترین خبریں شائع کر
صوبہ متحدہ کا نہایت ارزاں اخبار زیرادارت جناب مولوی فدا حسین صا
فاضل ادب کامل۔ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

ایجنٹوں کی ہر شہر و قصبہ میں ضرورت ہے۔ خط و کتابت سے مع
ہوسکتے ہیں۔ مشتہرین کے لئے خاص رعایت۔ نمونہ کا پرچہ مفت۔

جن لوگوں کو اخبار کی خریداری منظور ہو وہ ایک کارڈ بھیج کر ا
درج رجسٹر کرالیں۔ نامہ نگاروں سے خاص طور سے التماس ہے کہ اپنے
شہر کی اہم خبریں برابر بھیجیں جو بغیر کسی معاوضہ کے درج اخبار کی جاویں گی

چندہ سہ ماہی۔۔۔۔ عہ/
ششماہی۔۔۔۔ صہ/

پتہ :- مینیجر مونس اٹاوہ

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ، ڈی

جلد ۲۸	دسمبر ۱۹۳۷ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر

وردھا کی تعلیمی کانفرنس

(پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن) استاد جامعہ)

پچھلی جولائی سے رسالہ "ہریجن" میں ایسے مضامین نکلنے لگے جن سے سمجھنے والے سمجھ گئے کہ گاندھی جی کے دل میں ایک نئی دُھن سمائی ہے، اسی طرح کی دھن جس نے ستیاگرہ کی تحریک چلائی، قوم پرست ہندوستانیوں کو کھدر پہنایا، اور دو مرتبہ ہندوستان کے سارے جیل خانے کانگریسیوں سے آباد کردئے۔ یہ نئی دُھن تعلیمی ہے، مگر ابتدا اس کی اخلاق سے ہوئی، اور اسے پیدا دنیاوی حکمت عملی کے اس جال نے کیا جس میں اخلاقی حوصلے کا بلند پرواز عقاب اکثر پھنس جاتا ہے اور بیکسی کے غصے میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگتا ہے۔ مدراس کی کانگریسی حکومت نے ارادہ کیا کہ شراب کی تیاری اور خرید فروخت بند کرے اور یہ سوال فوراً اٹھ کھڑا ہوا کہ ایسا کیا گیا تو پھر تعلیمی منصوبوں کا کیا حشر ہوگا۔ اب تک تعلیم کا خرچ اس آمدنی سے نکالا گیا ہے جو شراب اور دوسری نشیات کی تجارت پر محصول لگانے سے ہوتی تھی، اور اس آمدنی کے موقوف ہونے سے عام جبری تعلیم کا ارادہ پورا کرنا درکنار ان تعلیمی اداروں کی جان پر بن جائے گی جو اس وقت موجود ہیں۔ یہ صورت حال ایک مدراس کے صوبے میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں پائی جاتی ہے، اور ہمارے ملک میں افلاس بھی اس طرح پھیلا ہے کہ مزید آمدنی کی ضرورت ٹیکس بڑھانے سے پوری نہیں کی جا سکتی۔ اس عملی دشواری نے گاندھی جی کے دل پر بہت اثر کیا، وہ سوچتے رہے کہ کیا کرنا چاہئے اور اچانک ان کے دل میں خیال آیا کہ تعلیم کو اپنا خرچ آپ برداشت کرنا چاہیئے۔ اس سے حکومت ہی کا کام آسان نہ ہوگا، بلکہ وہ بے روزگاری بھی بڑی حد تک دور ہو جائے گی جو ہمارے موجودہ نظام تعلیم نے پیدا کی ہے، کیونکہ تعلیم اپنا خرچ آپ برداشت تبھی کر سکتی ہے جب کتابیں پڑھا دینے کے بجائے دستکاری سکھائی جائے اور اتنا مال تیار کیا جائے کہ جسے بیچ کر اسکول اپنے اخراجات پورے کر سکیں۔

اپنا یہ خیال گاندھی جی نے "ہریجن" میں پیش کیا، لوگوں نے اس کے متعلق اپنی رائے دی اور گاندھی جی خود بھی اور نکتے اور تفصیلی باتیں جو اُن کی سمجھ میں آئیں بیان کرتے رہے۔ لیکن یہ معاملہ اتنا سلجھا ہوا نہیں ہے کہ مضمون لکھ کر طے کر لیا جائے، اس وجہ سے وردھا میں فن تعلیم کے ماہروں اور کانگرسی وزیروں کی ایک کانفرنس کرائی گئی۔

کانفرنس کے صدر مہاتما جی خود ہوئے۔ ان کی صحت بہت نازک ہے، اور اس ڈر سے کہ کہیں عین وقت پر ان کے قویٰ جواب نہ دیدیں انھوں نے چار یا پانچ روز پہلے سے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن کانفرنس کے پہلے اجلاس میں وہ قریب ڈیڑھ گھنٹے کے بولے اور تعلیم کا جو نیا طریقہ ان کے ذہن میں تھا اسے تفصیل سے بیان کیا۔ میں نے ان کی تقریر حرف بحرف لکھنے کی کوشش نہیں کی، اور گاندھی جی زبان کو سلجھانے اور آسان کرنے کے سوا اور کسی ادبی خوبی کی پروا نہیں کرتے، اس لئے میں ان کے خیالات کو اپنے الفاظ میں اور اختصار کے لئے ترتیب ذرا بدل کر بیان کردوں گا۔

گاندھی جی نے اس وقت کی اعلےٰ اور ابتدائی تعلیم پر جو اعتراض کئے وہ مسلم ہیں، انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ آئندہ تعلیمی نظام کو درست کرنے کے لئے ان دونوں کو الگ کر دینا ہوگا۔ ابتدائی تعلیم میں بھی انھوں نے شہروں کی ضروریات کو چھوڑ کر صرف دیہات کو مدنظر رکھا۔ موجودہ طریق تعلیم کے انھوں نے جو نقصان بتائے کہ اس کی بدولت دیہاتیوں کو شہریوں کی نقل کرنے کی خواہش ہوتی ہے، ان کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں اور کچھ نہیں تو انھیں اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ کر نوکری حاصل کرنے کی فکر ہو جاتی ہے، ان سب باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ انھیں شہروں اور شہری زندگی سے کچھ نفرت سی ہے۔ پھر بھی ہندوستانی آبادی کا اتنا بڑا حصہ دیہات میں رہتا ہے کہ گاندھی جی کے اس معاشرتی تعصب کا ان کی تجویز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اپنی تجویز کا یہ پہلو واضح کر دینے کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ ابتدائی تعلیم کے لئے عام طور سے چار سال کی جو مدت رکھی گئی ہے وہ بہت کم ہے، اسے بڑھا کر سات سال کر دینا چاہئے، اور ابتدائی تعلیم میں ثانوی تعلیم شامل کر کے پوری مدت کے لئے ایک مشترک اور مسلسل نصاب بنانا چاہئے،

اس طرح کہ فارغ ہونے پر لڑکے کی معلومات قریب قریب اتنی ہوں جتنی کہ اس وقت میٹریکولیشن کے لئے درکار ہیں۔ مگر یہ تعلیم خالی کتاب کے ذریعے سے نہ دینا چاہئے، جیسے کہ آج کل ہوتا ہے، بلکہ نصاب کا مرکز کسی دستکاری کو بنانا اور باقی تمام مضامین اسی کے ضمن میں پڑھانا چاہئے۔ گاندھی جی نے کہا کہ تعلیم کا یہ طریقہ بالکل نیا ہوگا، لیکن جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں مجھے تجربہ کرنے کے جو موقعے ملے ہیں ان کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس طریقہ پر تعلیم دینا نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ اس کی بدولت بے شمار فوائد بھی حاصل ہوں گے۔

اس وقت جو تعلیم عام طور پر دی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان اپنے خاندانی پیشے کو چھوڑ کر نئے ذرائع معاش تلاش کرتے ہیں۔ دستکاری کی جو تعلیم دیہات میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس میں ذہنی تربیت داخل نہیں، اور خود فن بھی جس طریقے پر سکھایا جاتا ہے وہ سائنٹفک نہیں، اور اسلئے یہ بھی اکثر ہوتا ہے کہ نوجوان اپنا آبائی پیشہ سیکھ کر بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ حکومت نے زراعت اور صنعت کی تعلیم دینے کے لئے جو مدرسے کھولے ہیں وہ ایسے اوزار، سامان اور تنظیم کی عادت ڈال دیتے ہیں کہ وہاں تعلیم پاکر پھر گاؤں میں کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت گاؤں میں اچھے دستکار نہیں ملتے اور دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ اگر ہم ابتدائی اسکولوں میں کام بھی سکھائیں اور ذہنی تربیت کا بھی انتظام کریں تو ہماری ہر غرض پوری ہو جائے گی۔ گاؤں کے رہنے والے گاؤں کو چھوڑے بغیر اپنا آبائی پیشہ اس طرح سیکھ لیں گے کہ وہ ان کا ذریعہ معاش بن سکے اور ان کے ذہنی قویٰ کی ایسی تربیت ہو جائے گی کہ وہ جدت اور ترقی کے حوصلے کر سکیں۔ کام کے سلسلے میں ذہنی تعلیم دی جائے تو دماغ پر بہت بوجھ نہیں پڑتا، اور ذہنی اور جسمانی نشو و نما میں ہم آہنگی رہتی ہے۔ سچی تعلیم دراصل دستکاری کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کے دیہاتوں میں ہر جگہ اب بھی بہت سی صنعتیں نیم جان یا انتہائی پستی کی حالت میں موجود ہیں جن کی تعلیم دی جا سکتی ہے، اور تکلی اور چرخا تو ایسی چیزیں ہیں جو ہر وقت اور ہر جگہ کام آ سکتی ہیں۔ کاتنے اور بننے کا کام کم سے کم سرمایہ سے شروع کیا جا سکتا ہے، اس میں یہ دشواری

بھی نہیں ہے کہ جو مال پیدا کیا جائے اس کی کھپت کیونکر ہو، اور اس کے دھندے ایسے ہیں کہ اس کے سلسلے میں تاریخ، معاشیات، ریاضی، جغرافیہ وغیرہ جیسے تمام علم بڑی آسانی سے سکھائے جا سکتے ہیں۔ ہم چاہیں تو ابھی سے تکلی ہاتھ میں لے کر اس نئے طریقے پر تعلیم دینا شروع کر سکتے ہیں۔ سیگاؤں میں اس وقت تکلی چلانے کے ساتھ ساتھ صفائی، حفظان صحت، ڈرل اور موسیقی کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

گاندھی جی کی تعلیمی تجویز کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نئی وضع کے مدرسوں کا نظام عمل ایسا ہو کہ وہ اپنا خرچ آپ برداشت کریں، یعنی اتنا مال پیدا کریں کہ اسے بیچنے سے ان کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ ہندوستان جیسے کنگال ملک میں تعلیم عام کرنے کا اور کوئی طریقہ ممکن ہی نہیں۔ ہمارے وزیر اس فکر میں رہے کہ آمدنی بڑھے تو تعلیم پھیلائیں تو انہیں بہت انتظار کرنا ہوگا۔ اگر وہ واقعی کام کرنا چاہتے رہیں تو انہیں اس اصول پر چلنا ہوگا کہ تعلیم اپنا خرچ آپ نکالے۔ دوسری طرف، اگر خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ مدرسے میں آمدنی کے خیال سے کام کرایا جائے۔ یہ سمجھ لینا کہ لڑکوں کے ہاتھ میں جو چیز دی جائے اسے وہ توڑ ہی ڈالیں گے بالکل بیجا ہے، اور ہم بغیر کسی دشواری کے کھلونوں کو تعلیم کا ذریعہ، اور پھر تعلیم کو آمدنی کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ ایک صاحب نے اس کے متعلق "ہریجن" میں لکھا ہے کہ لڑکوں سے اس طرح کام لینا ان کو غلام بنا لینے کے برابر ہے، لیکن اس طرح کا اعتراض صحیح نہیں، جب ہم دیکھتے ہیں کہ دیہی لڑکے اب بھی ماں باپ کے لئے برابر ایسے کام کرتے ہیں جن سے آمدنی کی امید ہوتی ہے۔ دیہاتی تو سب اس پر خوشی سے راضی ہو جائیں گے کہ ان کے لڑکوں کو دستکاریاں سکھائی جائیں، اور اگر اس تعلیم کا برابر بازار میں امتحان ہوتا رہا تو انہیں اور بھی زیادہ اطمینان ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے آپ کو اس دھوکے میں رکھیں کہ تعلیم صرف دان دی جا سکتی ہے، اور لڑکوں سے تعلیم کے لئے کچھ مل نہیں سکتا۔ حکومت کو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ مدرسوں اور طالب علموں سے یہ مطالبہ کر کے کہ وہ اپنا خرچ اپنے کام سے نکالیں وہ دراصل اس کا مطالبہ کر رہی ہے کہ تعلیم کارآمد ہو اور جو اسے حاصل کرلے وہ کمانے کھانے کے لائق ہو جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ ہمارے دیہاتی اسکولوں کے لئے مدرس کہاں سے آئیں گے۔ سو اس کا

مل وہی ہے جو پروفیسر شاہ نے پیش کیا ہے کہ ہم ان تمام لڑکوں کو جو میٹریکولیشن پاس کریں ایک سال کے لئے دیہاتی اسکولوں میں پڑھنے پر مجبور کریں۔ دوسرے ملکوں میں نوجوان فوج میں بھرتی کئے جاتے ہیں اور انھیں اپنی عمر کے دو سے لے کر چار سال تک قومی خدمت کے لئے وقف کرنا پڑتے ہیں اس لئے ہم اپنے نوجوانوں سے تعلیمی کام لیں تو اس میں کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔ جب ریاست لڑکوں کی تعلیم پر اتنا خرچ کرتی ہے تو وہ اپنے خرچ کا ایک حصہ اس طرح وصول بھی کر سکتی ہے۔

آخر میں گاندھی جی نے کہا کہ سیرت کی تشکیل کتاب کے ذریعے سے نہیں ہوتی، ہاتھ کے کام سے ہوتی ہے۔ خالی دماغ سے کام لینا آدمی کی صفت نہیں ہے، شیطان کی صفت ہے۔ تعلیم کے معاملے میں ہم یورپ کی تقلید نہیں کر سکتے، اسلئے کہ وہاں گولے بارود کا راج ہے، اور روس بھی ہمارے لئے کوئی مثال نہیں، اسلئے کہ ہم اہمسا کو مانتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں تعلیم پر بہت زیادہ خرچ کیا جاتا ہے لیکن ان کی دولت دوسری قوموں کا خون چوس کر حاصل کی جاتی ہے۔ ہمیں تو ایسی تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی جو ہماری معاشی حالت اور اخلاقی عقیدوں کے مناسب ہوں۔

گاندھی جی نے جو تجویزیں پیش کیں وہ ایسی تھیں کہ ایک طرف وزیر، جنھیں تعلیم کا انتظام کرنا تھا اور جو یوں بھی مالی مشکلات کے سبب سے پریشان تھے اور دوسری طرف ماہران تعلیم گھبرا گئے۔ وزیروں میں کوئی بھی نہیں مانتا تھا کہ تعلیم اپنا خرچ آپ برداشت کر سکتی ہے، لیکن اگر کانفرنس گاندھی جی کے اصرار پر طے کرتی کہ ایسا ہو سکتا ہے تو ان کی کچھ نہ چلتی، ان سے کہا جاتا کہ تعلیم کا بڑے پیمانے پر نئے اصول کے مطابق انتظام کرو اور اگر وہ ذرا بھی پس و پیش کرتے تو ہر طرف سے اعتراضات کی مار پڑتی۔ ماہران تعلیم زیادہ تر اس وجہ سے گھبرائے کہ وہ تعلیم کی پیچیدگیوں اور استادوں کی کوتاہیوں سے واقف ہیں، انھیں اخراجات کا بھی اندازہ ہے، اور اس لئے ان میں سے کوئی بھی یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا کہ مدرسوں میں دستکاری کے ذریعہ مکمل تعلیم دی جا سکتی ہے یا دستکاری سکھانے سے مدرسے اپنا خرچ نکال سکیں گے۔ لیکن دونوں اپنی بات کمزوریوں کے اعتراف کے پیرائے میں کہہ سکتے تھے، وزیر کہتے تو یہ کہتے کہ ہم میں اتنی انتظامی قابلیت نہیں ہے کہ ہم ایسے مدرسے بڑے پیمانے پر قائم

کر سکیں، ماہران تعلیم یہ کہتے کہ اب تک ہم نے جس طریقے پر پڑھایا ہے اس میں کتاب کے بغیر کام نہیں چلتا، کتاب کے ساتھ ہم اچھے استاد پر ہی بھروسا کرتے ہیں، اور اگرچہ ہم خالی کتابی تعلیم کو برا سمجھتے ہیں اور حتی الامکان ہاتھ کا کام بھی سکھاتے اور کراتے ہیں، ہم نے یہ کبھی نہ دیکھا ہے نہ سنا کہ مدرسے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو بیچ کر اپنا خرچ نکالتے ہیں۔ ہاں یہ بے شک ممکن ہے کہ ہم لڑکوں سے کارخانے کے اصول پر کام کرائیں اور کارخانے کا نام اسکول یا صنعتی اسکول رکھ لیں کانفرنس میں ایسے لوگ موجود تھے جنھیں دعوے تھا کہ انھوں نے دستکاری کے ذریعے سے مکمل تعلیم دی ہے اور مدرسے کی مصنوعات سے تعلیم کا پورا خرچ نکلتا ہے، اس لئے وزیروں اور ماہران تعلیم کی معذرت آمیز مخالفت کا نہ جانے کیا نتیجہ نکلتا۔ لیکن گاندھی جی نے تقریر ختم کر کے جب لوگوں سے کہا کہ اپنی اپنی رائے دیں تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ادھر اُدھر دیکھ کر اور سب کی نظریں نیچی پا کر کھڑے ہو گئے، اور ان کی تقریر نے سب کی مشکلیں آسان کر دیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب خود بھی سمجھتے ہیں کہ سچی تعلیم وہ ہے جس میں انسان کی تمام صلاحیتیں نشو و نما پائیں، اور چونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ خالی کتابیں پڑھ لینے سے یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا، اس لئے وہ بھی چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم میں خصوصاً ہاتھ کے کام کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ لیکن یہ مسئلہ تعلیمی ہے، اس کا روحانیات، اہمسا، دیہاتی تہذیب، تکلی اور چرخے سے کوئی خاندانی تعلق نہیں۔ ذاکر صاحب نے تقریر شروع اسی سے کی۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کا یہ خیال کہ وہ تعلیم کو ایک بالکل نئی صورت دے رہے ہیں صحیح نہیں، اس لئے کہ مشہور جرمن معلم پستالوئزی نے اسی طریقۂ تعلیم کو سب سے بہتر مانا ہے، اور اس کے بعد سے اس خیال کو عام طریق تعلیم میں شامل کرنے کی برابر کوشش ہوتی رہی ہے اور سینکڑوں معلموں نے تجربہ کر کے اس خیال کو بہترین عملی روپ دینے کی ترکیبیں نکالی ہیں۔ اس وقت اسی طریقے کی ایک خاص صورت امریکہ میں پروجکٹ متھڈ (منصوبی طریقہ) اور دوسری روس میں کومپلکس متھڈ کے نام سے رائج ہے۔ لیکن یہ طریقہ اتنا محدود نہیں ہے جتنا کہ گاندھی جی نے ظاہر کیا ہے، تکلی کے ذریعے ہر علم نہیں سکھایا جا سکتا

اور ایک دستکاری کو لے کر بیٹھ جانے سے کام کے ذریعے تعلیم دینے کا اصول برتا نہیں جا سکتا۔ گاندھی جی نے ابتدائی تعلیم کے لئے سات سال کی جو مدت مقرر کی تھی اس سے ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اختلاف کیا، اس بنا پر کہ یہ تعلیم اس وقت ختم ہو جائے گی جو دراصل صلاحیتوں کے ظاہر ہونے کی عمر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم اور تربیت نامکمل رہ جائے گی اور اس کا مقصد بھی یقین کے ساتھ نہ بتایا جا سکے گا کہ پورا ہوا یا نہیں۔ ہمیں چاہئے کہ سات برس کی عام جبری تعلیم کو تکمیل دینے کے لئے ایسے مدرسے قائم کریں جہاں مخصوص صلاحیتوں کے مطابق تربیت دی جائے، یعنی ایک مدرسہ دستکاری اور صنعتی تعلیم کے لئے ہو تو دوسرا ریاضی اور علوم طبیعی کے لئے، اور چونکہ ادبی ذوق بھی مانی ہوئی صلاحیتوں میں ہے، اس کی تربیت کے لئے بھی ایک مدرسہ چاہئے۔ چونکہ ہم اس طریق تعلیم کو بہت بڑے پیمانے پر رائج کرنا چاہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ہم چند ادارے منتخب جگہوں پر قائم کریں، اور وہاں اس کا تجربہ کر کے ایسے نمونے بنائیں جن کی پھر عام طور سے نقل کی جا سکے، ورنہ ممکن ہے کہ نئی تعلیم کے رواج سے ہمیں فائدہ کی جگہ الٹا نقصان ہو۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے ایک مختصر سی تقریر میں فرمایا کہ اگر بچوں کی تعلیم ساتویں برس شروع کی جائے تو اس کا بھی انتظام ہونا چاہئے کہ وہ پانچویں سے ساتویں برس تک تعلیمی کھیل کود میں مشغول رکھے جائیں اور مدرسے کی تعلیم کے لئے تیار کئے جائیں۔ مولوی صاحب کے بعد کئی حضرات نے جن میں قریب قریب سب کسی نہ کسی طرح کنڈر گارٹن کی تعلیم کا تجربہ رکھتے تھے کانفرنس کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔

کانفرنس کے لوگوں میں گاندھی جی کی تجویزوں سے بنیادی اختلاف صرف پروفیسر شاہ کو تھا۔ وہ سوشلسٹ ہیں اور ان کے خیال میں اس وقت مشین اور کارخانے سے عداوت برتنا جب کہ ساری دنیا میں انہیں کا راج ہے دریا کو الٹا بہانے کے منصوبے سے کم نہیں۔ گاندھی جی نے یہ طریقہ تعلیم بے روزگاری دور کرنے کے لئے سوچا ہے، لیکن تعلیم سے قطع نظر ہندوستان میں جو معاشی دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان کا سبب دولت کی غلط تقسیم ہے، اور یہ مسئلہ نئی تعلیم کی مدد سے حل نہ ہوگا۔ ہم دستکاری کی تعلیم دیں یا ایسے

تعلیم دینے کا ذریعہ بنائیں تو اس میں ایک خطرہ تو یہ ہے کہ سب لوگ ایک خاص ذہنیت کے نمونے بن جائیں گے اور ہماری غریبی اور بڑھ جائے گی۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اگر تعلیم کا خرچ نکالنے پر زور دیا گیا تو نئے مدرسوں کی صنعتی تعلیم ویسی ہی بیجان ہو جائے گی جیسی کہ کتابی تعلیم اس وقت ہو گئی ہے۔ معاشی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو تعلیم کا یہ طریقہ بڑی الجھنوں کا پیش خیمہ ہوگا۔ گاندھی جی کی تجویز کے مطابق ریاست نئے مدرسوں کو عمارت، سامان، استاد دے گی، اور ان میں جو چیزیں تیار ہوں انھیں بیچنے کا انتظام کرے گی۔ اس طرح کوئی دو کروڑ بچے ہر وقت صنعتی مال تیار کر کے منڈی میں ڈالتے رہیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر ان دستکاروں کا کیا حشر ہوگا جو اس وقت موجود ہیں، اور ان کو جنھیں نئے مدرسے تعلیم دے کر اپنی روزی کمانے بھیجیں گے اپنے مال کے خریدار کہاں سے ملیں گے۔ دراصل گاندھی جی کی تجویز اسی صورت میں قابل عمل ہو سکتی ہے کہ ہم دوسرے ملکوں سے مال کی درآمد بند کر دیں اور اپنی موجودہ صنعتوں کو بھی ختم یا کسی طرح نئے تعلیمی نظام میں محو کر دیں۔ لیکن پروفیسر شاہ کو بھی اس سے اتفاق تھا کہ تعلیم ہاتھ کے کام کے ذریعے سے دینا چاہئے، مگر اس میں بھی انھوں نے یہ شرط لگائی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے مخصوص استعداد کے مدرسوں کی جو تجویز پیش کی تھی وہ بھی منظور کی جائے، اور عام تعلیم کے انتظام کے ساتھ ایسے مدرسے بھی قائم کئے جائیں۔

پروفیسر شاہ کے بعد کئی اور حضرات نے تقریریں کیں جنھیں یہاں دہرانے کا موقع نہیں، اسی روز سہ پہر کو کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا۔ مہاتما جی نے شروع میں اعتراضات کا جواب دیا، لیکن ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ غلط فہمیاں رفع کریں اور یہ واضح کر دیں کہ وہ تکلی کا پرچار کرنا یا کسی نئے صنعتی نظام کی بنیاد رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان کے بعد جن لوگوں نے ان کے قریب بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر تقریریں کیں وہ ایک خاص ذہنی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور اپنے پیر و مرشد کی کمزوری اور پست ہمتی سمجھتے تھے کہ وہ دوسرے کی بات سنتے ہیں اور اس کے تجربے اور علم کی قدر کرتے ہیں۔ پہلے مقرر ونوبا صاحب نے کہنا چاہا کہ گاندھی جی کو سامنے سے ہٹا کر نئی تعلیمی تجویز پیش کرنے کا سہرا اپنے سر لے لیا اور فرمایا کہ "سر چین میں جو کچھ میں نے پڑھا اس نے میرے تجربے کی تصدیق کی، شاید گ سما نتا دلفظی شباہت) ہو تب بھی وچار

کے اندر جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کچھ چاہتے ہیں۔ یعنی گاندھی جی کی تجویز خاص ان کے ذہن کی ایجاد ہے، اور یہ جو کہا گیا کہ لوگ پہلے بھی اسے جانتے تھے وہ غلط ہے۔ آگے چل کر انھوں نے یہ فرمایا کہ آج کل لوگ محنت سے جی چراتے ہیں، استاد لڑکوں کو مدرسے کے سامنے پیشاب کرتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے، ان سے بیڑیاں منگواتے ہیں اور اپنی طرح انھیں بھی آرام طلب بنا دیتے ہیں۔ استادوں کی مخالفت کرتے کرتے ونوبا صاحب تعلیم کی بھی مخالفت کرنے لگے، اور ایسا کچھ کہا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ تعلیم کا لفظ دوسروں کی رعایت۔ شاید گاندھی جی کی اخلاقی کمزوری۔ سے درمیان میں آیا، ورنہ اصل کام تو دستکاری سکھانا ہے۔ گاؤں والے استاد اور تعلیم کی حقیقت معلوم کر چکے ہیں، وہ مروجہ قسم کے مدرسوں میں اپنے بچوں کو بھیجنے میں تامل کرتے ہیں، دستکاری سیکھنے کے لئے بڑی خوشی سے بھیجیں گے۔

ونوبا صاحب بول چکے تو کاکا صاحب کالیلکر کی باری آئی۔ انھوں نے ۱۹۰۸ء سے اپنا تجربہ اور اپنے تعلیمی نصب العین کے بدلنے کا قصہ سنایا، گاؤں کی اہمیت اور کتاب کی بے وقعتی جتائی، مشین سے اس وقت تک کام لینا حرام ٹھہرایا جب تک آدمی اور جانور کی پوری طاقت سے کام نہ لیا جا چکا ہو، پروفیسروں اور وکیلوں نے جو قوم کو الجھن میں ڈال رکھا تھا اس کی شکایت کی، اور اس کے بعد فلسفۂ تعلیم پر پہنچے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے چند ماہران تعلیم کے نام لئے تھے، یہ سب کاکا صاحب نے دہرائے اور فرمایا کہ میں ان سب کو پڑھ چکا ہوں، اور پھر یہ فتوی دیا کہ جب تک ہندوستانی ان قوموں میں شامل نہ ہو جائیں جو دوسروں کا خون چوس کر دولت حاصل کرتی ہیں تب تک ہندوستان میں مونٹے سوری اور پروجکٹ متھڈ (مشروبی طریقہ) رائج نہیں ہو سکتا۔

اس گولہ باری کے بعد صوبۂ متوسط کے وزیر تعلیم شُکلا صاحب نے تقریر کی۔ وہ خود اس فکر میں ہیں کہ عام جبری تعلیم کا خرچ کسی طرح سے نکالیں، اور انھوں نے یہ طے کیا ہے کہ جہاں جہاں اسکول بنائے ہوں وہاں اتنی زمین حاصل کرلیں جو استاد کی بسر اوقات کے لئے کافی ہو۔ اپنے مجوزہ مدرسوں کا نام انھوں نے "ودیا مندر" یعنی علم کا گھر رکھا ہے، اور انھیں وہ غالباً تعلیم کے ساتھ تنظیم کے مرکز بھی بنانا چاہتے ہیں۔ دستکاری کے ذریعے تعلیم دلانے میں انھیں کوئی عذر نہیں، اور مدرسے اپنا خرچ آپ نکال سکیں تو

انھیں بہت خوشی ہوگی، لیکن انھوں نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ممکن کیسے ہوگا۔ میں نے تو یہ سوچا ہے کہ واپس جاتے ہی حکم دیدوں گا کہ وردھا اور سیگاؤں کے اردگرد پندرہ بیس مدرسے بنا دئے جائیں، اور انھیں مہاتما جی کے سپرد کردوں گا کہ انھیں چلائیں۔ کامیابی کی صورت میں میں تیار ہوں کہ مہاتما جی جو نمونے پیش کریں ان کی نقل کردں۔

گاندھی جی کی خواہش پر اسی روز رات کو آٹھ سے دس بجے تک کانفرنس نے بحیثیت کمیٹی کے ان کی تجویزوں پر غور کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا۔ صدر کی حیثیت سے ذاکر صاحب کو ان لوگوں کی دلجوئی کرنے کا موقع مل گیا جنھیں ان کا یہ کہنا بہت ناگوار معلوم ہوا تھا کہ مہاتما جی کی تجویز نئی اور نرالی نہیں ہے، اور انھوں نے ان تمام لوگوں کو تقریروں کا موقع دیا جو اپنی قابلیت ظاہر کرنے کے لئے بے چین تھے۔ کمال یہ تھا کہ کام بھی ہوگیا، اور کمیٹی نے بحث کے بعد چار رزولیوشن اتفاق رائے سے کانفرنس کے سامنے پیش کرنے کے لئے مرتب کرلئے۔ رزولیوشن یہ تھے:

(۱) اس کانفرنس کی رائے میں سارے ملک کے لئے عام جبری تعلیم کا انتظام کیا جائے اور یہ تعلیم سات سال تک دی جائے۔

(۲) ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔

(۳) یہ کانفرنس مہاتما گاندھی کی اس تجویز کی تائید کرتی ہے کہ اس تمام مدت میں جو تعلیم دی جائے اس کا مرکز کوئی دستکاری ہونا چاہئے۔ یہ دستکاری ماحول اور ضروریات کا لحاظ رکھ کر منتخب کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو تعلیم اور صلاحیتوں کی تربیت کا جو طریقہ اختیار کیا جائے اس کا اسی دستکاری سے گہرا تعلق ہونا چاہئے۔

(۴) اس کانفرنس کو امید ہے کہ اس طریقہ تعلیم سے آہستہ آہستہ اتنی آمدنی ہونے لگے گی جس سے استاد کی تنخواہ نکل آئے۔

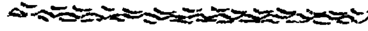
دوسرے روز کمیٹی کے یہ رزولیوشن کانفرنس کے سامنے پیش کئے گئے اور گاندھی جی نے یہ کہہ کر کہ کانفرنس کی تجویزوں کا مقصد ملک کو پابند کرنا نہیں ہے اور جنتا اور تعلیم یافتہ لوگوں نے انھیں دل سے قبول

نہ کیا اور مدد کرنے کو کھڑے نہ ہوگئے تو تجویزوں پر عمل نہ کیا جاسکے گا پھر حاضرین کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کی دعوت دی۔ پروفیسر شاہ نے پھر اصرار سے کہا کہ آمدنی پر زور نہ دینا چاہیئے، تعلیم کو کسی ایک صنعت تک محدود نہ کرنا چاہیئے۔ ایمی ناس لنگم صاحب، ایم ایل اے اور پروفیسر ملکانی صاحب نے اپنے تجربے کی بنا پر کہا کہ آمدنی اور تعلیم دونوں کا ایک ساتھ خیال نہیں رکھا جاسکتا، اور نانا بھائی صاحب نے بھی، جو بھاونگر کے ایک بہت مشہور اور کامیاب بچوں کے اسکول کے بانی اور مہتمم ہیں، کہا کہ تجارتی پہلو کا زیادہ خیال کیا گیا تو ابتدائی تعلیم کی تعلیمی قدر بہت گھٹ جائے گی۔ اس کے بعد وزیروں کی تقریریں ہوئیں، اور ان سب نے کانفرنس کی عام رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے بس بھر کرنے کا وعدہ کیا، مگر صبر اور احتیاط کی ضرورت بھی جتائی۔

آخر میں گاندھی جی نے کانفرنس میں جو خیالات ظاہر کئے گئے تھے ان پر ایک نظر ڈال کر کمیٹی کے چاروں ریزولیوشن کانفرنس کے سامنے پیش کئے اور وہ سب اتفاق رائے سے منظور ہوئے۔ گاندھی جی نے اس نئے طریقۂ تعلیم کے لئے نصاب بنانے کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی اور ذاکر صاحب کو اس کا صدر بنایا۔ ذاکر صاحب کو وردھا میں ایک دن کے لئے روک کر گاندھی جی نے نصاب کمیٹی کا پہلا جلسہ بھی کرالیا، اور یہ کمیٹی غالباً نومبر کے آخر تک اپنا کام ختم کردے گی۔

گاندھی جی نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ میں پہلے نہیں سمجھتا تھا کہ مجھ میں پروپگنڈا کرنے کی خاص صلاحیت ہے، لیکن لوگوں نے میری تعریف کرتے کرتے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ میں واقعی اس فن میں ماہر ہوں۔ دراصل لوگوں کی زبان سے زیادہ گاندھی جی کی اپنی یک جہتی اور ان کے خلوص نے ان کو تبلیغ کے فن میں کامل بنا دیا ہے۔ اور وہ اپنی بات کی دھوم ہی نہیں مچا سکتے بلکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرسکتے ہیں اور کرا سکتے ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت بھی ہے، جو خدا کی طرف سے صرف چند برگزیدہ ہستیوں کو ملتی ہے، کہ وہ آدمی ہی نہیں بلکہ زمانے کو بھی پہچانتے ہیں اور زندگی کو کبھی مقصد سے خالی نہیں رہنے دیتے۔ یہ ان ہی کی شخصیت کا فیض ہے کہ ہندوستان کی سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ ایسی معاشرتی تحریکیں بھی جاری رہیں جنہوں نے قومی خدمت کا حوصلہ اور استعداد رکھنے والوں کو برابر تعمیری کاموں میں

مصروف رکھا اور اب کہ مخالفت کی جگہ حکومت کے فرائض ادا کرنا کانگریس کے سپرد ہوا ہے۔ ان ہی کی نظر ہے جو وقتی دشواریوں اور ذمہ داریوں کے آگے دیکھا۔ یہی ہے کہ کانگریس کے موجودہ صدر نے کانگریس کو بحیثیت پارٹی کے مضبوط اور سب پر حاوی کرنے اور رجعت پسند ہاتھوں قدامت پسند اور فرقہ پرست مسلمانوں کی جڑ کاٹنے کا تہیہ کیا ہے، کانگریسی حکومتیں ابھی تک کندھے بدل بدل کر اپنے آپ کو سیاسی باربرداری کا عادی بنا رہی ہیں۔ گاندھی جی نے عام جبری تعلیم کی تحریک اٹھائی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری سیاست کی جان یہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قوم ان کی دور اندیشی کا حق ادا کر سکے گی یا نہیں۔ اپنی طرف سے تو وہ جو کچھ ہو سکتا ہے کر کے چھوڑیں گے۔"



ہندوستان میں مزدور تحریک

ابتدائی مزدور قوانین

سنہ ۱۸۸۱ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک

از ریاض الدین احمد صاحب ایم اے

ابتدائی مزدور قوانین کا دور ہندوستان کی کاروباری جدوجہد میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ملوں اور فیکٹریوں کا آغاز ہوا۔ اور جدید کاروباری اصول کی طرف ملک نے پہلا قدم اُٹھایا۔ اس وقت سیاسی بیداری اور کاروباری ہوش مندی کا فقدان تھا لیکن یہ مظاہرہ کسی حیرت انگیز اور غیر فطری حقیقت کا نہ تھا ہاں اگر عجیب اور غیر فطری کوئی چیز تھی تو وہ برطانیہ کی نامانوس ہمدردی اور مانچسٹر اور لنکاشائر کے "دکھلانے والے دانت" برطانوی تجار اور پیشہ وروں کا جو تعلق اس وقت تک ہندوستان سے قائم ہوچکا تھا اس کا مقتضیٰ یہی تھا کہ ہندوستان میں برطانوی مال تجارت کے لئے ایک عظیم الشان منڈی تیار کی جائے۔ جہاں نہ مقابلہ ہو نہ محاصل کی حدبندی۔ نہ صنعت وحرفت میں تیز رفتاری ہو نہ اس کے لئے کوئی جذبہ۔ یہ تھا وہ نظریہ جس کے تحت میں ہندوستان کے پہلے مزدور قانون کا مسودہ سنہ ۱۸۸۱ء بمبئی کی مجلس قانون ساز میں پیش ہوا۔ اس کے اہم نکات قارئین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مسودہ قانون سنہ ۱۸۸۱ء

(۱) بچوں کی عمر کا قانونی تعین

(۲) بچوں کے اوقات کا تعین۔

(۳) مشین کے خطرناک حصوں سے بچوں اور لڑکیوں کا تحفظ۔

(۴) تحفظ کے لئے چوگردوں کی تعمیر

(۵) حادثات کاروباری کی فوری اطلاع۔

(۶) فیکٹری انسپکٹروں کا تقرر۔

اگرچہ اس مسودے میں سہراب جی شاپور جی بنگالی کا ہاتھ تھا، جو یقیناً ہندوستان کے ان ناقابل فراموش بہی خواہوں میں سے تھے جن کا دل غریب مزدوروں کی تباہ حالی پر تاحیات آنسو بہاتا رہا مگر یہ بات ذرا قابل غور معلوم ہوتی ہے کہ مندرجہ بالا مسودے میں انھوں نے خود بھی ایسے ہی نکات شامل کئے تھے جن کا تعلق براہ راست برطانوی مفاد سے تھا۔ نہ اس میں مزدوری کے متعلق کوئی مطالبہ کیا گیا تھا نہ بود و ماند کے انتظامات کی طرف اشارہ تھا۔ نہ حادثات کے مواقع پر مالی اعانت کی گنجائش پیدا کی گئی تھی۔ وغیرہ۔ نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو اس کے اسباب بالکل عیاں ہیں۔ اول تو سہراب جی کی آواز میں کسی منظم فرقے کی طاقت شامل نہ تھی اُن کی جد و جہد ایک گونہ شخصی تھی اور وہ صرف اپنے ان تاثرات کو استعمال کر سکتے تھے جو انھوں نے برطانوی عہدہ داروں پر قائم کر رکھے تھے۔ دوم وہ سمجھ چکے تھے کہ ایسے قانون کا نافذ کرانا جو مان چسٹر اور لنکا شائر کے منشار کے خلاف ہونا ممکن تھا[۵۷]۔ اس لئے یہ مسودہ ایک "مجلسِ انتخابیہ" کے سامنے غور و خوض کے لئے بھیجا گیا جس نے بعد ترمیم مزید سفارشات پیش کیں وہ یہ تھیں۔

مجلس انتخابی کی تجاویز

(۱) ہر اس کارخانے کو جو کم از کم چار ماہ (فی سال) جاری رہے، اور جس میں بھاپ، پانی اور دیگر آلات کا استعمال بھی کیا جاتا ہو اور جہاں کام کرنے والوں کی تعداد کم از کم تیس ہو۔ قانون کی تحت میں لانا چاہیئے۔

(۲) ان کارخانوں میں کام کرنے والے بچوں کی عمر کے حدود ۸ اور ۱۲ برس مقرر کئے جائیں اور اُن کی تعداد اور دیگر حالات کا ایک مستقل رجسٹر رکھا جائے۔

(۳) دورانِ کار میں آرام کے لئے وقفے اور اُن کے وقت کا تعین کیا جائے اور صوبہ جاتی حکومت کو حق حاصل ہو کہ وہ جملہ کارخانوں کا معائنہ کریں اور ضرورت کے موافق وقفوں کا انتظام عمل میں لاویں۔

(۴) اس کمیٹی کی آخری مگر خاص تجویز یہ بھی تھی کہ فیکٹری قانون کو ہندوستان کے ہر حصے میں نافذ کیا جائے۔

---

۵۷ لندن ٹائمس ۱۳ ستمبر ۱۸۷۸ء صفحہ ۱۰ کالم اول (ہندوستان میں فیکٹری لیبر۔ مرتبہ ڈاکٹر احمد مختار صفحہ ۸)

۱۸۸۱ء کا قانون

یہ تجاویز پیش خیمہ تھیں اس قانون کا جو ۱۸۸۱ء میں نافذ ہوا۔ اور دس سال تک بلا ترمیم جاری رہا۔ اس کی رو سے :-

(۱) ہر وہ کارخانہ جس میں مشینوں کا استعمال بھاپ یا بجلی کی مدد سے ہوتا تھا۔ جو سال میں کم از کم ۴ ماہ جاری رہتا تھا، اور جہاں کم از کم ۱۰۰ مزدور روزانہ کام کرتے تھے۔ قانون کے تحت میں لایا گیا۔ لیکن چائے۔ نیل اور قہوے کے کارخانوں کو قانونی دست برد سے پناہ میں رکھا گیا۔

(۲) بچوں کی عمر ۷ اور ۱۲ برس کے درمیان میں مقرر ہوئی۔ اُن کے اوقاتِ کار کی آخری حد ۹ گھنٹے قرار پائی۔ اور ایک گھنٹہ یومیہ وقفے کا مقرر ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے لئے ہر ماہ میں کم از کم ۴ دن کی تعطیل بھی لازمی قرار دی گئی۔

(۳) جملہ حادثاتِ کاروباری کی اطلاع فیکٹری انسپکٹروں کے پاس بھیجنے کا حکم صادر کیا گیا۔

(۴) فیکٹری کے خطرناک حصوں میں چوگردوں کی تعمیر لازمی قرار دی گئی۔ اور فیکٹری انسپکٹروں کو اختیار دیا گیا کہ وہ خطرناک حصوں کی تجویز اپنی رائے سے کریں۔

(۵) ہر شہر کا حاکم ضلع، فیکٹری کا انسپکٹر مقرر ہوا۔ اور صوبجاتی حکومت کو اختیار دیا گیا کہ وہ حسب ضرورت دیگر انسپکٹروں کا تقرر بھی عمل میں لائے۔

(۶) صوبجاتی حکومت کو مزید اختیار عطا ہوا۔ کہ وہ اس قانون کے نفاذ کے لئے مناسب قواعد وضوابط خود وضع کرے۔

اس قانون کے مطالعے کے بعد برطانوی "نیک نیتی" کا دعویٰ فوراً باطل ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مانچسٹر اور لنکا شائر کے مدعیان اصلاح جنھوں نے ہندوستانی مزدوروں کی حالت سدھارنے کا بیڑا اس دعوے پر اٹھایا تھا کہ وہ یہاں کے غریب مزدوروں کو ان تجربات اور مصائب سے محفوظ رکھیں گے جو گذشتہ صدیوں میں برطانیہ کو برداشت کرنا پڑے تھے[۱] محض لسان اور فضول گو تھے۔ کیونکہ جس قانون کا نفاذ

---

[۱] کمپنی ملوں کے حالات از میو پور

ہواوہ اپنی جگہ پر بالکل ابتدائی تھا اورکسی طرح ہندوستانی مزدوری کی ضروریات کے لئے کافی نہ تھا۔ اس کے اہم نکات میں اوقات کار کے تعین اور بچوں کے تحفظ کے علاوہ کسی کارآمد اصول کی پابندی عمل میں نہیں لائی گئی تھی۔ مزدوری بے سروسامانی کے بنیادی اسباب کو چھوا بھی نہیں گیا تھا۔ درحقیقت جو کچھ کیا گیا تھا اس میں برطانیہ کا مفاد ہر حال میں مدنظر تھا۔ اور مانچسٹر اور لنکا شائر ہی کے مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

سنہ ۱۸۸۱ء کے قانون کے بعد

دیسی کاروبار اور ملوں کی ترقی کو روکنا برطانوی زعما اور تجار کا وہ حقیقی مقصد تھا جو آزادی کے ساتھ تقریر اور تحریر میں بیان کیا جاتا تھا[۵۱] اور یہ حقیقت ہے جس پر پردہ ڈالنا بڑے سے بڑے "برطانیہ پرستوں" کے بھی احاطے سے باہر ہے۔ لیکن اعداد وشمار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ روک تھام کی تمام کوششیں تقریباً ناکام رہیں اور اگرچہ اس تیز رفتاری کا سدباب ہوگیا جو "اندیشہ ناک" صورت اختیار کر رہی تھی لیکن پھر بھی سنہ ۱۸۹۰ء میں فیکٹریوں کی تعداد بمقابلے سنہ ۱۸۸۰ء کے ۶۰ کے بجائے ۸۹ ہوگئی تھی۔ اور کپڑے کی بیرونی تجارت ۳ کروڑ گز کے بجائے ۵ کروڑ گز ہوگئی تھی[۵۲] اس ترقی کو مزید طور پر واضح کرنے کے لئے مندرجہ ذیل نقشہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سوتی کپڑوں کے ملوں کی ترقی[۵۳]

سال	پھرکیوں کی تعداد	چرخوں کی تعداد
۱۸۷۷ — ۷۸	۱۲۸۹۷۰۶	۱۰۵۳۳
۱۸۸۲ — ۸۳	۱۶۵۴۱۰۸	۱۵۱۱۶
۱۸۸۷ — ۸۸	۲۳۷۵۷۲۹	۱۸۸۴۰
۱۸۹۲ — ۹۳	۳۳۷۸۳۰۳	۲۶۳۱۷

---

۵۱ تفصیل کے لئے "ابتدائی قانونی کوشش" مطبوعہ رسالہ جامعہ ماہ ستمبر صفحہ ۱۵۷ ملاحظہ ہو۔

۵۲ انڈین ایر بک ۳۷-۱۹۳۶ء ۵۳ منقولہ از تاریخ محصولات مرتبہ جے، ان، شاہ۔ صفحہ ۲۵۳

اِن اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۸۱ء کے قانون محصولات کے باوجود جس نے برطانیہ کو ہندوستان میں تجارتی آزادی دے کر مقابلے کو قبل از وقت شدید بنا دیا تھا ملوں کی تعداد اور کپڑوں کے کاروبار میں اضافہ ہوتا ہی رہا۔ لیکن اس موقع پر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر حکومت کی ہمدردی دیسی کاروبار کے ساتھ شامل ہوتی تو یقیناً ترقی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی اور یہ امید کی جا سکتی تھی کہ ہندوستان کی ملیں جلد ہی بیرونی مقابلے کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو سکتیں۔ مگر افسوس ہے کہ حکومت کی کوششیں اس کے خلاف تھیں اور بیرونی مقابلے کی پرورش کے لئے ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جا رہی تھی۔

نئے قانون کا مطالبہ

ایسی حالت میں مانچسٹر میں ایجی ٹیشن کا عود کر آنا حیرت انگیز نہیں معلوم ہوتا۔ نئے قانون کا نفاذ ہوتے ہی اس کے خلاف بیزاری کے اعلانات شروع ہو گئے تھے پھر دیسی تجارت کی تیز رفتاری نے زخم پر نمک کا کام کیا لہٰذا ۱۸۸۳ء ہی میں نئے مطالبات کے لئے چیخ و پکار اور ترمیم قانون کے لئے شور و غل شروع ہو گیا۔ اسی زمانے میں میڈکینگ[۵] نے جو ایک برطانوی فیکٹری انسپکٹر تھے بمبئی کی ملوں کا معائنہ کیا اور ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع کی جس میں اس زمانے کے جملہ نقائص پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے شکایات کی ایک طویل فہرست بھی تیار کی تھی جس کے اہم نکات درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

(۱) اس قانون میں صفائی اور تندرستی کے احکامات کا فقدان ہے۔

(۲) کام کی یکسانی، غیر دلچسپی کا سبب ہو کر عورتوں اور بچوں کی صحت پر خراب اثر ڈالتی ہے۔

(۳) اکثر ملوں میں بچوں کو ۶ بجے صبح سے ۶ بجے شام تک مشغول رکھا جاتا ہے

(۴) دوپہر میں وقفوں کا انتظام نہیں ہے

(۵) مل میں کام کرنے والے بچوں کی عمر اکثر ۸ برس سے بھی کم ہے۔

(۶) بچوں کے لئے ڈاکٹری معائنے اور اُن کی صحت کے تیقن کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

---

۵ میڈکینگ کی تحقیقات کا سلسلہ ۶ ماہ تک جاری رہا تھا۔

(۷) ۱۴ تا ۱۶ برس کی عمر کے بچوں کے لئے قانونی تحفظ کی ضرورت ہے اس لئے "نوعمردوں کا ایک نیا درجہ" قائم کیا جائے۔

میڈکینگ کی سفارشات زیادہ تر بچوں کے متعلق تھیں۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ برطانوی تجار کو عام طور پر یہ بڑی شکایت تھی کہ ایک تو ہندوستان میں مزدوریاں یوں ہی کم ہیں اس پر بچوں کا تقرر "سونے پر سہاگہ" نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیسی ملوں کے کپڑے ارزاں فروخت ہوتے ہیں اور برطانوی مال کو گھاٹا اٹھانا پڑتا ہے۔ یوں تو بچوں کی ملازمت کی اصلاح ہر حال میں ضروری تھی اور جملہ نقائص کا دور کرنا حکومت کا بہت بڑا فرض تھا لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی کم قابل غور نہیں کہ بچوں کا حال زار ملوں کی فطری خرابیوں کا نتیجہ تھا۔ یا پس ہندوستانی مزدوروں کی معاشی اور اقتصادی کم زوریوں کا؟۔ ایک طرف تو مزدوروں کی اُجرتیں اس قدر قلیل کہ بلا بچوں کی مدد کے پیٹ پلنے کے لالے۔ دوسری طرف مان چیسٹر اور لنکا شائر کا یہ اصرار کہ اُن کا وجود "غیر معاشی مقابلہ" کی قوت کو نشوونما دے رہا ہے، اس لئے اُن کی بیخ کنی لازمی، ایسی متضاد کیفیت کا مظاہرہ تھا کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن اس پر لطف یہ ہے کہ بے شمار مجالس نے سفارشیں کیں، بڑے بڑے کمیشنوں نے تجاویز پیش کیں۔ وفدوں نے حقوق طلب کئے۔ کانگریس نے یہ نہ سوچا کہ ان نقائص کی جڑ کدھر ہے۔ حقیقی اور بنیادی کم زوری کون سی ہے۔ بچوں پر پابندیاں عائد کرنے سے مزدور فرقے پر کیا اثر پڑے گا؟ ان کی صحت کے قائم رکھنے کا کیا انتظام ہوگا؟ اُن کی تعلیم وتربیت کی کیا صورت ہوگی؟ اگر ان تمام چیزوں کی ذمہ دار حکومت نہیں ہوسکتی تھی تو کیا ضرور تھا کہ بچوں کا تحفظ عمل میں لاکر اُن کی زندگی ملک وقوم اور والدین کے لئے اور بھی وبال دوش بنادی جائے۔ لیکن چونکہ اصل مقصد کا تعلق ہندوستان کے بہبود سے کم اور برطانیہ کے مفاد سے زیادہ تھا اس لئے مزدور قانون کے اُن لوازمات پر غور کرنے کی ضرورت تھی نہ فرصت۔ لہٰذا میڈکینگ کی سفارشات کی نقلیں صوبجاتی حکومتوں کے پاس روانہ کی گئیں۔ اور امید کی گئی کہ صوبوں کو ترمیم قانون میں اعتراض نہ ہوگا۔ بمبئی اور مدراس نے مجوزہ ترمیم کے لئے رضامندی کا اظہار کیا۔ لیکن حکومت بنگال نے سختی کے ساتھ مخالفت کی اور بقیہ صوبوں سے بھی ہمت افزا جواب نہیں ملا۔ ہوا کا رخ مخالف دیکھ کر لارڈ رپن نے نئے قانون کی تجویز پیش کرنا مناسب نہ سمجھا مگر حکومت بمبئی نے عزم بالجزم کا اظہار کیا اور ۱۸۸۴ء میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا۔ جس سے میڈکینگ کی

رپورٹ پر رائے طلب کی۔

ملک کمیشن

اس تحقیقاتی کمیٹی نے جس کے صدر مسٹر ملک تھے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل تجاویز پیش کیں۔

(۱) مزدور قانون کا صوبجاتی نفاذ نہ صرف غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔ اس لئے یہ قانون تمام ہندوستان میں نافذ ہونا چاہیئے۔

(۲) ملوں اور فیکٹریوں میں حفظان صحت کے حسب ذیل اصولوں کی پابندی لازمی اور ضروری قرار دی جانی چاہیئے:۔

ا - ۱۴ ماہ میں ایک بار سفیدی۔

ب - ۷ سال میں ایک بار رنگائی۔

ج - ہوا کی صفائی کے لئے پنکھوں کا انتظام۔

د - فیکٹری کی تعمیر میں نئے اصولوں کی پابندی۔

(۳) عورتوں اور بچوں کے تحفظ کا انتظام لازمی قرار دیا جائے۔ اور اُن کے اوقات کار ۷ بجے صبح اور ۵ بجے شام تک کے درمیان میں مقرر کئے جائیں۔

(۴) عورتوں اور بچوں کو ہر مہینے میں کم ازکم ۴ دن کی تعطیل دی جایا کرے۔

(۵) بچوں کی عمر کم ازکم ۹ اور زیادہ سے زیادہ ۱۴ برس کے درمیان مقرر کی جائے۔

(۶) بچوں کی تقرری کے لئے ڈاکٹری معائنے کی سند ضروری ہے۔

(۷) مالکان مل کے پاس مزدوروں کا ایک مکمل رجسٹر ہو جس میں اُن کی پوری کیفیت درج ہو۔

(۸) وہ تمام کارخانے بھی قانونی تحت میں لائے جائیں جہاں کام کرنے والوں (بچے، عورتیں، مرد) کی تعداد دس یا دس سے زیادہ ہو۔

حکومت بمبئی تو ترمیم قانون کے لئے بیتاب ہی تھی۔ اس لئے مندرجہ بالا نکات کو قبول کرنے کے لئے فوراً تیار ہو گئی۔ صرف دقت یہ تھی کہ دیگر صوبجات کو اپنا ہم خیال کیونکر بنایا جائے۔ حکومت بمبئی اسی اُدھیڑبن

میں تھی کہ ۱۵ نومبر ۱۸۷۸ء کو مانچسٹر کی مجلس تجارت نے وزیر ہند کی خدمت میں درخواست کی کہ انگلستان کا فیکٹری قانون ہندوستان میں بھی فوراً نافذ کر دیا جائے۔ دوسرے سال ۲۲ مارچ ۱۸۷۹ء کو پھر ایک وفد لنکا شائر کے تاجروں کا وزیر ہند لارڈ کراس کی خدمت میں پیش ہوا۔ اس نے بھی نئے قانون کا مطالبہ کیا۔[۵۸]

ہندوستان میں مخالفت کی ابتدا

اب کی بار ہندوستان کی پرسکون فضا میں بھی ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اور آنے والے قانون کی طرف سے بے اطمینانی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں ملک کمیشن کی تقرری نے جذبۂ اختلاف کو اور بھی بھڑکا دیا تھا اور مسٹر این ایم لوکھانڈی نے پہلی بار ۵۵۰۰ مزدوروں کو ہم نوا بنا کر اس کمیشن کے جانب دارانہ طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ان کی سب سے بڑی شکایتیں یہ تھیں کہ کمیشن کے اراکین میں کوئی ہندوستانی نہ تھا۔ مالکانِ مل کے نمائندوں کی اکثریت ہی بلکہ شاہدوں میں بھی انھیں کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ مزدوروں کی اس جماعت کی طرف سے مسٹر لوکھانڈی نے مطالبات کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی جو کمیشن کے سامنے پیش کی گئی۔ مطالبات یہ تھے۔

(۱) ہفتے وار تعطیل۔

(۲) دوپہر کے وقت کم از کم ½ گھنٹے کا وقفہ۔

(۳) اوقاتِ کار کا ½۶ بجے صبح اور غروب آفتاب کے درمیان میں تعین۔

(۴) ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک اجرت کی لازمی ادائیگی۔

(۵) کاروباری حادثات کے موقعوں پر تاوان کی ادائیگی۔

---

[۵۸] اس وفد نے کہا تھا کہ اگر ہندوستان کی ملوں کے مزدور دن رات، اتوار اور سنیچر برابر کام کرتے رہے تو ظاہر ہے کہ اس ملک (برطانیہ) کے مزدور دنیا کی منڈی میں ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہیں گے۔ لیکن یہ الزام بالکل غلط تھا۔ اس لئے بمبئی اور مدراس کی مجالس تجارت نے فوراً اس کی تردید کی اور ثابت کیا کہ یہاں کے مزدور گرمیوں میں ۱۳ گھنٹے اور جاڑوں میں صرف ۱۱ گھنٹے کام کرتے ہیں

ان تجاویز کا مقابلہ ملک کمیشن کی سفارشات سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مزدوروں کی اس جماعت کی آواز درجہ قبولیت تک پہنچنے سے قاصر رہی اور مندرجہ بالا مطالبات میں سے ایک بھی شامل نہیں کیا گیا۔ البتہ وہ تمام نکات موجود ہیں جو مانچسٹر اور لنکاشائر نے طلب کئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسی صورت حال نئے قانون کے منافی تھی اس لئے یہ تمام سفارشات معرض التوا میں پڑگئیں اور نئے قانون کی تجویز کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہوگئی

نئے قانون کے لئے مزید کوششیں

لیکن برطانوی تجار خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ التوا کی خبر مشتہر ہوتے ہی درخواستوں، وفدوں اور یزولیوشنوں کی ہماہمی پھر شروع ہوگئی۔ اور وزیر ہند کو ہندوستان میں نئے قانون کے نفاذ کے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ ۱۸۸۹ء میں مسٹر ان گرہم اور منڈلا نے دارالعامہ برطانیہ میں نئے قانون کے نفاذ کے متعلق متعدد سوالات کئے۔ اور وزیر ہند سے ان کوششوں پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی جو وضع قانون کے سلسلے میں ہندوستان میں جاری تھیں۔ اسی سال (۱۸۸۹ء میں) لنکاشائر کے کپڑوں کی ملوں اور دیگر فیکٹریوں کے نمائندوں کا ایک وفد وزیر ہند لارڈ کراس کی خدمت میں پیش ہوا جس نے ہندوستان میں نئے قانون کا مطالبہ شدومد کے ساتھ کیا۔

برلن کانفرنس

یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ بین الاقوامی مزدور کانفرنس کا انعقاد برلن میں ہوا۔ اس نے جو تجاویز شریک کانفرنس کے ممالک کو بھیجیں اس سے برطانوی تجار کو ایجی ٹیشن کا مزید موقع ہاتھ آیا۔ تجاویز یہ تھیں۔

(۱) ہفتے وار تعطیل ہر فیکٹری میں لازمی ہو۔

(۲) ۱۲ سال سے کم عمر کے بچے ملوں میں ملازمت نہ حاصل کرسکیں۔

(۳) بچوں کو رات میں کام کرنے کی ممانعت کی جائے۔

(۴) ملوں کے مخدوش حصوں میں کام کرنے سے بچوں کو روکا جائے۔

(۵) رات کے وقت عورتوں کو کام کی اجازت نہ دی جائے۔

(۶) ہر فیکٹری میں ۱½ گھنٹہ یومیہ کا وقفہ مقرر کیا جائے۔

(۷) عورتوں کو زچگی کے بعد ۸ ہفتے کی تعطیل منظور کی جایا کرے۔

ان تجاویز نے برطانیہ کو پھر یورش برپا کرنے کا موقع دیا اور میک لین اور ہیلٹ نے مضامین سے کانفرنس کے نکات کو ہندوستانی فیکٹری قانون میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ لہٰذا گورنر جنرل نے فوراً ایک کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا گیا جس کا مقصد برلن کانفرنس کی تجاویز پر غور کرنا اور ہندوستان کے لئے اُن کی موزونی پر روشنی ڈالنا تھا[۵۱]۔ لیکن اگرچہ اب تک ہندوستانی مزدوروں میں خود کوئی بیداری نہ ہوئی تھی۔ مگر بعض ہمدرد لیڈروں میں ان غریبوں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، اور غفلت کا خو پیدا کرنے لگا تھا، اس لئے مزدور حلقوں سے صدائے مخالفت بلند ہوئی[۵۲] اور مسٹر لوکھانڈی نے ایک بار پھر ۱۸۹۰ء کو دس ہزار مزدوروں کو ہم آہنگ کیا اور اُن کے مطالبات اور حقوق کی حمایت شدومد کے ساتھ کی۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ہفتہ وار تعطیل کا مطالبہ مالکان مل نے منظور کر لیا۔ اور اس کے لئے اتوار کا د

لیتھ برج کمیشن

۲۵ ستمبر ۱۸۹۰ء کو لیتھ برج کمیشن نے جو برلن کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا، شائع کر دی[۵۳] اور حسب ذیل تجویزیں پیش کیں:-

(۱) عورتوں کے کاروباری اوقات ۱۱ گھنٹے سے زیادہ نہ ہوں۔

(۲) بچوں میں "چھوٹے" اور "نوعمر" کی تفریق نہ کی جائے[۵۴]

---

[۵۱] "ہندوستان میں کاروباری حالات" از لوکاناتھن۔ صفحہ ۱۰

[۵۲] مخالفین میں جمعیتہ التجار کلکتہ، ایوان تجار بنگال، جوٹ ملوں اور کلکتہ ہائڈ رالک پریس کی مجالس قابل ذکر ہیں۔

[۵۳] اس کمیشن نے تحقیقات کی ابتدا بمبئی میں کی اور بعد میں احمد آباد، کانپور اور کلکتہ کا دورہ کیا۔ اس سلسلے نے ۳۴ فیکٹریوں کا معائنہ کیا اور ۹۶ مزدوروں کی شہادتیں طلب کیں۔

[۵۴] مجوزہ میڈ کیگنگ ۱۸۹۰ء

(۳) بچوں کی عمر تقرری زیادہ سے زیادہ ۱۴ اور کم سے کم ۱۲ ہو۔

(۴) بچوں کے اوقاتِ کار ۶½ گھنٹوں سے زیادہ نہ ہوں۔

(۵) ہفتے میں ایک دن عام تعطیل کا مقرر کیا جاوے۔

(۶) ½ گھنٹہ یومیہ کا وقفہ لازمی قرار دیا جائے۔

۱۸۹۱ء کا فیکٹری قانون

ان سفارشات نے اس نئے قانون کی طرف رہنمائی کی جس کے متعلق یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ کمیشنوں کانفرنسوں عرض داشتوں اور وفدوں کے عجیب و غریب مجموعے کی پیداوار تھا[۵] ۔ اس قانون کی رو سے:-

(۱) تمام وہ کارخانے جن میں مزدوروں کی تعداد کم سے کم ۵۰ تھی احاطہ قانون میں طلب کئے۔ اور صوبوں کی حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ ان کارخانوں کو بھی قانونی تحت میں لا سکتے ہیں جن میں مزدوروں کی تعداد کم از کم ۲۰ ہو۔

(۲) بچوں کے تقرری کی عمر ۱۴ اور ۱۹ کے درمیان مقرر کی گئی۔

(۳) بچوں کے اوقات کار کو ۹ کے بجائے ۷ گھنٹے کر دیا گیا۔ اور کام کا وقت ۷ بجے صبح اور ۸ بجے شام کے درمیان میں مقرر رہا۔ اسی وقت میں ½ گھنٹے کا وقفہ بھی منظور کیا گیا۔

(۴) عورتوں کے اوقاتِ کار ۱۱ گھنٹے یومیہ رکھے گئے۔ جو ۷ بجے صبح اور ۸ بجے رات کے درمیان کسی وقت مقرر کئے جا سکتے تھے اور ½ گھنٹے کا وقفہ بھی منظور کیا گیا (باقساط Shifts کام کرنے والے کارخانوں کو رات میں ہی کام کرنے کی اجازت دی گئی۔

(۵) ہفتے وار تعطیل منظور کی گئی۔

(۶) مجمع کے انسداد اور آب و ہوا کی صفائی کے متعلق صوبے کی حکومتوں کو حسب ضرورت قوانین کے وضع کرنے کا اختیار دیا گیا۔

۵ہندوستان میں کاروباری حالات۔ از لوکاناتھن صفحہ ۱۰

ان نکات کے مطالعے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ بچوں پر جو قانونی پابندیاں عائد کی گئیں انھوں نے ان کے فاضل اور غیر مصروف اوقات کو جو بہترین کاروباری اور علمی ترقی کا ذریعہ بن سکتے تھے بیکار کر دیا اور ان کی وہی مثل ہوئی کہ نہ الی الذی نہ الی الذی نہ خود ترقی کر سکتے تھے نہ والدین کو مدد دینے کے قابل رہے۔ کیا اس موقع پر برطانیہ کے تجربے سے فائدہ اُٹھا کر ان بچوں کے لئے جبریہ اور بلا معاوضہ تعلیم کا انتظام ممکن نہ تھا؟[۵۱] افسوس ہے کہ برطانوی مدعیان اصلاح نے خود غرضی کا دامن کسی حال میں بھی اپنے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ دیا۔ اور اس وقت بھی اپنے مفاد کی پاسداری میں ہندوستانی مزدوروں کے بچوں کو بے رقام اور آوارہ بنانے کی صورتیں مہیا کر دیں ——— کیونکہ فرصت اور ایسی فرصت جس میں کچھ کام نہ ہو صرف کارکردگی کے منافی ہی نہ تھی بلکہ والدین کو مجبور کرتی تھی کہ وہ فاضل اوقات میں اپنے بچوں کے لئے دوسری ملوں میں جگہیں تلاش کریں۔ غرضکہ ۱۸۹۱ء کے قانون کا یہ جز جس قدر اہم تھا اسی قدر عبث اور ہندوستانی کاروبار کی ترقی سے بے تعلق تھا۔

۱۸۹۱ء کے قانون سے بیزاری ——— مانچسٹر میں

اگرچہ یہ قانون ۱۸۸۱ء والے قانون کے مقابلے میں بہتر خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن ہندوستان اور مانچسٹر ہر دو جگہ آقا و مزدور ہر دو طبقے میں اس کے خلاف بیزاری کا اظہار کیا گیا۔ مانچسٹر کی مخالفت کا سبب وہ وسیع مطالبات تھے جس کا مقصد دیسی ملوں کی قوتِ مقابلہ کو یک سر نیست و نابود کرنا تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ برلن کانفرنس کی سفارشات پر عمل کیا جاتا۔ اگرچہ ان کی پابندی خود برطانوی ممالک پر عائد کرنا گوارا نہیں کی گئی مگر ہندوستانی مزدوروں کے قانون میں ان کا شامل کرنا ناگزیر خیال کیا جانے لگا[۵۲] اس مقصد کی تکمیل کے لئے دار العامہ میں سوالات کئے جانے لگے اور گرماگرم

---

[۵۱] تاریخ قوانین مزدوران۔ از ہچنس و ہیریسن صفحہ ۹۔ مظہر ہے کہ برطانیہ میں مزدوروں کے بچوں کی جبریہ تعلیم کا انتظام ۱۸۳۳ء اور ۱۸۶۷ء کے قوانین کی رو سے عمل میں آگیا تھا اور نیم اوقاتی مدارس میں مقررہ حاضریوں کا پورا کرنا لازمی قرار دیا جا چکا تھا۔

[۵۲] ہندوستان میں فیکٹری قوانین۔ از راجنی کانت داس (فیکٹری قانون ۱۹۱۱ء)

مباحثوں کے سلسلے جاری ہوئے۔ مان چیسٹر کے خاص نمائندے مسٹر ہولٹ ہیلٹ نے بھی اس موقع پر ہندوستانی فیکٹریوں کی حالت کا خوب ہی خوب چرچا اتارا۔ اسی دوران میں بین الاقوامی حفظان صحت کانفرنس کا انعقاد لندن میں ہوا[۵۱] وہاں بھی اسی مسئلے پر پرزور مقالے پڑھے گئے اور مسٹر ہیلٹ نے ثابت کرنا چاہا کہ جسمانی تندرستی کے لحاظ سے ہندوستانی مزدوروں کی حالت قابل رحم تھی۔ مگر خوش قسمتی سے اس کانفرنس میں چند ایسے اصحاب بھی موجود تھے جو حقیقت سے پوری طرح آشنا تھے۔ اور مخالفوں کا جواب ترکی بہ ترکی دے سکتے تھے۔ اس سلسلے میں گرانٹ کالج بمبئی کے استاد ڈاکٹر ان نبرجی اور سرجن جنرل ایچ کک[۵۲] کے نام خاص طور پر یادگار رہیں گے۔ ان حضرات نے ذاتی تجربے کی بنا پر ثابت کر دکھایا کہ مان چیسٹر کی طرف سے جو کچھ بیان کیا گیا تھا وہ حقیقت سے کس قدر دور تھا۔ اور مسٹر ہیلٹ کے مبالغے نے واقعات کی اصل صورت کو بالکل ہی مسخ کر دیا تھا۔"

اسکاٹ لینڈ

اسی دور میں ہندوستان ایک نئے جرم کا خطادار دیا جانے لگا تھا۔ وہ یہ کہ یہاں کی جوٹ ملیں بھی اسکاٹ لینڈ کے کارخانوں سے برسر پیکار ہو چلی تھیں۔ اور اتنی ترقی کی رفتار سے یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ ڈنڈی کے کارخانے کہیں ٹھپ نہ پڑ جائیں۔ ۱۸۸۰ء کے بعد ۱۵ برس کی مدت میں جوٹ کے کاروبار میں جو ترقی ظہور پذیر ہوئی اس نے اسکاٹ لینڈ کے مالکان مل میں شدید ہیجان برپا کیا۔ اور مان چیسٹر کے کپڑوں کے مل والوں کی طرح یہ بھی شور و غل مچانے لگے۔ اور ترمیم[۵۳] قانون کا مطالبہ کرنے لگے۔ نیچے دیئے ہوئے نقشے سے معلوم ہو گا کہ ۱۸۹۵ء میں جوٹ ملوں کی ترقی کس زینے پر تھی:۔

---

۵۱ اس کانفرنس کا انعقاد ۱۰ اگست ۱۸۹۱ء کو ہوا تھا۔

۵۲ سرجن جنرل کک نے ہندوستان میں ۳۰ (تیس) سال کی طویل مدت گذاری تھی اور جو کچھ انھوں نے بیان کیا وہ ذاتی تجربات کی بنا پر تھا۔

۵۳ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہندوستان میں فیکٹری قانون از ڈاکٹر داس (بہ سلسلہ قانون ۱۹۱۱ء)

اضافہ فی صدی (بعد ۱۵ سال)	نکات
۴۲	(۱) ملوں کی تعداد
۹۶	(۲) چرخوں کی تعداد[a]
۹۴	(۳) رقم اصل مصروفہ
۶۶	(۴) تعداد ملازمین

اس کے علاوہ بجلی کے استعمال نے ان ملوں میں شب و روز باقساط[1] کام کرنے کی آسانیاں بہم پہنچا کر اسکاٹ لینڈ کے خطرات کو اور بھی مستحکم اور شدید بنا دیا تھا۔ اس لئے وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اگر یہی حالت قائم رہی تو بنگال کے مقابلے میں ڈنڈی کے کاروبار کا خاتمہ ہے اس لئے وہاں کی مجلس التجار نے ہندوستان کی جوٹ ملوں کے لئے نئے قانون کا مطالبہ کیا اور حکومت برطانیہ سے درخواست کی کہ برلن کانفرنس کی تجاویز ہندوستان سے منظور کرائی جائیں۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دیسی مزدوروں کے ہمدرد اور انسانیت کے علم بردار کا روپ بدل کر خود ہندوستان کی جوٹ مجالس سے درخواست کی کہ ترمیم قانون کے لئے جدوجہد میں آگے بڑھیں۔

برطانیہ میں مزید یورش اور اس کے اسباب

اگرچہ ان تحریکات نے اب تک کوئی خاص نتیجہ پیدا نہیں کیا تھا اور نہ دیسی ملوں کی ترقی نے کسی خاص معاشی یا اقتصادی انقلاب کی صورت اختیار کی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ حالات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں، حکومت کی پالیسی کاروباری نظام پر گہرا اثر ڈال رہی تھی۔ بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات وسیع کئے جا رہے تھے اور اسی لحاظ سے ملکی آئین میں بھی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ غرض کہ قدرتی اور مصنوعی اسباب کچھ اس طرح بہم ہوتے گئے تھے کہ ۱۹۰۲ء میں ایسے تغیرات کی ابتدا ہوئی جس نے برطانوی تجارت کو شدید خطرے میں مبتلا کر دیا۔ یہ تغیرات

---

[1] اس وقت جوٹ ملیں ۳ قسطوں میں کام کرتی تھیں۔ لیکن عورتوں اور بچوں کو ۸ بجے رات کے بعد کام کی اجازت نہیں تھی۔

مختصر طور پر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :۔

(۱) ۱۸۹۲ء میں زراعت کی ناکامی کے باعث خام روئی کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔

(۲) ۱۸۹۳ء میں چاندی کے (DEMONETISE) ہونے اور روپیوں کی ٹکسال سے بند ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان اور دور دراز مغربی ممالک کے درمیان تجارتی رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے جدید سکہ جاتی انتظامات کی ضرورت لاحق ہوئی۔

(۳) اسی سال یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ صورت کی لچھیوں کو محصول سے معاف رکھا جائے۔ مگر سوتی کپڑوں پر خواہ وہ باہر سے آویں یا ہندوستان کے تیار شدہ ہوں ۵ ء ۳ فی صدی کا محصول عاید کیا جائے

(۴) ۱۸۹۴ء ہی میں چین و جاپان کی جنگ کا بھی آغاز ہوگیا جس نے بین الاقوامی معاشی ہم آہنگی کو منتشر کر دیا۔

(۵) ۱۸۹۴ء میں ہندوستانی محاصل کا ترمیم شدہ قانون پاس ہوا اور سوتی سامان پر ۵ فی صدی محصول درآمد عاید کیا گیا۔ (یہ محاصل ۱۸۸۲ء میں اٹھائے گئے تھے)

(۶) بیرونی (بلکہ برطانوی) سامان پورش پر محصول کے اعادے نے مانچسٹر میں تہلکا مچا دیا۔ اور وہاں کے تجار نے اس قدر شور وغل مچایا کہ حکومتِ ہند کو مجبور ہو کر دیسی سامان پر بھی ۵ فی صدی محصول عائد کرنا پڑا

(۷) ۱۸۹۶ء میں زبردست قحط اور ساتھ ہی طاعون نے ہندوستانی کاروبار میں ایسی جدید معاشی کیفیتیں پیدا کر دیں جنھوں نے برطانوی مفاد کو شدید ترین خطرے کے مد مقابل کر دیا۔

ان تمام غیر معمولی حالتوں کے باوجود جب کہ کساد بازاری بھی پورے عروج پر تھی۔ دیسی فیکٹریوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا رہا۔ لہٰذا ۱۸۹۲ء میں جو تعداد صرف ۱۲۷ تھی ۱۹۰۰ء میں ۱۹۰ ہوگئی۔ یہ ترقی یقیناً برطانوی کاروباری حلقوں میں ہلچل پیدا کرنے والی تھی۔

(۸) اسی زمانے میں بنگال کی تقسیم کے اعلان نے ہندوستان میں ایک نئی سیاسی تحریک کی بنا ڈالی یعنی سودیشی کا پرچار اور بدیشی کا بائیکاٹ۔ اس تحریک نے مانچسٹر اور لنکا شائر کو اپنا دشمن بنا لیا۔ اس لئے ۱۹۰۶ء میں برطانوی مزدوروں کی مجلس نے وزیر ہند سے درخواست کی کہ ہندوستان کے بالغ مزدوروں

پر بھی قانونی پابندیاں عائد کی جائیں۔

ہندوستان میں

۱۹۰۵ء میں کساد بازاری کا دور تقریباً ختم ہو چکا تھا اور تجارتی دنیا میں پھر ہماہمی شروع ہو گئی تھی حالات میں جو تغیر واقع ہو چکا تھا اس نے ملوں کی مصروفیتوں کو بہت بڑھا دیا تھا۔ اور کاروباری اوقات میں غیر معمولی اضافہ عام طور پر رائج ہو گیا تھا۔ اور اکثر ملوں میں جہاں بجلی کا استعمال ہوتا تھا دن و رات مسلسل کام جاری رہنے لگا تھا۔ اس طرح ۱۴، ۱۵ گھنٹے یومیہ کام لینا بالکل معمولی بات ہو گئی تھی۔ ایسی صورت میں مزدور طبقے میں شدید بے اطمینانی پیدا ہو چلی تھی اور اب کی بار قانون کا مطالبہ انہی کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ اور درخواست کی جا رہی تھی کہ ۱۱ گھنٹے یومیہ کا قانونی تعین عمل میں لایا جائے اور مالکانِ مل کو مجبور کیا جائے کہ حادثات کے تاوان اور طبی امداد کے اصول کو منظور کریں۔ اس زمانے میں مزدوروں کے حامیوں میں ہندوستان کا مشہور اینگلو انڈین اخبار "ٹائمس آف انڈیا" بھی تھا۔ اس کے ایڈیٹر نے "غلامانِ بمبئی" کے عنوان سے ایک مضمون ۱۶ دسمبر ۱۹۰۵ء کے اخبار میں شائع کیا جس میں ہندوستانی مزدوروں کے حالِ زار کا پر درد نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس مضمون کا آخری حصہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے:۔

"........ طمع اور حرص کے اس کاروبار کو جو دس ہزار ناتوان اور حرمان زدہ مزدوروں کا خون چوس رہے ہیں روکنے والا کوئی نہیں۔ دولت بارش کی طرح برس رہی ہے۔ مالکانِ مل خوش اعتقادانہ تحریکیں پاس کر رہے ہیں۔ تحقیقاتوں کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے مگر مظلوم مزدوروں کی جگر خراش صدائیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچتیں۔"

ممکن ہے کہ "ٹائمس آف انڈیا" کی یہ حمایت در پردہ مانچسٹر، لنکا شائر اور ڈنڈی ہی کی بہبودی کے لئے ہو۔ مگر فی الحال اس سے بحث نہیں کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ بہر حال یہ پروپیگنڈا بھی اس طویل یورش کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے جس نے ہندوستانی مزدوروں کے لئے قانون کا مطالبہ کیا۔

۱۹۰۶ء کی تحقیقاتی کمیٹی

بالآخر کارروائیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں حکومت ہند نے وزیر ہند کے ایما سے ایک تحقیقاتی کمیٹی

مقرر کی جس کے صدر سر ایچ، پی فریبیر اسمتھ تھے۔ تحقیقات کا مقصد سوتی کپڑوں کی ملوں کے مزدوری حالات کی جانچ کرنا اور اس کی بنا پر نئے قانون کے لئے مشورہ دینا تھا۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ

"قوانین خصوصاً جن کا تعلق مزدوروں سے ہو اگر کامیابی کے ساتھ عمل میں نہ لائے جا سکیں تو ان سے کسی مفید نتیجے کی اُمید کرنا عبث ہے۔ بلکہ درحقیقت اکثر و بیشتر ان سے سوائے نقصان کے فائدہ نہیں پہنچتا۔ مالکانِ مل کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ حکومت کی دخل اندازی نے اُن کی ذمہ داریوں کو بہت کچھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان کے بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے۔ اس لئے ان کا فرض ہے کہ وہ قانون کے عمل درآمد میں پوری طرح حکومت کی مدد کرتے رہیں۔" ؎۵

اور حسب ذیل سفارشات حکومت کے سامنے پیش کیں :۔

(۱) فیکٹریوں کے اوقات کار کو باقاعدہ متعین کیا جائے اور ان ملوں میں جہاں "باقساط" کام نہیں ہوتا ہے مزدوروں کے اوقاتِ کار ۱/۲ ۵ صبح اور ۱/۲ ۷ شام کے درمیان میں مقرر کئے جائیں۔ ۱۲ اور دو بجے کے درمیان میں کم ازکم آدھے گھنٹے کے لئے مشین بالکل بند کر دی جایا کرے۔ جن کارخانوں میں "باقساط" کام ہوتا ہے وہاں قسطوں کا تعین ۵ بجے صبح اور ۸ بجے رات کے درمیان کیا جائے اور بالغ مزدوروں کے کام کی حد ۱۲ گھنٹے سے زیادہ نہ ہو۔

(۲) عورتوں سے رات کے وقت ہرگز کام نہ لیا جائے۔

(۳) "نوعمروں کا ایک درجہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ۱۶ برس سے کم عمر کے مزدوروں کا ایک الگ رجسٹر قائم کیا جائے۔

(۴) یومیہ اور نصف یومیہ کام کرنے والے لڑکوں کے لئے ملازمت سے قبل عمر اور تندرستی کی سند حاصل کرنا لازمی قرار دی جائے۔

؎۵ سوتی کارخانوں کے مزدوروں کی تحقیقاتی کمیٹی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴

(۵) اس کے علاوہ حسب ذیل دیگر انتظامات کرنے کی درخواست کی گئی:۔

(ا) فیکٹری کے مرطوب حصوں میں خشک قمقموں والے مقیاس الحرارت (DRY BULB THERMOMETER) کا استعمال کیا جائے۔

(ب) پانی کی صفائی کا خاص انتظام کیا جائے۔

(ج) سفیدی کی تاریخ درج رجسٹر کی جایا کرے۔

(د) پائخانوں کا مناسب انتظام کیا جائے ــــ وغیرہ

۱۹۰۸ء کا لیبر کمیشن

سوت کی ملوں کے متعلق جو سفارشات اوپر درج کی گئی ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی فیکٹریوں کے لئے ایک نئے قانون کی ضرورت تھی۔ لہذا حکومتِ ہند کو ان کا وہ وعدہ یاد دلایا گیا جس میں ۱۹۰۶ء کی تحقیقات کا فیصلہ نئے قانون کے حق میں ہونے پر ایک باقاعدہ کمیشن کے تقرر کی امید دلائی گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں آنریبل مسٹر (بعد ازاں سیر) ڈبلو۔ ٹی۔ مارسین کی قیادت میں ایک کمیشن کا تقرر ہوا۔ جس نے ۱۹۰۸ء میں ایک کارآمد اور قابل قدر رپورٹ شائع کی[۵۱]۔ اس کمیشن کی رائے میں ہندوستانی فیکٹریوں کی سب سے بڑی خرابی بچوں کی تقرری کا طریقہ تھا۔ جس میں قانونی نکات کی پاسداری بھی روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ اس لئے انھوں نے یہ تجویز کیا کہ ۹ برس کے بچوں کو "نصف یومیہ" اور ۱۴ برس کے لڑکوں کو "یومیہ" ملازم تصور کیا جائے اور اس قانون کی خلاف ورزی کو مناسب سزا کے ذریعے سے روکا جائے۔ اسی طرح انھوں نے بنگال جوٹ ملوں کے طریقہ عمل کو بھی قابل اعتراض قرار دیا کیوں کہ وہاں ۶، ۷ برس کے لڑکے بھی ۸ اور ۹ گھنٹے کام کرنے پر مجبور کئے جاتے تھے اور غرض کی دھن میں عمر کے قانونی تعین کو بھی ٹھکرا دینے میں گریز نہ کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "نصف یومیہ" مزدوروں میں سے تقریباً ۳۰۔۴۰ فی صدی ایسے تھے جن کو "یومیہ" کام کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ حالانکہ ان کی اُجرتوں میں کوئی خاص اضافہ واقع نہ ہوتا تھا۔

---

۵۱ فیکٹری لیبر کمیشن ۱۹۰۸ء۔

اسی طرح عورتوں اور مردوں کے مزدوری حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی ۔ اور دکھلایا گیا تھا کہ باوجود قانونی پابندیوں کے اکثر ملوں میں دوپہر کے وقفے کا دستور ہی نہ تھا اور نہ اتوار کا دن تعطیل ہی کے لئے وقف کیا جاتا تھا۔ لبسا اوقات عورتوں سے رات میں بھی کام لیا جاتا تھا۔[1] روئی صاف کرنے والے کارخانوں میں جہاں باقساط کام کا طریقہ رائج تھا لبسا اوقات عورتوں سے رات میں بھی کام لیا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام کمزوریاں معائنہ کرنے والوں کی غفلت اور عدم توجہی کا نتیجہ تھیں، اور محض سخت گیر انسپکٹروں کی تقرری سے درست ہوسکتی تھیں۔ مگر جو زیادہ اہم مسائل کمیشن کے پیش نظر تھے وہ عمر اور تندرستی کی سند حاصل کرنے اور بالغ مردوں اور عورتوں کے اوقات کار کے تعین کے لئے ۔ یہ مسائل تھے جن پر نہ صرف عام رایوں میں اختلاف تھا بلکہ ممبران کمیشن خود بھی کسی ایک رائے پر متفق نہ تھے۔ کمیشن کی کثریت اس بات پر زور دے رہی تھی کہ یومیہ مزدوروں کے لئے عمر اور تندرستی کی سند تقرری سے قبل حاصل کر لینا لازمی قرار دیا جائے۔ لیکن ڈاکٹر نائر کا[2] خیال تھا کہ نہ صرف "یومیہ" بلکہ "نصف یومیہ" مزدوری سے بھی اس سند کا مطالبہ کرنا چاہیئے ۔ اسی طرح عورتوں کے اوقات کار کے متعلق بھی رایوں میں اختلاف تھا۔ عام طور پر خصوصاً برطانیہ میں مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ ان کے اوقات کار کو گھٹا دیا جائے۔ مگر کمیشن کو اس سے اختلاف تھا اور بجائے گھٹانے کے اُن کے اوقات کو ۱۱ گھنٹے یومیہ سے ۱۲ کر دینا چاہتے تھے اور ایک گھنٹہ یومیہ کے وقفے میں بھی کاٹ چھانٹ کر کے صرف ½ گھنٹہ کر دینا چاہتے تھے ۔ رات کے اوقات میں البتہ عورتوں کے کام کی مخالفت کمیشن نے بھی کی اور ساتھ یہ سفارش کی کہ صفائی اور حفظان صحت کے طریقے تمام فیکٹریوں میں رائج کئے جائیں

غرض کہ یہ رپورٹ جو اب تک اپنے قسم کی آخری چیز ہے "محققین فیکٹری قوانین کے لئے باعتبار تنظیم خیالات (نہ کہ باعتبار نتائج ماخوذہ) از حد دلچسپ ہے" اسی رپورٹ کی بنا پر ۱۹۱۱ء کا نیا قانون نافذ ہوا جس نے گذشتہ قانون میں حسب ذیل ترمیمات رائج کیں:-

---

[1] اکثر ملوں میں اتوار کا دن ظاہراً تعطیل کا ہوتا تھا مگر مشین کی صفائی کے بہانے سے کام بھی جاری رکھا جاتا تھا۔

[2] ڈاکٹر نائر کا اختلافی نوٹ ملاحظہ ہو رپورٹ کمیشن ۱۹۰۸ء

(۱) مردوں کے اوقات کار ۱۲ گھنٹے یومیہ مقرر ہوئے جس میں ½ گھنٹے یومیہ وقفے کی رعایت بھی رکھی گئی تھی۔

(۲) بچوں کی عمر اور تندرستی کی سند پیش کرنا قبل ملازمت لازم کی گئی۔

(۳) عورتوں کے لئے رات کا کام بالکل بند کر دیا گیا (صرف روئی صاف کرنے والی فیکٹریوں میں عورتوں کو رات کے کام کی اجازت دی گئی)

(۴) موسمی کارخانے بھی قانون کی تحت میں لائے گئے۔

(۵) ملوں میں حفظانِ صحت اور تحفظ کے طریقوں کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔

(۶) ملوں کے معائنے کے لئے انسپکٹروں کے علاوہ دیگر عملوں کے تقرری کا حکم بھی دیا گیا۔

یہ قانون بخیر و خوبی اپنے فرائض کو انجام دے رہا تھا کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کی ابتدا ہوگئی۔ اس نے یک بیک سیاسی اور معاشی حالات کا رخ پلٹ دیا۔ کاروبار کی خاموش ترقی کے دن ختم ہوگئے اور ایک ہیجانی اور ہنگامی دور کی ابتدا ہوئی جس نے درحقیقت پہلی بار ہندوستانی مزدوروں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور ان کو حقوق کی پاسداری کا سبق دیا۔ اس لئے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک ہندوستان عجیب و غریب معاشی اور سیاسی کشمکش کی آماجگاہ بنا رہا۔ جس کی تفصیل فی الحال آئندہ کے لئے ملتوی کی جاتی ہے۔

فروخت پیداوار

حبیب الرحمن صاحب پروفیسر معاشیات جامعہ عثمانیہ نے مارچ ۱۹۳۶ء میں "ہندوستانی زراعت کے بعض معاشی مسائل" پر لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے تین تقریریں نشر کی تھیں۔ یہ اس سلسلہ کی تیسری تقریر ہے۔

اگرچہ اب بھی ہندوستانی کاشتکاروں کے اکثر خاندان اپنے ہی استعمال کے لئے غلہ اور اجناس اگاتے ہیں، تاہم یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قدیم طریقے پر اب بہت سرعت کے ساتھ زوال آرہا ہے۔ جدید وسائل آمد و رفت کی ترقی نے نہر سویز کے افتتاح کے بعد سے ہندوستان کی زرعی پیداواروں کے لئے دور دراز ممالک میں خریدار پیدا کر دئے ہیں، خاص کر یہاں کی روئی، سن، چاول اور مختلف روغن دار تخموں کے لئے تو ساری دنیا کے بازار کھل گئے ہیں۔ مزید برآں خود ملک کے اندر کثرت کے ساتھ چھوٹے بڑے شہر نمودار ہو رہے ہیں، جن کی بدولت اشیائے خوراک کے وسیع بازار پیدا ہو رہے ہیں اور ملک میں صنعت و حرفت کے کارخانوں کے ساتھ ساتھ خام پیداواروں کے لئے بھی نئے نئے بازار مہیا ہوتے جا رہے ہیں۔ ان تمام رجحانات کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہندوستان میں کاشتکاروں کی روزافزوں تعداد اس لئے کاشت نہیں کرتی کہ اپنی پیداوار سے براہ راست اپنی احتیاجات رفع کرے بلکہ اس کا زیادہ تر یہ منشا ہوتا ہے کہ دوسروں کے ہاتھ اپنی پیداواریں فروخت کر کے منافع حاصل کرے اور اس کو اپنی معاش کا ذریعہ بنائے۔

ہمارے نظم معیشت کی اس تبدیلی کی وجہ سے ہندوستانی کاشتکار کی خوش حالی کے گوناگوں عوامل میں ایک اور عامل کا اضافہ ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے ملک میں، نیز ملک کے باہر نقل و حمل کے وسائل محفوظ اور ارزاں ہوتے جاتے ہیں اور زرعی پیداواروں کے بازار پھیلتے پھیلتے تمام دنیا پر محیط ہو جاتے ہیں، اس نئے عامل یعنی فروخت پیداوار کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے

اور اگر پھر بھی اُس کی طرف سے غفلت کی جائے تو زراعت کے دوسرے شعبوں کی اصلاح و ترقی سے کاشتکاروں کو جو فوائد حاصل ہونے چاہئیں، اُن سے وہ بڑی حد تک محروم رہتے اور دوسرے اشخاص اُن سے مستفید ہوتے ہیں۔

زرعی پیداواروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ موسموں کی پابند ہیں جس کی وجہ سے سال بھر کی تمام پیداوار ایک خاص وقت پر پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ مصنوعات کی طرح وہ سال کے بارہوں مہینے متواتر تیار نہیں ہوتی رہتیں۔ نتیجہ یہ کہ جب تک کوئی خاص انتظامات نہ کئے جائیں، بازار میں رسد غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے اور چونکہ ہر کاشتکار جلد از جلد اپنی پیداوار فروخت کرنا چاہتا ہے، اور خریداروں کو کوئی خاص عجلت نہیں ہوتی اس لئے قیمتیں ناواجبی طور پر گر جاتی ہیں اور کاشتکاروں کو اپنی محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا۔ مزید برآں زرعی کاروبار بالعموم اس قدر چھوٹے پیمانے پر کئے جاتے ہیں کہ اگر کوئی ایک کاشتکار بلکہ کسی ایک گاؤں کے تمام کاشتکار اپنی پیداوار کو روک رکھیں تب بھی مجموعی رسد پر اُس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ قیمتیں گرنے سے رُک سکتی ہیں۔ لہٰذا ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی نظم قائم کیا جائے وہ سارے ملک پر حاوی ہو، اور زرعی کاروبار کی حد تک یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ مصنوعات تیار کرنے والے چند بڑے بڑے کارخانوں میں جس سہولت کے ساتھ اتحادِ عمل پیدا کیا جا سکتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے کم حیثیت کثیر التعداد کاشتکاروں میں ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ زرعی پیداوار کے خریدار بالعموم بڑے بڑے کارخانوں کے ایجنٹ یا مقامی ساہوکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بالعموم دولت مند، تعلیم یافتہ، طلب و رسد کے حالات سے باخبر اور معاملہ کرنے میں بڑے تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں اس کے برعکس کاشتکار غریب، جاہل، اور مقامی اور بیرونی حالات سے قطعاً ناواقف ہوتے اور معاملہ کرنے میں بڑی آسانی سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اکثر کارخانوں کے ایجنٹ انھیں کچھ پیشگی رقم دے دلا کر تیار ہونے سے پہلے ہی پیداوار پر اپنا حق جما لیتے ہیں اور جب معاملہ مقامی ساہوکار سے پڑے تو پھر کاشتکار کو ذرا بھی چون و چرا کی

گنجائش نہیں رہتی کیونکہ وہ پہلے سے ساہوکار کا قرضدار ہوتا ہے اور جب تک وہ اُسے مزید قرضہ نہ دے، آئندہ بھی اُس کا کوئی کام نہیں چل سکتا۔ اور اگر بالفرض کاشتکار مقامی ایجنٹ یا ساہوکار کے ہاتھ فروخت نہ کرے تو پھر جائے کہاں۔ ہندوستان کے اکثر دیہاتی علاقوں میں ذرائع آمدورفت اس قدر ناقص حالت میں ہیں کہ پیداوار کو دیہات سے باہر لے جانے میں کافی مصارف لاحق ہوتے ہیں۔ اور اگر کاشتکار یہ مصارف برداشت کر کے دُور دراز شہروں اور منڈیوں تک اپنی پیداوار لے بھی جائے، تب بھی اُسے ویسے ہی تیز ہشیار، باخبر اور مالدار فریق سے دوچار ہونا پڑے گا کیونکہ گو ہندوستان میں منڈیاں کافی تعداد میں موجود ہیں، لیکن اکثر و بیشتر صورتوں میں وہ نہ کسی خاص قانون اور ضابطے کے تحت قائم ہوئی ہیں اور نہ ان کے کاروبار میں کسی قسم کے قواعد و ضوابط کی پابندی کی جاتی ہے مختصر یہ کہ کاشتکاروں کی ناقابل برداشت قرضداری، اُن کی جہالت اور عام ناواقفیت، کثرت تعداد کی وجہ سے اُن میں اتحاد عمل کا فقدان، دیہاتی علاقوں میں ذرائع آمد و رفت کی غیر اطمینان بخش حالت، اور باضابطہ منڈیوں کی عدم موجودگی، یہ ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ کاشتکار بغیر کسی بیرونی امداد کے اپنی پیداواروں کی واجبی قیمتیں پا سکیں گے اور جب مناسب قیمتیں ملنے کا ہی قرینہ موجود نہ ہو تو پھر کس امید پر کوئی اپنی پیداوار کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ نتیجہ یہ کہ زرعی ترقی کے تمام شعبوں کی کامیابی فروخت پیداوار کے مناسب انتظامات کے ساتھ ناگزیر طور پر وابستہ ہے۔

جہاں تک فروخت پیداوار کے موجودہ طریقوں کا تعلق ہے، وہ نہ صرف مختلف صوبوں میں مختلف ہیں بلکہ ایک ہی صوبے کے اندر مختلف پیداواروں کو فروخت کرنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ لیکن باوجود ان گوناگوں اختلافات کے چند عام خصوصیات ایسی ہیں جو ملک کے ہر حصے میں نظر آتی ہیں اور جن کا بحیثیت مجموعی تمام ملک پر اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً اوزان اور پیمانے بالعموم اس طور پر استعمال کئے جاتے ہیں جس سے ہمیشہ کاشتکار ہی کو نقصان پہنچتا ہے۔

چونکہ ملک میں اوزان اور پیمانوں کے معینہ معیار نہیں ہیں اور نہ ان کی تنقیح و نگرانی کا کوئی باقاعدہ انتظام ہے اس لئے اس قسم کی دھوکہ بازی کا یہاں وسیع امکان موجود ہے جس کا خمیازہ ہمیشہ کمزور فریق کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مزید برآں مذہبی اور خیراتی اغراض کے نام سے بغیر کاشتکار کی رضامندی کے قیمت کا ایک جزو وضع کر لیا جاتا ہے اور رسم و رواج کا اثر اس قدر غالب ہے کہ کاشتکار اپنی ناراضگی کے اظہار کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔ نمونے کے طور پر پیداوار کی اچھی خاصی مقدار نکال لی جاتی ہے اور خواہ پیداوار خریدی جائے یا نہ خریدی جائے، بیچنے والے کو نمونے کی مقدار کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ بسا اوقات خود کاشتکاروں کو اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے ایجنٹوں کا واسطہ ڈھونڈنا پڑتا ہے اور یہ ایجنٹ خریداروں کے نمائندوں سے جو کچھ گفت و شنید کرتے ہیں وہ بالکل راز میں رہتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں پر کپڑا ڈالکر انگلیوں کے اشاروں سے معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ اور غریب کاشتکار اُن کی نوعیت سے سراسر ناواقف رہتا ہے۔ بڑی بڑی منڈیوں میں کاشتکار کسی نہ کسی دلال کو مقرر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ دلال بالعموم کاشتکاروں سے ناواقف لیکن خریداروں سے روزانہ ملنے جلنے والے ہوتے ہیں اور اس وجہ سے فطرتاً انہیں کی حمایت کرتے ہیں، اور اگر کہیں خریدار اور فروشندہ، دونوں کا ایک ہی دلال ہو تو پھر خریدار کی حمایت اور بھی زیادہ یقینی اور بدیہی ہو جاتی ہے۔ یہ ایسے نقائص ہیں جو ہندوستان کے کسی خاص مقام یا کسی خاص پیداوار کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ملک کے ہر حصہ میں اور ہر پیداوار کی خرید و فروخت میں وہ کم و بیش ضرور پائے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان خرابیوں کو کیونکر رفع کیا جائے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کاشتکار کے تمام موجودہ مصائب کا باعث محض یہ درمیانی اشخاص ہیں جو کاشتکار سے اس کی پیداوار اونے پونے داموں پر خرید کر خریداروں سے اس کی خوب قیمتیں وصول کرتے اور اس طور پر مفت اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ لہٰذا ان خرابیوں کی اصلاح کا سیدھا سادہ علاج یہ ہے

کہ درمیانی تاجروں کا قلع قمع کر دیا جائے اور کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ کاشتکار اپنی پیداوار یں براہ راست صارفین کے ہاتھ فروخت کر سکیں۔ واضح رہے کہ اس قسم کے عام بیانات کو علمی تحقیق کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اور نہ کوئی ذمہ دار شخص ان کی بنا پر کوئی عملی تدبیریں اختیار کر سکتا ہے جدید نظام معیشت سے جو لوگ ذرا بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ درمیانی تاجروں کی ناگزیر ضرورت اور ان کے اہم فرائض کی نوعیت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ کاشتکاروں سے پیداوار اکٹھا کر کے اسے صارفین میں اس طور پر تقسیم کرنا کہ مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں طلب و رسد کا توازن نہ بگڑنے پائے ایک نہایت دقت طلب اور پیچیدہ کام ہے اور جب تک کہ کوئی شخص اپنے آپ کو ابتدا ہی سے اس کے لئے وقف نہ کر دے، وہ اسے کامیابی کے ساتھ نہیں انجام دے سکتا۔ مال تیار کرنے یا پیداوار اگانے والوں سے یہ توقع کرنا کہ وہی اس پیچیدہ کاروبار میں بھی مہارت تامہ حاصل کریں، دراصل عبث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں تجارت پیشہ اشخاص کا ایک علیحدہ گروہ موجود ہے جو ملک کی معاشی زندگی میں ناگزیر خدمات انجام دیتا ہے ہندوستانی زراعت میں تو ان خدمات کو انجام دینے والے ایک مخصوص طبقے کی ضرورت اور بھی ناگزیر ہے۔ اول تو یہاں ذرائع آمد و رفت انتہا درجے ادنیٰ حالت میں ہیں دوسرے یہاں کا زرعی کاروبار کثیر التعداد کم حیثیت کاشتکاروں کے ہاتھوں میں ہے۔ تیسرے ان کسانوں کی نہ مالی حالت ایسی ہے کہ وہ اپنی پیداوار فوراً فروخت کرنے کے لئے بے چین نہ ہوں اور نہ انھیں ایسے گودام میسر ہیں جہاں وہ بہتر قیمتوں کی امید میں اپنی پیداواروں کو بہ حفاظت رکھ سکیں مزید براں جس حالت میں وہ اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے آتے ہیں، وہ بے احتیاطی اور قصداً آمیزش کرنے سے ہرگز اس قابل نہیں ہوتی کہ بازار میں اس کی اچھی قیمت مل سکے۔ ان گوناگوں دقتوں پر غالب آنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم بھی دوسرے ممالک کی طرح درمیانی تاجروں کی خدمات سے مستفید ہوں، اور ان خدمات کا واجبی معاوضہ ادا کرنے میں تامل نہ کریں۔ البتہ یہ احتیاط لازم ہے کہ یہ لوگ ملک کے حق میں مفید ثابت ہونے کی بجائے

کہیں اُلٹے وبال جان نہ بن جائیں۔ ہندوستان میں فروخت پیداوار کی حد تک سردست جو خرابیاں نظر آرہی ہیں، وہ دراصل ایسی ہی احتیاط نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ قرض دینے والے ساہوکار کا خود اپنے آسامی کی پیداوار خرید لینا، یا ضرورت سے زیادہ اشخاص کا اس درمیانی تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنا لینا، یا اس میں ایسے اشخاص کا داخل ہونا جن کا منشا محض کاشتکاروں کی مجبوریوں سے بے جا فائدہ اُٹھانا ہو، یہ ایسی خرابیاں ہیں جو زراعت کی ترقی اور زراعت پیشہ طبقے کی خوش حالی میں بُری طرح حائل ہیں اور اسی وجہ سے ان کی اصلاح کے مسئلے کو یہاں بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اصلاح کی تدبیروں میں سب سے زیادہ اہم باضابطہ منڈیوں کا قیام ہے۔ زرعی کمیشن کا بیان ہے کہ جب کبھی کاشتکار کو اپنی پیداوار اپنے ہی گاؤں میں فروخت کرنے کی بجائے کسی منڈی میں فروخت کرنے کا موقعہ ملتا ہے تو باوجود مصارف نقل و حمل کے اُسے نسبتاً بہت بہتر قیمت ملتی ہے، خواہ منڈی کتنی ہی محدود اور اس کی تنظیم کتنی ہی خراب ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں موجودہ منڈیوں کی اصلاح اور جدید باضابطہ منڈیوں کا قیام کاشتکاروں کے حق میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ لہذا ملک کی زرعی ترقی کے لئے جو بھی اسکیم بنائی جائے، باضابطہ منڈیوں کا قیام اس کا ایک لازمی عنصر ہونا چاہیئے کیوں کہ اسی کی بدولت زراعت کے محکموں کی گوناگوں کوششیں بارآور ہوسکتی ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ اب ہندوستان کے اکثر صوبوں میں باضابطہ منڈیوں کے قیام کی کوششیں کی جارہی ہیں اور ہماری ریاست حیدرآباد بھی اس جدوجہد میں دوسروں کے دوش بدوش چل رہی ہے چنانچہ ایک خاص قانون کے تحت متعدد باضابطہ منڈیاں قایم ہوچکی ہیں اور ہمارے کاشتکاران کے فوائد سے روز بروز مستفید ہورہے ہیں۔ قوانین بازار کی رو سے ہر ہر صوبہ وار حکومت منڈیاں قایم کرکے ان کا اعلان کردیتی اور ان کے انتظام کے لئے کمیٹیاں مقرر کردیتی ہے جن میں خریدار اور فروشندہ، دونوں کے نمائندے شامل کئے جاتے ہیں، انتظامی کمیٹیوں کی

اوران کے اختیارات کی صراحت کردی جاتی ہے اوران کی رہ نمائی کے لئے مفصل قواعد
ئے جاتے ہیں جن کے مطابق وہ فیس وصول کرتی اور بازار کے اغراض پر صرف کرتی ہیں،
ں اور تولنے اور ناپنے والوں کو خاص شرائط کے تحت لائسنس عطا کرتی ہیں، تول اور ناپ
لئے خاص خاص مقام اور خاص خاص اوزان اور پیمانے مقرر کرتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کی
) اور تصحیح کرتی ہیں، غرض منڈی کے انتظام سے متعلق جو جو امور پیش آسکتے ہیں، ان سب
یھ بھال کرتی ہیں۔ صوبہ واری حکومت کو یہ اختیار ہے کہ غیر اجازت یافتہ منڈیوں اور
ات کو خاص خاص حدود کے اندر ممنوع قرار دے۔

زرعی کمیشن نے ان قوانین کی تفصیلات میں بہت کچھ اصلاح کی گنجائش بتائی ہے لیکن
ں اصول پر مبنی ہیں اس کی بہت تعریف کی ہے اور حکومت سے پرزور سفارش کی ہے کہ
رے صوبوں میں بھی ایسے ہی قوانین نافذ کرکے جلد از جلد باضابطہ منڈیاں قائم کی جائیں۔
یلی سفارشات بیان کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں ہے، البتہ تین چار امور ایسے ہیں جن کا
سری ذکر کردینا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ان قوانین کے تحت جو باضابطہ منڈیاں اب تک قائم
ں ہیں، ان سب کا تعلق صرف روئی کی خرید و فروخت سے ہے۔ بمبئی کا قانون تو صریحاً
ئی ہی کی تجارت کے لئے بنایا گیا ہے۔ برار کے قانون میں اگرچہ دوسری پیداواروں کے لئے
اِش موجود ہے لیکن عملاً جتنی منڈیاں اب تک قائم ہوئی ہیں وہ سب روئی کی تجارت سے
لق ہیں۔ ممکن ہے کہ ابتداءً یہی طرز عمل قرین مصلحت رہا ہو لیکن اب جبکہ تجربے سے باضابطہ
ڈیوں کے فوائد بدیہی طور پر ثابت ہو چکے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ وہ روئی کے علاوہ دوسری
اواروں کے لئے بھی مفید ثابت ہوں۔ دوسرے یہ کہ باضابطہ منڈیوں کا قیام بلدیات یا
ِس اضلاع کے صوابدید پر نہ چھوڑا جائے۔ یہ ادارے پہلے ہی سے دوسرے طبقوں کے
یر اثر ہیں اور کاشتکاروں کو ان میں کوئی دخل یا اثر حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ
ر صوبہ واری حکومت اپنی عملداری میں ایک بالکل علیحدہ قانون نافذ کرے جس کے تحت باضابطہ

منڈیوں کا قیام، انتظامی کمیٹیوں کی تشکیل اور ان کے قواعد و ضوابط کا تعین عمل میں آئے۔ تیسرے یہ کہ جب خریدار اور فروشندے کے درمیان کوئی جھگڑا واقع ہو تو اس کے تصفیہ کے لئے پہلے سے باقاعدہ انتظام موجود ہونا چاہیئے۔ ورنہ کاشتکار ہی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ مثلاً روئی کی حد تک اکثر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ خریدار منڈی میں تو نمونہ دیکھ کر روئی خرید لیتا ہے لیکن [illegible] میں پہنچ کر جب گاڑی سے روئی اتار لی جاتی ہے تو اسے خلاف نمونہ قرار دے کر قیمت میں کمی کر دیتا ہے۔ غریب کاشتکار میں کہاں یہ استطاعت کہ پھر گاڑی میں روئی لاد کر اسے کہیں اور فروخت کرنے کے لئے لیجائے۔ چار و ناچار اسی قیمت پر راضی ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ انتظامی کمیٹی کی جانب سے کوئی پنچایت یا ثالثی بورڈ مقرر کر دیا جائے جو اس قسم کے تمام جھگڑوں کا مناسب تصفیہ کر سکے۔

باضابطہ منڈیوں کے قیام سے کاشتکاروں کو اور بھی بہت سے فوائد پہنچنے کا قرینہ ہے۔ مثلاً پیداواروں کی طلب اور رسد اور ان کی قیمتوں سے ہمیشہ باخبر رہنا فریقین کاروبار کے لئے خاصکر اس روز افزوں مسابقت کے زمانہ میں بے حد ضروری ہے۔ ذرائع نقل و حمل اور وسائل خبر رسانی کی غیر معمولی ترقی کی بدولت اب اکثر زرعی پیداواروں کے لئے ساری دنیا گویا ایک بازار بن گئی ہے۔ اگر دنیا کے کسی ایک گوشے میں فصل خراب یا معمول سے زیادہ سرسبز ہوتی ہے تو اس کے اثرات صرف اسی خطے تک محدود نہیں رہتے بلکہ ساری دنیا پر پھیل جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی ایک ملک میں کسی پیداوار کی طلب بڑھتی یا گھٹتی ہے تو دوسرے تمام ممالک اس تبدیلی سے کم و بیش متاثر ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کاشتکار کو اپنی پیداوار کی واجبی قیمت پانے کے لئے بازار کے حالات اور ان کی تبدیلیوں سے بر وقت واقفیت حاصل کرنا نہایت ضروری ہے

ہندوستانی کاشتکار کی لاعلمی کی یہ کیفیت ہے کہ دوسرے ممالک کے حالات تو ایک طرف، وہ خود اپنے صوبے کی حالت سے بھی بے خبر رہتا ہے اور اسی وجہ سے معاملہ کرنے میں دوسرے فریق سے بہ آسانی دھوکہ کھا جاتا ہے۔ روئی کی حد تک اس قسم کی واقفیت بہم پہنچانے کے

کہیں کہیں انتظامات موجود ہیں ۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سردست ملک میں کاشتکاروں کو بازار کے حالات سے بروقت واقف ہونے کے کوئی ذرائع حاصل نہیں ہیں۔ باضابطہ منڈیوں کے قیام سے یہ کمی بہ آسانی پوری کی جاسکتی ہے اور وہ اس طور پر کہ انتظامی کمیٹی کے فرائض میں یہ بات شامل کردی جائے کہ وہ اس منڈی میں لین دین کرنے والوں کے فائدے کے لئے بازار کے متعلق خاص خاص معلومات وقتاً فوقتاً مہیا کیا کرے مثلاً یہ کہ پڑوس کی دوسری منڈیوں میں اور ملک کے بڑے بڑے بندرگاہوں میں جہاں سے پیداوار برآمد کی جاتی ہے، کیا قیمتیں رائج ہیں، گرنیوں اور کارخانوں میں سابقہ ذخیرے کن مقداروں میں موجود ہیں دوسرے ملکوں میں طلب و رسد کے کیا حالات ہیں اور پیداواروں کی قیمتوں پر ان کے کیا اثرات پڑنے کا قرینہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

مناسب قیمت حاصل کرنے کے لئے بعض اوقات پیداوار کو کچھ دنوں کے لئے روک لینا ضروری ہوتا ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ پیداوار کو بحفاظت رکھنے کے لئے گودام موجود ہوں اور اس پیداوار کی بنا پر فوری ضروریات کے لئے روپیہ حاصل کرنے کا امکان بھی ہو، ہندوستان میں یہ سہولتیں بالکل مفقود ہیں ۔لیکن اگر باضابطہ منڈیاں قائم ہو جائیں تو اس کمی کی تلافی بھی چنداں مشکل کام نہیں ہے ۔ ہر انتظامی کمیٹی اپنی مالی حالت کے مطابق تھوڑا بہت روپیہ محفوظ گوداموں کی تعمیر پر صرف کرسکتی ہے ۔ اور امداد باہمی کی انجمنوں کے اتحاد عمل سے اراکین کو ان کی پیداواروں کی ضمانت پر تھوڑی مدت کے لئے حسب ضرورت قرضہ دینے کا انتظام کیا جاسکتا ہے ۔اس قسم کی سہولتوں کا وجود ہی بسا اوقات خریداروں کو کاشتکاروں کی مجبوریوں سے بیجا فائدہ اٹھانے اور ناواجبی طور پر پیداواروں کی قیمتیں گھٹانے سے باز رکھنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں اوزان اور پیمانہ جات کی موجودہ حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہے ۔صوبہ بمبئی کے صرف ایک ضلع یعنی مشرقی خاندیش کی سولہ منڈیوں میں کوئی تیرہ مختلف اوزان کے جدا جدا

مروج ہیں پنجاب کے ضلع جہلم میں صرف ساٹھ مربع میل کے رقبے کے اندر اناج کی خرید و فروخت میں چھ مختلف پیمانے استعمال کئے جاتے ہیں۔ کم و بیش یہی حال ہندوستان کے دوسرے حصوں کا بھی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اشیاء کے لین دین میں بالعموم سخت مزاحمت واقع ہوتی ہے۔ خاصکر کاشتکاروں کو اس سے ہمیشہ نقصان پہنچتا ہے۔ اپنی جہالت اور دوسری مجبوریوں کے باعث پہلے ہی سے ان کا انحصار درمیانی اشخاص کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ لیکن اوزان اور پیمانوں کا کوئی عام معیار معین نہ ہونے سے ایک اور حربہ ان درمیانی اشخاص کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس کی بدولت غریب کاشتکاروں کو دھوکہ دینے اور ان کی مجبوریوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کے مزید امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ حکومت ہند نے اس مسئلے کی تحقیق کے لئے ۱۹۱۳ء میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے اس بارے میں متعدد سفارشیں پیش کیں۔ ان کے منجملہ ایک بہت اہم سفارش یہ تھی کہ حکومت ۸۲ ½ پونڈ کے مَن کو سارے ملک کے لئے وزن کا معیار قرار دے۔ بدقسمتی سے ان سفارشوں پر اب تک کوئی عمل نہیں کیا گیا اور صورت حال اب بھی وہی ہے جو اس تحقیق سے پہلے موجود تھی۔ لیکن باضابطہ منڈیوں کے قیام سے اس بات کی قوی توقع ہے کہ یہ خرابیاں بھی بڑی حد تک رفع ہو جائیں گی اور اس ضروری اصلاح میں ان کی وجہ سے بہت ناگزیر مدد ملے گی۔

باضابطہ منڈیوں کا ایک اور اہم فائدہ یہ ہے کہ ان کو مظاہروں اور پروپگنڈا کا ایک موثر ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ زرعی ترقی کی مختلف تدبیروں سے کاشتکاروں کو واقف کرانے کے لئے زراعت اور امداد باہمی کے صوبہ واری محکمے بہت کچھ پروپگنڈا کرتے ہیں اس غرض کے لئے ان کے کارکن وقتاً فوقتاً دیہات کا دورہ کرتے اور کاشتکاروں کو مختلف امور سے جو ان کی زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں، آگاہ کرتے اور ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے اور ترقی کے راستے پر چلنے کی ہدایت کرتے اور تدبیریں بتاتے ہیں۔ باضابطہ منڈیوں کے قیام سے اس ضروری پروپگنڈا کے لئے ہر جگہ نہایت موزوں مرکز مہیا ہو جائیں گے۔ مزید برآں ہر اہم منڈی کے احاطے میں

انجمن امداد باہمی یا ڈاکخانے کے سیونگ بنک کی ایک شاخ کھول کر کاشتکاروں کو آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قیمت پیداوار کا کچھ نہ کچھ حصہ اس میں بطور امانت رکھ دیں بلکہ خود مشترک سرمایہ دار بنکوں کے سامنے بھی ان منڈیوں کے قیام سے کاروبار کا ایک وسیع میدان کھل جائے گا اور عوام میں بنکوں سے لین دین کرنے کی عادت ترقی پائے گی۔ ؎

اِسلامی دنیا میں تیل کا خزانہ

حبشہ پر حملہ کرنے کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے مسولینی نے "پلانسوپی جی" کے کونسل روم میں آمرانہ انداز میں کہا تھا کہ "ہاں تو اب ہم حملہ کریں گے، برطانیہ دخل نہیں دے گا۔ جرمنی کو فوجی تعمیر سے فرصت نہیں ہے، فرانس ہمارا یار ہے، رستہ بالکل صاف ہے، ہمارے پاس سونا، آدمی، جنگی مشینیں بہت ہیں ہمیں کوئی نہیں روک سکتا"۔ ایک مغربی مصنف پیٹرک تھامپسن کا خیال ہے کہ مسولینی اس وقت ایک چھوٹی سی چیز بھول گیا جو اس کے یلغار کے لئے سدِ سکندری بن کر حبشہ میں اس کی مشین گنوں کو ٹھپ کر سکتی تھی، وہ شے تھی کیا؟ "تیل" وجہ اس کی یہ ہے کہ اٹلی لہ میں تیل کا خرچ تو کروڑوں ٹن ہے اور ہوتی ایک بوند نہیں۔ نہ اس کے اپنے ملک میں ہوتی ہے اور نہ اس کے زیرِ اثر علاقوں میں تمام تیل اس کو دوسرے ملکوں سے خریدنا پڑتا ہے۔

برطانوی کابینے کے ایک سابق رکن نے جنگِ عظیم کے متعلق کہا تھا "اتحادیوں کی فتح کشتی تیل کے سمندر کے ذریعے آئی تھی" تو غلط نہیں کہا تھا لیکن تیل صرف جنگ ہی میں صرف نہیں ہوتا۔ اب امن وامان کے زمانے میں اس کی جو مقدار سالانہ خرچ ہو رہی ہے وہ چودہ کروڑ ٹن کے قریب ہے۔ پھر کس کی مجال ہے جو تیل کی اہمیت سے انکار کرے۔

اسلامی دنیا ایشیا کے بحری اور ہوائی راستے میں واقع ہونے کی وجہ سے تو سیاسیاتِ عالم میں اہم ہے ہی لیکن پٹرول

لہ یوں تو برطانیہ عظمیٰ بھی محتاج محض ہے، لیکن ماتحت علاقوں میں اتنا تیل موجود ہے کہ دوسرے ملکوں کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑتا۔ مگر اٹلی کے کسی ماتحت علاقے میں بھی تیل نہیں ہوتا۔ دنیا کی سات بڑی طاقتوں میں صرف روس اور امریکہ تیل کے معاملے میں بے نیاز ہیں ورنہ باقی پانچ میں یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو ناقابلِ ذکر۔ فرانس اپنے کل خرچ میں سے ۲۹/۳۰، جرمنی ۹/۱۰ جاپان ۶/۱۰ اور اٹلی سو فی صدی دوسرے ملکوں کے دست نگر ہیں۔

مفلسی ، اور جھونٹوں کے ہاں تیل کی فراوانی نے اس کی اہمیت میں اور اضافہ کر دیا ہے ۔ افغانستان سے لے کر مصر
شام تک تمام ملکوں میں تیل کی اچھی مقدار موجود ہے ۔ اسے اتفاق کہئے یا قدرت کی ستم ظریفی کہ تیل بیچنا سب
لے انھوں نے شروع کیا جو فارسی پڑھتے اور نہ صرف پڑھتے بلکہ لکھتے اور بولتے بھی ہیں سیال سونے کی یہ کثرت ان
وں کی خوش قسمتی ہے ۔ لیکن جب روشنی طبع پر حرص و آز کی بلائیں ہجوم کرنے لگیں تو خطرہ بھی بن جاتی ہے ۔

بہر حال یہ قدرت کا ایک عطیہ ہے ، جس میں اہلیت نہیں ہے اس کے پاس نہیں رہے گا اور جو صلاحیت رکھتے
ب ان سے کوئی چھین نہیں سکے گا عام واقفیت کے لئے ہم ان عطیات پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں ۔

ایران

تیل کی زیادتی کے لحاظ سے ممالک اسلامیہ میں ایران کا نمبر اول ہے ۔ اینگلو ایرانین کمپنی (اس میں
ریکفالت حکومت برطانیہ ہے) جو گذشتہ سال تک ایرانی تیل کی واحد اجارہ دار تھی ، ایران کی سب سے پہلی کمپنی ہر

یہ کمپنی اصل میں ڈبلیو۔ کے۔ ڈی۔ آرکی کے اس معاہدے کی پیداوار ہے جو سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا۔ مسٹر آرکی جو ایک زمانے میں برماشل کمپنی میں بھی رہ چکے تھے، حکومت (اس زمانے میں مظفرالدین قاچار بادشاہ تھے) نے ۶۰ سال کے لئے معاہدہ کیا تھا اور ایران کے پانچ شمالی ضلعے مستثنیٰ کرکے تمام ملک میں انھیں تحقیق کی اجازت دے دی تھی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں یہ اجارہ اینگلو ایرانین کمپنی نے حاصل کرلیا۔ مسٹر آرکی نے ۸ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد مسجد سلیمان میں تیل کا پتہ لگایا۔ کنوئیں کھودوائے گئے۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے قائم ہوئے اور ۲۰ سال بعد سنہ ۱۹۲۲ء سے تیل کی باقاعدہ تجارت ہونے لگی۔ سنہ ۱۹۱۹ء تک اس کے تیل کی مقدار ۱۰ لاکھ ٹن تک تھی اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ۶۰ لاکھ ٹن ہوئی۔ گذشتہ سال ۹۰ لاکھ تک پہنچ گئی ابھی اس میں ترقی کی بہت گنجائش ہے۔

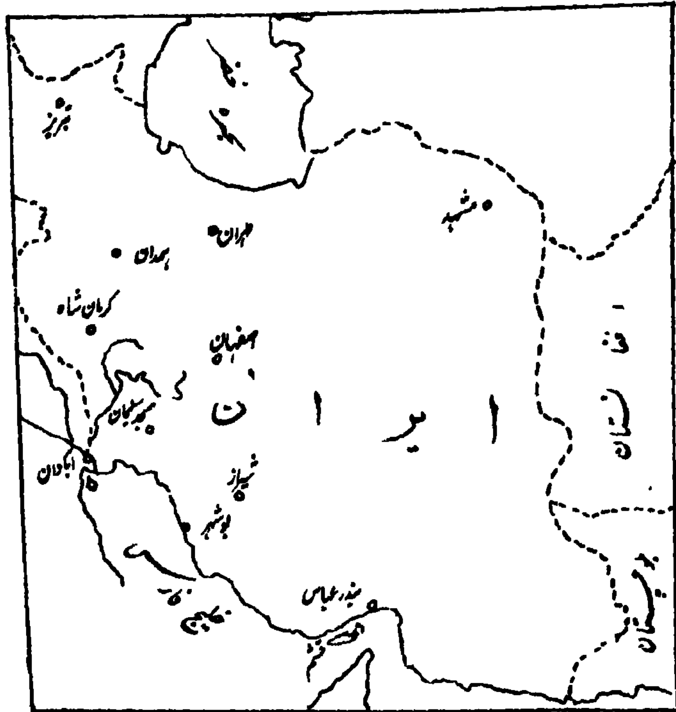
تیل کی صفائی آبادان میں ہوتی ہے اور یہیں سے اس کی برآمد ہوتی ہے۔ مسجد سلیمان اور آبادان کا فاصلہ کوئی ۲۰۰ میل کے قریب ہے۔ آبادان ایک چھوٹی سی بستی ہے جس کو سمندر سے نکالی ہوئی نہر نے دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ ایک طرف ایرانی آباد ہیں دوسری طرف کمپنی کے انگریز افسر اور ملازمین کی کوٹھیاں ہیں۔ یہ نہر کمپنی نے اپنی سہولت کے لئے بنائی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں اس نے شہر میں خاص رونق پیدا کردی ہے۔

تیل نکالنے کا مرکز صرف مسجد سلیمان ہی نہیں ہے۔ ہفت کل کے علاقے میں اگرچہ بعد میں تیل دریافت ہوا ہے۔ لیکن اس کی پیداوار بڑھ رہی ہے اور اب مسجد سلیمان سے زیادہ ہوگئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں ہفت کل کے تیل کی مقدار چوالیس لاکھ چوہتر ہزار ٹن تھی اور مسجد سلیمان کی چھتیس لاکھ اکتالیس ہزار ٹن۔ نئی تحقیقات برابر جاری ہیں۔ ہفت کل سے ۱۲۵ میل جنوب مشرق میں اور آبادان کے مشرق میں ۵۵ میل پر ایک مقام ہے گچ قزل علی وہاں بھی تیل کے آثار ہیں، اس کے قریب ہی اسمری میں ایک کنواں گذشتہ سال کھودا گیا تھا۔ اس سے تو ۹۰۰ ٹن یومیہ تیل نکلا، لیکن دوسرے سے چار ہزار ٹن یومیہ کا اوسط رہا۔ خیال یہ ہے کہ یہ میدان مسجد سلیمان کے میدان سے بازی لے جائے گا۔

مسجد سلیمان کے شمال مغرب میں زلو کے مقام پر تیل کا یقین تھا۔ کھدائی شروع ہوئی اور جب عام گہرائی پر تیل نہیں نکلا تو اور زیادہ کھودا گیا۔ حتیٰ کہ وہ گیارہ ہزار فٹ یعنی ۲ میل سے زیادہ گہرا ہوگیا۔ یہ دنیا کا عمیق ترین کنواں ہے۔ لیکن تیل کی مقدار کھودا پہاڑ نکلا چوہا کی مصداق رہی۔

سنہ ۱۹۲۸ء سے اب تک یعنی ۱۰ سال میں ایران کے ان میدانوں سے نو کروڑ ٹن سے زیادہ تیل حاصل ہے۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں ایران میں انقلاب ہوا۔ شاہانِ قاچار کے آخری بادشاہ سلطان احمد کو تخت سے اتار دیا گیا ماہ پہلوی کی تاج پوشی ہوئی، ایرانیوں میں نئی زندگی پیدا ہوئی۔ ملک میں دورِ جدید کا آغاز ہوا۔ ہر ہر ملکی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا تو بعض شکایات کی بنا پر نومبر ۱۹۳۲ء میں کمپنی کے معاہدے کو بھی فسخ لیکن پھر کمپنی سے نئی شرائط کے ساتھ مصالحت ہو گئی۔ اجارہ کی مدت ۶۰ سال ہو گئی، اور یہ طے پایا کہ م ساڑھے سات لاکھ پونڈ سالانہ حکومت کو ضرور دے گی (چار شلنگ فی ٹن کے حساب سے تیل خواہ اندر فروخت کیا جائے یا باہر، دونوں صورتوں میں)



سنہ ۱۹۳۵ء میں حکومت ایران سے دو کمپنیوں نے اور معاہدہ کیا ہے۔ ان میں ایک ایرانین تیل کمپنی (سی بورڈ) دوسری ایران پائپ لائن کمپنی (سی بورڈ) ہے۔ پہلی سے یہ معاہدہ ہے کہ وہ مشرقی اور شمال شرقی ایران

، پانچ لاکھ مربع میل علاقے میں تحقیق و تلاش کا کام شروع کرسکتی ہے۔ لیکن کھدائی کے لئے صرف ایک لاکھ مربع یل کا علاقہ دیا جائے گا۔ کمپنی تین سال کی مدت میں وہ ایسے علاقوں کا انتخاب کرے گی جو رقبہ مجاز سے زائد نہ ہوں ۔ علاقہ تعین ؟ بندر شاہ سے سرحد بلوچستان تک ہے۔ ضلع سیمنان (طہران کے مشرق میں) تو تیل کا یسے یقین ہے۔

اگران میدانوں میں اچھے کنوئیں نکلے تو کمپنی کام جاری رکھے گی۔ حتیٰ کہ ۶۰ لاکھ ٹن تیل سالانہ ہو جائے کمپنی بھی انگریز ایرانی کمپنی کی طرح چار شلنگ فی ٹن حکومت کو دے گی اور عام شریکوں کے حصے میں سے ۵۰ فیصدی دا کرے گی (انگریز ایرانی کمپنی ۱۶ فی صدی دیتی ہے) ان دونوں رقموں کی تعداد پہلے تین سال میں تین ن لاکھ، دوسرے پانچ سال میں پانچ پانچ لاکھ اور اس کے بعد (ختم معاہدہ تک) چھ چھ لاکھ پونڈ سے ، نہ ہونی چاہیئے۔ (انگریز ایرانی کمپنی کم ازکم ہے لاکھ پونڈ ادا کرتی ہے) کمپنی سے یہ بھی طے ہوا ہے کہ وہ ایرانی لباء کو امریکہ میں تعلیم دلانے کے لئے (جب تیل تجارتی مقدار میں نکلنا شروع ہو جائے گا) دس ہزار پونڈ سالانہ) امداد دے گی۔

دوسری کمپنی نے پائپ لائن تعمیر کرنے کا معاہدہ ہوا ہے، یہ دونوں معاہدے ساٹھ سال کے لئے ہیں' ائپ کمپنی افغانستان کا تیل ایرانی نلوں سے بھیجنے کی مجاز ہوگی۔ ایران کی ایک تازہ اطلاع (تصدیق طلب) ہے کہ جنوبی ایران میں اجارہ کے متعلق بعض کمپنیوں سے گفت و شنید ہو رہی ہے۔ جزیرہ قشم میں تیل کے یقینی آثار ہیں۔

عراق

عراق کی تاریخی سرزمیں جو تہذیب کے قدیم ترین مرکز بابل و نینوا ہی کو اپنے دامن میں نہیں چھپائے ہو بلکہ مسلمانوں کے تمدن کا گہوارہ بھی رہ چکی ہے، آج تیل کی طویل ترین لائن کا منبع ہونے کی حیثیت سے مشرق ومغرب کی سیاست کا شریک بنی ہوئی ہے۔ یہاں ایک اجارہ دار، عراق پٹرولیم کمپنی ہے جس کے ساڑھے نی صدی حصے انگریز ایرانی (برطانوی حکومت) شاہی ڈچ، شل، فرانسس دی پٹرول (بہ شرکت حکومت فرانس) اور امریکن کمپنیوں (اسٹینڈرڈ آئل آف نیوجرسی اور ساکونی ویکم) کے پاس ہیں۔ دوسری کمپنی

بی، او، ڈی ہے جو موصل آئل فیلڈ کمپنی کے ماتحت ہے۔ عراق کے تیل کے میدانوں کا رقبہ کوئی ۲۰ مربع میل ہے، بالکل بیابان، تیل اور پانی کے نلوں کے انچارج افسروں اور ملازموں کے سوا یہاں نہ

ترکی
بحیرہ روم
طرابلس
شام
موصل
کرکوک
(ب)
پالمیرا
حدیثہ
حیفہ
بغداد
رتبہ
ا
عراق
نجد

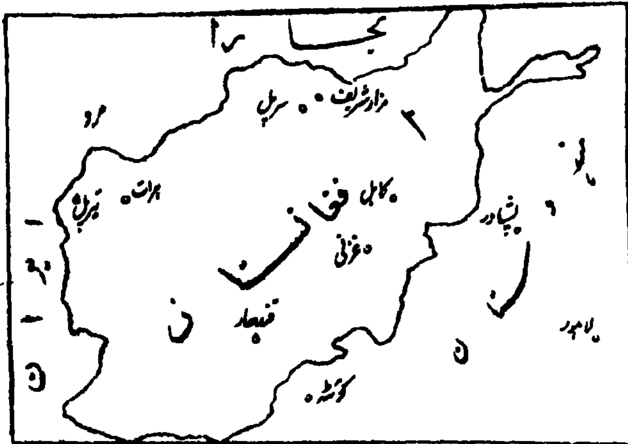
کوئی رہتا ہے نہ بستا ہے۔ لیکن یہ میدان جو بقول لارڈ کمیڈمین "سوڈے کی بوتل کی مانند تیل سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کی زمین کے نیچے بڑی بڑی قوتیں پوشیدہ ہیں اور باہر آنے کے لئے بیتاب ہیں"۔ ۱ تیل کا نل کا کرکوک سے بحر روم تک مسلسل چلا گیا ہے۔ درمیان میں شام، شرق اردن اور فلسطین کے ملکوں سے گذرتا ہے اس نل کی دو لائنیں ہیں ایک شام سے گذرتی ہوئی ٹری پولی چلی جاتی ہے یہ فرانس کی لائن ہے۔ دوسری شرق اردن اور فلسطین ہوتی ہوئی حیفہ بندرگاہ تک آتی ہے۔ یہ برطانیہ کا نل ہے۔ کرکوک سے دونوں نل ساتھ چلتے ہیں حدیثہ (اس کو تیل کی دنیا میں (ک - ۳ - K-3) کہتے ہیں۔) پہنچ کر فرانس کا نل پالمیرا کا رخ کرتا ہے۔ اور برطانوی نل رتبہ کی راہ لیتا ہے۔ اس لائن پر ۱۲ پمپنگ اسٹیشن ہیں۔ تین آباد اور ترقی یافتہ بستیوں کے کنارے ہیں اور نو بے آباد مقامات پر۔ دنیا کی یہ عجیب وغریب لائن جو بقول لارڈ ہیلی اہرام مصر سے کم تعجب خیز نہیں ہے۔ ۶۰۰ میل تک ریگستان میں چلتی ہے۔ کل لمبائی گیارہ سو پچاس میل ہے۔ لائن کا نشیب فراز بھی خوب ہے۔ ایک جگہ بلند ہوتے ہوتے آٹھ سو فٹ بلند ہو گئی ہے اور دوسری جگہ پست ہونی شروع ہوئی تو سطح سمندر سے نو سو فٹ نیچے پہنچ گئی ہے جہاں پہاڑ راستے میں آ گئے ہیں پوری چٹانیں کاٹ ڈالی ہیں

بظاہر یہ کام انسانوں کا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن فرہادِ عشق کی تیشہ زنی پتھر کو پانی کر دیتی ہے

عراق میں تیل کا دوسرا میدان نفت خانہ ہے۔ یہ ایران اور عراق دونوں کو تیل دیتا ہے۔ نفت خانہ سے درۂ پاتتاک ہو کر لائن کرمان شاہ جاتی ہے۔ کرمان شاہ میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ ہے جس کارخانہ میں دس ہزار ٹن تیل روزانہ وصول ہوتا ہے۔ سالانہ پیداوار پچاس لاکھ ٹن سے زیادہ ہے۔

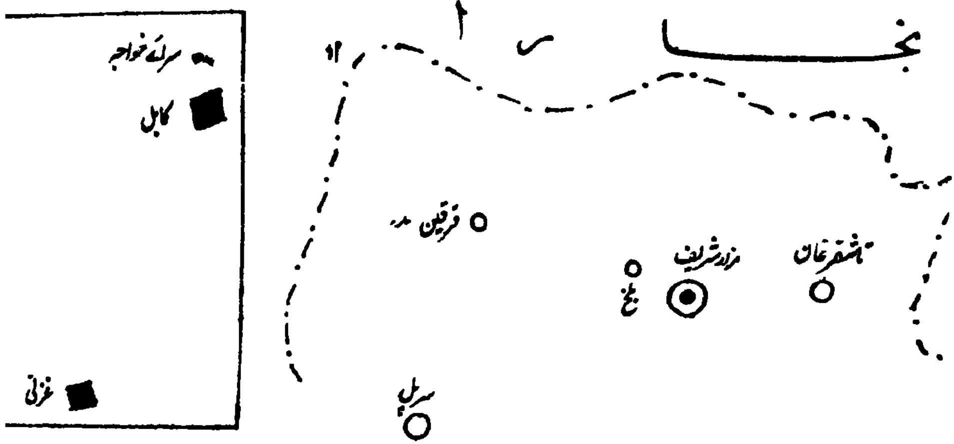
افغانستان

افغانستان میں بھی لوگوں کو تیل کا یقین ہو چلا ہے۔ اس سلسلے میں جن مقامات کا نام لیا جاتا ہے ان میں ایک تیرپل ہے جو ہرات کے مغرب میں ٹھیک ایران کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں کچھ چشمے دریافت ہوئے ہیں اُن . . . رت افغانستان کے عجائب خانہ میں بھی موجود ہے مقر (غزنی کے جنوب میں) اور سمت جنوبی میں (جس کی سرحد ہندوستان سے ملتی ہے) میں بھی زمین کا پتہ دیتی ہے۔ علاوہ ازیں مزار شریف کے جنوب مغرب میں سرپل، تاشقرغان (مزار شریف کے بالکل قریب) قطغن اور سرائے خواجہ (نزد کابل)



میں بھی زمین کی حالت بہت امید افزا ہے۔ ان حالات میں باقاعدہ تحقیق و تلاش ضروری تھی ہی، حال میں حکومت نے ایک امریکن کمپنی سے معاہدہ کر لیا ہے۔ اس کی شرائط بھی بالکل اسی قسم کی ہیں جیسی ایران اور آرمینین کمپنی کے درمیان طے ہوئی ہیں۔ کمپنی کا نام ان لینڈ ایکسپلوریشن کمپنی ہے۔ مدت معاہدہ پچھتر سال ہے۔ کمپنی کا وعدہ ہے کہ جلد سے جلد تیل کی مقدار کو بیس لاکھ ٹن تک پہنچا دے گی، حکومت کو فی ٹن چار شلنگ اور منافع کا

۲۰ فی صدی حصہ پیش کرے گی۔ یہ واجب الادا رقم ساڑھے چار لاکھ پونڈ سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ حتی الوسع افغانستان کے باشندوں کو ملازم رکھے گی۔ کمپنی کو اجازت ہے کہ وہ فنی اشخاص کو بقدر ضرورت افغانستان لائے۔ لیکن امریکہ کے علاوہ اور کہیں سے نہیں لاسکتی کمپنی تیل کی برآمد شروع ہوتے ہی افغانستان کے طلبار کی تعلیم (امریکہ میں) کے لئے ۵۰ ہزار ڈالر مخصوص کر دے گی وغیرہ وغیرہ

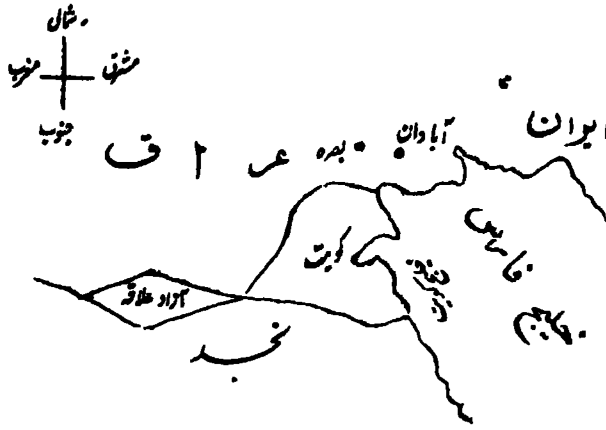


کمپنی نے عہد کیا تھا کہ وہ آٹھ مہینے کے اندر اندر افغانستان کے ہمسایہ ممالک میں سے کسی ایک سے معاہدہ کر کے سمندر تک تیل کے جانے کے حقوق حاصل کرے گی۔ سو اب ایران سے معاملہ کر لیا ہے۔ یوں کمپنی کی تجویز یہ ہے کہ افغانی تیل کے میدانوں سے بحرۂ عرب تک ایک پائپ لائن تعمیر کر لی جائے۔

کویت

کویت خلیج فارس کے شمالی سرے پر آبادان سے کوئی سو میل جنوب میں واقع ہے یہ ڈیڑھ لاکھ آبادی کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ لیکن عرب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست میں اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ عراق اور سعودی عرب کی سرحد پر واقع ہے۔ اس تمام ریگستان میں جو عراق کو عرب سے الگ کرتا ہے کویت ہی ایسا مقام ہے جہاں پانی کے اچھے کنوئیں موجود ہیں اسی لئے عراق اور عرب کی شاہراہ کویت سے ہو کر گذرتی ہے۔ ایک ربع صدی پہلے تمام جزیرۃ العرب کی طرح یہ امارت بھی حکومت عثمانیہ میں شامل تھی

لیکن ایک خانہ جنگی نے ۱۹۱۴ء میں اس کو انگریزوں کا غلام بنا دیا۔ موجودہ امیر شیخ احمد الجابر ہیں۔ کویت



برطانوی ہوائی جہازوں کا مستقر ہے۔ جب سے برطانوی ہوائی جہاز خلیج فارس سے جانا شروع ہوئے ہیں خلیج فارس کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کویت کی۔ برطانیہ اس کے اپنے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں سمجھتی اس لئے یہ امارت اندرونی طور پر آزاد کہلاتی ہے۔ اگرچہ ایک مستقل برطانوی افسر وہاں مقیم ضرور رہتا ہے۔ پہلے کویت موتیوں کی تجارت کے لئے مشہور تھا مگر جب سے مصنوعی موتیوں کا بازار گرم ہوا ہے کویت کے بازار کی آب و تاب جاتی رہی۔ "گلف آئل کارپوریشن" جس کے ساتھ "انگلو ایرانین کمپنی" نے آدھا ساجھا کر لیا ہے، یہاں تیل کی تحقیق و تلاش کا کام کر رہی ہے، کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہو رہی ہیں۔ خلیج کویت کے شمال میں ایک کنواں کھودا جا رہا تھا، اس کی گہرائی آٹھ ہزار فٹ تک پہنچی۔ تیل تو اس میں نکلا مگر تجارتی طور پر کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے اسے بند کر دیا۔ کویت کی جغرافیائی تحقیقات ابھی ابھی مکمل ہوئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ خلیج کویت کے جنوب میں حالات بہت امید افزا ہیں۔

بحرین

بحرین جو اپنے موتیوں کے لئے عہد وسطی میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جزائر کا ایک مجموعہ ہے۔ مکہ معظمہ سے مشرق کی طرف اگر ایک خط مستقیم کھینچا جائے تو وہ تقریباً سات سو میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا بحرین سے مل جائے گا۔ آٹھ سو تراسی مربع میل اس کا رقبہ ہے اور کوئی دو لاکھ آبادی

موتیوں کی برآمد اب بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ صدر مقام جزیرہ محرق ہی ۔ خلیج فارس کی دوسری اسلامی حکومتوں کی طرح یہ بھی برطانیہ کے زیر اقتدار ہے۔ موجودہ امیر شیخ محمد بن عیسیٰ الخلیفہ ہے۔ امریکہ کی دو بہت بڑی کمپنیاں اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کیلیفورنیا اور ٹیکسس کارپوریشن یہاں تیل کا کام کر رہی ہیں۔ یہاں کے تیل کی کانیں سونے کی کانیں ہیں۔ تیل نکالنے میں تقریباً کچھ خرچ نہیں ہوتا اور تیل بافراط۔ تیل کو سیال سونا کہنا سب سے زیادہ بحرین ہی میں صحیح ہے۔ بحرین کے میدانوں سے تین ہزار ٹن سے زیادہ تیل روزانہ نکل رہا ہے۔ بقول شخصے جہاں قدرت آدمی کو کچھ نہیں دیتی۔ وہاں تیل چھپا ہوتا ہے جو لوگ اللہ کی صفت رحیمی پر ایمان رکھتے ہیں انھیں تو ہر حال میں رحمت کا یقین ہے خواہ وہ بظاہر زمین سے برآمد یا آسمان سے نازل نہ بھی ہو مگر محض کی تسکین کچھ نظر آنے ہی پر ہوتی ہے۔ بحرین کے کنوؤں پر صدہا امریکن، یورپی، ہندوستانی اور عرب کام میں لگے ہوئے ہیں۔ میدان سے ساحل سمندر تک پائپ کی لائن دوڑائی چلی گئی ہے۔ بحرین دنیا کے گرم ترین علاقوں میں ہے اس کا درجہ حرارت ۱۲۰ ف۔ تک پہنچ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بڑھتی ہوئی آبادی، تالاب، میدان اور بستیوں سب کچھ موجود اندازہ ہے کہ اس سال اس کے تیل کی مقدار ایک لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی تیل کے میدانوں میں ترتیبی تعداد کا نمبر بارھواں ہے۔ خیال ہے کہ بحرین اس کی جگہ لے لے گا۔

عرب

سعودی عرب کی وادی غیر ذی ذرع میں بھی تیل کے بہت آثار پائے گئے ہیں، عراق پٹرولیم کمپنی نے مغربی عرب میں سلطان ابن سعود سے مراعات حاصل کی ہے اور حال میں اس میں یہ مزید اضافہ ہوا ہے کہ یہ کمپنی حجازی ساحل کے شمالی علاقے میں ۶۰ میل کی چوڑائی تک اپنی تحقیقی کوششیں شروع کر سکتی ہے (مقامات مقدسہ اور ان کے طبقات کا تحقیق سے کوئی تعلق نہیں) اجازت ملنے کی دیر تھی۔ کمپنی نے کام شروع کر دیا ہے۔ مشرقی عرب میں کیلیفورنیا اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کو اجازت ملی ہے۔ عمان میں (جو بحرین کے ایک جزیرہ "الاسی" کے مقابل تقریباً ۲۰ میل شمال کی طرف واقع ہے) خوب کام ہو رہا ہے۔

ایک نجی کمپنی نے ایک لاکھ پونڈ کے سرمایہ سے قطر کے علاقے میں کام شروع کیا ہے۔ یہ کمپنی عراق پٹرولیم کمپنی کے ماتحت ہے۔ قطر کا علاقہ جزائر بحرین کے جنوب شرق میں ایک جزیرہ نما کی شکل میں ہے۔ اور خلیج فارس کی



بحرۀ روم
ترکی
عراق
عقبه
تبوک
ینبوع
مدینه منوره
رابغ
جده
بغداد
بصره
کویت
آبادان
ابادان
ریاض
بحرین
قطر
حضرموت

میں شاید ہی ایک علاقہ ہو جو برطانیہ کے پاس نہیں ہے

صوبہ احسا (عرب کا شمال مشرقی علاقہ) میں بھی تیل کی امید ہے۔ یہاں بھی کام ہو رہا ہے۔ یہ علاقہ کافی وسیع ہے۔ خلیج فارس کے ساحل پر ہے۔ یقین ہے کہ یہاں بھی تیل کا بڑا خزانہ ہو گا۔

عرب کے جنوب مغرب میں دو، لاکھ چوبیس ہزار مربع میل کی ایک ریاست ہے، مسقط، اس کے ساحل کی لمبائی چار سو کیلو میٹر ہے، آبادی بھی دوسری ریاستوں سے کہیں زیادہ یعنی ۱۵ لاکھ ہے۔ ایک خاص قسم کی کھجور یہاں پیدا ہوتی ہے اور امریکہ کو جاتی ہے۔ صور، شیناس، وغیرہ مشہور شہر ہیں سعد ابن تیمور حاکم ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص اس علاقے کے اولین گورنر تھے۔ اب سلاطین کی کم زوری کی وجہ سے سوا سو سال سے انگریزوں کی نگرانی میں ہے۔

تیل کے خزانے یہاں بھی موجود ہیں۔ لیکن ابھی کوئی کمپنی میدانوں میں نہیں پہنچی ہے۔

شام

عرب کے گنگا جمنا، دجلہ و فرات مشہور دریاؤں کے درمیان شمال میں جو علاقہ ہے وہ جزیرہ کہلاتا ہے۔ اس کے کچھ مشرقی حصے کے علاوہ تمام علاقہ حدود شام میں شمار ہوتا ہے، ماہرین فن کے اس فیصلے نے کہ جزیرہ ان چشموں کا منبع ہے جو عراق میں پائے گئے ہیں فرانس کے سیاسی اور معاشی سمندر میں ایک تلاطم پیدا کر دیا ہے فرانس حال ہی میں شام کو انتداب کی قید و بند سے بہت کچھ آزاد کر چکا تھا اب بہت سٹ پٹا رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ہاتھ سے نکلی ہوئی چڑیا کو کسی طرح پھر پکڑ لے۔ حال ہی میں یہ تجویز سننے میں آئی کہ حکومت فرانس جزیرہ کو شام سے الگ ایک علیحدہ نظام کے ماتحت رکھنا چاہتی ہے۔ اس نظام کی اسپرٹ سمجھنا مشکل نہیں ہے۔

شام اپنی وسعت میں انگلستان کے لگ بھگ ہے، ۱۵ لاکھ انسانوں کا مسکن ہے، جنگ عظیم کے نتائج اور شریف حسین مہری میکموہن کے "معاہدہ کے مطابق" فرانس کے حصے میں آیا تھا۔ یہ ذلت شامیوں پر بہت شاق تھی۔ ہزارہا مجاہدین آزادی فرانس کے ظلم و جور کا شکار ہو کر ملک پر قربان ہو گئے۔ لیکن غلامی کا بندھن کچھ مضبوط ہی ہوتا گیا۔ سنہ ء میں صیاد آپ ہی آپ مہربان ہوا اور چند شرائط کے ساتھ آزادی بخش دی۔ دنیا کی چال ڈھال سمجھنے والوں کا خیال ہے کہ عراق اور مصر میں برطانوی پالیسی کا عمل اور

بحرۂ روم کی خطرناک صورت حال کو دیکھتے ہوئے فرانس کے لئے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔

قومی حکومت تیل کے خزانوں کو امداد غیبی سمجھ رہی ہے۔ اور اپنی مشکلات کے حل کرنے میں اس نے ان چشموں سے بہت امیدیں وابستہ کرلی ہیں۔ اور اس کا ارادہ تھا کہ ان چشموں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک ملکی کمپنی قائم کی جائے لیکن ابھی معلوم ہوا ملک کی مالی دشواریاں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ اور اب مجبوراً کسی غیر ملکی کمپنی کو ٹھیکہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

مصر

مصر میں تیل کافی ہوتا ہے۔ تقریباً ۳۰ سال سے ایک انگریزی کمپنی یہاں کام کر رہی ہے۔ پچھلے سال حاصل شدہ تیل کی مقدار ایک لاکھ چوہتر ہزار ٹن رہی۔ یہ تیل پیوستہ سال کی نسبت ایک ہزار ٹن زیادہ ہے۔

مصر میں ابھی تحقیقات کا کام جاری ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت ہندستی کمپنیوں کو مزید علاقوں میں تیل کا اجارہ دینے والی ہے۔ اس سال اس کمپنی نے پانچ جدید کنوئیں مکمل کر لئے ہیں۔ ان میں سے ایک کنوئیں سے صرف دو مہینے میں ۲۶ ہزار ٹن تیل حاصل ہوا۔



غزل

از جلیل صاحب قدوائی ایم۔ اے

جو وہ بر سرِ مہربانی نہیں ہے
تو کچھ لذتِ زندگانی نہیں ہے

نگاہیں تو ملتی ہیں اب بھی مگر اب
نگاہوں میں وہ مہربانی نہیں ہے

نہیں یاد آئیں گی میری وفائیں
انھوں نے مری قدر جانی نہیں ہے

نہیں حسن میں کوئی ان کا مقابل
تو الفت میں میرا بھی ثانی نہیں ہے

نگاہیں جو کہدیں تو کہدیں وگرنہ
مجھے حالتِ دل سنانی نہیں ہے

بجز داغِ حسرت کے اب اور کوئی
مرے پاس دل کی نشانی نہیں ہے

ترے حسنِ دلکش کا ہے اک ترانہ
مرے دردِ دل کی کہانی نہیں ہے

حقیقت ہی ہر لفظ میں اس کے پنہاں
جو تم سُن رہے ہو کہانی نہیں ہے

وہ اک کھیل لفظوں کا ہی جذبِ دل کی
اگر شعر میں ترجمانی نہیں ہے

کوئی اُن سے جا کر یہ کہہ دے جلیل اب
مری حالتِ دل بیانی نہیں ہے

روس میں اندرونی کشمکش

کسی ملک میں "انقلاب" ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں جو کچھ بھی ہو جائے تعجب نہیں۔ ہر انقلاب بے شک خاص حالات کے اثر اور خاص لوگوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہوتا ہے، لیکن زندگی جب ایک مرتبہ اپنی پرانی روش چھوڑ دے تو وہ پھر کسی ڈھرے پر لگتے لگتے بہت پلٹے اور اکثر پٹخنے کھاتی ہے، اور انقلاب چاہے جتنا "کامیاب" ہو، یعنی کسی ایک عقیدے کے لوگ ملک کی زندگی پر کتنے ہی حاوی کیوں نہ ہو جائیں، اس کا آخری نتیجہ دراصل ایک قسم کا سمجھوتا ہوتا ہے۔ وہ ایک فیصلہ ہے جس میں عدالت کے حکم میں اس کا ردعمل، یعنی سزا یافتہ مجرم کی خواہشیں، اغراض اور حوصلے بھی شامل ہو جاتے ہیں، جیسے بھنور میں پانی چکر کھا کر پلٹتا بھی ہے اور دھارا آگے بھی بہتا چلا جاتا ہے۔ روسی انقلاب کی ابتدا سوشل ڈیموکریٹک (جمہوری) پارٹی نے کی، پھر اس پر لینن اور بولشوک پارٹی کا قبضہ ہو گیا۔ بولشوک پارٹی کارل مارکس کی صحیح تقلید کا دعویٰ کرتی تھی، لیکن اسے ماحول مصلحت اور موقع کا بہت کچھ لحاظ کرنا پڑا۔ اب بولشوک حکومت کی باگ ڈور ستالن کے ہاتھ میں ہے، اور وہ کارل مارکس اور لینن کی تعلیم پر موقع اور مصلحت کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل کر رہا ہے۔

۱۹۳۶ء کے شروع میں وہ لوگ جو روس کی حالت سے بخوبی واقف تھے سب یہ کہہ رہے تھے کہ روسی زندگی انقلاب کی طوفانی منزلوں سے گزر چکی ہے، اب وہ ایک خاص ڈھرے پر لگ گئی ہے اور ایسی رکاوٹوں اور دشواریوں کا اندیشہ نہیں ہے جو اسے اپنا رخ بدلنے یا زور دکھانے پر مجبور کریں۔ پھر اچانک جولائی میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ زینووی یف، کامینف اور چودہ اور آدمی جو سب کم و بیش ممتاز تھے گرفتار کر لئے گئے ہیں، اور ان پر غیر ملکوں سے تعلقات رکھنے، انھیں روسی فوج اور سامان جنگ کے بارے میں اطلاعات پہنچانے، روسی حکومت اور صنعت کا نظام بگاڑنے اور مختلف عہدہ داروں کے قتل کی

سازشیں کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ جنوری ۱۹۳۷ء میں ۱۷ اور آدمی اسی طرح پکڑے گئے، جن میں سے تیرہ کو موت اور چار کو لمبی قید کی سزا دی گئی۔ جون ۱۹۳۷ء میں مارشل توخاچفسکی، انقلابی فوج کے سپہ سالار اور اس کے ساتھ فوج کے سات اور بڑے عہدہ داروں کو موت کی سزا ملی۔ حال ہی میں یہ خبر آئی ہے کہ لتوی نوف، جو یورپی ملکوں میں روس کا سب سے ممتاز نمائندہ رہا ہے اور جو خارجی پالیسی میں ستالن کا دست راست کہا جا سکتا ہے گرفتار ہوا ہے، اور غالباً وہ بھی چند روز کے اندر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ یہ تمام ملزم تو ایسے ہیں جن کے نام روس کے باہر کے لوگ بھی جانتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے سزائیں پائی ہیں جن کی صرف تعداد بتائی جاتی ہے۔

ان کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی حکومت چھپے مخالفوں سے پاک کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ روس کا اپنا گھر کا معاملہ ہی نہیں ہے، اس کا اثر دنیا کی سیاست پر پڑے گا۔ اسی وجہ سے اس پر غور کرنا بہت ضروری ہے، اگرچہ حقیقت کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے اور ہم کوئی بات پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔

ان تمام لوگوں پر جنھوں نے سزائیں پائیں یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ٹروٹسکی کے پیرو، یعنی ستالن اور اس کی حکمت عملی کے مخالف ہیں، اور ان کے خلاف یہ ثابت کیا گیا کہ ایک طرف تو وہ سبوتاژ (آلات اور سامان صنعت کی تخریب) کے ذریعے موجودہ صنعتی پالیسی کو کامیابی سے محروم رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف غیر ملکوں کو ترغیب دلا رہے ہیں کہ وہ روس پر حملہ کریں یا اس کے کسی حصے پر قبضہ کر لیں۔ ستالن اور ٹروٹسکی کے درمیان شخصی عداوتوں کے علاوہ یہ اصولی اختلاف ہے کہ ٹروٹسکی عالمگیر انقلاب کو سوشلسٹ تحریک کی کامیابی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک مارکس کے ہر سچے پیرو کا فرض ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے ہر ملک میں انقلابی تحریک کو تقویت پہنچائے۔ اس کے برخلاف ستالن اس پر تلا ہوا ہے کہ روس کو سوشلسٹ نظام کا ایک مکمل نمونہ بنائے، اور اس طرح دنیا کی اور قوموں کو سوشلزم کی طرف مائل کرے۔ شاید ٹروٹسکی اپنی اصولی اور اصطلاحی بحث میں روس کی خاص ضروریات کو نظر انداز کرتا ہے، اور ممکن ہے اصولی نقطۂ نظر سے ستالن پر جو الزام وہ لگاتا ہے وہ بھی کسی حد تک صحیح ہوں۔ ستالن کا حکومت

اور کومن ترن، یعنی اس جماعت پر جو عالم گیر انقلاب کی ذمہ دار مانی جاتی ہے، پورا تسلط ہے، استالن نے ٹروٹسکی کو جلا وطن کرا دیا۔ اور اس کے ہم خیال لوگوں کو بے دست و پا کر دیا۔ ان کے لئے سازشیں کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا اور بہت ممکن ہے جن لوگوں پر الزام لگایا گیا ہے وہ سازشوں میں شریک ہوئے ہوں۔ لیکن اصولی اختلافات ہر ملک کی سیاسی پارٹیوں میں ہوتے ہیں۔ یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ ٹروٹسکی اور ستالن میں اصولی اختلاف تھا اس وجہ سے ایک کے پیرو روس کو غیروں کے ہاتھ بیچنے پر تیار ہو گئے اور دوسرے نے انھیں پکڑ کر قتل کرا دیا۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ جنھیں روسی عدالت نے سزا دی واقعی اسی سزا کے مستحق تھے، لیکن ان پر جو الزام لگائے گئے تھے ان سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی کا انھوں نے اپنی زبان اور قلم سے اقبال کیا۔ عدالت اور حکومت نے غالباً ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی، اور ملک میں کوئی ان کی حمایت میں نہیں بولا۔ اس سے ایک گہری سازش کا پتہ چلتا ہے، اگرچہ ایسی کارروائیوں کے ظاہری اور حقیقی پہلو میں اکثر زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بہر حال روسی عدالت کا ان ملزموں کے بارے میں جو فیصلہ تھا وہ بغیر چون و چرا دنیا بھر نے تسلیم نہیں کیا، ہر طرح کے لوگ جو بجائے اس معمے کو حل کرنے کی فکر میں پڑ گئے، اور ہر طرف سے تحقیقات اور رائے زنی ہونے لگی۔ اس سب کا نتیجہ جو بحیثیت مجموعی صحیح معلوم ہوتا ہے یہ ہے۔

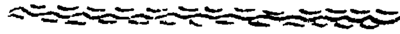
روسی عدالت نے بے انصافی نہیں کی، اگرچہ سرکاری وکیل کی زبان کہیں کہیں پر قابل اعتراض تھی، مجرم کے اقبال جرم کو ثبوت کے برابر سمجھا گیا، اور بہت سے کاغذات اور خطوط جن کی بنا پر الزام قائم کئے گئے تھے عدالت میں پیش نہیں کئے گئے۔ ملزموں کا مفصل اور مدلل اقبال جرم حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے اور فوراً یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کو اقبال جرم پر مجبور کیا گیا ہوگا، لیکن جبر کے علاوہ اس کے اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ان لوگوں کے اوپر جاسوس لگائے گئے تھے، جو انھیں دھوکے میں ڈال کر سازشوں میں شریک ہوئے، اور بعد کو جب انھیں جاسوسوں کا سامنا کرایا گیا تو ملزموں کو سب کچھ قبول کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ شاید وہ یہ بھی سمجھتے ہوں کہ

جرم قبول دینے سے ان کی سزا کچھ ہلکی ہو جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ انقلاب کے شیدائی غدار کیسے بن گئے۔ اس کا جواب ملزموں کی شخصیت اور ان کے عقائد پر غور کرنے سے مل جائے گا۔ ملزموں کے پہلے اور دوسرے گروہ میں زیادہ تر لوگ ایسے تھے جن کی عمر سازشیں کرتے گذری، ان کے عقیدے ملک اور قوم کے تصورات کے پابند نہیں تھے، اور وہ یہ جانتے تھے کہ معاشرتی انقلاب بغیر بین الاقوامی فساد کے ممکن نہیں۔ لہٰذا اگر ان میں سے کوئی یہ تدبیر سوچتا کہ جرمنی کو روس کا ایک حصہ دیکر اس کی طاقت بڑھائی جائے اور پھر دوسرے ملکوں کو اس سے بھڑا دیا جائے تو اس میں کوئی بات اصول یا انقلابی تعلیم کے خلاف نہ ہوتی۔ روسی عدالت نے ملزموں کو غدار اس لئے نہیں ٹھہرایا کہ انھوں نے انقلابی اصولوں کو چھوڑ دیا تھا بلکہ اس بنا پر کہ انھوں نے روس اور روسی قوم کو شدید نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ روس میں اب عام رائے قومیت کی طرف مائل ہے۔ روسیوں کے حوصلے صنعتی اور معاشرتی تعمیر کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہیں، وہ انقلاب کے شعلے بھڑکانے کی خاطر اپنی زندگی کو درہم برہم نہیں کرنا چاہتے۔ ملزموں کا تیسرا گروہ، جس میں سب سے ممتاز مارشل توخاچسکی تھا، اس حد تک تو انقلاب پسندوں کے ساتھ تھا کہ جرمنی کو فساد برپا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے، لیکن فساد سے اس کو صرف انقلابی تعلیم کے پھیلنے کی امید نہ تھی بلکہ وہ اپنی ترقی بھی چاہتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ توخاچسکی انقلاب اور فساد سے وہی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو نپولین کو ہوا۔ روسیوں کا اپنے موجودہ مسلک پر قائم رہنا اور ستالن کا اسی طرح حاوی رہنا توخاچسکی کے حوصلوں کے لئے ناکامیابی کا اعلان تھا۔ جرمن فوج اور اعلےٰ فوجی افسروں سے روسی سپہ سالار اور اس کے ماتحتوں کے کئی برس سے خاصے گہرے تعلقات رہے تھے، اور کوئی تعجب نہیں کہ اس نے ان تعلقات سے کام لینے کا ارادہ کیا ہو۔

اتنے ممتاز آدمیوں کا ایک ساتھ سزا پانا ایسا امر تھا جس نے روس کے باہر لوگوں کو روسی انقلاب کی خونریزیاں یاد دلا دیں۔ لیکن [illegible]یز اور امریکن کبھی مانتے ہی نہیں ہیں کہ دوسری قومیں انصاف کر سکتی ہیں یا ظلم اور تشدد سے پرہیز کرنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ دراصل موقع کو دیکھتے ہوئے روسی

حکومت نے کوئی خاص زیادتی نہیں کی ہے۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئی ہیں ان میں سے اکثر ایسے
تھے کہ ان کی بے چین طبیعتیں پُرامن زندگی گوارا نہیں کرسکتی تھیں اور بہت سے ایسے بھی تھے
جنھوں نے انقلابی بن کر ذاتی فائدے حاصل کئے تھے یا ایذا رسانی کا شوق پورا کیا تھا۔ روسی اپنی
حکومت کی اس کارروائی سے خوش ہیں اور باہر کے لوگوں کو بھی مطمئن ہی ہونا چاہئے۔ روس ان
ملکوں میں سے ہے جو اس وقت جنگ سے بچنا چاہتے ہیں اور دنیا کے امن کا دارومدار ایسے ہی
ملکوں پر ہے۔



سیاسی گرفتاریوں کے سلسلہ میں لتوی نات
کا نام بھی اس مضمون میں آ گیا ھے - بعد کی
اطلاعوں سے معلوم ھوا کہ یہ صحیح نہیں ھے -
(ایڈیٹر)

تعلیمی دُنیا

(محمد عبد الغفور صاحب ۔ ایم ۔ اے علیگ)

روس میں صنعتی مراکز | حکومت روس کی طرف سے اسکولی بچوں کے لئے تقریباً آٹھ سو صنعتی اور زرعی مرکز کھولے گئے ہیں، یہاں ہزاروں بچوں کو جدید ترین صنعتی اور زرعی طریقوں نیز آلات سے روشناس کیا جاتا ہے۔ ان مرکزوں میں بچوں کو اپنے سیدھے سادے طریقے سے تجربے کرنے اور نئی چیزیں ایجاد کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ مشہور ماہرین فن کے زیر ہدایت عمل کرتے ہیں۔ سب سے بڑا زرعی اسٹیشن ماسکو میں ہے جو زراعت سے دلچسپی رکھنے والی نوجوان نسل کا مرکز ہے۔ ہر سال ہزاروں بچے اس کے دفتر میں خطوط، استفسارات نیز بیج، پودوں اور پیوندی شاخوں کے لئے درخواستیں بھیجتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال اس ادارے میں ۱۱۰۰۰ خطوط موصول ہوئے، جن کے جواب میں آٹھ ہزار بیجوں اور ۶۳۰۰ پودوں کے بنڈل بھیجے گئے۔ ماسکو کے مرکز میں ۹ سال سے ۱۰ سال کے نوجوان، علم نباتات، حیوانات، فلکیات وغیرہ پر کام کر رہے ہیں۔

جرمنی میں یونیورسٹی طلبار کی تعداد سنہ ۱۹۳۲ء میں ۰۰۰ر۱۳۰ تھی۔ یہ اب گھٹ کر صرف ۰۰۰ر۶۵ رہ گئی ہے۔ سائنس میں تحقیقات کا کام محض جنگی ضروریات کے نقطۂ نگاہ سے کیا جا رہا ہے۔ آرٹس میں علمی آزادی کے آخری نشان بھی آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں۔ اساتذہ جب تک آریہ نسل سے ہونے کا پورا ثبوت نہ دیں نہ لیکچر دے سکتے ہیں، نہ کوئی کتاب شائع کر سکتے ہیں۔ کم از کم ۱۵۰۰ معلمین کو زبان بند رکھنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اور ان کے علاوہ ہزاروں روزی چھن جانے کے ڈر سے خاموش ہیں۔ نئی ملازمتیں صرف ان کو مل سکیں گی جو لیبر کیمپ، فوج یا کسی خاص کیمپ میں جہاں نازی ازم کی تعلیم دی جاتی ہے، کام کر چکے ہوں۔ حکومت کی طرف سے ایک نیشنل اسٹوڈنٹ لیڈر

مقرر ہے جو ہر یونیورسٹی کے لئے ایک لیڈر معین کرتا ہے۔ اس افسر کے اختیارات یونیورسٹی رکٹر (Rector) سے بھی زیادہ ہیں۔ پچھلے دنوں تمام یونیورسٹی رکٹروں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ وزارت تعلیم سے مشورہ لئے بغیر کسی طالب علم کو سند نہ دیں۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا تیرھواں اجلاس ۲۷ دسمبر سے ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء تک کلکتہ میں منعقد ہوگا۔ مفصلہ ذیل عنوانات پر مقالات پڑھے جائیں گے اور بحث و مذاکرات ہوں گے۔ ابتدائی اور دیہاتی تعلیم۔ ثانوی۔ یونیورسٹی۔ گھریلو تعلیم۔ تعلیم بالغان۔ بیٹیوں کی تعلیم۔ طریقۂ امتحان۔ صحت اور ورزش کی تعلیم۔ تعلیم اخلاق و مذہب۔ اساتذہ کی تربیت و تعلیمی تحقیقات۔ بین الاقوامی اخوت اور امن کی تعلیم۔ اس کانفرنس میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کا یورپی وفد بھی شامل ہوگا۔ نیز ایک تعلیمی نمائش بھی اس سلسلہ میں منعقد کی جائے گی۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب وائس پرنسپل ٹریننگ کالج علیگڑھ کو برمنگھم یونیورسٹی کی طرف سے ان کے مقالہ پر جو انھوں نے ایم اے ایجوکیشن کے لئے پیش کیا تھا، کیڈبری پرائز عطا کیا گیا ہے۔ پروفیسر موصوف پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے یہ تعلیمی امتیاز حاصل کیا ہے۔ مقالہ کا موضوع "طریقِ امتحان اور اس کا جائزہ" تھا۔ امتحان کا تعلیمی مسئلہ ولایت کے تعلیمی حلقوں میں جاذبِ توجہ ہے۔ ابھی پچھلے سال سر فلپ ہارٹوگ کے قلم سے "امتحانوں کا امتحان" کے عنوان سے ایک رپورٹ شائع ہو چکی ہے۔ نیز ایک بین الاقوامی تعلیمی کمیشن نے بھی اس موضوع پر مبسوط تحقیقاتی رپورٹ شائع کی ہے۔ پروفیسر موصوف کو اس کامیاب مقالے کی تصنیف پر پروفیسر سیرل برٹ جیسے مشہور ماہر تعلیم اور محقق نفسیات تعلیمی نے مبارکباد دی ہے۔ امید ہے یہ مقالہ عنقریب چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ نیز Intellectual Co-operation کے بین الاقوامی مرکزی دفتر سے صاحب موصوف سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ ہندوستانی نظام تعلیم اور امتحان کے سلسلے میں

علمی تحقیقات کے کام میں مرکز مذکور سے تعاون کریں ۔

چین میں تعلیمی فلموں کے سلسلے میں کچھ عرصے سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے ۔ پچھلے سال وزارت معارف کی جانب سے ملک بھر میں ۱۶۰ فلمیں (۱۶ ملی میٹر، باآواز اور خاموش دونوں) کی تقسیم و اشاعت کا انتظام کیا گیا تھا ۔ یہ فلمیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں امدادی طور پر استعمال ہونگی ۔ نیز عوام کے لئے دلچسپ معلومات اور تفریح کا سامان مہیا کریں گی ۔ تمام ملک کو ۱۲۰ اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا ہے ۔ ہر ضلع میں ایک تربیت یافتہ آپریٹر ہوگا ۔ پچھلے سال نانکن یونیورسٹی کی طرف سے آپریٹروں کی تربیت کے لئے ایک خاص جماعت کھولی گئی تھی ۔ حکومت ایک سینما اسکول کھولنے کی تجویز پر بھی غور کر رہی ہے ۔

حکومت اسپین کی طرف سے مزدوروں کے لئے ایک آسان بی ۔ اے کی ڈگری کا انتظام کیا گیا ہے جس میں پندرہ سال سے ۳۵ سال کی عمر تک کے طلباء داخل ہو سکیں گے ۔ ان طلباء کا انتخاب ان امیدواروں میں سے کیا جائیگا جن کے نام کسی ٹریڈ یونین کی طرف سے پیش کئے گئے ہوں اور جنھوں نے فاشسزم کے خلاف عملی جدوجہد کی ہو ۔ مدت تعلیم دو سال ہوگی ۔ اختتام کے بعد طلباء کو بی ۔ اے کی سند دی جائے گی جس کی علمی حیثیت دوسری اسناد کے برابر تصور کی جائے گی ۔ طلباء سے فیس نہیں لی جائے گی بلکہ کتابیں اور سامان تعلیم بھی مفت مہیا کیا جائے گا ۔ حکومت کی طرف سے ان طلباء کو جو مشقت و مزدوری سے اپنا کنبہ پالتے تھے امداد دی جائے گی ۔ تاکہ وہ اور ان کے متعلقین مالی مشکلات سے بے فکر ہو جائیں ۔

ورلڈ ایجوکیشنل کانفرنس ٹوکیو میں دو ہزار جاپانی اور نو سو غیر ملکی نمائندے شامل ہوئے جن میں تقریباً چالیس ممالک کے ماہرین تعلیم تھے ۔ جاپان کے بعد امریکہ کے نمائندے سب سے زیادہ

تھے یعنی ۴۷۵ - اس کے بعد کنیڈا ۹۲ - فلپائن ۷۳ - ہندوستان ۶۲ - انگلستان ۲۸ - سیام ۱۱ - چین ۱۱ - جرمنی ۸ - لنکا ۷ -

کانفرنس کا پروگرام متنوع اور بے حد دلچسپ تھا جس میں خاص قابل ذکر چیزیں مفصلہ ذیل ہیں :- ٹوکیو پریفیکچرل آرٹ گیلری میں آرٹ کی نمائش - جدید و قدیم - شرو کیوڈ یپارٹمنٹ سٹور میں تمدنی اور صنعتی آرٹ کی نمائش سٹوکیو میں نسوانی اعلے نارمل اسکول میں تعلیمی نمائش ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی کی سیر - جاپانی ناچ - مہانوں کے لئے جاپانی ارکسٹرا orchestra ڈرامے - چائے نوشی کے مہذب طریقے - جاپانی پھولوں کی سجاوٹ - فن پہلوانی - تیغ زنی - تیراندازی وغیرہ کے مطالعہ کے لئے مناسب سہولتیں مہیا کی گئی تھیں - بقول ایک ہندوستانی ڈیلیگیٹ کے معلوم ہوتا تھا کہ اہل جاپان نے ہم لوگوں کو اپنے تہذیب و تمدن سے روشناس کرانے کے لئے بلایا ہے نہ کہ اک دنیا بھر کی تعلیمی مجلس میں مشورے اور بحث و گفتگو کے لئے -

---

ہائی کمشنر ہند کے دفتر تعلیم سے انگلستان میں ہندوستانی طلبار کے موضوع پر سالانہ رپورٹ حال میں ہی شائع ہوئی - یہ رپورٹ ستمبر ۱۹۳۶ء تک کی ہے - اس سال کے دوران میں ۱۳۵۰ ہندوستانی طلبار انگلستان میں تعلیم پا رہے تھے جن میں ۴۷ عورتیں تھیں - سب سے زیادہ طلبار ڈاکٹری میں (یعنی ۴۴۶) - اس کے بعد آرٹس میں (۳۱۲) ہیں - اس سال کے دوران میں ہندستانی طلبار کا ہوسٹل جو ۲۱ کرام ول روڈ پر واقع تھا - طلبار کی کمی کی وجہ سے بند کر دیا گیا - ہندوستانی طلبار کی یونین اور ہوسٹل واقعہ ۱۱۲ - گوئر اسٹریٹ اپنے مفید فرائض باقاعدگی کے ساتھ انجام دیتے رہے - اور پچھلے سالوں کی نسبت انجمن کے ممبروں میں کافی اضافہ ہوا - اس سال ہندوستانی طلبار نے تعلیمی حالت اور امتیازات حاصل کرنے کا معیار تسلی بخش رکھا - ۴ سائنس کے طلبار کو ڈی ایس سی ۲۴ کو پی ایچ ڈی - اور ۱۲ کو ایم ایس سی کی ڈگریاں ملیں - آرٹس میں ۱۴ طلبار نے پی ایچ ڈی کی تکمیل کی کھیلوں میں جہانگیر خاں کیمبرج کی طرف سے کرکٹ کھیلا - مسٹر بیگ نے مکہ بازی میں

کیمبرج یونیورسٹی کی نمائندگی کی اور بعد ازاں یونیورسٹی کے ٹینس بلیو (Blue) کا امتیاز حاصل کیا۔ اس سال میں خاص طور پر قابل ذکر یہ امر ہے کہ ایجوکیشن یعنی اساتذہ کی ٹریننگ کلاسوں میں طلباء کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں ایک نیا تعلیمی دور کا آغاز ہونے والا ہے، امید ہے کہ ہندوستانی تربیت یافتگان کی بڑھتی ہوئی تعداد تعلیمی ہندوستان کی روزافزوں ضروریات کو پورا کر سکے گی۔

پچھلے پندرہ ماہ کی مدت سے فرانس کا نظام تعلیم ایک ایسے دور اصلاحات میں سے گزر رہا ہے جس میں نظم ونسق۔ اسکولی بچوں کی عمر کے تعین وغیرہ کے سلسلے میں دلچسپ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مادام ژولیو کیوری کو ان وسائل کی نگرانی پر مقرر کیا گیا ہے جن کے ذریعہ حکومت اعلٰے سائنس کی ایجادات کو فروغ دے سکے گی۔ وزیر تعلیم موسیو ژری آن زاا اسکولی عمر کی حدود کو متعین کرنے اور لازمی تعلیم کے اجراء میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔ ایک نئے قانون کی رو سے چھ سال سے چودہ سال کے بچوں کے لئے خواہ ملکی یا غیر ملکی۔ ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ نیز لیبر کوڈ (Labour Code) میں بھی مناسب تبدیلیاں کردی گئی ہیں جن کی رو سے کوئی بچہ چودہ سال کی عمر سے پہلے کسی تجارتی یا صنعتی ادارے میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔ پچھلے دسمبر میں ایک اسکول براڈ کاسٹنگ کمیشن مقرر کیا گیا ہے جس کا فرض اسکولوں کے لئے مناسب تعلیمی پروگرام تیار کرنا ہے۔

جولائی ۱۹۳۶ء میں ہام برگ میں کل دنیا کی فالتو اوقات اور تعلیمی تفریح کی کانگرس کے مذاکرات کے بعد برلن میں ایک مرکزی بیورو قائم کیا گیا ہے جس کے فرائض مفصلہ ذیل ہیں:- ان انجمنوں اور مشاہیر کے پتے مہیا کرنا جو تفریحی تحریکات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ نیز اس تحریک پر ہر قسم کا لٹریچر مہیا کرنا۔ تفریحی تحریک کی تاریخ پر تحقیقات کرنا مختلف قوموں کی تفریحی تنظیم اور طریق کا مطالعہ کرنا اور

اس کی کل دنیا میں اشاعت کرنا۔ یہ ادارہ تفریح کے عملی پہلو۔ مختلف ممالک کی تحریکوں کی رپورٹ وغیرہ بھی مہیا کرتا ہے۔ نیز اس سلسلے میں اعداد و شمار فراہم کرتا ہے۔ ایسے مختلف ممالک میں جو تفریحی تنظیم میں پیش پیش ہیں۔ تعلیمی دوروں۔ تقریر و نکا علما اور عملی کام کرنے والوں کی باہمی کانفرنسوں کا انتظام کرتا ہے۔ اس تحریک کی پہلی کانفرنس لاس انجلوس میں ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوئی تھی۔

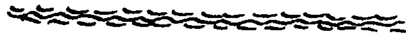
نازی حکومت کی تحریک سے جرمنی کے تعلیمی اور سماجی حلقوں میں جسمانی ورزش پر بہت توجہ کی جارہی ہے اور کچھ عرصے سے مختلف یورپی ممالک کے ماہرین تعلیم بھی اس تحریک کو بے حد دلچسپی سے مطالعہ کررہے تھے۔ پچھلے نومبر میں انگلستان سے ریاضت جسمانی کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک وفد جرمنی بھیجا گیا جو دس افراد پر مشتمل تھا۔ وفد نے ابتدائی اور ثانوی مدارس کا مطالعہ کیا۔ نیز چند ایسے اداروں کا جو جرمنی بلکہ اس کی موجودہ حکومت سے مخصوص ہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر نیشنل پولٹیکل ایجوکیشن کا ادارہ ہے جس میں ان طلبا کی تربیت کی جاتی ہے جن میں قیادت اور رہبری کا ذاتی ملکہ موجود ہے۔ ایک دوسرا اسکول قائدین کے لئے ہے۔ لیبر کیمپ میں نوجوانوں کو بغیر کسی سماجی امتیاز کے اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور مشقت کی عزت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ landyear camp میں شہری بچوں کو دیہات کی زندگی اور مشغلوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ وفد نے ہٹلر کی نوجوان تحریک کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔ وفد نے ولایت کے تعلیمی بورڈ کے سامنے اس موضوع پر رپورٹ پیش کردی ہے جس کی سفارشات پر غور کیا جارہا ہے۔ ہندوستان میں ریاضت جسمانی کی تحریک ابھی قائدین کرام اور ماہرین تعلیم کی توجہ کی محتاج ہے۔ مسٹر کھیر نے جو خوش قسمتی سے وزیر اعظم کے فرائض کے ساتھ ساتھ وزارت تعلیم کا قلمدان بھی سنبھالے ہیں کونسل کے اندر اور باہر ملک کی توجہ اس اہم مسئلہ پر مبذول کرائی ہے۔ مگر ہندوستان میں ریاضت جسمانی کے ساتھ ساتھ اسکولی بچوں کی خوراک کا مسئلہ بھی انتہائی ضروری ہے بلکہ اس سے زیادہ اہم ہے۔ خالی پیٹ ورزش کرانا یا ایسے بچوں سے جن کو غربت کی وجہ سے اچھی غذا نہ مل سکے ریاضت جسمانی کا کام لینا یقیناً ان کی صحت کے لئے مضر ہوگا۔

حکومت بمبئی نے شریمتی ناتھی بائی دامودر ٹھاکرسے انڈین وومن یونیورسٹی کو سرکاری طور پر منظور فرما کے طبقۂ نسواں پر بڑا احسان کیا ہے۔ یونیورسٹی کی بنیاد پروفیسر کاروے کی مخلصانہ اور سرفروشانہ کوششوں سے پڑی تھی۔ حکومت کی طرف سے منظوری ہونے کے بعد یونیورسٹی کو پندرہ لاکھ کا وہ گراں قدر عطیہ مل جائے گا جو سر وٹھل تھیکرسے نے اس ادارے کے لئے وقف کر دیا تھا اور اب تک شرائط وقف کی رُو سے یونیورسٹی اس رقم کے صرف سود سے مستفید ہو سکتی تھی۔ اس ادارے میں سب مضامین کے لئے ذریعہ تعلیم دیسی زبانیں ہیں۔ اور بی۔اے کے بعد کی جماعتوں میں بھی دیسی زبانوں ہی میں تعلیم ہوتی ہے۔

آئندہ سال ماہ جنوری میں انڈین سائنس کانگریس، کلکتہ میں اپنی سلور جوبلی کی تقریب منا رہی ہے اس سلسلے میں کانگریس کی طرف سے برٹش ایسوسی ایشن (Br. Association) کے سرکردہ اصحاب اور غیر ممالک کے مشاہیر سائنس کو مدعو کیا گیا ہے۔ طے کیا گیا تھا لارڈ رتھرفورڈ کی صدارت میں برٹش ایسوسی ایشن اور انڈین سائنس کانگریس کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوگا۔ مگر پروفیسر موصوف کی بے وقت اور ناگہانی موت کے سبب اس تقریب کو یہ عزت حاصل نہ ہو سکی۔ انگریزی وفد دسمبر میں روانہ ہوگا اور تقریبًا دو ماہ انگلستان سے باہر رہے گا۔ کانگریس کی طرف سے پروفیسر آئن سٹائن کے نام بھی ایک دعوت نامہ بھیجا گیا تھا، ان سے اس موقع پر اپنے خاص موضوع پر چند تقریریں کرنے کی درخواست کی گئی تھی مگر موصوف نے ناسازی طبع کی وجہ سے حاضری سے معافی چاہی۔ اس کانگریس میں دنیائے سائنس کے درخشاں و تابندہ ستارے شامل ہو رہے ہیں۔ سرزمین ہند پر اس سے پہلے سائنس کے علماء کا اتنا بڑا اور اہم اجتماع نہیں ہوا۔ مثلاً صرف شعبہ نفسیات میں ہی مائر (Myers) ڈائرکٹر لیبریٹری آف انڈسٹریل سائیکالوجی انگلستان، پروفیسر سپیرمین (Spearman) لندن یونیورسٹی۔ ڈاکٹر ینگ وغیرہ شامل ہو رہے ہیں۔

ٹروینڈرم میں آئیندہ دسمبر میں ہونے والی آل انڈیا اورنیٹل کانفرنس کی صدارت پروفیسر ایف ۔ ڈبلیو ۔ ٹامس فرمادیں گے جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں بوڈن پروفیسر آف سنسکرت ہیں ۔

کونسل آف برٹش اکادمی نے سر رادھا کرشنن ، پروفیسر فلسفہ کلکتہ (حال آکسفورڈ) کو Master Mind (بہترین دماغ) کے موضوع پر سالانہ لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا ہے ۔ اس سلسلے میں اس سے پہلے دانتے ۔ ارسطو ۔ سپینوزا وغیرہ پر ڈین انگ اور پروفیسر راس نے لیکچر دئے ہیں ۔ رادھا کرشنن صاحب آغاز ۱۹۳۸ء میں مہاتما بدھ پر تقریر فرمائیں گے ۔ اور یہ لیکچر کتاب کی شکل میں اکادمی مذکور کی طرف سے شائع کیا جائے گا ۔



رفتارِ عالم

مراکش

مراکش میں بے چینی برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے، عرب وطن پرست آئینی جد و جہد کو چھوڑ کر مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں، پڑوس میں اسپینی مراکش ہے، جہاں نوجوان عرب جرمن افسروں سے قواعد سیکھ سیکھ کر جنرل فرانکو کی فوجوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہیں سے مراکشی وطن پرستوں کو ہتھیار پہنچے ہیں۔ فرانسیسی حکومت سختی کرتی ہے تو خون خرابہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر نرمی برتتی ہے تو وطن پرستوں کی تحریک آزادی کو اور پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ہل چل صرف مراکش تک ہی محدود نہیں بلکہ الجزائر اور ٹیونس میں بھی قوم پرستوں نے آزادی کی لڑائی شروع کر دی ہے۔ آخر الذکر ملک کے مشہور رہنما عبدالعزیز الثعالبی ایک عرصے کی جلا وطنی کے بعد واپس ٹیونس پہنچے ہیں۔ آپ کے دم سے ملک کی مردہ تحریک میں از سر نو جان پڑ گئی ہے، فرانس میں اس وقت عوام پسند حکومت ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ شمالی افریقہ میں پرانی حکمتِ عملی کو بدلا جائے اور قوم پرستوں کے مطالبات کو ایک حد تک مان لیا جائے لیکن اہل ملک کی مصیبت اتنی بڑھ چکی ہے کہ معمولی دوا دارو سے ان کا اچھا ہونا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ سرے سے سامراج کی لعنت سے اس زمین کو پاک کیا جائے۔ پھر کہیں جا کر شمالی افریقہ میں بسنے والوں کو اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

مراکش، الجزائر اور ٹیونس کی بے چینی کی تہ میں اقتصادی اسباب کام کر رہے ہیں۔ ساحل کی زرخیز زمینیں فرانسیسی آبادکاروں نے لے لیں، تجارت یہودیوں اور فرانسیسیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اب عرب کھائے تو کہاں سے کھائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سوزش پھیلنے لگی اور اب فرانس ہے کہ تمام جتن کرتا ہے لیکن حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

(م، س)

فلسطین

فلسطین کے عربوں کی "خودسری" اور "ناشکری" پر برطانیہ کہاں تک صبر کرتی آخر سات آٹھ لاکھ عربوں کو برطانیہ کی جناب میں یہ گستاخی کرنے کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ برطانیہ کے شاہی کمیشن کے فیصلے کو ٹھکرا دیں مجبوراً ان سر پھروں کو قرار واقعی سزا دینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ آن کی آن میں تمام فلسطین پر فوجی قبضہ ہو گیا مجلس اعلیٰ توڑ دی گئی اور اس کے ارکان قید و بند کی نذر ہوئے، مجلس اسلامی معطل، اور مفتی اعظم برسبب جس نے اجتماع کی جسارت کی، گرفتار کر لیا گیا۔ راستوں اور سڑکوں پر پہرے بٹھا دئے گئے۔ جس گاؤں کے قریب گولی چلنے کا حادثہ ہوا۔ اس گاؤں کے ممتاز لوگ گرفتار رہا اور اُن کے مکان آگ کی نذر، اختیارات عام عدالتوں سے چھین کر فوجی عدالتوں کو دے دئے گئے ہیں۔ راہ چلتوں کی جامہ تلاشی ہو رہی ہے۔ جس کے پاس سے آتشیں ہتھیار نکلتا ہے وہ پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

فوجی قانون کی اس دارو گیر نے "سر پھرے" عربوں کو کچھ زیادہ سراسیمہ نہیں کیا۔ ریلوے گاڑیاں اب بھی بارود سے اُڑائی جا رہی ہیں۔ عرب نشانہ باز پولیس اور فوج کی تاک میں برابر رہتے ہیں اور کوئی دن نہیں جاتا کہ کوئی واردات نہ ہوتی ہو۔ ایک طرف فلسطین میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے تو دوسری طرف جزیرہ عرب، شرق اردن، شام اور عراق میں برطانیہ کی اس حکمت عملی کے خلاف سیاسی مجلسوں، دینی اجتماعوں اور جمہوری اداروں میں آگ برسائی جا رہی ہے۔ حجاز کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیرۂ عرب کے بدو تک اپنے فلسطین بھائیوں کی مصائب سے متاثر ہو رہے ہیں اور ابن سعود کی حکومت کے لئے "برطانیہ دوستی" کا طرز عمل رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

عراق اور مصر تو چند سال بیشتر برطانیہ کے ساتھ خون کی اس قسم کی ہولی کھیل ہی چکے ہیں۔ اور وہ اچھی طرح سے جان گئے ہیں کہ جب برطانی سامراج اس طرح کے اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے تو یہ اس کی "باعزت پسپائی" کی تمہید ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ برطانیہ کب تک بندوقوں کی گولیوں، طیاروں کے بموں اور پھانسیوں کے تختوں کے ذریعے عربوں کو شاہی کمیشن کے فیصلوں کو ماننے پر اصرار کرتی ہے۔

(م۔ س)

مصر

مصر کی سیاسی ہائے و ہو صرف ان باتوں میں گھر کر رہ گئی ہے ، بادشاہ کی ذات ، وفد جماعت اور اس کا رہنما ، سیاسی جماعتوں کی آپس کی تو تو ، میں میں ، بادشاہ کسی جامع مسجد میں نماز ادا کرتا ہے تو ہفتوں تک اخبارات کے کالم سیاہ ہوتے ہیں ۔ اب خیر سے بادشاہ کی شادی کی دھوم ہے ، بادشاہ کی ہر دل عزیزی وفد کے رہنما مصطفے نحاس کو پریشان کر رہی ہے ۔ بادشاہ شہر کی ایک جامع مسجد میں نماز پڑھتا ہے تو نحاس پاشا کسی دوسرے حصے میں پہنچتا ہے ۔ ایک طرف "زندہ باد بادشاہ" کے نعرے بلند ہوتے ہیں تو دوسری طرف نیلی "پوشوں" کے دستے "زعیم مصر" کو سلامی دیتے ہیں ۔ نیلی پوشوں کی تحریک وفد جماعت نے شروع کی ہے ، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نحاس پاشا مصر میں ہٹلر اور مسولینی بننے کا خواب دیکھ رہا ہے حاشیہ نشین اسے بادشاہ کے خلاف بھڑکا رہے ہیں اور ہٹلر اور مسولینی کی مثال دے کر مصر کا مختار مطلق بننے کی ہمت دلاتے ہیں ۔ وفد اور قصر شاہی کی یہ کشمکش اب ہر شخص کی زبان پر ہے ۔ وفد کو اپنی اکثریت پر ناز ہے اور بادشاہ پرست استحقاق شاہی اور دین دار طبقوں کی پشت پناہی ڈھونڈھتے ہیں ۔

سیاسی جماعتوں کی خانہ جنگی نازک صورت اختیار کر رہی ہے ۔ وسط نومبر میں پارلیمنٹ کا سہ ماہی اجلاس شروع ہوا ۔ ایک اخبار کا بیان ہے کہ کئی ارکان اندر کی جیبوں میں پستول لے کر گئے ۔ پارلیمنٹ کے باہر پولیس بغرض احتیاط تیار تھی ۔

ادھر زعمار آپس میں دست گریبان ہیں اور ادھر مغربی حدود پر مسولینی فوج پر فوج بھیج رہا ہے ۔ اہل مصر نام نہاد آزادی پاکر خوشی میں یہ بھی بھول گئے کہ آزادی کے لئے سپاہ و اسلحہ کی ضرورت پڑتی ہے ۔ مصر جیسا غیر محفوظ ملک جو چاروں طرف سے دشمن سے گھرا ہوا ہے فوج کی طرف سے کس طرح غفلت برت سکتا ہے لیکن برطانیہ کی قوت و جبروت پر بھروسہ ہے اس لئے مگن ہے ۔ اور آپس میں لڑ رہے ہیں ۔

(م ، س)

ترکی کا پنج سالہ پروگرام

مصری اخبارات کا خیال ہے کہ عصمتی وزارت کے استعفے اور جلال بائر کے کابینے کے تقرر کی وجہ یہ ہے کہ ملک کو اب سیاسی مدبروں سے زیادہ معاشی ماہروں کی ضرورت ہے، ممکن ہے عزل و نصب کی یہ وجہ صحیح نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ جمہوریہ ترکیہ اپنی تمام تر توجہ اس وقت ملک کے معاشی اور سماجی اصلاح و تعمیر پر صرف کر رہی ہے۔ کانح سعد آباد میں توفیق رشدی آراس نے جو تقریر کی تھی اس میں سب سے زیادہ زور معاشی اصلاح و استحکام پر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ترکی میں پہلے پنج سالہ پروگرام کے ختم ہونے سے قبل ہی ایک دوسرے پروگرام کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ ترکی جمہوریت قوم کی معاشی اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کی تعمیر براہ راست خود کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایک بڑے اجارہ دار کی طرح ان کاموں کو انجام دے رہی ہے۔ وہ ریلیں نکالتی ہے فیکٹریاں کارخانے اور بجلی گھر قائم کرتی ہے۔ زراعت کو نئے نئے آلات کے ذریعے ترقی دیتی ہے اور یہ تمام کام ایک معین اور واضح پروگرام کے ماتحت کئے جاتے ہیں۔ سنہ ۲۷ء میں حکومت نے پہلے پہل یہ تحقیق کیا تھا کہ ملک میں تمام چھوٹے بڑے کارخانے ۲۴۲ ۱ ہیں۔ جن کی سالانہ آمدنی نوے کروڑ روپے کے قریب ہے، یہ سب نجی کارخانے تھے۔

حکومت نے ان تمام کاموں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ملک میں سب سے پہلے ایک شکر فیکٹری قائم کی جس کی سالانہ پیداوار رفتہ رفتہ ۷۵ ہزار ٹن ہو گئی۔ ملک کی ضرورت کے لئے یہ مقدار بالکل کافی تھی، اس طرح شکر کی درآمد کا دروازہ بند ہو گیا۔ پہلے پنج سالہ پروگرام کا سب سے بڑا عطیہ کپڑا بننے کا کارخانہ ہے۔ وہ اس وقت ملک کی اسی فی صدی ضرورت کو بخوبی پورا کر رہا ہے۔ ملاطیہ میں فیکٹری کی عمارت بن رہی ہے اس کی تکمیل کے بعد پھر باہر کے کپڑے کی قطعاً ضرورت نہیں رہے گی۔ نقلی ریشم کے کپڑے کی صنعت بھی اچھی ترقی کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں معدنیات اور کاغذ بنانے کے کارخانے بھی پہلے ہی پروگرام سے حاصل ہوئے۔ ترکی صنعتی ترقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۳۲ء میں نوے کروڑ روپے کی چیزیں تیار ہوئی تھیں اور سنہ ۳۶ء میں چار ارب اڑتیس کروڑ کی تیار ہوئیں۔

دوسرا پنج سالہ سالہ پروگرام (سالہا ۳۷-۴۱ء) جس کا اجرا ابھی عمل میں آیا ہے۔ معدنیات کو خاص

طور پر ترقی دینا چاہتا ہے۔

ترکی میں معدنیات کی کمی نہیں ہے، ترکی زمین اُن کا بہت بڑا خزانہ چھپائے ہوئے ہے۔ اور پھر یہ کہ ان کانوں میں نہایت عمدہ قسم کی دھاتیں ہیں۔ ترکی کی کچی دھاتوں میں اصل دھات کی جو مقدار ہوتی ہے دوسرے ملکوں کی دھاتوں میں عموماً نہیں ہوتی۔ بعض بعض دھاتوں میں تو دوسرے ملکوں کی نسبت دوگنی مقدار نکلتی ہے۔ معدنیات کے کارخانے ابھی ابتدائی حالت میں ہیں لیکن کم از کم گندھک کے لئے اب بھی ترکی کسی کا محتاج نہیں ہے۔ پہلے ہی پروگرام کے ماتحت "کیسی کارلو" میں گندھک صاف کرنے کا کارخانہ مکمل ہوگیا۔ اس لئے گندھک کی درآمد کی ضرورت نہیں رہی۔ تانبے کی کانوں میں بھی اب از سرِ نو کام شروع ہوا ہے تاکہ جدید ایجادات اور تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر انھیں زیادہ بہتر بنایا جاسکے۔ اس پروگرام میں معدنی کارخانوں کے علاوہ دوسری اہم چیز بحری جہازوں کی تعمیر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ترکی بندرگاہوں پر بھی نظرِ ثانی کی جائے گی اور ان کی اصلاح و ترمیم عمل میں آئے گی۔ چند نئی بندرگاہیں اور بجلی گھر بھی بنائے جائیں گے۔

ایک تیسرا پروگرام اور ہے وہ خالص زراعتی ہے اور ۳۸ء سے ۴۲ء تک عمل کرے گا۔ اس کے کل خرچ کا اندازہ دو ارب روپے ہے۔ اس کے ماتحت بہت وسیع پیمانے پر زراعت اور جنگلات کا کام کیا جائے گا۔ لکڑی کے ہل کی بجائے لوہا و زراعتی مشینیں استعمال ہوں گی۔ دوسرے زراعتی ملکوں کی نسبت ترکی بڑا خوش قسمت ہے یہاں نہ آبادی بڑھ جانے کی شکایت ہے اور نہ ابھی زمین کی کمی کا شکوہ، ضرورت صرف دو چیزوں کی ہے۔ نئے آلات کا استعمال اور پانی کے خزانوں کی تعمیر۔ اور یہی دو کام زراعتی پروگرام کا مقصود ہے۔

اس سلسلے میں گذشتہ مہینے کمال اتاترک نے سمرنا کے قریب (اسمری) میں کپڑا بننے کے ایک کارخانے کا افتتاح کیا ہے۔ جس کا سرمایہ دو کروڑ نئے قریب ہے، اس موقع پر کمال اتاترک اور وزیرِ اعظم جلال بایر نے ملک کی معاشی ترقی کے متعلق ایک نہایت موثر تقریر کی۔

ریلوں کی طرف سے بھی حکومت غافل نہیں رہی ہے۔ پچھلے پروگرام میں بھی ریلوں کی تعمیر ایک اہم عنصر تھا اور اس نئے پروگرام میں بھی موجود ہے ہم آئندہ کوشش کریں گے کہ تعمیر شدہ اور مجوزہ ریلوے لائن کو نقشے کے ذریعے واضح کریں

(ع ۔ م)

جیمس رامزے میکڈانلڈ

۹ر نومبر کی شب کو "رینا ڈل پیسیفکو" نامی جہاز پر دنیا کے زبردست مدبر اور برطانیہ عظمیٰ کے سابق وزیر مسٹر میکڈانلڈ کا انتقال ہوگیا۔ آپ تفریح کی خاطر تین ماہ کے لئے جنوبی امریکہ جارہے تھے۔ اور روانگی کے وقت آپ نے فرمایا تھا کہ "یہ پہلا سفر ہے جو میں دنیا کی تمام فکروں سے آزاد ہوکر شروع کررہا ہوں" اتفاق دیکھئے کہ اس کے ساتھ ہی ان کا آخری سفر بھی شروع ہوگیا۔ خوش قسمتی کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ ایک معمولی سے مزدور کا لڑکا دنیا کی عظیم الشان سلطنت کا ایک مرتبہ نہیں بلکہ تین مرتبہ وزیر اعظم بنے اور جب مرے تو دنیا کی تمام فکروں سے آزاد ہوکر

مسٹر میکڈانلڈ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۶ء کو انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں لاسی متھ میں پیدا ہوئے۔ اور قصبہ ڈرینی کے بورڈ اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چند سال بعد وہیں پڑھنے اور پڑھانے کے دونوں کام ایک ساتھ انجام دینے لگے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ لندن پہنچے اور تقریباً دس روپیہ فی ہفتہ پر کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ لیکن اپنی تعلیم کا سلسلہ شبینہ مدارس اور نجی مطالعہ کے ذریعے سے برابر جاری رکھا۔ اس کے بعد خرابیٔ صحت کی وجہ سے ملازمت ترک کرکے اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کرلیا۔

مسٹر میکڈانلڈ کے وسیع مطالعہ نے انھیں پکا اشترا کی بنادیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء وہ انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی میں شامل ہوگئے اور اگلی ہی سال پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے۔ لیکن ناکام رہے۔ ۱۸۹۶ء میں مارگریٹ ای گلیڈ اسٹون کے ساتھ آپ کی شادی ہوئی اور ۱۹۱۰ء میں آپ پہلی مرتبہ ہندوستان تشریف لائے۔ پھر ۱۹۱۲ء-۱۹۱۴ء میں سول سروس رائل کمیشن کے رکن کی حیثیت سے آئے۔

یہ آپ کی ابتدائی زندگی کے چند معمولی واقعات ہیں جنھیں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اصل چیز تو آپ کی سیاسی زندگی ہے۔ ۱۹۰۰ء سے پہلے انگلستان میں ٹریڈ یونین جماعتیں سیاسیات اور دستوری جدوجہد سے بالکل الگ تھلگ رہتی تھیں۔ یہ مسٹر میکڈانلڈ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۹۹ء میں ٹریڈ یونین کانگرس نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ وہ پارلیمنٹ میں مزدوروں کی سیاسی جماعت قائم کرنے کے مسئلے پر غور کرے۔

اس کمیٹی کے سکریٹری خود مسٹر میکڈانلڈ ہوئے۔ بالآخر اسی کی سفارش پر ۱۹۰۰ء میں لیبر پارٹی قائم ہوگئی اور ۱۹۰۶ء میں اس نے پہلی مرتبہ پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لیا۔ چنانچہ اس مرتبہ صرف ۲۹ رکن منتخب ہوسکے جن میں سے ایک مسٹر میکڈانلڈ بھی تھے۔ ہوتے ہوتے ۱۹۱۱ء میں آپ لیبر پارٹی کے لیڈر ہوگئے۔ اور ۱۹۱۴ء میں یعنی جنگ عظیم سے عین قبل آپ نے وہ معرکہ آرا تقریر کی جس میں آپ نے برطانیہ کے جنگ میں حصہ لینے کی سخت مخالفت کی تھی۔ اس تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم میں جس پر اس وقت جنگ کا بھوت سوار تھا، آپ مردود و معتوب ٹھہرے اور آپ کو لیبر پارٹی کی لیڈری سے استعفیٰ دینا پڑا۔ پھر ۱۹۱۸ء کے عام انتخابات میں آپ پارلیمنٹ کے معمولی رکن بھی منتخب نہ ہوسکے۔ اس طرح ۱۹۲۲ء تک آپ ملک کی عملی سیاسیات سے بالکل علیحدہ رہے۔ حتیٰ کہ قوم کو ہوش آیا اور اسے آپ کی اصابتِ رائے تسلیم کرنا پڑی۔ چنانچہ ۲۲ء کے انتخابات میں لیبر پارٹی کے ۱۴۰ ممبر منتخب ہوکر آئے اور مسٹر میکڈانلڈ تمام مخالف جماعتوں کے لیڈر مقرر ہوئے ۱۹۲۳ء میں پھر عام انتخاب ہوا۔ اور لیبر کو ۱۹۲ نشستیں حاصل ہوگئیں۔ اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں اپنی حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش کی جو لبرل جماعت کے اشتراک سے پاس ہوگئی۔ چنانچہ ۲۲ جنوری ۱۹۲۴ء کو آپ وزیر اعظم مقرر ہوگئے۔ آپ کا یہ پہلا دورِ حکومت صرف ۱۰ ماہ تک جاری رہا۔ اس عرصے میں آپ نے ۱۹۱۴ء کی تقریر کی مطابقت میں دنیا میں امن و امان قائم کرنے کی بہت سی تدابیر اختیار کیں۔ ان میں سے ایک تدبیر روس سے معاہدہ کرنا تھا۔ اس پر لبرل جماعت علیحدہ ہوگئی اور کمیونسٹ ورکرز ویکلی کے ایڈیٹر مسٹر جے۔ آر کیمبل کے خلاف مقدمہ واپس لینے کے سلسلے میں مسٹر میکڈانلڈ کی حکومت کو شکست ہوئی جس کی وجہ سے عام انتخاب لازمی ہوگیا۔ اب ساری قوم لیبر جماعت سے برگشتہ ہوگئی تھی اور اسے بالشویک اصول کا حامی سمجھتی تھی۔ اس لئے اس مرتبہ لیبر جماعت کے صرف ۱۵۰ ممبر منتخب ہوسکے چنانچہ مسٹر میکڈانلڈ نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور پھر مخالف جماعتوں کے لیڈر ہوگئے۔ اور لیبر جماعت نے ۱۹۲۵ء کی کانفرنس میں ان کی لیڈری پر اپنے اعتماد کی مہر ثبت کردی

پانچ برس بعد ۱۹۲۹ء کے انتخابات میں لیبر جماعت کا پلہ پھر بھاری ہوگیا یعنی اس کے ۲۹۰ ممبر منتخب ہوگئے بخلاف اس کے ۲۵۹ قدامت پسند، ۵۸ لبرل اور ۹ غیر متعلق ارکین پہنچ سکے۔ چنانچہ آپ دوبارہ

وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ وزارت ترتیب دینے کے بعد ہی آپ نے دنیا میں امن قائم کرنے کا اپنا ناتمام مشن دوبارہ شروع کر دیا۔ اور اس میں بہت بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اسی زمانے میں عالمگیر کساد بازاری کا دور دورہ ہوا اور اکثر ملکوں کی حکومتوں کی طرح مسٹر میکڈانلڈ کی حکومت بھی دو برس کے اقتدار کے بعد اس کا شکار ہوگئی۔ یہاں تک آپ کی زندگی کا ایک باب ختم ہو جاتا ہے اور آگے بالکل نیا اور دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔

اس شکست کے بعد آپ نے لیبر جماعت کی مرضی کے خلاف دوسری جماعتوں سے سمجھوتہ کرکے ایک مشترکہ قومی حکومت قائم کرلی۔ پھر ۱۹۳۱ء کے عام انتخابات میں قومی حکومت کو زبردست تائید حاصل ہوئی۔ اور خود مسٹر میکڈانلڈ ایک سوشلسٹ کے مقابلے میں زبردست اکثریت سے کامیاب ہوئے لیکن آپ کی لیبر جماعت آپ سے برگشتہ ہوچکی تھی۔ اور اس قلابازی کو پارٹی کے ساتھ غداری سے تعبیر کرتی تھی مسٹر میکڈانلڈ کے اس طرز عمل کے اسباب و وجوہ کچھ بھی ہوں یعنی چاہے آپ نے اس وقت کے حالات اور مصالح کے پیش نظر قوم کی بہبودی کی خاطر یہ صورت اختیار کی ہو یا ذاتی وجاہت اور اقتدار کی لالچ میں ایسا کیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ جس جماعت کے آپ بانی تھے۔ جسے گہوارے سے لے کر شباب تک آپ نے پروان چڑھایا تھا اور جس کے اقتدار اور عدم اقتدار کے ہر زمانے میں بیس برس تک آپ لیڈر رہے تھے اس جماعت کو آپ کی اس حرکت سے زبردست دھکا لگا۔ اس کا وجود معرض خطر میں پڑ گیا اور اس کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ شاید وہ اس ضرب کاری سے نہ سنبھل سکے۔ تھامس مور نے ایک موقع پر لبرلوں کے لئے کہا تھا کہ "جس طرح شہد کی مکھیاں پھولوں پر بیٹھ کر بھنبھنانا بند کر دیتی ہیں اسی طرح وگ جماعت والے جب وزارت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو اُن کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔" لبرلوں سے زیادہ یہ چیز لیبر پر اور اس کے بانی اور رہنما پر صادق آئی۔ کیونکہ نہ صرف اس کی زبان بند ہوگئی بلکہ اس نے سرے سے اپنی جماعت ہی سے منہ موڑ لیا اور وزارت کی کرسی ہی کا ہو رہا۔

بہر حال ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک آپ قومی حکومت کے متواتر وزیر اعظم رہے لیکن اس زمانے میں اپنے متعلق خود آپ کی یہ رائے تھی کہ "میں کنسرویٹو جماعت کے ہاتھوں میں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا تھا۔"

۱۹۳۵ء میں آپ نے خرابیٔ صحت کی وجہ سے قلمدانِ وزارت مسٹر بالڈون کے سپرد کر دیا اور خود لارڈ پریسیڈنٹ کے عہدے پر قناعت کی۔ پھر آخر ۱۹۳۵ء میں جب عام انتخابات ہوئے تو مسٹر میکڈانلڈ اپنی اس قلابازی کے بدولت بہت بری طرح ہارے۔ لیکن کابینہ میں رکھنے کی خاطر آپ کے احباب نے ۱۹۳۶ء میں آپ کو اسکاٹش یونیورسٹیوں کی طرف سے پھر منتخب کرالیا۔ چنانچہ مئی ۱۹۳۷ء تک آپ مسٹر بالڈون کی حکومت کے لارڈ پریسیڈنٹ رہے۔ اس کے بعد مسٹر بالڈون کے ساتھ آپ بھی مستعفی ہو گئے۔

ہندوستان کو بھی لیبر گورنمنٹ سے اور اس سے زیادہ بیداری ہند کے مصنف مسٹر میکڈانلڈ سے بہت کچھ امیدیں تھیں۔ لیکن جو امیدیں انھوں نے خود پیدا کی تھیں ان کا بھی لیبر پارٹی کی طرح خود ہی خاتمہ کر دیا۔ اور ہندوستانیوں کو یہ محسوس کرایا کہ آزادی کسی کے دینے سے نہیں بلکہ خود حاصل کرنے سے ملتی ہے۔ بہر حال موجودہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مسٹر میکڈانلڈ ہی کے زمانے کی یادگار ہے۔ (م، ع، خ)

سر جگدیش چندر بوس

سر جگدیش کی موت سے ہندوستان کی وہ زبردست شخصیت اٹھ گئی جسے مہاتما گاندھی اور سر رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح بین الاقوامی اہمیت حاصل تھی۔ نباتات کے متعلق جدید تحقیقات کے سلسلے میں سر جگدیش کی شہرت ان کے اوائل شباب ہی میں دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھی۔ اُن کی شخصیت اور اُن کی دریافت مسلمہ ہو چکی تھی۔

موصوف چند روز سے اپنے ایک عزیز کے یہاں گریڈیہ میں مہمان تھے اور علالت کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ ۲۲ر نومبر کی شب میں حسب معمول آپ ۱۰ بجے سو گئے اور صبح ہشاش بشاش اٹھ کر غسل خانے میں تشریف لے گئے۔ لیکن جب خلاف معمول وہاں آپ کو دیر ہوئی تو لیڈی بوس نے اس کی جستجو کی چنانچہ آپ وہاں بے ہوش پائے گئے۔ فوراً ڈاکٹر طلب کئے گئے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور اس عظیم الشان سائنٹسٹ کی روح ۲۳ر نومبر کو ۸ بجے جسد خاکی سے پرواز کر گئی۔

سر جگدیش کی عمر اس وقت ۷۹ برس کی تھی۔ آپ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ سینٹ اکسیویر کالج کلکتہ سے ڈگری لینے کے بعد آپ تکمیل تعلیم کے لئے کیمبرج تشریف لے گئے جہاں سے ۱۸۸۴ء میں آپ نہایت اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے اور واپسی پر فوراً ہی کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج میں طبیعات کے پروفیسر مقرر ہوگئے اس کے بعد آپ نے تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ نباتات میں بھی نشوونما کی وہی صورتیں پائی جاتی ہیں اور وہی احساسات موجود ہیں جو دوسرے جاندارون میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ اس کے ثابت کرنے کے لئے آپ نے ایک خاص آلہ یا مشین ایجاد کی جسے کریسکوگراف کہتے ہیں۔ یہ آلہ نباتات کی چھوٹی سی چھوٹی حرکت کو ظاہر کرسکتا ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پودے بھی اسی طرح بڑھتے۔ جوان ہوتے اور بوڑھے ہوکر مرجاتے ہیں جس طرح دوسرے جاندار۔ علاوہ ازیں ہر مرض مرض۔ درد تکلیف اور رنج خوشی کا انھیں بھی اسی طرح احساس ہوتا ہے جس طرح ہمیں ہوتا ہے اور وہ ان سب چیزوں سے پوری طرح متاثر ہوتے ہیں۔

شروع شروع میں سائنس داں دنیا نے آپ کے ان دعووں کو افسانوں سے زیادہ وقعت نہیں دی لیکن جب مختلف ممالک میں آپ کو اپنے دعووں کو ثابت کرنے کے لئے مدعو کیا گیا اور آپ نے اپنے ایجاد کردہ آلات سے انھیں پوری طرح ثابت کرکے سائنس دانوں کو مطمئن کردیا تو انھیں بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔

اس کے بعد آپ نے کلکتہ میں بوس انسٹیٹیوٹ کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی جس میں آپ کی دریافت کے سلسلے میں مزید تفتیش و تحقیق جاری ہے اور سائنس سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی جاتی ہے۔ (م، ع، خ)

حکیم محمد احمد خان

خاندانِ شریفی میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے بعد حکیم محمد احمد خاں یونانی طب میں غیر معمولی شہرت کے مالک تھے۔ ملک کے گوشے گوشے سے مریض اُن سے علاج کرانے دہلی آتے تھے اور سینکڑوں بندگانِ خدا

زمانہ اُن کے فیض عام سے مستفید ہوتے تھے۔

آپ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ مبادیات طب اپنے والد سے اور عربی ادب و فلسفہ مولوی طیب عرب صاحب رام پوری سے پڑھا لیکن والد کے انتقال کے بعد طب کی تکمیل اور مطب کی مشق اپنے چچا حکیم واصل خاں صاحب سے کی۔ اس کے بعد اپنا علیحدہ مطب شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ ایک عرصے تک طبیہ کالج میں درس بھی دیتے رہے۔

حکیم اجمل خاں صاحب کے انتقال کے بعد طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانہ تو ان کے صاحبزادے حکیم محمد جمیل خاں صاحب کے سپرد ہوا۔ طبی کانفرنس حکیم غلام کبریا خاں صاحب عرف بھورے میاں کے ذمے کی گئی اور خاندانی مطب میں حکیم محمد احمد خاں صاحب بٹھائے گئے۔ لیکن حکیم محمد جمیل خاں صاحب کے مستعفی ہو جانے اور حکیم بھورے میاں کے انتقال سے یہ تمام ذمہ داریاں حکیم محمد احمد خاں کے سپرد ہو گئی تھیں جنھیں گذشتہ سال تک آپ نے سنبھالا۔ لیکن اس سال آپ سب سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنی تمام توجہ مطب تک محدود کر دی۔ چونکہ ایک عرصے سے آپ کی صحت خراب تھی اس لئے ابھی کچھ مدت ہوئی کہ تبدیل آب و ہوا اور آرام کی خاطر آپ عراق تشریف لے گئے تھے وہاں شدید بخار کا حملہ ہو گیا اور حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر آپ کے ہمراہی فوراً آپ کو ہندوستان واپس لے آئے۔ جب آپ ۱۳ر نومبر کو دہلی پہنچے تو سرسامی کیفیت طاری تھی۔ یہ صورت ۱۵ر نومبر تک جاری رہی اور شام کو ۵ بجے کے قریب آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

حکیم محمد احمد خاں بڑے جید طبیب تھے اور قدیم فلسفہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس ضمن میں علم طب اور علم کیمیا سے آپ کو خاص شوق تھا۔

طب کے سلسلے میں آپ کی قوت تشخیص اور علاج میں اُپج خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یوں تو آپ کے علاج کے متعلق سینکڑوں قصے مشہور ہیں لیکن ہم یہاں مریضوں سے نہیں بلکہ امراض سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ حکیم محمد احمد خاں صاحب کو بعض امراض کے علاج میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ یعنی ان امراض کا جس طرح وہ علاج کرتے تھے اس طرح اب تک دوسرے اطبا نے ان کا علاج نہیں کیا تھا دوسرے اطبا کو مرحوم کی سی

کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی

میں یہاں صرف دو امراض کا تذکرہ کروں گا یعنی ورم زائدہ دودیہ (Appendicitis) اور دردِ قولنج (Colic)۔ ان دونوں امراض کے علاج میں مرحوم کو خاص ملکہ حاصل تھا۔

(Appendicitis) کے متعلق ڈاکٹروں کا یہ نظریہ ہے کہ انسان کے جسم میں ایک ایسی آنت ہے



جو کسی زمانے میں اپنا کام کرتی تھی۔ لیکن انسانی ارتقاء کے سلسلے میں اب اس نے کام کرنا بند کر دیا ہے اس لئے وہ سوکھ کر رہ گئی ہے۔ اسے (Appendix) کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ...) جب اس میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی داخل ہو جاتی ہے تو سمیت پیدا ہو کر ورم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے درد شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے ڈاکٹروں کے نزدیک اس کا کوئی علاج نہیں ہے بجز اس کے پیٹ کا آپریشن کر کے یہ زائد آنت کاٹ کر پھینک دی جائے۔ حکیم محمد احمد خاں اس کے قائل نہ تھے اور انہوں نے اس کے متعدد کامیاب علاج کئے۔

آپ کا نظریہ یہ تھا کہ ایک تو ہاضمہ درست رکھا جائے اور سمیت پیدا نہ ہونے دی جائے۔ اور دوسرے پیدا شدہ سمیت کو رفع کر کے ورم کو تحلیل کیا جائے۔ جب ورم تحلیل ہو جائے گا تو آنت مذکور سکڑے گی اس فعل میں وہ عارضی چیز یا تو خود بخود خارج ہو جائے گی یا اگر کچھ عرصے تک سمیت پیدا نہ ہوئی

تو وہ جزو بدن ہو جائے گی۔

دوسرا مرض قولنج تھا۔ اس سلسلے میں آپ کا خیال تھا کہ (Colon) میں (ملاحظہ ۲) صفرا نہ گرنے کی وجہ سے انقباض پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے درد اٹھنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں اسہال کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے عموماً کسٹر آئل۔ گرم پانی۔ صابون وغیرہ کا اینما کیا جاتا ہے۔ لیکن جب قبض شدید ہوتا ہے تو یہ چیزیں کوئی اثر نہیں کرتیں۔ اس لئے زیادہ تیز اور زود اثر چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ حکیم محمد احمد خاں ہمیشہ گائے کے پتے (صفرا Bile) کا اینما دیا کرتے تھے۔ ایک تو تیزی کی وجہ سے اس کا اثر یقینی ہوتا تھا۔ دوسرے صفرے کی کمی کو یہ خارجی طور پر پورا کر دیتا تھا۔

اس کے علاوہ امراض نسواں کے علاج میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا اور عرق گلاب سے فالج کا علاج بھی آپ کا بہت مشہور ہے۔

علم کیمیا اور دوا سازی سے حکیم صاحب کو غیر معمولی شغف تھا۔ کیمیا میں آپ اس حد تک کامیاب ہوئے تھے کہ سونے کا "جوڑا" بنانے لگے تھے۔ جوڑا کیمیا کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم ایسا سونا بنالینا ہے جو ہم وزن اصلی سونے سے ملا دینے کے بعد اصل شرح سے کچھ کم پر فروخت ہو سکے۔

مرحوم یونانی دوا سازی کے فن کو یورپ کے سائنٹیفک اصولوں پر ڈھالنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں دو مرتبہ یورپ کا سفر بھی کیا اور وہاں کے مختلف کارخانوں میں دوا سازی کے طریقے اور سائنٹیفک آلات کا بطور خود مطالعہ اور تجربہ بھی کیا اور ہندوستان واپس آکر انہی اصولوں پر امراض معدہ و جگر و امعاء، امراض خون، امراض سینہ وغیرہ کے لئے چند دوائیں تیار کیں۔ مختلف خام ادویہ کے ریکوب یا ست نکالنے اور ان کے امتزاج سے کوئی نئی دوا تیار کرنے میں آپ ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ افسوس کہ موت نے انھیں مہلت نہ دی ورنہ یونانی طب کو ان کی ذات سے بہت کچھ فائدہ پہنچنے کی امیدیں تھیں۔

(م، ع، خ)

جاپان کا چین پر حملہ

۷ر جولائی کو جاپان نے ایک معمولی سے واقعے کو بہانہ بنا کر چین پر لشکر کشی شروع کردی۔ یہ لڑائی غصے میں نہیں چھڑی۔ جاپانی فوجوں کی پہلی نقل و حرکت سے ظاہر ہو گیا کہ اُن کے سپہ سالار سب کچھ طے کئے بیٹھے تھے اور بس اشارے کے منتظر تھے۔ چین کے دارالسلطنت پیئی پنگ سے ایک جاپانی فوج شمال مغرب کی طرف بڑھی۔ ایک جنوب مغرب کی طرف اور ایک جنوب کی طرف۔ اس لشکر کشی کا مقصد یہ تھا کہ شمالی چین کے پانچ صوبوں یعنی چاہار، سوئی یوآن، شان سی، شان تنگ اور ہوپئی پر قبضہ ہو جائے، جن کا رقبہ چار لاکھ مربع میل اور آبادی ساڑھے سات کروڑ ہے۔ دو برس پہلے جاپان نے مانچوکو کی طرح ان صوبوں کو بھی ایک ماتحت سلطنت بنانے کی کوشش کی تھی جو ناکامیاب ہوئی اور سنہ ۳۶ء کے آخر میں مانچوکو کی ایک فوج جو چاہار صوبے میں گھس گئی تھی، پسپا کردی گئی۔ اب جاپان علانیہ ان صوبوں پر قبضہ کر رہا ہے۔

چین کی حالت اتنی نازک تو نہیں ہے جتنی کہ حبش کی تھی، لیکن سامان جنگ اور جدید آلات کی کمی کے سبب سے چینی فوج، جس کی کل تعداد پچیس تیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جاپانیوں کے سامنے کہیں بھی نہ ٹھہر سکے گی وہ تمام ریاستیں جو جاپان کی روک ٹوک کر سکتی تھیں خاموش بیٹھی رہیں، اور جاپان کو اٹلی کے مقابلے میں کہیں زیادہ آزادی سے مہم سر کرنے کا موقع مل گیا ہے۔

مالیات کے ماہر کہتے ہیں کہ جاپان نے ۱۹۳۱ء کے بعد سے جو صنعتی اور سیاسی پالیسی اختیار کی ہے اس کا نتیجہ جاپان کے حق میں مفید ہو ہی نہیں سکتا۔ جاپان نے مانچوکو فتح کر کے کئی ارب ین کا نقصان اٹھایا اور اب چین کی مہم بھی انتہائی کامیابی کے باوجود جب حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت ہی غلط سودا ہے۔ لیکن یہ جب ہوگا تب ہوگا۔ ابھی تو جاپانی فوجیں آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور جن صوبوں پر وہ قبضہ کرنا چاہتی ہیں ان کے مرکزی مقامات اُن کے ہاتھ آ گئے ہیں۔ شروع دسمبر میں نہیں تو بڑے دن تک چینی دارالسلطنت نین کنگ پر جاپانی جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ شنگ ہائی میں جن قوموں کا کاروبار ہے۔ یعنی انگریز

امریکن اور فرانسیسی ۔ انھوں نے جاپان کو وہ مرتبہ دینا منظور کر لیا ہے جو چینی حکومت کو اب تک حاصل تھا اور برسلز میں جو کانفرنس ہو رہی تھی اس نے جاپان کو اخلاقاً مجرم ٹھہرا کر اسے عملاً اختیار دے دیا ہے کہ جو چاہے کرے ۔ در اصل برطانوی سامراج کے تمام اراکین اور باقی تمام قومیں جنھیں جاپان سے ذرا بھی اندیشہ تھا جاپان کی حکمت عملی سے بہت مطمئن ہیں ۔ کیونکہ اب جاپان ایک عرصے تک چین کے سوا اور کسی طرف پھیلنے کا خیال نہ کرے گا ۔ وہ اہل رائے جو پہلے کہتے تھے کہ جاپان کی مالی حالت بہت نازک ہے ۔ اب کہتے ہیں کہ چین کی فوجوں کو شکست دینا بہت آسان ہے ۔ چین پر قابض رہنا بہت مشکل ہوگا ۔ اس لئے کہ میدان میں شکست کھانے کے بعد چینی قزاقانہ جنگ شروع کر دیں گے ۔ لیکن یہ سب بحث کے بارے میں بہت وثوق کے ساتھ کہا جا چکا ہے جاپان نے چین پر منہ مارا ہے اور جتنا منہ میں سمایا اتنا تو نگل جائے گا ۔

(باقی آئندہ)

صحیفۂ چین

از

اسد علی انوری فرید آبادی

"صحیفۂ چین" میں چین کی قدیم وجدید تاریخ پر نہایت محققانہ نظر ڈالی گئی ہے، اور ثابت کیا گیا ہے کہ پرانے زمانے میں مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی علوم کا معیار کس قدر بلند تھا۔ زبان میں سلاست اور روانی کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

کتابت وطباعت نہایت عمدہ اور کاغذ چکنا لگایا گیا ہے۔ کتاب کی جلد بندی میں خاص اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے، ڈسٹ کور کی رنگینی نے اس کی زینت کو اور بھی بڑھا دیا ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عمر)

شعلۂ طور

از

جگر مراد آبادی

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری

جو فارسی میں

امیر خسرو کے کلام کی مخصوص صفت ہے

اُردو میں

جگر مراد آبادی کے حصہ میں آئی ہے

شعلۂ طور

جگر کے کلام کا مکمل مجموعہ ہے

قیمت سے،

مکتبہ جامعہ دہلی

Printed at Mahbub-ul-Mataba, Delhi.